

خواہورت کس نیوں کا مجموعہ

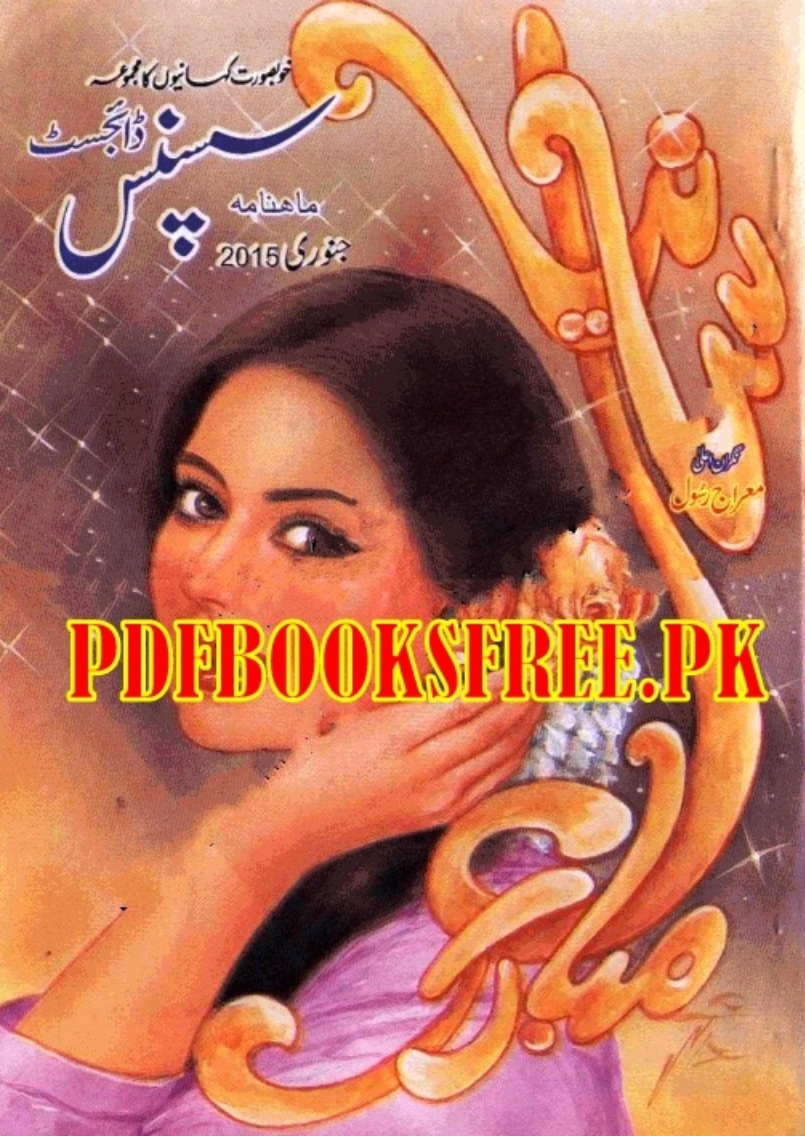
سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

جنوری 2015

گلابی
معراج رسول

PDFBOOKSFREE.PK



آپ کے ہاتھوں ہی ایک انجمن رنگ رنگ تپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

محفل شعریں

قارئین 164

شکجہ مناقہ کی منکر میں گھسنے والوں کی عجیب منطقوں کا اظہار

شکجہ

سلیم انور 167

ماوی ایک چوڑی دھڑکی چھانوں کی چھوٹ جیت کی عنایتوں ذائقوں اور تقاضوں کا ایک دل بہا سلسلہ

ماوی

محمی الدین نواب 176

پہلے آئے وقت کو کارآمد کرنے والے ایک بے وقوف عاشق کا اگلا سفر

پہلے آئے

منظر امام 221

نابالو عباس ایک نوجوان کی محبت اور اس کی محبت کے اثرات و خیرات کا احوال

نابالو عباس

ضیاء نسیم بلگرامی 225

نافا بل معانی ایک نوجوان کا شرم و غم و حسرت کے اثرات و خیرات کا احوال

نافا بل معانی

ڈاکٹر شیر شاہ سید 237

چھان بہن چھان بہن کی تلاش اور چھان بہن میں جیون تمام کرنے والے ایک دلکش و شہزاد کی سوانح

چھان بہن

تنویر ریاض 241

بے شرم نشا شہلی چاہتی ہے اور جیون رفاقتوں اور کیمس رشتہ جیون کی ابو ابو داستان

بے شرم نشا

سلیم فاروقی 250

انشائیہ

جون ایلیا 7

آپ کے خط

مدیر اعلیٰ 8

عشق نامہ

الیاس سینا پوری 16

عفریت

کاشف زبیر 59

عشق نامہ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی 76

جدا از غما

طاہر جاوید مغل 117

کہنہ عشق

مرزا امجد بیگ 124

راہ عشق

سید احتشام 153

اپنی کوہ پیوں اور سڑکیوں پر ایک صاحب نظر کا نوحہ

سپنس ٹیکس مشاورت فیس کی تخفیفیں ہاتھ لگنے پر پرنسٹن مشورے

بانی کا آئینہ ہاتھ لگنے پر اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

ایک خونی بلا کا احوال جو دست کا خوف کا اظہار تھا

محفل شعریں

محفل شعریں

محفل شعریں

محفل شعریں

محفل شعریں

محفل شعریں

محفل شعریں

محفل شعریں

محفل شعریں

محفل شعریں

محفل شعریں

محفل شعریں

بے دولتی

ہمارا سب سے بڑا ہنر یہی تو ہے کہ ہمارا ہنر اپنے کام نہ آئے اور یہ کہ وہ دوسروں کے پس و پیش، چپ و راست اور پست و بلند کی صورت گری کرنے، انہیں سنوارنے اور نکھارنے میں اپنا جواب نہ رکھتا ہو۔ تم تھے ہی نہیں، ہم تھے ہی نہیں، تم ہو ہی نہیں، ہم ہیں ہی نہیں۔ ہم اور تم تو بس ایک دکھائی دینے والا دھوکا ہیں، ایک دھوکا جو نہ جانے کیوں ہے؟ میں یہ سوچتے سوچتے بلکان ہو گیا ہوں کہ وہ جو نہیں ہیں، وہ جو دھوکا ہیں، وہ دکھائی بھی کیوں دیتے ہیں۔

ہمیں شرم آنا چاہیے کہ ہم تم میں سے ہیں اور تمہیں اس پر بچھتنا چاہیے کہ تم ہم میں سے ہو۔ تم اور ہم ایک بیزار کر دینے والا قہر میں جسے دیکھتے دیکھتے چوٹے دیکھنے لگے ہیں۔

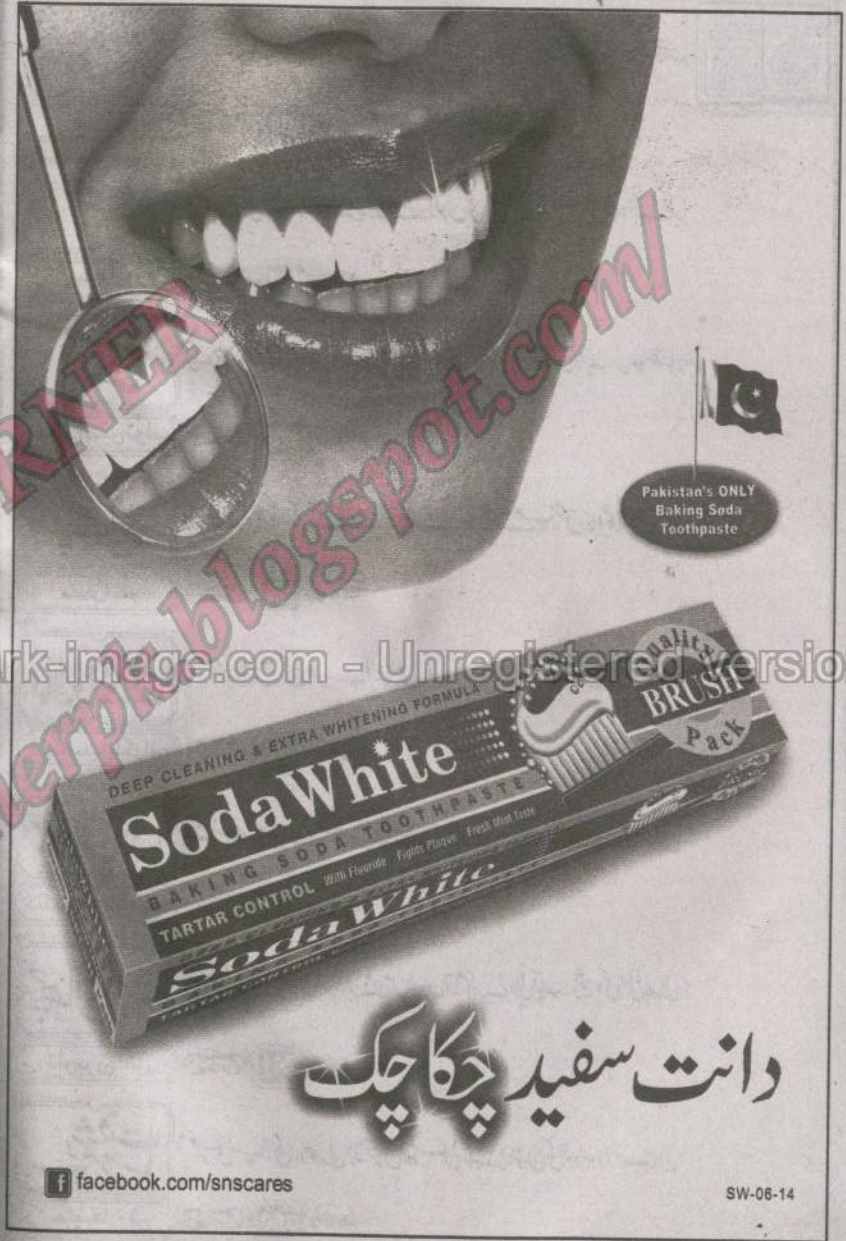
اب ہم سب سرزمین عرب کے اس علاقے کو ایک ساتھ دیکھ رہے ہیں جس کو ہماری سرزمین کے ہنرمندوں نے ریگستان کا معجزہ بنا دیا ہے، ہنر کا معجزہ۔ ہماری کارگزاری کا سارا سلیقہ دوسروں کے لیے اس کمال کے ساتھ ظہور میں آیا ہے۔ ہم نے اپنی بستیوں سے دوران بستیوں میں آکر جو عمارتیں بنائی ہیں، وہ سر بلند رہنے کے لیے ہیں، دیکھتے ہی دیکھتے گر پڑنے کے لیے نہیں ہیں اور گزرگاہوں کا جو فرش بچھایا ہے وہ زمین کے سینے پر جڑے رہنے کے لیے ہے، موسم کی انہی ہی روشیں ادھرنے کے لیے نہیں۔ نہیں سمجھا جاسکتا کہ شہر پر دازی کی وہ کاوش اور دفتر داری کی وہ دانش آخر کس کام کی جو اپنے شہروں اور اپنے دفاتروں کے کام نہ آئے۔

تمہارے شہروں کے باہر، تمہارے ماہر، تمہارے محنت کش دوسری سرزمینوں کے ناموں کو لپیٹے ہوئے کانوں سے سنتے ہیں۔ ایسے کتنے ہیں جو یہاں سے سفر اختیار کرنا نہ چاہتے ہوں۔ کسی نے کہا تھا اور کراہتے ہوئے کہا تھا:

”میرے لوگ، میرے جنات دوسری قوموں کی مزدوری کریں گے۔ ان کی تھکان دوسروں کا آرام بنے گی۔ میرے اہل ہنرمندوں کے غلام بن جائیں گے۔ میرے اہل دانش کی مہارت دوسروں کے اشاروں کی خدمت کا ترن ہو جائے گی۔ ان میں سے ہر گروہ اپنے اپنے کام کے حساب سے خوب کام لے گا اور یہ دولت، منامت اور نصرت کی کمائی ہوگی۔ وہ اپنے وجود سے دھیر وار ہوجائیں گے اور پھر تو وہ جو چاہیں، پائیں اور معنی اشرافیاں چاہیں، اپنی جیبوں میں بھر کر لائیں۔“

پر یہاں ایک اور بات بھی کہنی چاہیے اس لیے کہ وہ حق اور انصاف کی بات ہے اور وہ بات یہ ہے کہ ہم میں سے زیادہ لوگ آخر یہ کیوں نہ چاہیں کہ انہیں دو وقت کی روٹی ملنے کا سہارا تو ہو۔ اور اگر اس سے بھی زیادہ، بہت زیادہ کی امید ہو تو آخر وہ اپنے شہروں سے کیوں نہ کوچ کر جائیں۔ میں تو بھی سمجھی یہ کہتا ہوں کہ ایسا ہی ہوتا چاہیے۔ جہاتوں اور ہنرمندوں کو اپنی سرحدیں پار کرنے کی خواہش آخر کیوں نہیں رہتی چاہیے؟ انہوں نے اپنی عمر کا بہترین زمانہ دن رات محنت کر کے گزارا ہے۔ ان میں سے اکثر کو ان کے شہروں سے کیا ملا ہے۔ ان میں سے لاکھوں لوگ ایسے ہیں جو ہر حالت میں سیکڑیں رہنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے لاکھوں ایسے ہیں جو آج کی امید نہ سبکی توکل کی امید پر زندگی بسر کرنے کی خواہش رکھتے ہیں مگر یہاں تو ابھی تک نہ آج کی امید ہے اور نہ کل کی۔ وہ یوں کہ جو ہمارے والی ٹھہرے ہیں، وہ بھی فضول ہیں اور جوان والیوں کو ہٹا کر ان کی گدی پر بیٹھنا چاہتے ہیں، وہ بھی فضول ہیں۔

جن لوگوں نے اپنے آقاؤں سے لو لگائی ہے اور جنہوں نے ان آقاؤں کے حریفوں سے امیدیں رکھی ہیں، وہ سب گھٹائے میں رہے ہیں۔ حکمرانوں اور مدعیوں کا کہنا باطل ہی ثابت ہوا ہے، باطل باطل سب باطل۔ اب اگر لوگ پھر کر ان دونوں پر ٹوٹ پڑیں تو کیا یہ کوئی جرم ہوگا؟ میں کہتا ہوں کہ یہ حق ہوگا، انصاف ہوگا، عدل ہوگا۔ لوگ وعدوں سے تنگ آگئے ہیں چاہے یہ وعدے یہ کریں یا وہ..... اس ملک کے حاکموں اور ان کے حریفوں نے اور ان کی حکمتوں نے یہاں کی جو ہر دار ذہانتوں کو دوسری قوموں کا گدار کر بنا دیا ہے اور یہ ہنرمند بے قصور ہیں۔ یہ بے چارے ملکوں ملکوں جا کر گداگری کرتے ہیں اور اپنے اپنے مشکلوں کی بھیک اپنے ملک میں بیچ دیتے ہیں۔ وہ اس ملک کی اور کیا خدمت کر سکتے ہیں؟ عمران محنت کشوں کی بیٹی ہوئی یہ دولت اس ملک کی بے دولتی ہے۔ ہاں، اسے مجبور بار برداری کی قوم! یہ تیری بے دولتی ہے۔



Pakistan's ONLY Baking Soda Toothpaste

DEEP CLEANING & EXTRA WHITENING FORMULA

Soda White

BAKING SODA TOOTH PASTE

TARTAR CONTROL With Fluoride Fights Plaque Fresh Mint Taste

Soda White

facebook.com/snscares

SW-06-14



بولتا ہے کہ اگر کراہے۔ غیر بھی کریں مسلمانوں کے دل اسلام کے پرچم تلے اکٹھے چھوڑتے ہیں اور ایک دوسرے مسلمانوں کی بھلائی کے لیے چھوڑتے رہیں گے۔ سب سے زیادہ خوب صورت تحریر دو ڈائریاں تھیں۔ ایک بچے کی زندگی کا احاطہ کرتی خوب صورت تحریر جو ہمارے لیے کسی قسم کے سوالات پیدا کرتی۔ کاش کوئی اسپتال تو ہوتا "گرین ہوپ اسپتال" خدا نے کتنے انکس روزانہ ہی اسکی موت مرتے ہوں گے۔ خطوط میں زویا اعجاز کا بہت خوب صورت تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ کرمی صدارت مبارک ہو۔ قدرت اللہ نیازی صاحب آپ نے جس نظریے پر مبنی بات کی جو کہ استاد گریز زیادہ آگئے ہیں وہ شکیک ہوئی لیکن میں جواب دینا لازمی سمجھتا ہوں کہ اپنی نکالیں میں اور اول نکالیں سے فرسٹ پوزیشن لیتا آ رہا ہے۔ ڈائجسٹ کا حقوق اسے بہت زیادہ ہے۔ اس کی پڑھائی پر اس بات کا (شکر ہے خدا کا) بھی اثر نہیں پڑا۔ خود الحمد للہ میں BSC کا اسٹوڈنٹ ہوں اور نکالیں میں اول ہوں۔ ڈائجسٹ نے بھی اثر نہیں والا ہم پر..... کاشف ذہیر کی کہانی بدنام، انہوں کی جاہت اور تلاش میں جھگڑنے والی لڑکی کی ایک زبردست تحفہ ہمارے دل سے تمام قارئین کو دل سے نیا سال مبارک ہو اور اللہ سے دعا ہے کہ ہم سے ہمارے شریک بھگتے والوں کی مغفرت فرمائے۔ خاص طور پر وادھہ یاد پڑے 60 شہیدوں اور ایک بے نیاز زائرین جاننا کہ ملک کو۔ آخری صفحات پر طاہر جاوید صاحب کو ملا بھیجیں..... بس انتہائی بڑھ چکا ہوں اپنی رسالہ ایسی زیر مطالعہ ہے۔ سب سال میں "سینس" کا نام کسی اور انداز میں آنا چاہیے اور پورا رسالہ ہی خوب صورت ہونا چاہیے۔" (انشاء اللہ)

✽ طالب حسین طلحہ، سینٹرل جیل ملتان سے محفل میں شریک ہیں۔ "سینس" کا کافی عرصے سے پڑھ رہا ہوں۔ کئی اشعار اور تحریریں بھی بھیج دیتا ہوں اور آپ کی نوازش سے شائع بھی ہو جاتی ہیں۔ قید تہائی اور تھیل میں بیٹھا ہوں۔ دسمبر 2014ء کا شمار ہوا ہوں میں ہے سو چاکر آج خطوط کی محفل میں قسمت آزمائی کی جائے نیلی صبح کر کاغذ، قلم اٹھایا اور لکھنا شروع کیا۔ قارئین "سینس" میں سے کسی مہربان نے مجھے جیل میں دعاؤں سے مزین خط و تقریب بھیجا ہے جس میں ان کا شکر بھی ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آئندہ بھی دعاؤں سے نوازتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے اور خوش رکھے۔ آئیں۔ نیا سال مبارک ہو۔ ہمارے کی روتی گردانی کی۔ جون ایلیا کا افتتاحیہ پڑھنے کے بعد آپ کی خوب صورت اور فکر انگیز باتیں پڑھیں۔ خطوط کی محفل میں سب دوستوں نے خوب تبصرے کیے۔ تاریخی کہانیاں زبردست ہوئی ہیں۔ ملک صفحہ حیات کی کہانیوں کے کیا کہنے۔ تصوف کی زبان پڑھ کر ایمان کی کیفیت بہتر ہوئی۔ باروی بھی بھڑکی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سودائے جنوں کا پہلا حصہ پڑھا۔ بیوں سے مجاہدین اسلام اور فلسطینی مجاہدینوں کے لیے دعا بھی لکھیں۔ محفل شعر و سخن میں دوستوں کا انتخاب اچھا لگا۔ کتر میں اس بار بھی خوب رہیں۔ بانی "سینس" زیر مطالعہ ہے۔ رات کا کافی بیت بھی ہے۔ سزائے موت کی پگھلیوں میں بند بکریاں اور خاویں کی تیر کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ قارئین "سینس" اور "سینس" کی پوری ٹیم کو نئے سال کی خوشیاں مبارک ہوں۔" (آپ کو بھی مبارک ہو اور جلد از جلد ہائی نصیب ہو)

✽ زویا اعجاز اور سہیل عقیل احمد، دینی اور سکولر دونوں دنیاؤں کے لیے کام کرتے ہیں۔ "سینس" کے لیے بھی اشعار اور تحریریں بھیج دیتے ہیں۔ "سینس" کی خبر 14 نومبر کی شامی jzshidpanclub میں شریک ہو چکی ہیں اور "سینس" کی جگہ اور ہونے پورے سال میں کاشف ذہیر کی طرف خوب وحشت زدہ آکھیں ہی پسند آگیا۔ "فہرست کاغذ اور نیا تھا۔ جون ایلیا کی بیان شدہ سلاطی کی راہ مصر حاشی کی پدمایوں، نفلوں، افراتفری، اسے کسی اور خود مرضی کی دیکھ دھندے سے براہ کھیں مگر کدی ہے۔ ادارہ پر نظر دوڑائی تو خوشخبریوں کی فصل نظر آئی۔ یوم عاشورہ کا تحریک سے گزرا کر تک نیم کی صفوں میں اتحاد اور تو جات کا خوش کن سلسلہ آگئی کئی بہتر برائے کم نہیں۔ اس ماہ کی بہترین تحریر محفل "عظیم کی دو ڈائریاں" میں۔ لفظ نظر دردار اور سطر طے چار کی کاغذ پر پیش کرتی یہ تحریر ایسے سوالوں کی بازگشت چھوڑتی ہے جس کا جواب ارباب اقدار اختیار نہیں کر سکتے۔ پشیدہ ہونے کے باوجود دل کو چھو گئی۔ قاسم کا ڈاکو بننا متصادم بات کا حال نظر آیا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا ناول سودائے جنوں سامنے آیا اور کیا خوب آیا۔ موت کے سوداگر کے بعد حساس عالمی موضوع کا احاطہ کی ناول نے نہیں کیا۔ مسئلہ فلسطین اور یہودیوں کے نفس مزاحم آکھار کرتی یہ تحریر بلا جواب رہی۔ باروی میں محبوب کا بھڑکا اور باروی پر غصہ اس کے کردار کا پہلا فیصلہ پہلو لگا ہے۔ ورنہ ہر کردار ایک غیر فطری زندگی اختیار کیے ہوئے ہے۔ ویسے آپس کی بات سے ذرا دیر تو بتائیں ملک صفحہ حیات کی ذہن میں مزید کتنے کیسز باقی ہیں؟ ایک سو صدی میں بیٹھے ہوئے ہم انہیں سوچاں اور ساتھ کی دہائی کے کیساں کل و غارت کیسز پڑھ کر اب اسے ایک پتھر ہو چکے ہیں کہ دوسرے یں مٹنے پر قاتل کا اعزاز دیا گیا ہے۔ ایسا ہی بیٹا پوری کی مشق تمام پتھر دھگے دھکے ایک محفوظ ہے۔ کاشف ذہیر کی بدنامی کا کافی ترنگ لگی۔ تصوف کی زبان کا کافی پیچیدہ موضوع کا بیان بھی۔ نرم گوشہ کے نرم دل پولیس آفیسر اور اس کی قربانی نے کافی حیران بھی کیا اور متاثر بھی۔ اشعار اس دفعہ ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ آخر میں پر عیش کرتی ہے کہ ڈائجسٹ آنا ایک ماہ بعد ہے جبکہ ایک ہی صفے میں کم بھی جاتا ہے..... کیا کریں ہم۔" (مہربان اگلے شمارے کا انتظار)

✽ محمد قدرت اللہ نیازی، یکم ٹاؤن خانیوال سے شریک محفل ہیں۔ "دسمبر 2014ء رواں برس کا آخری شمارہ بروقت مل گیا۔ سرورق پر سینے ہمارے پہنوں میں کوئی نظر آئی تاہم ابھی مصروفیت بہت ہے اس لیے محمود اور انکار کہہ کر فہرست کی جانب چل دیے۔ کرمی صدارت پڑو یا اعجاز کو موجود پایا۔ مبارک ہوئی آپ کی صدارت نامہ کا اختتامیہ گزشتہ خطوط کی طرح تھا۔ برائے مہربان اس کو کھڑا تبدیل کریں تاہم باقی تبصرہ زوردار تھا۔ محمد رحمان خوش آمدید۔ مجرموں کی پینڈے کی کاغذ پر۔ اسد عباس محفل شعر و سخن کے بعد محفل یاران میں آپ کی شہادت دیکھ کر خوش ہوئی۔ علی رحمان! آپ کا اسٹوڈنٹ سا تبصرہ کیونکہ لگا لگا محرم معاویہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے مایوسی کو لکھ رہا گیا ہے۔ خود کو بھی عیساں دہی کرتے ہیں جو اللہ کی ذات سے مایوس ہوتے ہیں۔ اللہ ہم کو آزمائش سے بچائے۔ سید عقیل ایبھی کی پندیں مبارک ہو۔ احسان عرا آپ کا تبصرہ شاعرانہ رنگ لیے ہوئے



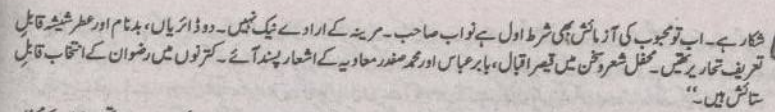
نظر آیا۔ آتش ایم آپ کی تحریروں کے شکر ہیں بھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سودائے جنوں، فلسطین کے بس منظر میں کسی بھی ایک عمدہ تحریر ہے۔ جلی قطعی زبردست رہی اور لگتا ہے کافی ریسرچ کے بعد لکھی گئی ہے۔ باروی میں محبوب کا طرز عمل تبدیل ہو رہا ہے جو باروی کے لیے مشکل کا سبب بن رہا ہے۔ دوسری طرف مراد مریدی کی چالانیاں اسے آگاہ ہو چکا ہے۔ کہانی میں کچھ کثرت دوڑنے لگے کیا ہے۔ آخری صفحات پر منظر امام سیلاب لے گیا، لے کر آئے۔ سیلاب کی آمد کی منظر کشی ہولناک تھی۔ پانی جو زندگی کی علامت ہے، وہی زندگیوں کو کھنکھایا۔ کاشف ذہیر کی بدنامی حواش "سینس" اور "سینس" سے بہرہ یورجی تھی۔ ان کے ہاتھ سے جب میری جوانی کا ایک پختہ گاڑی میں مراد و منظر کشی کی خوب تھی۔ طاہر جاوید غل کی دو ڈائریاں لے ملا دیں۔ بہت خوش گوار مسودوں میں انہیں کی صحت، کامیابیوں، شادی اور بچوں کو گواہ کر رہے تھے کہ ان کا ایک سبک بگڑا خوب اور تصور بن گیا۔ کہانی کا ایک جملہ کہ "سینڈ کا شہر والی صحت یاب ہو سکتے تھے تو میں بھی ہو جاؤں گا" نے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ناکائی سمجھوں کی وجہ سے کتنی زندگیوں کے چراغ گل ہو رہے ہیں لیکن ہر کی کو اپنی پڑی ہے۔ شرمیاس کی ملاپ، میاں بیوی کے مجھڑوں سے اولاد پر ہونے والے اثرات آشکار کرتی چشم کشا تحریر تھی۔ شکر و سخن بھی زوردار نظر آئی۔ احسان عرا و شاد حسن کا انتخاب بہترین لگا۔ آپ سے گزارش کی تھی کہ اگلیہ طبع سے بھی کچھ لکھ سکیں۔ کیا اس بار سے میں کوئی تجویز پر غور ہے؟ ساڈھ شمارے میں ڈاکٹر شہر شاد کی ایک تحریر شائع ہوئی جس میں فیصلہ کر لیکن کے لیے لکھا گیا کہ اس کا کوئی مناسب علاج نہیں۔ دل کو کچھ لینے والا ایک جملہ جب زائد نہ کیا۔ ان دیہاتوں میں سرحد کے دونوں طرف کیا صرف زلزلوں کی ضرورت ہے ڈاکٹر صاحب اس صفے میں پیچھے کب نہ افسردہ کر رکھا۔"

✽ رمضان پاشا بکشین اقبال، کراچی سے حاضر ہیں۔ "حسب معمول اس شمارے کا بھی گیٹ اپ بہت دلکش ہے، فہرست کی ترتیب کاری بھی بھلی لگی۔ آٹا اس بار تو بڑے بڑے حیدر اور چادر ہی تبصرہ نگاروں کے اساتذہ گرامی بلکے اسٹ میں نظر آئے، ساتھ ہی اس حقیر فقیر کا بھی نام اس "کالی فہرست" میں درج ہے، بڑی ہی خوشی ہوئی۔ اس دفعہ ہنگامی کہانیوں میں میری نظر میں بدنام سہیل پیر پٹھی۔ دوسرے نمبر پر راز اور سترے نمبر پر چھوٹی۔ مصنف کے تصور میں تخیل کرنے سے مجرموں کے منصوبے کا دعویٰ تھوہو گیا ہے۔ فلسطین کے بس منظر میں کسی بھی صاحب کی کہانی نے بہت متاثر کیا۔ یہ صرف کہانی تھی بلکہ یہ ایک دستاویزی حیثیت کی حامل تحریر بھی تھی۔ اگلے صفے میں ابھی بہت کچھ ہونے والا ہے۔ بیٹے بھانے کے ٹریک سے اتر کر دوڑنے ملائے والے ٹریک پر آئے والے منظر امام کی کہانی بہت زبردست تھی۔"

✽ سید عقیل احمد، دینی اور سکولر دونوں دنیاؤں کے لیے کام کرتے ہیں۔ "سینس" کے لیے بھی اشعار اور تحریریں بھیج دیتے ہیں۔ "سینس" کی خبر 14 نومبر کی شامی jzshidpanclub میں شریک ہو چکی ہیں اور "سینس" کی جگہ اور ہونے پورے سال میں کاشف ذہیر کی طرف خوب وحشت زدہ آکھیں ہی پسند آگیا۔ "فہرست کاغذ اور نیا تھا۔ جون ایلیا کی بیان شدہ سلاطی کی راہ مصر حاشی کی پدمایوں، نفلوں، افراتفری، اسے کسی اور خود مرضی کی دیکھ دھندے سے براہ کھیں مگر کدی ہے۔ ادارہ پر نظر دوڑائی تو خوشخبریوں کی فصل نظر آئی۔ یوم عاشورہ کا تحریک سے گزرا کر تک نیم کی صفوں میں اتحاد اور تو جات کا خوش کن سلسلہ آگئی کئی بہتر برائے کم نہیں۔ اس ماہ کی بہترین تحریر محفل "عظیم کی دو ڈائریاں" میں۔ لفظ نظر دردار اور سطر طے چار کی کاغذ پر پیش کرتی یہ تحریر ایسے سوالوں کی بازگشت چھوڑتی ہے جس کا جواب ارباب اقدار اختیار نہیں کر سکتے۔ پشیدہ ہونے کے باوجود دل کو چھو گئی۔ قاسم کا ڈاکو بننا متصادم بات کا حال نظر آیا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا ناول سودائے جنوں سامنے آیا اور کیا خوب آیا۔ موت کے سوداگر کے بعد حساس عالمی موضوع کا احاطہ کی ناول نے نہیں کیا۔ مسئلہ فلسطین اور یہودیوں کے نفس مزاحم آکھار کرتی یہ تحریر بلا جواب رہی۔ باروی میں محبوب کا بھڑکا اور باروی پر غصہ اس کے کردار کا پہلا فیصلہ پہلو لگا ہے۔ ورنہ ہر کردار ایک غیر فطری زندگی اختیار کیے ہوئے ہے۔ ویسے آپس کی بات سے ذرا دیر تو بتائیں ملک صفحہ حیات کی ذہن میں مزید کتنے کیسز باقی ہیں؟ ایک سو صدی میں بیٹھے ہوئے ہم انہیں سوچاں اور ساتھ کی دہائی کے کیساں کل و غارت کیسز پڑھ کر اب اسے ایک پتھر ہو چکے ہیں کہ دوسرے یں مٹنے پر قاتل کا اعزاز دیا گیا ہے۔ ایسا ہی بیٹا پوری کی مشق تمام پتھر دھگے دھکے ایک محفوظ ہے۔ کاشف ذہیر کی بدنامی کا کافی ترنگ لگی۔ تصوف کی زبان کا کافی پیچیدہ موضوع کا بیان بھی۔ نرم گوشہ کے نرم دل پولیس آفیسر اور اس کی قربانی نے کافی حیران بھی کیا اور متاثر بھی۔ اشعار اس دفعہ ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ آخر میں پر عیش کرتی ہے کہ ڈائجسٹ آنا ایک ماہ بعد ہے جبکہ ایک ہی صفے میں کم بھی جاتا ہے..... کیا کریں ہم۔" (مہربان اگلے شمارے کا انتظار)

✽ اعجاز احمد رحیل، ماہی، ساہیوال سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ "سال رواں کا آخری شمارہ پر نظر ہے۔ یہ وقت بھی کتنی تیزی سے بیت جاتا ہے۔ پچھلے ماہ اپنی اس سندر سی محفل میں حاضر نہ ہو سکے تو اس بار حاضری لازم تھی۔ سرورق پر مجھ پر دلخذا اپنی تمام تر رعایتوں کے ساتھ موجود ہے۔ انشاء یہ سلاطی کی راہ مرحوم جون ایلیا کی لاواں تحریروں میں سے ایک عمدہ انتخاب ہے۔ فہرست پر اس دفعہ کافی توجہ دی گئی ہے۔ ادارہ پر ہمیشہ کی طرح عمدہ لگا بیٹھک ہے۔ گما پائیں ہوئی ہیں۔ زویا اعجاز صاحبہ کو صدارت کی مبارکباد تبصرہ کا ٹکڑا ہے۔ حیدر آباد سے ہمیں ناز کا سندر سا تبصرہ بہت پیارا ملا۔ دیگن۔ طاہر جاوید غل صاحب اور ناصر ملک صاحب میرے بہت ہی ٹیوٹ رائٹر ہیں۔ اس دفعہ سودائے جنوں سے آخذا کیا بلاشبہ عبدالرب بھٹی صاحب نے حق قلم ادا کر دیا۔ انہیں ان کی کامیابیوں کے خلاف پروپیگنڈا اور فلسطینیوں پر ڈھائے جانے والے جبر و دھم کو واضح کرتی ٹیوں رنگ داستان واقعی قابل تحریف ہے۔ محبوب قلم کا کردار کے بغیر طاہر جاوید غل کی دل گداگر تحریر دو ڈائریاں خوب رہی۔ ایک ماں کے احساسات و جذبات کی ترجمانی اور انہیں کی دل سوز تعریف کو بھیجی گئی۔ منظر امام صاحب۔ آخری صفحات کا حق ادا کر گئے۔ سیلاب لے گیا۔ قدرتی آفات اور ان کے گرد کوئی داستان پڑا اثری۔ حمید کا کردار ہے حد پسند آیا۔ ایسا ہی بیٹا پوری کی مشق تمام متاثر کن رہی۔ دولت اور عورت بلاشبہ لازم و ملزوم ہیں مگر جو نسا دہی ہوتے ہیں۔ باروں کا کردار عمدہ لگا۔ باروی بھی کافی بہتر رہی۔ مراد کو بہت سی مشکلات کا سامنا ہے مگر اس کے دل میں باروی کی محبت کے دھپ جلتے ہیں سو فطرت محبت کرنے والے مشکلات کا سامنا کرنا چاہتے ہیں۔ کاشف ذہیر کی اسٹوری بدنام شاہد ار رہی۔ انہوں کے حصول کے لیے واقعی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

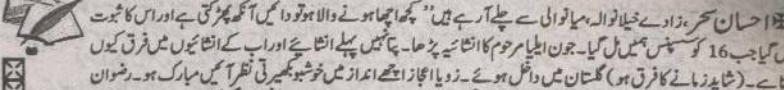
✽ سید اکرم شہرہ، ماہرہ سے محفل کی زینت ہیں۔ "آئی ایم بیک" کچھ عرصہ گما رہا، وجہ ایک صفے میں، جو جزا رہا ہمارا کہنے کے "ماہرہ" انہی چند سال کی پڑھائی میں محنت ووشن مستقبل کی ضمانت ہے" یقیناً آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ "سینس" کے سرورق پر نظر پڑی تو کچھ حیران رہی ہوئی۔ انشاء یہ قابل غور ہے۔ ساتھ کہیں کہ انسان کا اخلاق اور باطن اچھا ہونا چاہیے، ورنہ اچھی باتیں تو یہ یادوں پر بھی لکھی ہوئی ہیں۔ گلستان کا رخ کیا۔ بیٹے کا بیٹے کا اولین بھول خوش رنگ پر لگا پڑی تو خوشی اس قدر دل چسپے ہو کر بھول گیا۔ آئی زویا کی شاہد ار لگا۔ کہانیوں کی ابتدا باروی سے کی۔ مراد مشکلات کا



✽ قصیر اعوان اینڈ عرفان نجی سیال، ڈسٹرکٹ جیل سرکودھا سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں۔ ”سردق نے کوئی خاص تاثر نہ دیا۔ انشاء یہ میں جون ایلیا کی سلاطین کی راہ نے واقعی انسان کو سلاطین کی راہ دکھائی کہ انہوں نے ہم سے ہی اپنی ذات کے خویش میں قید ہیں۔ انشاء کے ہونے بگڑکھوں کی جگہ پر یہاں تو دنیا کا جادو برائیاں پایا۔ یہاں سہارا کھول فرما گئے۔ مسلسل ایک لک کے خفت نے میرا دیا اس لیے میں خاموش قادیان تک محدود ہو گئے۔ یہاں ہم بدول شہزادہاں کے آپ نے ہم قیدیوں کو دعاؤں میں یاد رکھا۔ نام آپ کی وجہ سے نہیں غور کر سکیں کہ آپ ضرور دیکھ جائیں گی اور آپ کا ہاتھ ہوا دیکھ کر ہر کہہ رہے ہیں۔ آپ بھی دعاؤں میں یاد رکھیے آپ کے دیکھنے کو اور اپنی پڑنے کے لیے محمد یوسف آپ پریشان مت ہوں۔ یہیں محفل سے کہیں غائب نہیں ہوتیں بس ذرا دیر ہو جاتی ہے۔ بیٹی کی سہارا کھول فرما گئے۔ آغا فرید نے محفل کو جھوک کر بغیر بھی کہیں نہیں بس ذرا ادب کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ محفل صاحب کے یاد آؤں۔“

[illegible]

سینٹر آف الیٹس 12 جنوری 2015ء



﴿زیرِ حسن، اجہور، لاہور سے محفل کی زینت بنے ہیں﴾ آپ کو تو پتا ہے کہ سال میں صرف ایک بار سچس میں حاضری دیتا ہوں۔ سچس کا پورا شمار تو نہیں ہوتا۔ کمالین سب سے پہلے اپنے محبوب مصنف محبت کے شہنشاہ طاہر جاوید مغل صاحب کی تحریر کو اکٹھوں کے رستے دل میں اتارا۔ آہ۔۔۔ کیا دور ہماری تحریر تھی۔ یہ تاں میں طاہر صاحب اتنی جذباتیت سے ہجر پور لڑا دینے والی تحریریں کیے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے سیر کا ملانے والے سے مجھے ایک بڑا ہی عقیدت ہے۔ میں جب بھی ان کی کوئی تحریر پڑھتا ہوں کہ مجھ کی لذت آشتی سے دو چار ہوتا ہوں۔ منظر امام کی تحریر سیلاب کے گہا بہت زبردست تھی۔ سیلاب کی ہولناکیاں اور تباہ کاریوں سے ہر کوئی واقف ہے۔ درحقیقت سیلاب اور زلزلے اللہ کا عذاب ہیں۔ مجھے دو رات زندگی میں نہیں بھولے گی جب میں اپنے گاؤں حویلی بہادر شاہ میں تھا اور اچانک رات کے دو بجے شہر چاکی محلے والے ایک دوسرے کو خبردار کر رہے تھے۔ مسجدیں اعلان ہو رہے تھے کہ بھڑنٹھ گیا ہے۔ بہت بڑا پانی کا ٹیلا آ رہا ہے۔ اس وقت کی نیفاٹا کو الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ ہم ایک دوسرے کو بظاہر تسلیاں دے رہے تھے لیکن اندر کی کیفیت سب کی ایک جیسی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو آخری بار دیکھ رہے ہیں۔ آخر کار سب گاؤں خالی کر کے اپنے اپنے رشتے داروں کے گھر چلے گئے۔ پھر درودن بعد یعنی کئی اللہ کے فضل و کرم سے ہمارا گاؤں بچ گیا ہے۔ تو ہم داخل آئے۔ کچھ فضل و ادب سے لوگ اللہ کے عذاب کو دیکھتے ہوئے بھی تو نہیں کرتے۔ زو یا اچھا کڑا خوش مبارک باد۔ کرمی صدارت ایک مینے کے لیے آپ کی ہوئی۔ باقی واچسٹ انجی زیر مطالعہ ہے۔ آج سے سو دو ہاتھ انتہاس ہے کہ پلجیز محبت کے شہنشاہ افضل صاحب سے محبت، درد اور جذبات بری داستان سچس کے آخری صفحات پر لکھوا گئے۔“

شوکست شہر یار، اوکاڑہ سے 3۵ کی گولیں غیر جانبری کے بعد پھرے محفل میں حاضر خدمت ہیں ”جب سے پہلے تو اپنی بیاری دوست
 پر ہنس کر ہجرہ نکال کر صروت کو شادی کی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دے (آمین) تا نکلی کر اس مرتبہ کچھ
 خاص بھی محفل میں داخل ہونے تو ذرا اچھا تو پورے مغلطراق کے ساتھ بڑی شان سے کرسی صدارت پر برار جمان دیکھا۔ ذویابی آپ کو مبارک ہو۔
 تاغافری بھائی حقیقی کر لکھنے سے پہلے آپ پوری کہانی تو پڑھ لیتے تار۔ طائرہ جہان مغل صاحب کے دیوانے تو ہم بھی ہیں۔ پر وہ ایک کہتے ہیں کہ
 دل کی دل میں رکھتا ہوں۔ سب سے پہلے سنا کہ تمام پڑھی بہت اچھی لیکن اینڈ میں جاری ہے کافظہ دیکھ کے دیوانہ سارے کے روکے نرم گوش
 میں ایک پھیلے آفریں کی سوچ تھی اس کی اور ذہنی کا بغزت زندگی گزارنے کا موشوں کی گلاب بام کاشف زہیر کی ایک بہت اچھی تحریر تھی۔ آخر میں ان
 سبند، یحییٰ اور دو بیویج میں ایک کھانا خانہ لکھ گئے۔ سودائے جنوں کی جلی قسط شاندار تھی۔ جس کی بھی طعن و بیاں ہوں تو یہ تحریر خود کا مایاب ہوگی۔
 انشاء اللہ۔ ظاہر جاوید کی روداد اڑیاں ایک سبق کو آخر تھر تھی۔ تیسرا اپنیل صرف امیروں کے لیے بنایا گیا ہے کیونکہ مغل ذہنی طور پر بھی اس کا تجربہ ہے۔
 ملک مغیر خاتون نے اس مرتبہ نہ کو اس کے انعام کچھ کچھ لکھی یا بدیہ شیش ہمارے معاشرے کے کسی کا نہ بولنا ثبوت ہے۔ پائل عورت میں لی ادنیٰ
 لکھی تھی۔ راوی کی یہ قسط اس مرتبہ شاندار تھی جتنے میں کچھ لکھی یا بدیہ شیش ہمارے معاشرے کے کسی کا نہ بولنا ثبوت ہے۔ پائل عورت میں لی ادنیٰ
 تاثر کر گئی۔ قاسم جیسے لوگ واقعی انھوں شریف لوگوں سے بہتر ہیں۔ جس میں بھی اس کو لے ڈولی۔ پانچ بہت اچھی تھی۔ آخری صفحات پر سیلاب کے گمیا دل کو
 کر کما کو زندگی گزارنے کے لیے ایک مرد کا سہارا تو ضروری تھا۔“

نمبر 13 جنوری 2015ء

[illegible][illegible][illegible][illegible]

✽ ہارون مجاہد، مروان سے ملے آ رہے ہیں "سرداروں پر کیا تبصرہ کریں سر مجی! ابن ابی سنا تھا۔ سید عادتوں کی محفل میں پہنچا ہوا۔
سرفروست تخت شاہی سے جناب زید اعجاز صاحب کو بڑی آن بان سے تخت شاہی پر جلوے کھینچتے پایا۔ مبارک باد قبول ہو گی۔ یوسف بھائی استادوں پر
کنہ کا اینڈ نوٹیٹ اینڈ تھامسی اداسی یار۔ کلکل کا گلی بھائی کی کی محسوس ہو رہی ہے۔ کہاؤں کی ابتدا تاریخ کے جمروکوں سے منتخب جناب ایلاس سینا پوری
صاحب کی مشق انجام سے کی۔ جاندار انداز میں کبھی محی اس کہانی کے مرکزی کردار ہارون پر چہنچاں مجھے کیوں بار بار مہی آ رہی محی۔ نواب صاحب کی
باروی آج کل جو بن رہے۔ مراد اور محبوب بیلا تھیں رقیب سے لیکن اب مکمل کے ایک دوسرے کے خلاف بولتے ہیں گئے۔ باروی بھی اب مکمل کے
محبوب کا ساتھ دے رہی ہے۔ ڈاکٹر مہاراج بھٹی صاحب کی دوا دے جنوں کی طرف بڑھے تو کہاں کی سحر میں ایسے کھوئے کے غم کے ہی دریا۔ قلم
ور بریت، دشت، شفاک اور نصاب اسرائیلیوں کے مظالم کے خلاف فلسطین کے جاہازوں کے کارناموں کا بہت ہی دلچسپ اور مہینہ خیز احوال۔
جاندار کردار اور بہت ہی مضبوط پلاٹ۔ ادارے سے ایسی ہی کہانی کی امید تھی۔ درد، تک اور دل گرفتہ کہانیوں کے خالق ظاہر جاوید مفضل صاحب نے
والیک یا پھر ایسا دروایت کو برقرار رکھتے ہوئے دلایا۔ پروڈیوسر اشفاق مٹھی صاحب ایک درد مند دل رکھنے والے انسان۔ انجس کی بے چاری اور ان کے
اداسی کا پھر ایسا دروایت کو برقرار رکھتے ہوئے دلایا۔ پروڈیوسر اشفاق مٹھی صاحب ایک درد مند دل رکھنے والے انسان۔ انجس کی بے چاری اور ان کے
اداسی کا پھر ایسا دروایت کو برقرار رکھتے ہوئے دلایا۔ پروڈیوسر اشفاق مٹھی صاحب ایک درد مند دل رکھنے والے انسان۔ انجس کی بے چاری اور ان کے

عشق نما

الیا سیتا پوری

اگر کتابیں لکھنے کا رجحان طاقتور نہ ہوتا تو آج کوئی تاریخ سے واقف بھی نہ ہوتا... اور اقی کتاب کے ہوں اور واقعات ماضی کے... تو پڑھنے والا مستقبل کی سوجھ بوجھ بھی پالیتا ہے... تاریخ صرف بادشاہت کے اصول یا سیاست کی نیرنگی سے ہی واقف نہیں کراتی بلکہ دلوں کے بھید اور خوابوں کی تعبیر بھی بتاتی ہے... اس کی آنکھوں میں بھی کچھ خواب تھے مکروہ رشتوں کے گرداب میں ایسا الجھا ہوا تھا کہ کسی ایک سمت جانے کا فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا... کیونکہ ہر رشتہ اس کے پیروں کی زنجیر تھا۔ اس کے کاندھوں پر اگرچہ ایک اہم عہدے کی ذمہ داری تھی لیکن مشکلات کے باوجود وہ کسی رشتے کو چھوڑنے کے لیے تیار بھی نہ تھا۔ دولت کی ریل پیل نہ اینوں کو دشمن اور دشمنوں کو اپنا تو بننا دیا تھا مگر قسمت کا یہ فیصلہ اسے منطوق نہ تھا۔ اسے تو ایسا اصل جہیز لکھنے کی تمنا تھی... کیونکہ وہ ایسا نہ کرتا تو اپنے لخت جگر کو کھو دیتا جو اصل میں اس کا وارث تھا۔

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

رہی تھی لیکن اس کے باوجود اسے مزہ سے کوئی شکایت نہیں تھی کیونکہ اس نے ابھی تک مال و زر اور درہم و دینار سے کوئی سروکار نہیں رکھا تھا۔

ہارون خراسان واپس جانا چاہتا تھا لیکن جانے سے پہلے چند خطرات اسے خوفزدہ کر رہے تھے۔ وہ اپنے بہنوئی کی طرف سے مطمئن نہیں تھا اور ہمیشہ یہ خدشہ محسوس کرتا رہتا تھا کہ وہ کسی دن بھی حملہ کر سکتا ہے۔ حملے کی نوعیت کیا ہوگی؟ وہ یہ نہیں جانتا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو بھی بار بار یہی سمجھایا کہ وہ اپنے داماد سے ہوشیار رہے اور مزہ کو بھی خردوار کیا کہ اس کے بہنوئی سے چونکا رہے لیکن مزہ جواب میں کہتی کہ اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں، شادی تو ہو چکی۔ ہاں اگر شادی نہ ہوئی ہوتی تو خوف کی بات تھی۔

ہارون نے سمجھایا۔ ”مزہ! وہ چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح اپنی ناک کا بدلہ لینے کی کوشش ضرور کرے گا۔“ مزہ نے بات ہی میں اڑادی۔ ”وہ کیا بدلہ لے گا۔“

ہارون اور مزہ خوش و خرم زندگی گزارنے لگے۔ عامر بھی بہت خوش تھا۔ شروع شروع میں مزہ نے اپنی کارکردگی کی مثال قائم کر دی۔ عامر کو اپنے ہاتھوں سے غسل دینا، صاف سقرا رکھنا اور کھانے پینے کا خاص خیال رکھنا، یہ سب اس کے روزمرہ کے کاموں میں شامل تھا۔ رات کو سونے سے پہلے وہ عامر کو دلچسپ حکایتیں سناتی رہتی۔ عامر کسی بات پر روٹھتا تو مزہ سوچنے کے مناجاتی۔ ہارون کا باپ یہ سب بڑی دلچسپی اور شوق سے دیکھ رہا تھا۔ مزہ کی ہر بات اچھی لگتی تھی مگر ایک بات وجہ نزاع بن گئی۔ وہ مال و زر اور درہم و دینار کو اپنے ہی قبضے میں رکھنا چاہتا تھا اور یہ بات مزہ کو..... ناپسند تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے یہ بوڑھا آدمی اس کے گھر کا مالک و مختار بن بیٹھا رہے۔ وہ ہارون کے باپ کو ہر طرح سے دغل کر دینا چاہتی تھی۔ اس نے عامر کو اس بری طرح اپنے قبضے میں کیا ہوا تھا کہ اب وہ دادا کے پاس جاتے ہوئے گھبرا لگتا تھا۔ دادا کو یہ بات ناگوار گزر

اب تو وہ منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہا۔“

کچھ دنوں بعد منیزہ کا باپ بھی آگیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہارون کا سب کچھ اس کی بیٹی منیزہ کے قبضے میں ہوگا لیکن یہاں اپنی بیٹی کو اپنے شوہر کے باپ کا دست گرد کیج کر افسوس ہوا اور اپنی بیٹی کی حماقت پر غصہ بھی آیا۔ اس کا خیال تھا کہ بیٹی نے گھر کی ہر چیز اپنے قبضے میں کر لی ہوگی لیکن یہاں یہ دیکھ کر پریشان اور گھرمند ہو گیا کہ منیزہ کی حیثیت ثانوی رہ گئی تھی اور اس گھر میں جو کچھ بھی تھا، ہارون کے باپ کا تھا۔

ہارون کے باپ نے منیزہ کے باپ کو خشکی نظروں سے دیکھا کیونکہ اس نے منیزہ کے باپ کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات میں خطرات محسوس کر لیے تھے جو منیزہ کے باپ کے دل و دماغ میں پرورش پا رہے تھے۔ اس نے اپنے مہمان کا استقبال خوش دلی سے نہیں کیا۔ منیزہ کے باپ نے بھی اس کدورت کو محسوس کر لیا۔ اس نے زمانہ سازی سے کام لیا۔ بولا۔ ”شاید یہ شادی پہلے ہوجانی اگر مجھے یہ معلوم ہو گیا ہوتا تو نے اپنے بیٹے کو منیزہ سے شادی کرنے کی اجازت دے دی ہے کیونکہ مجھ کو ہارون سے بھی کوئی شکایت ہی نہیں رہی۔“

ہارون کے باپ نے منیزہ کے باپ سے یہ بات سنی تو سوچ کر یہ رشتہ قبول کر لیا کہ میں تو جو انوں کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھتا ہی چاہیے۔“

منیزہ اپنے باپ کے ساتھ برقی جانے والی سردھری کو بری طرح محسوس کر رہی تھی۔ رات کو ایک ہی دسترخوان پر سب ایک ساتھ بیٹھے۔ ہارون نے کھانے کے دوران منیزہ کے باپ سے کہا۔ ”کچھ دنوں بعد میں خراسان واپس چلا جاؤں گا۔ میری رائے میں آپ بھی یہیں منیزہ کے پاس آجائے، دل بہلا رہے گا۔“

لیکن منیزہ کے باپ نے ابھی جواب دیا بھی نہ تھا کہ ہارون کا باپ بول اٹھا۔ ”گھر تو بس اپنا ہی ہوتا ہے۔ اگر مجھ سے کوئی کہے کہ اپنے گھر کو چھوڑ کر میرے ساتھ رہو تو تو میں صاف انکار کروں گا۔“

منیزہ کے باپ نے اپنے گال پر طمانچہ سا محسوس کیا۔ ”تو میرے گھر کو لے جاسا، بولا۔“ اپنا گھر کے نہیں اچھا لگتا لیکن تو نے جس طرح اور جس موقع پر اپنے گھر کی تعریف کی ہے میرے لیے یہ تعریف گالی بن گئی ہے۔ اب تو ہم دونوں ایک ساتھ کہیں بھی نہیں رہ سکتے۔“

ہارون کے باپ نے غیر جذباتی لہجہ میں کہا۔ ”خدا

کے فضل سے تو سمجھ دار انسان ہے، بیٹی کے گھر کو اپنا گھر سمجھنا بھی نہیں چاہیے۔“

ہارون باپ کی باتوں پر کٹنا جا رہا تھا۔ وہ کھانا بھول گیا، بولا۔ ”باوا جان! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ منیزہ کا باپ ہمارا مہمان ہے اور مہمانوں کی دل آزاری گناہ ہے۔“

باپ نے جواب دیا۔ ”ہارون! میں نے کسی کی بھی دل آزاری نہیں کی۔ میں نے ایک جگہ بات کہہ دی ہے، یوں بھی مشہور ہے (جس پر ہنس مچ گئی) کہ منیزہ (جس پر ہنس مچ گئی) کہ منیزہ کو کھانا چھوڑ کر اٹھ گئی، بولی۔ ”باوا جان! آپ کل ہی یہاں سے چلے جائے۔ یہ گھر مہمانوں کے لیے تنگ ہے۔“

ہارون کے باپ نے غصے میں کہا۔ ”مہمانوں کے لیے نہیں، منصوبہ بازوں کے لیے کہہ۔ منیزہ! میں تیرے باپ کے ارادوں سے اچھی طرح واقف ہوں اور جب تک میں زندہ ہوں، یہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔“

منیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”میرا کوئی مقصد نہیں، میں اپنی بیٹی کو خوش و خرم دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر میں لاپرواہ ہوتا تو اس وقت تک اپنی بیٹی کی ہارون سے شادی ہی نہ کرتا جب تک میں اس کو الگ رہنے پر آمادہ نہ کر لیتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ پھر اپنے ہاتھ ایک کپڑے سے لپیٹتے ہوئے بولا۔ ”افسوس کہ میں یہاں تو کدورت شرمندہ ہوا۔ اگر میں انسانی طبع اور خود مرضی کی خباثتوں پر ڈرنا سا بھی غور کر لیتا تو شاید اس شرمندی، خجالت اور ذلت سے محفوظ رہتا۔“

ہارون کے باپ نے غصے میں کپکپاتے ہوئے کہا۔ ”غوب، یعنی میں خود غرض، طامع اور حریص ہوں۔ میرے ہی گھر میں میری برائی کرنا یہ تو کوئی توجہ سے.....“

ہارون دونوں کی تلخ کلامی سے دل برداشتہ ہو رہا تھا۔ باپ کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”باوا جان! ویسے یہ بڑی زیادتی کی بات، آپ نے واقعی اپنے مہمان کی دل آزاری کی ہے۔ آپ کو اپنے مہمان سے معذرت کرنا چاہیے۔“

باپ بیٹے پر برس پڑا۔ ”تو چپ رہ۔ معذرت کا مطلب ہے معافی مانگ لوں؟ ایسا نہیں ہوسکتا، قیامت تک ایسا نہیں ہوسکتا اور اب میرا فیصلہ بھی سن لے۔ تو نے منیزہ سے شادی کی ہے، اس لیے یہ منیزہ کا گھر ہے۔ منیزہ کا باپ یہاں نہ تو رہ سکتا ہے اور نہ ہی وہ مہمان بن کر آسکتا ہے۔ اس گھر میں میری مرضی کے خلاف کچھ بھی نہ ہوگا۔“

منیزہ کا باپ تھلا کر چپٹا۔ ”جی ہم، کے اہانتیں کر لے، جتنا چاہے بولتا رہ لیکن یہ مت بھول، بھی کے دن

بڑے کسی کی راتیں۔ کوئی ایسا وقت بھی آسکتا ہے جب میں تجھے تیری اہانتوں کا جواب دے سکوں۔“

منیزہ نے اپنے باپ کو سمجھایا۔ ”باوا جان! میں شرمندہ ہوں، اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ شادی کے بعد بھی کدورتیں زندہ رہیں گی اور آپ کو میری وجہ سے یوں ذلیل و خوار ہونا پڑے گا تو میں شادی ہی نہ کرتی۔“

ہارون کو اپنے باپ پر غصہ آ رہا تھا۔ بولا۔ ”باوا جان! ہماری مہمان نوازی تو مشہور ہے، آپ ذرا دل سے کام لیجیے۔ اس گھر میں آپ ہی کا حکم چلے گا لیکن آپ اپنے حکم کو عدل و انصاف کے دائرے میں چلائیے۔“

باپ نے ایک بار پھر بیٹے کو ڈانٹ دیا۔ ”مجھے تیرے مشوروں کی کوئی ضرورت نہیں ہارون..... تو خاموش رہ ورنہ میں تیرے خلاف بھی جنگ کا اعلان کروں گا۔“

منیزہ کو رونا آگیا۔ وہ ان سب کو چھوڑ کر ایک کونے میں چلی گئی اور وہاں جا کر رونے لگی۔

ہارون کے باپ نے عامر کو گود میں اٹھالیا اور اسے لے کر باہر چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں چند بھجوریں دے دیں، عامر خوش ہو گیا۔ ہارون کے باپ نے عامر سے پوچھا۔ ”بیٹے عامر! کس لیے گھبراہٹ ہوئی؟“

عامر نے فوراً جواب دیا۔ ”بہت اچھے، سب سے اچھے۔“

باپ نے سر کوٹھیل دوڑا سوال کیا۔ ”اور یہ دوسرا بوڑھا جو منیزہ کا باپ ہے، کچھ کیا کا؟“

عامر نے فی الفور جواب دیا۔ ”برا، آپ سے لڑتا جو ہے۔“

دادا نے پوتے کی پشت چھتپائی اور تیسرا سوال کیا۔ ”تیری یہ بی بی کیسی ہے؟“

عامر نے جواب دیا۔ ”اچھی، بہت اچھی۔“

اور وہ رونے لگا، بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر۔

ہارون کے باپ کو شہ گزرا کہ شاید منیزہ کا سلوک عامر کے ساتھ اچھا نہیں ہے اس لیے عامر منیزہ سے متعلق سوالات پر رونے لگا۔ اس نے بیٹے کی پیچھے تھپتھپائی اور تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”میرے بیٹے عامر! تو مت گھبرا، اگر منیزہ نے تجھ کو ستایا ہے تو اس کو اس کی سزا دی جائے گی۔“

عامر نے برا مان کر جواب دیا۔ ”دادا جان! آپ معلوم نہیں کیا سوچ رہے ہیں۔ میں تو اس لیے رو رہا ہوں کہ کہیں میری یہ ماں مجھ سے روٹھ کر نہ چلی جائے۔“

دادا اس جواب پر چونک پڑا۔ اسے اپنے سارے منصوبے درہم برہم ہوتے نظر آئے، بولا۔ ”میرے معصوم

عشق کا مجھ

کر سکتا جو منیزہ کی محبت کے پیچھے کارفرما ہے لیکن تو ذرا اور بڑا ہوئے تو میں ان سب کی اچھی طرح نشان دہی کر سکوں گا۔“

منیزہ کے باپ نے ہارون کے باپ کو عامر سے باتیں کرتے دیکھا تو بیٹی کو سمجھایا۔ ”منیزہ! تو ہوشیار رہ، یہ عیار انسان اپنے پوتے کو معلوم نہیں کیا کھانا بڑا حار ہے۔ میرا خیال ہے اس گھر میں کوئی بھی ایسا نہیں جس پر تو اعتبار کرے۔ عامر میں زیادہ سرکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

منیزہ نے برا مان کر جواب دیا۔ ”باوا جان! میں آپ کی یہ بات بھی نہیں مانوں گی۔ میں عامر کو چاہتی ہوں، از حد، بے حد، بہت زیادہ اور یہ تاہن کہ ہے کہ عامر محبت کا جواب محبت سے نہ دے۔“

باپ نے افسوس سے کہا۔ ”میری یہ بات ابھی تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ تو یہ کیوں نہیں سوچتی کہ عامر تیرا بیٹا نہیں ہے۔ تو اس کے ساتھ کچھ بھی کرے، اس کا کوئی بھی خیال نہیں کرے گا۔ ہاں اگر تیری اپنی اولاد ہوگی تو تو اس پر پوری طرح اعتبار کر سکتی گی تو اپنی جھٹیں، اپنی مامتا، اپنی خدمت اپنی اولاد کے لیے محفوظ رکھ۔“

لیکن باپ کی کھٹیں بے اثر رہیں اور وہ اپنے دل سے عامر کی محبت نہیں نکال سکی۔

کچھ دنوں بعد جب دادا کا رونا سنا گیا عامر منیزہ کے پاس آیا تو اس کے دل میں منیزہ کی محبت کا طوفان برپا تھا۔ آج اس وقت اس کو منیزہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اسی طرح منیزہ بھی آج عامر کو زیادہ حسین، زیادہ معصوم اور زیادہ پرکشش محسوس کر رہی تھی۔ اس نے بے اختیار عامر کو گود میں اٹھالیا اور پیچھے پیچھے کر پیار کرنے لگی۔ عامر بھی منیزہ کی گود میں بیٹھتا ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

ہارون خراسان چلا گیا، وہاں وہ شورشلوں اور ہنگاموں میں یوں الجھا رہا کہ گھر کا ہوش ہی نہ رہا۔ ابھی بھی اپنی خیریت سے منیزہ کو مطلع کر دیا کرتا۔ دوسری طرف منیزہ کا باپ آذربائیجان گیا ہوا تھا۔ وہاں اس نے چند ایسے کارنامے دکھائے کہ خلافت کی طرف سے انعام و اکرام کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ یہیں ہارون کا بیٹو بھی تھا۔ اس نے منیزہ کے باپ سے بڑی شکایتیں کیں اور کہا۔ ”تو اگر یہ سمجھتا ہے کہ منیزہ ہارون کے پاس خوش رہے گی تو یہ تیری غلط فہمی یا خوش فہمی ہے۔ منیزہ سب سے زیادہ آزرہ اور ناخوش اسی گھر میں رہے گی کیونکہ اس گھر میں ہارون کا ایک بچہ پہلی ہی کی گئی رہتا ہے۔ تیری بیٹی اسی لڑکے کی وجہ سے

ذلیل و خوار ہوتی رہے گی۔“

مینزہ کے باپ نے ازراہ شکایت جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے تو ٹھیک کہتا ہے۔ میں نے تیرے ساتھ بڑی نا انصافی کی۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو مینزہ آج تیری بیوی ہوتی اور میں یوں ذلیل و خوار نہ ہو رہا ہوتا۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”ایک بات میری بھی یاد رکھ، وہ یہ کہ ایک سازش کے زیر اثر تیری بیٹی ہمیشہ اولاد سے محروم رکھی جائے گی۔“

مینزہ کا باپ چونک کر بولا۔ ”یہ بات تجھ کو کس نے بتائی؟“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”مجھ کو یہ بات کون اور کیوں بتائے گا۔ مجھے تو خود بخود یہ باتیں معلوم ہوئیں۔“

مینزہ کے باپ نے اصرار کیا۔ ”اچھا ذرا اس کی وضاحت کر دے کہ مینزہ بے اولاد کیوں رہے گی اور یہ کہ اس کے خلاف اگر اس قسم کی محاذ آرائی ہو رہی ہے کہ میری مینزہ کو لا دل رکھا جائے تو اس کا سبب کیا ہوگا؟“

بہنوئی نے ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشی میں کہا۔ ”اگر تو اجازت دے تو گفتنی اور نا گفتنی محل کر کہہ دوں۔“

مینزہ کا باپ ہارون کے بہنوئی کی باتوں سے بہت زیادہ پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے بے مشکل دریافت کیا۔ ”کیا ایسا ممکن ہے کہ تو کسی رشتے کے احترام یا لحاظ کے بغیر ہر بات صاف صاف بتا دے؟“

”کیوں نہیں، کیوں نہیں۔“ ہارون کے بہنوئی نے جواب دیا۔ ”جناب والا! ہارون اور اس کے گرد و پیش رہنے والوں نے ہارون کو یہ شور مچا دیا کہ مینزہ کو بے اولاد رکھا جائے۔ اس سے ہارون کو یہ فائدہ رہے گا کہ اس کے بیٹے عامر کو ہمیشہ مینزہ کی محبت حاصل رہے گی۔“

مینزہ کے باپ نے دل ہی دل میں شادی کی مدت کا حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ شادی کو ڈھائی سال گزر چکے ہیں مگر مینزہ اولاد سے محروم ہے۔ اس کو ہارون کے بہنوئی کی باتوں پر پورا پورا یقین آ گیا اور وہ غصے اور نفرت کی آگ میں جھلنے لگا، آہستہ سے بولا۔ ”تو یہ بات ہے۔ سازش، لیکن میں اس سازش کو ناکام بنا دوں گا اور دیکھوں گا میری مینزہ اولاد سے کس طرح محروم رہی جاتی ہے۔“

اس کے بعد اس نے اپنی بیٹی کو ایک خط لکھا جس میں اشاروں کنایوں میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ شادی کے ڈھائی سال بعد بھی وہ اولاد سے محروم کیوں ہے؟ اس نے مینزہ کو ہدایت کی کہ وہ چند ماہ بعد محض پہنچ رہا ہے، اس لیے وہ بھی محض پہنچ جائے تاکہ چند نہایت ضروری باتیں کی

جاسکیں۔ اس خط میں یہ بھی لکھ دیا کہ اس کو اچانک ایسی سازش کا پتا چلا ہے جو مینزہ کے خلاف شادی سے پہلے ہی تیار کر لی گئی تھی اور یہ اسی سازش کا اثر ہے کہ مینزہ ڈھائی سال بعد بھی بے اولاد ہے۔

مینزہ کو جب یہ خط ملا تو وہ پریشان ہو گئی۔ مینزہ اپنے دل میں اولاد کی شدید خواہش محسوس کر رہی تھی لیکن وہ مجبور تھی۔ اس کو اپنی اولاد کی ضرورت یوں اور زیادہ محسوس ہونے لگی تھی کہ عامر کو اس کا دادا باری طرح ورغلا رہا تھا۔

دادا کی پوری کوشش یہ تھی کہ عامر کا دل مینزہ کی محبت سے خالی اور محروم رکھے۔ اس نے سو سو طرح سے بیٹی بار کر دیا کہ مینزہ اس کی اپنی ماں نہیں ہے اور اب تک وہ جس محبت کا اظہار کرتی رہی ہے، محض بناوٹی ہے۔ وہ اس طرح اپنی محبت کا فریب دے کر اس فکر میں ہے کہ کسی طرح عامر کے اس مال و زر اور درہم و دینار پر قبضہ کر لے جو اس کو اپنے باپ سے ورثے میں ملنے والا ہے۔ اس نے عامر کو یہ سبق بھی پڑھا یا کہ عقل مند لوگ دولت اور درہم و دینار کے معاملے میں کسی پر اعتبار نہیں کرتے۔

جب اسٹے بیٹھے سوتے جاتے یہی سبق دے گئے تو عامر کے دل میں بھی ذرا سافرق آ گیا۔ اب وہ مینزہ کے طرز عمل میں اس کے صنف، عماری اور ذوق کو تلاش کرتا رہتا اور غما ساز دہن ان میں سے کوئی نہ کوئی نئے مینزہ میں پایا کرتا تھا۔

ہارون خراسان میں رہا تھا مگر گھر کی طرف سے بہت فکر مند تھا۔ یہاں اس کو اچانک اپنے بہنوئی کا خیال آ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا بہنوئی زخمی سانپ کی طرح ہے جو کسی وقت بھی حملہ کر سکتا ہے چنانچہ اس نے مینزہ کو خط لکھ دیا اور اس میں بطور خاص یہ ہدایت کی کہ اس کی عدم موجودگی میں اگر بہنوئی آئے تو مینزہ اس کے سامنے نہ جائے اور نہ ہی اس سے کسی قسم کی بات کرے کیونکہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔

اس خط کے ساتھ ہی دوسرا خط اپنے باپ کو لکھا اور باپ کو صاف صاف لکھ دیا کہ اس کے بہنوئی کی طرف سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس نے یہ دھمکی دے رکھی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح میرے خاندان پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ اس خط میں ذرا سا غلغلہ عامر کے لیے بھی تھا جس میں ہارون نے اپنے بیٹے کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے دادا کا خاص خیال رکھے کیونکہ اس بڑھاپے میں ان کی دل جوئی بے حد ضروری ہے۔

اس خط کی آخری سطروں نے مینزہ کو بڑا دکھ دیا۔ وہ

خود کو اکیلا اور تنہا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ میں جس عامر پر اپنی بخشش بھروسہ کرتی رہی، اس کو ہارون بے ہدایت دے رہا ہے کہ وہ اپنے دادا کا خاص خیال رکھے کیونکہ بڑھاپے میں دادا کی دل جوئی بے حد ضروری ہے۔ مینزہ نے سوچا، وہ خود جس تنہائی اور اکیلے پن کے کرب سے دوچار ہے، کیا اس میں کسی کی محبت اور دل جوئی کی ضرورت ہی نہیں؟

اس نے چڑ کر ہارون کو لکھ دیا۔

”ہارون! میں چند ماہ کے لیے محض جاری ہوں کیونکہ وہاں میرا باپ آذر بائیجان سے پہنچ رہا ہے۔ میں محض تنہا جاری ہوں کیونکہ عامر کا اپنے دادا کے پاس رہنا بہت ضروری ہے۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ عامر کو اپنے دادا کا بہت خیال رکھنا چاہیے کیونکہ اس بڑھاپے میں ان کی دل جوئی بے حد ضروری ہے۔“

”ہارون! میں نے تیرے بیٹے کو اب تک جو پیار دیا ہے اور اس کا جتنا خیال رکھا ہے تو اس سے اچھی طرح واقف ہے۔ میرے اس پیار اور خیال کی روشنی میں تیرا فرض تو یہ تھا کہ عامر کو لکھتا کہ وہ میرا خاص خیال رکھے اور مجھے اکیلا پن نہ محسوس ہونے دے لیکن تو نے بھی مجھ کو نظر انداز کر دیا۔ کچھ میں نہیں آتا کہ میں کس کا شکوہ کس سے کروں؟ بہرحال میں محض جاری ہوں اور یہی بات کہ میرے بہنوئی کے سامنے نہ جاؤں اور اس سے باتیں نہ کروں تو یہ سب فضول باتیں ہیں۔ اگر تو یہ سب نہ بھی لکھتا، میں تب بھی یہی کچھ کرتی۔“

”ہارون! میں بہت اداس ہوں اور یہ ادا کی اس طرح دور ہو سکتی ہے کہ یا تو، تو خود چلا آ، یا پھر مجھے اپنے پاس ہی بلا لے اور ایک تیسری صورت بھی ہے۔ وہ یہ کہ عامر کی طرح مجھے بھی ایک بیٹا دے کیونکہ میں اب اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اپنے بیٹے ہی کو پناہ دے سکتی ہوں، اسی پرناز کر سکتی ہوں اور اسی سے امیدیں وابستہ کر سکتی ہوں۔ میرے بیٹے کو تیرا باپ ورغلا نہیں سکے گا اور میرا بیٹا ہی مال و زر اور درہم و دینار کو جبراً تقسیم کر سکے گا جس پر تیرا باپ سانپ کی طرح بیٹھ گیا ہے۔ اس وقت میری سب سے بڑی ضرورت ایک بیٹا ہے جس کو میں حاصل کر کے رہوں گی، آج، جلد آتا کہ میں تجھ سے ایک بیٹا، کم از کم ایک بیٹا حاصل کر سکوں۔“

خراسان میں جب یہ خط ہارون کو ملا تو اس کو شدید غمزدگی مینزہ کو اولاد سے محروم رہنے کی سازش سے کسی نہ مطلع ضرور کر دیا یہ ورثہ وہ اس طرح ایک بیٹے کی خواہش نہ

کرتی۔ وہ اپنے بہنوئی سے بہت زیادہ خوف زدہ تھا اور اس کو یقین تھا کہ مینزہ کچھ بھی لکھے لیکن اس راز کا افشاں اس کے بہنوئی نے ہی کیا ہوگا۔

ہارون کی خواہش تھی کہ جب تک وہ خود دمشق نہ پہنچ جائے مینزہ دمشق نہ چھوڑے۔ وہ اسے محض خود پہنچانا چاہتا تھا اور مینزہ کے ساتھ محض میں وہ خود بھی رہنا چاہتا تھا کیونکہ اس کو قطعی یقین نہیں تھا کہ اس کا بہنوئی اس کی عدم موجودگی میں محض اپنے اور مینزہ اور اس کا باپ دونوں ہی اسے اپنے گھر میں داخل ہونے دیں۔ اس نے بھلت مینزہ کو لکھ دیا کہ جب تک میں واپس نہ آؤں، وہ دمشق نہ چھوڑے اور اگر محض جانا ہی چاہتی ہے تو عامر کو اپنے ساتھ لیتی جائے۔

یہ خط ابھی راستے ہی میں تھا کہ مینزہ نے سفر کی تیاریاں مکمل کر لیں۔ عامر مینزہ کی لافعلی اور بے پروائی سے پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ مینزہ سے باتیں کرے لیکن مینزہ نے سرد مہری سے اس کو خاموش کر دیا۔ اس زبردست تبدیلی کو ہارون کا باپ بھی محسوس کر چکا تھا۔

ہارون کے باپ کو بھی پتا نہ تھا کہ مینزہ کہاں جارہی ہے۔ مینزہ نے بستر اور ضروری سامان باندھ کر ایک طرف رکھ دیا اور دروازے پر کھڑے ہو کر کسی کا انتظار کرنا لگی۔ عامر دور دراز پر صبر و استقامت دیکھ رہا تھا لیکن کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں پارا تھا۔ ہارون کا باپ بھی یہ سب دیکھ رہا تھا مگر بوسے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں کر پارا تھا۔

شام کو مغرب کی نماز کے بعد مینزہ چپ چاپ اپنے کمرے میں جا کر بیڑ رہی۔ عامر بڑی دیر تک اپنے بستر پر بیٹھا اور وہیں بدلتا رہا لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ اس کی بی بی ماں کہاں جارہی ہے اور اس کو اپنے ساتھ لے جانے کی یا نہیں۔ ہارون کا باپ خوش تھا کہ اس کے گھر سے واپس جا رہی تھی۔

رات کے اندھیرے میں عامر چپکے سے اٹھا اور مینزہ کے دروازے پر دھلیز سے لگ کر پیٹنے پر ہا۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور عامر میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ دستک دے کر کھلوا لیتا۔ اس رات مینزہ کو بھی عامر کی یاد بہت ساری تھی، اس کو وہ تنہا مٹا عامر ہی طرح یاد آ رہا تھا جو کئی سال پہلے شادی سے قبل اس کی یاد میں جڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں

بھر آئیں اور دل ہی دل میں وہ ہارون کے باپ کو برا بھلا کہنے لگی جس نے ان دونوں کے درمیان ایک خلیج محال کر دی تھی۔

داشنگ مشین کے لئے سویاں صوفی سوپ

اجلی دھلائی کی سچی طاقت

U.A.N. 111-100-786
www.sufigroup.biz
info@sufigroup.biz



عامر دبیز پر بیٹھے بیٹھے اٹھ گیا۔ ہارون کا باپ خراٹے لے رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں میزہ کو کمرے کے دروازے پر کسی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور کمرے کا دروازہ کھول کر جیسے ہی باہر لگی کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر خود بھی گر گئی۔ میزہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”کون؟“

جواب میں عامر کی آواز سنائی دی۔ ”ماں! میں ہوں عامر۔“ میزہ نے حیرت سے پوچھا۔ ”عامر! مگر تو یہاں کیا کر رہا ہے؟“

عامر نے جواب دیا۔ ”ماں! میں آپ کے پاس آیا تھا مگر کمرے کا دروازہ بند دیکھ کر دبیز پر ہی بیٹھ گیا تھا کہ آٹھ لگ گئی اور میں بیٹھے بیٹھے گر گیا۔“

میزہ نے عامر کو سینے سے لگا لیا۔ ”یہاں دبیز پر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی؟ آواز نہیں دی تو دستک دے لیتا۔“ میزہ اس کو کمرے میں لیے چلی گئی۔ اس نے صبح کی روشنی میں عامر کے چہرے پر خشک آنسوؤں کے نشانات دیکھے۔ شوخی سے پوچھا۔ ”کیا تو رورہا تھا؟“

عامر کی آنکھیں ایک بار پھر چمکنے لگیں بولا۔ ”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”اپنے باپ کے پاس چھٹی کیونے ہوئے یہ سول کیوں گیا؟“

عامر نے پوچھا۔ ”کیا آپ تنہا جا رہی ہیں؟“ اس نے جواب دیا۔ ”ہاں کیونکہ میں چھس سے اکیلی ہی آئی تھی۔“

عامر نے دیکھا میزہ یہ جواب دیتے ہوئے کپکپا گئی تھی اور اس کی نظریں خلا میں گڑ گڑہ گئی تھیں۔ عامر نے پوچھا۔ ”میں کس کے پاس رہوں گا؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”اپنے دادا کے پاس کیونکہ میں بہر حال تیرے لیے غیر ہوں۔“

عامر نے خوشامدی۔ ”آپ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلے۔ میں یہاں نہیں رہوں گا، میں دادا کی بات نہیں مانوں گا۔“

میزہ نے عامر کو پیار بھری نظروں سے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ عامر کی بات رد نہیں کر سکتی تھی مگر ہارون کے باپ کی باتیں سنتے سنتے اس کا دل پک گیا تھا، بولی۔ ”عامر! تو ضد نہ کر اور اپنے دادا کے پاس رہ۔ میں جلد ہی واپس آ جاؤں گی۔“

عامر اس سے چپٹ گیا۔ ”میں آپ کے ساتھ ہی جاؤں گا۔ آپ کے بعد یہ گھر ذرا بھی اچھا نہیں لگے گا۔“

اسی وقت خوابیدہ حالت میں عامر کا دادا کمرے میں داخل ہوا اور جہاں لیٹے ہوئے کہا۔ ”عامر! تو یہاں کیوں آیا تھا؟ چل، زیادہ رات تک جاگنا اچھی بات نہیں۔“ عامر نے جواب دیا۔ ”دادا جان! آپ چاہیے اور آرام کیجیے۔ میں یہیں اسی کمرے میں رہوں گا۔“

دادا نے انکوائی لیتے ہوئے ذرا سختی سے کہا۔ ”عامر! تو خوب جانتا ہے کہ اس دنیا میں تیرے دو ہی غم خوار ہیں، ایک تیرا باپ ہارون اور دوسرا میں خود۔ ان دو کے علاوہ میں کسی اور کو نہیں جانتا۔“

عامر نے کہا۔ ”آپ سب کا ارشاد سنا آٹھوں پر۔“ دادا نے پوچھا۔ ”میں نے اب تک جو کچھ بھی تجھے بتایا اور سمجھا دیا ہے، اس کی آہستہ آہستہ تصدیق ہوتی چلی جائے گی۔ اس وقت بھی تو نے یہی بات محسوس کی ہوئی کہ تو، تو میزہ کے پاس رہنے اور اس کے ساتھ جانے کی ضرورت رہا ہے لیکن میزہ تجھے اپنے ساتھ لے جانا نہیں چاہتی۔ بیٹے! جتنی ماں کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔“

میزہ دل سسوس کر رہ گئی، بولی۔ ”باوا جان! آپ ایسی باتیں نہ کیجیے جس سے عامر کا مستقبل ہی تباہ ہو جائے۔ آپ عامر کو جو کچھ محسوس کرانا چاہتے ہیں، اس سے کئی آدمی تیار ہو کر باوجود ہر شے میں عامر کی شہرت اور مقبولیت، حالانکہ آپ اس محسوس کو یہی یاد کر رہے ہیں۔“

ہارون کے باپ نے حیدریاں بدل کر جواب دیا۔ ”میں کچھ بھی باور نہیں کر رہا، عامر تجھ کو وہی سمجھے گا جو تو اپنے طرزِ عمل سے ثابت کرے گی۔ تو حریص ہے اور تو نے میرے بیٹے کے درہم و دینار دیکھ کر اس سے شادی کر لی۔ اب اگر تو عامر کو نظر انداز کرے گی اور عامر کے اصرار کے باوجود چھس اکیلی ہی چلی جائے گی تو اس کا مطلب کیا ہوگا؟ اس سے میں یا عامر کس نتیجے پر پہنچیں گے؟ یہی تا کہ تجھ کو عامر سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تو اپنی خواہشات کی غلام ہے۔“

میزہ رونے لگی، بات کاٹ کر بولی۔ ”بس بس، اب میں آپ کی مزید باتیں نہیں سن سکوں گی۔ میں عامر کو اپنے ساتھ اس لیے نہیں لے جانا چاہتی کہ آپ اس کی مخالفت کریں گے۔ میں اپنے ساتھ لے جانے کا اعلان کر کے عین روائی کے وقت اس ندامت سے نہیں دوچار ہونا چاہتی جو عامر کو جبراً روک کر آپ میرے چہرے پر مل دیں گے۔“

ہارون کے باپ کو ایک دم اتنا غصہ چڑھ گیا کہ وہ اپنے ہوش و حواس ہی میں نہ رہا۔ اس نے عامر کو میزہ کے ہاتھوں سے چھین کر اپنی گود میں لے لیا۔ بولا۔ ”عامر! ادھر

آء میرے ساتھ چل۔ میں تجھ کو اور زیادہ ذلیل نہیں ہوں دوں گا۔" پھر میزہ کو بطور خاص حکم دیا۔ "لو! تو محض اس طرح جارہی ہے کہ ابھی تک مجھ سے محض جانے کی اجازت تک نہیں لی۔ تو اپنی مرضی سے جارہی ہے اس لیے تو اس وقت تک محض میں رہ جب تک ہارون خراسان سے واپس نہ آجائے۔"

میزہ نے رقت سے جواب دیا۔ "آپ تو واپسی کی بات کر رہی رہے ہیں لیکن ایمان داری کی بات تو یہ ہے کہ میں اب واپسی کا کوئی ارادہ ہی نہیں رکھتی۔ اس جہنم میں، میں دوبارہ نہیں واپس آؤں گی۔"

عامر کا دادا تھلا کر رہ گیا۔ اس نے عامر کو گود میں اٹھالیا اور چلا گیا۔ کچھ دن بعد میزہ اس طرح محض روانہ ہوئی کہ اس کا ایک پرہیزی دوران سفر اس کا سر پرست تھا اور وہ غم زدہ اور افسردہ میزہ کو تسلیاں دینے میں مشغول رہا۔ وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے مشیتِ ایزدی کے مطابق ہے۔ اس لیے میزہ کو شکایت نہیں کرنا چاہیے۔

چند رشتے داروں نے اپنے گھر میں اتر گئی۔ یہاں اس کے رشتے کی ایک بہن اور اس کے شوہر نے میزہ کو محبت اور عزت سے اتارا اور اس کی خاطر اور بات میں لگ گئے۔ میزہ کو رہ کر دمشق، عامر اور ہارون کی یاد ستاتی رہتی۔ دمشق جہاں اس کا اپنا کوئی نہ تھا۔ عامر، جس پر اسے کوئی اختیار حاصل نہ تھا اور ہارون جو اس سے بہت دور خراسان میں بیٹھا تھا۔ وہ محض کی فضا میں چھائے ہوئے بادلوں کو بڑی حسرت سے دیکھتی رہتی۔ ان کا لے کا لے اور بھورے یا سرمئی بادلوں میں بڑا کیف تھا لیکن میزہ کا زخمی اور غم زدہ دل اس کیف کو محسوس کرنے سے قاصر تھا۔ وہ شام سے ذرا پہلے جب دروازے یا محبت سے موسیقیوں کے گلے آبادی میں داخل ہوتے دیکھتی تو معلوم نہیں کیوں یہ سوچنے لگتی کہ یہی تمام مناظر اس کا شوہر ہارون بھی خراسان میں ہر شام دیکھتا رہتا ہوگا۔

ایک دن علی الصبح اس کا باپ بھی آذربائیجان سے آگیا۔ باپ کے ساتھ ہارون کا بہنوئی بھی آیا تھا۔ اس کی نظر میں میزہ پر جو پڑیں تو وہ مسکرائے لگا اور اشاروں اشاروں میں مانی تعمیر سمجھانے لگا۔ اس نے میزہ کو پھر شوق نظروں سے دیکھا اور عاجزی سے سوال کیا۔ "میزہ! کیا بات ہے تو پریشان کیوں ہے؟ کیا ہارون کے باپ نے تجھ کو

نکال دیا؟"

میزہ نے خفیہ کی بڑی کوشش کی لیکن برداشت نہ کر سکی اور آنکھوں کے گوشے جھپکنے لگے۔ "نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں، میں خود ہی چلی آئی۔ ہارون کا باپ مجھ کو نکالنا کیوں؟" بہنوئی نے طنز آؤ چھا۔ "عامر کہاں ہے؟" میزہ نے چور کی طرح جواب دیا۔ "دمشق میں اپنے دادا کے پاس۔"

بہنوئی نے شرارتا پوچھا۔ "وہ میرے ساتھ کیوں نہیں آیا؟" اس نے جواب دیا۔ "وہ تو میرے ساتھ آنے کے لیے ضد کر رہا تھا لیکن میں نے یہ سوچ کر اپنے ساتھ نہیں لیا کہ اس کا دادا تنہائی سے اکتا جاتا اور وہ اپنے پوتے سے بڑی محبت کرتا ہے۔"

بہنوئی کو اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا، بولا۔ "میزہ! تو جو چاہے کہہ لے لیکن میں تیری باتوں پر یقین نہیں کر سکتا۔ ہارون کا باپ بڑا ہی موزی ہے۔ حرص و طمع کا جیکر، اگر تجھے یہ بات ابھی تک نہیں معلوم تھی تو آج مجھ سے سن لے۔" میزہ دم بخود کسی مصحوم تماشا کی طرح تندوئی کی صورت دیکھتی اور باتیں مٹتی رہی۔

ہارون کا بہنوئی کہتا رہا۔ "میزہ! سادہ لوح اور بھولی بھالی لڑکی! بھلا جب بھی میں تجھ کو دیکھتا ہوں یہی سوچتا رہ جاتا ہوں کہ مجھ کو کوئی چیز ہے، تو مجھ کی بات ہے۔" لیکن اسی وقت میزہ کا باپ بھی آگیا۔ اس نے ہارون کے بہنوئی سے پوچھا۔ "کہیں تو میری بیٹی کو غلا تو نہیں رہا؟" پھر میزہ سے پوچھا۔ "بیٹی! کیا بات ہے؟ تو ملول کیوں ہے؟"

میزہ نے جواب دیا۔ "پدر بزرگوار! کوئی ایک سبب اداسی کا ہو تو بیان بھی کر دوں۔ میں ہارون سے شادی کر کے مصیبتوں کا جو دروازہ کھول چکی ہوں، اس کو بند کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔"

باپ نے مفتی خیر علیجہ میں پوچھا۔ "کیا مطلب؟" ہارون کا بہنوئی بول اٹھا۔ "مطلب کیا ہے؟ وہی مطلب ہے جس سے ہم دونوں ہی واقف ہیں۔ اس گھر میں اگر ہارون کا باپ نہ ہوتا تو گھر میں تپا چلت ہوتا لیکن اب وہ گھر....." میزہ رونے لگی، بولی۔ "میں اس بوڑھے کو کیا نہیں سمجھتی تھی۔ اس نے حد کر دی ہے۔"

میزہ کے باپ نے اصرار کیا۔ "پھر بھی ہوا کیا؟ کچھ تو بتا؟ میں اس ذلیل انسان کو ٹھیک کر سکتا ہوں۔" میزہ نے جواب دیا۔ "اب میں دمشق واپس نہیں

جاؤں گی۔"

ہارون کے بہنوئی نے میزہ کے باپ سے کہا۔ "میزہ کے اس جواب میں کہ اب میں دمشق واپس نہیں جاؤں گی، اس سے کچھ پوچھنا ہے کار ہے۔" میزہ کے باپ نے کہا۔ "اچھا، اب تو واقعی دمشق واپس نہیں جائے گی۔ تو محض ہی میں رہے گی، ہارون بھی یہیں آئے گا اور یہیں رہے گا۔"

میزہ نے اٹھک بار نظروں سے باپ کو دیکھ کر پوچھا۔ "اور عامر؟ عامر کہاں رہے گا؟" میزہ کے باپ نے نفرت سے جواب دیا۔ "میں نہیں جانتا کہ عامر کہاں رہے گا لیکن وہ ہمارے ساتھ یا تیرے پاس نہیں رہے گا۔" پھر ہارون کے بہنوئی سے کہا۔ "تو کچھ دیر کے لیے باہر چلا جا، میں میزہ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ باہر چلا گیا میزہ کے باپ نے آہستہ سے کہا۔ "یہ تو بار بار عامر کام نام کیوں لیتی ہے؟ یاد رکھو وہ تیرا بیٹا نہیں ہے۔ ہارون کا باپ اپنے پوتے کو سکھا پڑھا کر تیرے خلاف تیار کر رہا ہے۔ افسوس کہ تو اولاد سے محروم ہے اور تیرا مستقبل تیری اولاد ہی محفوظ اور روشن رکھے گی، ورنہ کچھ بھی نہیں ہے۔ تم دونوں، ہارون اور تم کسی وقت بھی ایک دوسرے سے ٹکرائے بغیر رہنا چاہو۔" میزہ ان باتوں کا کیا جواب دیتی لیکن باپ کی باتوں نے اس کے دل میں اپنی اولاد کی شدید خواہش کا ایسا چراغ روشن کر دیا جو اپنی پوری آب و تاب کی گرمی سے اس کے سینے اور پورے وجود کو پگھلائے دے رہا تھا۔

میزہ کے باپ نے دے دے کیجے اور اشاروں کنایوں میں پوچھا۔ "میزہ! مجھے تو تیری اولاد سے محرومی کے پیچھے کوئی سازش، کوئی خاص منصوبہ کا فرما نظر آ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے میرا خیال غلط ہو لیکن میرے اس خیال کی روشنی میں تجھ کو غور و فکر کرنا ہوگا اور ہارون کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہوگی۔"

میزہ کوئی جواب دے بغیر باپ کے سامنے سے ہٹ گئی لیکن تنہائی میں لیٹ کر اس نے ہارون کی غلطیوں کا بڑی دیانت داری سے جائزہ لیا اور ان لمحوں کو پکڑ لیا جہاں ہارون نے چالاکیوں سے کام لے کر انتہائی نازک، خاص اور لطیف مواقع پر خود کو بے غلت میزہ سے الگ کر لیا تھا اور یہی وہ غلطی اور نازک لمحے ہوتے تھے جن میں اسے اولاد مل سکتی تھی۔ پہلے وہ ہارون کے اس فعل کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتی تھی

لیکن اب وہ ماضی کے اس عمل میں تواتر اور باندی محسوس کر کے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس خوف نے غصے اور اشتعال کی شکل اختیار کر لی اور اس نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا کہ اب وہ ایسا نہیں ہونے دے گی اور اولاد حاصل کر کے رہے گی۔

دوسری طرف ہارون کا بہنوئی اس فکر میں تھا کہ وہ کسی طرح ہارون اور میزہ میں اختلافات پیدا کرادے۔ وہ ہر وقت اس موقع کی تلاش میں رہتا جب وہ میزہ سے تھپتھے میں چند باتیں کرے۔

میزہ کے باپ کا خلافت کی طرف سے بلاوا آگیا۔ اس کو دمشق میں طلب کر لیا گیا تھا۔ وہ اس بلاوے کو ٹال دینا چاہتا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے خطرناک نتائج بھی نقل سکتے ہیں۔ اس نے کوشش کی کہ ہارون کے بہنوئی کو بھی اپنے ساتھ ہی لیتا جائے لیکن اس نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ آخر بدرجہ مجبوری اس کو اپنی بیٹی کو سمجھانا پڑا، کہا۔ "میزہ! میری بیٹی! میں چند دنوں کے لیے دمشق جا رہا ہوں۔ ہارون کا بہنوئی یہیں رہے گا۔ کیا اچھا ہوتا کہ یہ بھی میرے ساتھ ہی چلتا۔"

میزہ خاموش رہی، اس کا باپ کچھ توقف کے بعد مزید بولا۔ "لیکن میں اس کو ساتھ چلنے پر مجبور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ ہمارا محض ہے۔ اس لیے اگر وہ میری ہم عمر ہو تو میں اس کو ساتھ لے کر جاتا ہوں۔" میزہ نے اپنے ہارون کے بہنوئی سے کہا۔ "لیکن مشکل تو یہ ہے کہ وہ تجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا اور اگر ہارون ذرا تاخیر سے پہنچتا تو، تو آج ہارون کے بجائے اس کے بہنوئی کی بیوی ہوتی۔ بس اس واقعے نے انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے۔"

میزہ نے کہا۔ "بادا جان! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ جو کچھ کہنا ہے فی الفور کہہ دیجیے۔ گھما پھرا کر بچنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

باپ نے جواب دیا۔ "میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اب تو ہارون کی بیوی ہے، ہارون کی وقت بھی آ سکتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ جب ہارون یہاں آئے تو اپنے بہنوئی کو تیرے ارد گرد دیکھ کر شتمیل ہو جائے۔ تو عطا طرہ بالکل اس طرح جیسے ہارون بھی یہیں کہیں موجود ہے اور وہ تیری حرکات و سکنات پر نظریں رکھے ہوئے ہے۔"

میزہ نے کہا۔ "میں جانتی ہوں، پھر بھی مزید خیال رکھوں گی۔"

منیزہ کا باپ دمشق چلا گیا۔ ہارون کا بہنوئی اس گفتگو سے لاعلم تھا اس لیے اس نے ایک اور ہی منصوبہ بنالیا تھا۔ وہ ابھی تک منیزہ کی طرف سے مایوس نہیں ہوا تھا لیکن اب مشکل پیش آرہی تھی کہ منیزہ اس سے بچتی پھر رہی تھی۔ کئی ایسے مواقع ملے جب وہ منیزہ کو ورغلا سکتا تھا لیکن منیزہ نے ان موقعوں کو ضائع کر دیا۔

منیزہ علی الصباح اٹھ کر نماز پڑھتی، اس کے بعد کچھ دیر تلاوت میں لگتی پھر کمرہ کے کاموں میں مشغول ہوجاتی لیکن ایک دن اس کے معمولات میں فرق آگیا۔ منیزہ نے کئی دن سے پریشان کر رکھا تھا، وہ اس کو نال دیتی تھی لیکن ایک دن وہ بستر پر گھٹی، بخار بھی ہو گیا۔ رات بھر نیم مدهوشی میں معلوم نہیں کیا بڑبڑاتی رہی۔ ہارون کے بہنوئی کو اس کے قریب جانے کا موقع مل گیا۔ صبح کی نماز بھی قضا ہو گئی۔ بہنوئی اس کے سر ہانے جا کھڑا ہوا، پوچھا۔ ”منیزہ! اب کیسی طبیعت ہے؟“

منیزہ نے آنکھیں میھاڑ میھاڑ کر ادھر ادھر دیکھا اور اپنے سامنے اسے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی، پوچھا۔ ”آپ یہاں کب آئے؟“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”منیزہ! میں تیری مجبور یوں سے واقف ہوں لیکن میں یہ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ تو اتنی مجبور نہیں ہے، اس سے زیادہ مجبور بنا کر رکھی گئی ہے۔ اب تجھ کو خول سے باہر آ جانا چاہیے۔“

منیزہ نے جواب دیا۔ ”بھائی! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ نہ میں خود کو مجبور محسوس کرتی ہوں اور نہ ہی میں نے اپنے آس پاس کوئی خول چڑھا رکھا ہے جو اس سے باہر آ جاؤں۔“

بہنوئی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ شوقی سے بولا۔ ”تجھے تو جھوٹ بول کر دھوکا دینے میں مزہ آنے لگا ہے۔“

منیزہ نے مختصر کہا۔ ”یہ آپ کی سوچ کا کرشمہ ہے ورنہ میں بالکل بنشاش اور مطمئن ہوں۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”منیزہ! میں تجھ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

منیزہ نے جواب دیا۔ ”بھائی! پھر کبھی باتیں کر لینا، مجھے اچھا ہو جانے دو۔“

بہنوئی نے منہ پتا کر کہا۔ ”ان باتوں کے لیے اس سے بہتر موقع نہیں ملے گا۔“

منیزہ نے آنکھیں بند کر لیں اور عدم دلچسپی کا اظہار کیا، بولی۔ ”جو بات کرنی ہو، مختصر آ جلدی کر لیں کیونکہ

طبیعت باتیں کرنے یا سننے پر رغب نہیں ہورہی۔“

بہنوئی نے پوچھا۔ ”منیزہ! تو بچ بچا، کیا تو موجودہ حالات سے خوش اور مطمئن ہے؟“

منیزہ نے جواب دیا۔ ”اگر ہارون میرے پاس ہوتا تو میں خوش بھی ہوتی اور مطمئن بھی لیکن اس کی عدم موجودگی میں خوشی اور مطمئن کا اثر انہیں کر سکتی۔“

بہنوئی تھلا گیا بولا۔ ”تو غلط بیانی سے کام لے رہی ہے، کیونکہ میں کیا جو بھی تجھے قریب سے جانتا ہے، خوب سمجھتا ہے کہ تو بالکل ناخوش اور غیر مطمئن ہے۔ اور اگر ہارون تیرے پاس بھی ہوتا تب بھی موجودہ کیفیت برقرار رہتی۔“

منیزہ نے کہا۔ ”بس یہی بات کہنا یا کچھ اور بھی؟“

بہنوئی سخت مایوس تھا، بولا۔ ”پہلے تو اس کا اقرار کر کہ تو نے میری بات کے جواب میں جو کچھ کہا، وہ غلط ہے، جھوٹ ہے۔ اس کے بعد میں چند اہم مگر کام کی باتیں کروں گا۔“

منیزہ نے بڑی سنجیدگی اور مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ”بھائی! میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، سچ کچھ کہہ رہی ہوں۔ میں جھوٹ کیوں بولوں گی؟ ہاں اگر تم میری زبان سے وہی سبب سننا چاہتے ہو جو یہ چیز کہو ان پر منحصر ہوتی ہیں تمہیں خوش کرنے کے لیے کہہ دیتی ہوں کہ میں ناخوش بھی ہوں اور غیر مطمئن بھی۔ اب آگے کیے بچھڑے۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”اگر ہارون اور تیرے درمیان ہارون کا باپ اور عامر موجود نہ ہوتے تو میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ کم دونوں بہت خوش و خرم ہو لیکن ایسا ہے نہیں۔ اس لیے میں.....“

منیزہ نے جواب دیا۔ ”بہر حال میں بہت مطمئن اور خوش ہوں۔ جو تھوڑی بہت رنجش آج بھی گئی ہیں ہم دونوں کے دل و دماغ میں تو وہ چند دنوں کے ساتھ ہی دھل جائیں گی۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”لیکن میں اسے ناممکن سمجھتا ہوں۔ منیزہ! اگر تو نے اپنے باپ کی ہاں میں ہاں نہ ملائی ہوتی تو آج تو میری بیوی ہوتی اور شہادت کی زندگی گزار رہی ہوتی۔“

منیزہ نے جواب دیا۔ ”اے بھائی! یہ شہادت کی زندگی کیا شے ہوتی ہے؟ مجھے کیسے معلوم ہو؟“

بہنوئی نے ہنس کر کہا۔ ”تو ہارون سے طلاق لے کر مجھ سے شادی کر لے، پھر تجھے خود بخود دیر کی باتوں کا جواب مل جائے گا۔“

منیزہ غصے میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ طیش میں بولی۔ ”بھائی! یہ تم کیسی باتیں کرنے لگے۔ اگر تم سے شادی کرنا

ہوتی تو ہارون سے شادی کیوں کرتی؟ میں ہارون سے محبت کرتی ہوں۔“

بہنوئی نے طنز کیا۔ ”محبت کرتی ہے ہارون سے! خوب۔ منیزہ! تو تو مجھ کو بے وقوف بنارہی ہے یا پھر تو بہت سیدھی سادی لڑی ہے۔“

منیزہ چڑ کر بیٹھ گئی۔ سر کو دونوں ہاتھوں سے دبا کر بولی۔ ”میرا سر درد کر رہا ہے۔ خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو بھائی! ورنہ میں دوپارے سے سرنگراؤں گی۔“

اتنے میں منیزہ کی پھوپھی بھی آگئی۔ اس نے منیزہ کو بستر پر بیٹھے جو دیکھا تو دور رہی سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے منیزہ! تیری طبیعت تو خشک ہے؟“

بچ میں بہنوئی بول پڑا۔ ”منیزہ کی طبیعت خراب ہے اور میں بڑی دیر سے اس کو یہ رائے دے رہا ہوں کہ کسی طیب سے رجوع کر لیکن یہ آمادہ ہی نہیں ہوتی۔“

پھوپھی نے کہا۔ ”یہ خشک تو کہتا ہے۔ تجھ کو اس کا کہنا مان لیتا چاہیے منیزہ! نزلے کا زیادہ دنوں تک دیا نہ رکھنا خطرناک بات ہے۔“

منیزہ نے جھنجھلا کر کہا۔ ”پھوپھی جان! آپ بھی بھائی کی ہاں میں ہاں ملائے علی جاری ہیں۔“

پھوپھی نے سختی سے کہا۔ ”تو طیب کو بللا، میں انہیں کی اطلاع کی طرح نہیں کر سکتی۔“

بہنوئی طیب کے پاس چلا گیا اور منیزہ نے سکھ کا سانس لیا۔ وہ ہارون کے بہنوئی کو اتنا غیبت نہیں سمجھتی تھی۔ اس کے جی میں آئی کہ جب ہارون واپس آجائے تو اس کو ان باتوں سے آگاہ کر دیا جائے لیکن پھر یہ سوچ کر دل گئی کہ اس کا نتیجہ بہت برا نکلتے گا۔

کافی دیر بعد جب وہ واپس آیا تو طیب تو اس کے ساتھ آئے نہیں، ہاں چند دو ایمیل البتہ اس کے ہاتھ میں تھیں۔ منیزہ کی طرف بڑھا دیا، بولا۔ ”منیزہ! میں نے تیرا حال کہہ کر طیب سے یہ دو ایمیل لے لی ہیں۔ اب تو کیسی ہے؟“

منیزہ نے بیزار سے جواب دیا۔ ”بھائی! تم نے بلاوجہ زحمت کی، اب میں بالکل خشک ہوں۔“

بہنوئی نے ادھر ادھر دیکھ کر یہ اندازہ لگایا کہ پھوپھی کا کہیں پتا نہیں ہے۔ بولا۔ ”منیزہ! میں تجھ سے جواب چاہتا ہوں، یہ تو تو اچھی طرح یقین کر لے کہ ہارون کا باپ ہمیشہ دوسرا بنا رہے گا۔ رہی یہ بات کہ تو خود صاحبزادہ اولاد ہو جائے، ناممکن ہے۔ ہارون ایسا بھی نہیں ہوئے دے گا

اور اگر یہ لغزش بھی گئی تو یہ بھی ممکن ہے کہ پیدائش کے بعد اس کو ہلاک کر دیا جائے۔ بہر حال تیری آغوش تیری اپنی اولاد سے محروم ہی رہے گی۔“ پھر وہ اور زیادہ بے شری پر اتر آیا پوچھا۔ ”منیزہ تیرا کچھ کیوں نہیں ہوا؟“

منیزہ پھر کھڑی ہو گئی۔ اس نے غصے میں کئی ہاتھ رسید کر دیے، بولی۔ ”مے شرم انسان! تو اسی وقت دور ہوجا میری نظروں سے ورنہ کوئی بدترین حادثہ رونما ہو جائے گا۔“

لیکن بہنوئی بھی آسانی سے زیر ہو جانے والا شخص نہیں تھا مسکراتے ہوئے بولا۔ ”منیزہ! میں غرض مند ہوں اسی لیے یہ ذلت بھی برداشت کر لوں گا۔ میں انتہائی خلوص سے تجھ کو یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ تو ہارون اور اس کے حالات کو سمجھنے میں سخت غلطی کر رہی ہے۔“

منیزہ نے سچ میں کھڑے بہنوئی کو دھکا دے کر راہ سے ہٹا دیا، بولی۔ ”میرا راستہ چھوڑ دے اوجھیت انسان! تو جو کچھ کہہ رہا ہے یا جو کچھ مزید کہے گا، میں نہیں سنوں گی اور ہارون کو تیری باتوں سے آگاہ کر دوں گی پھر وہ دے گا سچ جواب۔ افسوس کہ تو انتہائی غلط انسان نکلا۔“

منیزہ بھاگ کر پھوپھی کے پاس چلی گئی۔ بہنوئی کچھ دیر کھڑا اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ بالآخر وہ بھی مایوس ہو کر باہر چلا گیا۔ اس کی ایک اور غلطی لڑائی ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ منیزہ نے یہ سب کچھ ہارون کو بتا دیا تو کیا ہوگا؟

اور آخر کار یہ فیصلہ کر لیا کہ پہلے تو وہ اس سے انکار کرے گا لیکن اگر انکار ناممکن ہوا تو وہ ہارون کا مقابلہ کرے گا اور اس مقابلے میں وہ ہارون کو شکست دینے کی کوشش کرے گا۔

دوسری طرف منیزہ کو اب تنہائی سے خوف محسوس ہونے لگا تھا اور وہ دل کی گہرائیوں سے دعا مانگ رہی تھی کہ خدا یا تو باپ کو دمشق سے واپس بلاوے ورنہ ہارون ہی کو واپس بلالیا جائے۔

یہ دعا اس طرح مقبول بارگاہ ہوئی کہ دوسرے ہی دن اس کا باپ آگیا۔ باپ کو دیکھتے ہی اس نے سکھ کا سانس لیا اور اس کے سینے سے لگ کر زار و قطار رونے لگی۔ باپ نے اس کی پشت پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر پوچھا۔ ”منی منیزہ! کیا ہوا؟ یہ تو رویوں رہی ہے؟ خیر تو ہے؟“

منیزہ نے ہچکچاہٹ لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”بادا جان! میں آپ کی نصیحتوں کو یاد کر کے رو رہی ہوں جو آپ دمشق جانے سے پہلے کر رہے تھے۔ اس عرض میں اب میں نے یہ سمجھا ہے کہ بزرگوں کو شاید آنے والے واقعات کا قتل

از وقت ہی علم ہو جاتا ہے۔

باپ نے پوچھا۔ ”کیا کوئی خاص بات ہوگئی؟“
میزہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، ابھی تک تو نہیں۔“

باپ نے شوقی سے میزہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔
”کوئی بات بھی نہیں ہوئی اور بزرگوں کو آنے والے
واقعات کا قبل از وقت علم بھی ہو جاتا ہے۔ اب تو ذرا نہ
گھبرا، میں آگیا ہوں۔“ پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔ ”میزہ! بچ
بچ بتا اس نے تجھ کو کیا باتوں میں؟“
میزہ رونے لگی۔ ”بادا جان! یہ شخص قابل اعتبار
ہرگز نہیں۔“

باپ نے چونک کر پوچھا۔ ”تو رو کیوں رہی ہے؟
اس نے کیا کیا؟ مجھے تو بتا کچھ۔“
میزہ نے پرجوش آواز میں کہا۔ ”یہ کرتا کیا، اگر یہ
کچھ کرتا تو میں اس کا براہِ حشر کر دیتی۔“

باپ نے بار بار اور مختلف طریقوں سے وہ بات
معلوم کرنا چاہی جس نے میزہ کو رلا دیا تھا لیکن اس نے نہیں
بتایا۔ آخر وہ ہارون کے بہنوئی کو تلاش کرتا ہوا وہیں پہنچ گیا
جہاں وہ چوروں کی طرح چھپا کھڑا تھا۔ میزہ کے باپ نے
طنز اُپوچھا۔ ”تو یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے؟ میں تو تجھے تلاش
کرتا پھر رہا ہوں۔“

بہنوئی کی جان میں جان آگئی، بولنے لگا۔ ”جسٹ ولانا
آپ مجھ کو کہاں تلاش کر رہے تھے؟ میں تو بڑی دیر سے کھڑا
آپ کا انتظار کر رہا تھا۔“

میزہ کے باپ نے منہ بنا کر ہارون کے بہنوئی پر یہ
بات واضح کر دی کہ اس کا دل اس سے صاف نہیں ہے۔ اس
لیے وہ اب اس پر اعتبار نہیں کرے گا۔ ہارون کے بہنوئی
نے بھی منہ بنا کر پشت پھیری اور دل ہی دل میں کچھ کہنے
میں مشغول ہو گیا۔

☆☆☆

ہارون خراسان سے چلا تو پہلے دمشق پہنچا۔ وہاں
اپنے بیٹے عامر کو سینے سے لگا لیا۔ عامر باپ کو دیکھتے ہی
پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اور میزہ کی شکایت کر دی، ہچکچاں
لیتے ہوئے کہا۔ ”وہ تنہا محض چلی گئی مجھ کو نہیں لے گئی،
حالانکہ میں نے اس کی بڑی خوشامد کی تھی۔“

باپ کو اپنے بیٹے سے ہمدردی ہوئی۔ ابھی وہ اس
سے فارغ بھی نہ ہوا تھا کہ اس کا باپ بھی اس کے پاس
جا کھڑا ہوا اور پوچھا۔ ”یہ عامر تجھ سے کیا کہہ رہا تھا؟“
ہارون نے جواب دیا۔ ”اپنی ماں کی شکایت کر رہا تھا۔“

باپ نے منہ بنا کر کہا۔ ”ہاں، میں جانتا ہوں کہ یہ
شکایتوں میں حق بجانب ہے۔ میں نے بھی اس کی سفارش کی
تھی کہ اپنے ساتھ لیتی جائے مگر میزہ پر اس کا کوئی اثر نہ
ہوا۔ وہ اپنی مرضی سے محض چلی گئی۔ تنہا، اکیلی۔ میں نے
پہلی بار اس کی خودی محسوس کی۔“

ہارون نے تملکار پوچھا۔ ”بادا جان! اس نے آپ
کی بات بھی نہیں مانی؟ یعنی اس میں اتنی خودی آگئی تھی۔
میں یہ تو معاف کر سکتا ہوں کہ اس نے عامر کا دل توڑ دیا، یہ
معاف نہیں کر سکتا کہ اس نے آپ کا حکم بھی نہیں مانا۔“

باپ نے پچھرا پھیرا۔ ”نہیں، بہو سے بات کرنے
کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے اسے معاف کر دیا۔“
لیکن اس سے ہارون کا پارا چڑھ چکا تھا۔ وہ میزہ
سے سخت ناراض تھا اور دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ پہلے تو
وہ میزہ کو کھٹھائے گا، اگر وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہوگئی تو کوئی
بات نہیں ورنہ وہ طلاق کی دھمکی دے دے گا۔

میزہ کی سرکشی کا ایک خاص سبب بھی اس کی سمجھ میں
آ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس کے
بہنوئی نے کسی طرح میزہ کو درغلا یا ہوا اور میزہ کا محض جانا
بھی کہیں اسی سلسلے کی کوئی کڑی تو نہیں۔ وہ ان الجھنوں کو
اپنے دل و دماغ میں بسائے ہوئے عامر کو لے کر محض روانہ
ہو گیا۔ میزہ ان دونوں کو اپنے گھر لے گئے۔

اس وقت ہارون کا بہنوئی بھی گھر ہی میں موجود تھا۔
بہنوئی نے سلام میں پہل کی اور ہارون کو سلام کر کے عامر کی
طرف بڑھا۔ ہارون نے سلام کا جواب نہیں دیا، جیسے لہجے
میں پوچھا۔ ”تو، تو یہاں موجود ہے، تو کیا میرا اندازہ غلط
نہیں نکلا۔“

بہنوئی نے بڑی محبت سے عامر کو گود میں اٹھانا چاہا مگر
ہارون نے عامر کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور بہنوئی
سے کہا۔ ”بہن مرگئی تیرا ارشد ختم ہو گیا۔ اس لیے اب
بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کر۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”تو معلوم نہیں کسی اکھڑی اکھڑی
باتیں کر رہا ہے۔“

اس کے بعد اس نے ایک بار پھر عامر کو گود میں
اٹھانے کی کوشش کی مگر ہارون نے سختی سے منع کر دیا۔ ”کیا
میری بات تیری سمجھ میں نہیں آئی؟ میرا تیرا ارشد ہی کیا، اب
ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔“

بہنوئی شرمندہ اور دل برداشتہ ہو کر باہر چلا گیا۔ اس
کے جاتے ہی ہارون نے میزہ سے پوچھا۔ ”میزہ! تیرا

عشقی نام تمام

باپ کہاں چلا گیا؟“

میزہ نے ناگواری سے کہا۔ ”میرا باپ گویا تیرا تو
کچھ ہے ہی نہیں۔ وہ باز آ رہا ہوا ہے۔“

ہارون نے بڑی تنگی نظر سے میزہ کو گھورنا شروع
کر دیا۔ میزہ نے نیک آدھ بار اس کو اس طرح گھورتے
دیکھ لیا اور سہم گئی۔ میزہ نے عامر کو اپنی گود میں بٹھالیا اور
اس سے گھر کی خبریت معلوم کرتی رہا۔ ہارون نے سختی سے
کہا۔ ”میزہ! مجھے تجھ سے یہ امید نہیں تھی کہ میرے جاتے
ہی تو اتنی بدل جائے گی۔“

میزہ نے جواب دیا۔ ”میں ذرا بھی نہیں بدلی۔ تجھ
سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں بدل گئی ہوں؟“
ہارون نے کہا۔ ”میں جانتا چاہتا ہوں کہ میرے
بہنوئی کا اس گھر میں کیا کام ہے؟ یہ یہاں کیوں رہتا ہے؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”ہارون! تو شاید یہ بات
بول گیا کہ یہ میرا گھر نہیں ہے۔ یہ میرے باپ کا گھر ہے
اور یہاں ہر وہ شخص آ کر رہ سکتا ہے جس کو والد صاحب اپنے
ساتھ رکھنا پسند کریں گے۔“

ہارون دانٹ پیتا ہوا بولا۔ ”اگر یہ بات تھی تو تجھے
اپنے باپ کو صاف صاف بے بتا دینا چاہیے تھا کہ میں اپنے
بہنوئی کو سخت نا پسند کرتا ہوں۔“

میزہ نے کہا۔ ”افسوس کہ میں نے تجھ کو بڑی مشکل
سے حاصل کیا تھا اور میں یہ امید کرتا تھا کہ تو مجھ سے اور
میرے متعلقین سے ہمیشہ بہت اچھی طرح پیش آتی رہے گی
لیکن تو نے عامر تک کا خیال نہیں رکھا۔ اسے چھوڑ کر اپنی
محض چلی آئی۔“

میزہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، وہاں میں بہت
پریشان تھی اور اس وقت تک میرے پاس میری پریشانی کا
کوئی حل ہی نہیں تھا۔ اس لیے میں محض چلی آئی۔“

ہارون نے منہ بنا کر کہا۔ ”میں تیری ساری باتیں سمجھ
چکا، اب تو میری بات بھی سن لے۔ میں دمشق سے یہ فیصلہ
کر کے چلا ہوں کہ یا تو تو میری فرماں بردار بن کر رہے گی
یا پھر میں تجھے طلاق دے دوں گا۔“

اس سچ ترین اعلان نے میزہ کو بدحواس کر دیا۔ اس
نے جو کچھ سنا تھا، کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے نرمی سے
جواب دیا۔ ”فرماں برداری؟ کس قسم کی فرماں برداری؟
کس کی فرماں برداری؟“

ہارون نے کہا۔ ”مجھ کو باتوں میں نہ بہلا میزہ! تو
نے میری باتوں کا مطلب اس سے کہیں زیادہ سمجھ لیا ہے جتنا
میں سمجھنا چاہتا تھا۔“

میزہ کو غصہ تو بہت آیا تھا مگر بات کو ختم کرنے کے
لیے وہ وہ ہارون کے سامنے سے ہٹ گئی، بولی۔ ”ہارون!
میں محسوس کر رہی ہوں کہ اس وقت تو اپنے ہوش و حواس میں
نہیں ہے اس لیے میں اس وقت کوئی بات نہیں کروں گی۔
پھر کسی وقت، جی بھر کے باتیں کر لوں گی۔“

ہارون دیکھتا کہ دیکھتا رہ گیا۔ میزہ اپنی پھوپھی کے
پاس چلی گئی۔ دوسرے کمرے تک جاتے ہوئے ایک جگہ
ہارون کا بہنوئی نظر آ گیا۔ وہ شاید اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔
میزہ کا کھنگلی اور غم میں ڈوبا ہوا چہرہ دیکھ کر اس نے پوچھا۔
”میزہ! کیا بات ہے؟ میرا خیال ہے اس اجڑا انسان نے
تیرا دل بھی دکھا دیا۔“

میزہ نے ڈانٹ کر جواب دیا۔ ”تو چپ ہو جا اور
مجھ سے بات نہ کر کیونکہ ہارون کی ناراضی کا اصل سبب تو
ہے۔ ہارون تجھ پر اعتبار نہیں کرتا اسی لیے وہ اکھڑی اکھڑی
باتیں کر رہا ہے۔“

ہارون کا بہنوئی خاموش ہو گیا۔
سب سے پہلے میزہ کے باپ سے یہی ملاقات ہوگئی۔ اس
نے اپنے داماد کو بڑی خوشی اور غلغلے سے خوش آمدید کہا
مگر ہارون اب بھی روٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

میزہ کے باپ نے کہا۔ ”میں تو تیرا بڑی بے چینی
سے انتظار کر رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ تو آ گیا۔“
ہارون نے بد مزگی سے کہا۔ ”کیا میں پوچھ سکتا ہوں
کہ اس گھر میں میری مرحوم بہن کے شوہر کا کیا کام ہے؟ اس
کا ارشد تو ختم ہو چکا۔“

میزہ کے باپ نے بڑے سکون سے جواب دیا۔
”ہارون بیٹے! تیرا بہنوئی کتنا ہی برا بھی لیکن یہ میدان جنگ
کے اس دے میں تھا جس میں، میں خود شامل تھا۔“ پھر ذرا
دم لے کر بولا۔ ”میں نے یا میزہ نے تیرے بہنوئی کو
تیرے ہی ذریعے پہچانا ہے اور اس گھر میں اس کی جتنی بھی
قدردانیت ہے، اس کا بنیادی سبب وہی ہے جو میں نے
بیان کر دیا۔“

ہارون نے کہا۔ ”اگر یہ بات درست ہے کہ تو نے
میری مرحوم بہن کے شوہر کو میرے حلق اور میرے رشتے سے
پہچانا ہے تو اب اس رشتے اور حلق کا واسطہ دے کر یہ کہہ رہا
ہوں کہ اس گھر سے اس کو ہمیشہ کے لیے نکال باہر کیا جائے۔“

میزہ کے باپ نے افسوس سے کہا۔ ”مگر کس طرح؟ اس سے تیری دشمنی کا تعلق، سبب، وجہ؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ میں نے جو کچھ کہہ دیا، اس پر عمل ہونا چاہیے۔“

میزہ کے باپ نے ذہن پر زور دے کر کچھ سمجھنے کی کوشش کی اور جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اپنا فیصلہ کن جواب دے مارا۔ ”افسوس کہ تو میرے ہی گھر میں کچھ اس طرح باتیں کر رہا ہے گویا میں تیرا غلام ہوں اور تو میرا آقا۔ تجھ کو گفتگو کا سلیقہ تو ہونا ہی چاہیے۔ تو میزہ کو اپنے ساتھ لے جا اور مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دے۔ میں کسی کے حکم پر نہیں چل سکتا۔“

شاید ہارون کو بھی اپنی تلخ کلامی کا احساس ہو گیا۔ ذرا نرمی سے بولا۔ ”پدر بزرگوار! میں جب بھی اپنے بہنوئی کی شکل دیکھتا ہوں، مجھے بہنوئی کی عیاریاں اور بہن یاد آنے لگی ہے۔ اس لیے میں اس شخص کو اپنے سامنے رکھنا ہی نہیں چاہتا۔“

میزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”تو بلا کا جذباتی اور حساس انسان ہے۔ یہ سب کچھ جان لینے کے بعد کہہ میں تجھ سے۔“

لیکن ہارون نے بات کا ٹھنڈی بولی۔ ”آپ کچھ بھی کہیں مگر میں اس شخص پر اعتبار نہیں کر سکتا۔“

میزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”میں کب کہتا ہوں کہ تو اس پر اعتبار کر۔ اس کے بعد وہ ہارون کو باہر لے گیا۔“

”میرے ساتھ چل، ہم دونوں غصے میں کچھ باتیں کریں گے۔“

میزہ کا باپ اسے گھر کے قریب ہی ایک چھوٹے سے باغ میں لے گیا۔ باغ میں انگریزی بیلوں کے سامناں پھیلے ہوئے تھے اور انجیر اور فالے کے درختوں کی کثرت تھی۔ میزہ کا باپ اس کو تانستان کے سامنے میں لے کر بیٹھ گیا اور گفتگو کا آغاز کیا۔ ”ہارون! تو سوچ رہا ہوگا کہ میں تجھ کو یہاں کیوں لایا اور باتوں کے لیے میں نے گھر کو کیوں نہیں پسند کیا؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں نے اس پر غور تو کیا ہے مگر جہاں ہرگز نہیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بہت سی باتوں کے لیے گھر کی چار دیواری موزوں نہیں ہوتی۔“

میزہ کا باپ ہنس دیا۔ ”بالکل میرے دل کی بات کہہ دی۔ واقعی میں جو بات کہنا چاہتا ہوں اس کے لیے یہ پاکستان کی خلوت بہترین جگہ ہے۔“

ہارون نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”آپ لوگ سنسنی خیز باتوں کے عادی ہیں یا پھر سیدھی سی بات یہ ہے کہ

میرے بہنوئی کا جادو کام کر گیا ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ میں میزہ سے قطع تعلق کروں اور آپ میزہ کو میرے بہنوئی کے حوالے کر دیں۔“

میزہ کے باپ نے کانوں پر ہاتھ رکھے اور گہرا کر کہنے لگا۔ ”بھڑا ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تو تجھ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ شادی کے کئی سال بعد بھی تو لاؤد کیوں ہے؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”یہ سوال تو خدا سے کیجیے۔ لاؤد دینا یاد دینا تو اس کے اختیار میں ہے۔“

میزہ کے باپ نے ایک دم غصہ کر کہا۔ ”میں خدا سے جو مانگتا ہوں، وہ اس سے ملتی رہتا ہے لیکن اب جو میں پوچھوں گا، اس کا تعلق تجھ سے اور میزہ سے ہوگا اور تجھ کو ان کے جوابات دینا پڑیں گے۔“

ہارون نے کہا۔ ”جو کچھ بھی پوچھتا ہے جلد از جلد پوچھیں، ورنہ شاید اس کا بھی موقع نہ آئے اور میں واپس چلا جاؤں۔“

میزہ کے باپ نے کہا۔ ”میزہ کب تک تیرے بیٹے عامر کی پرورش کرتی رہے گی؟ وہ اپنے بچے کی پرورش کب کرے گی؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”جب تک عامر بڑا نہیں ہو جاتا تیری بیٹی اس کی پرورش کرے گی۔ اس کی اصل ذات یہ خود ماں بن جائے گی تو اپنے بچے کی پرورش بھی کرے گی۔“

میزہ کے باپ نے ذرا زور دے کر پوچھا۔ ”وہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ وہ ماں کب بنے گی؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”جب خدا چاہے گا۔“

میزہ کے باپ نے کہا۔ ”اس میں خدا کو تو کیوں شامل کر رہا ہے؟ کیا یہ جھوٹ ہے کہ تو اپنے عامر کی خاطر میری بیٹی کو لاؤد سے محروم رکھے ہوئے ہے؟“

ہارون ذرا جھجکا کیونکہ اس کا چور پھڑا گیا تھا۔ نرمی سے بولا۔ ”یہ جھوٹ ہے۔ یہ بات کس نے بتائی آپ کو؟“

میزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”یہ جھوٹ نہیں ہے، اگر درمیان میں عامر نہ ہوتا تو آج میری بیٹی کی کوئی بچہ ضرور ہوتا۔“

ہارون نے غصہ ظاہر کیا۔ ”یہ ساری شرارتیں میرے بہنوئی کی طرف سے ہو رہی ہیں اور میں انہیں کسی قیمت پر بھی برداشت نہیں کر سکتا۔“

میزہ کے باپ نے بھی سختی سے کہا۔ ”ہارون! تو نے مجھ پر احسان کیے تھے۔ میں نے اس کا یہ صلہ دیا کہ اپنی

عشق نامہ

بیٹی کو میں اس وقت تیرے حوالے کر دیا جبکہ وہ کسی اور کے لیے ذہن بنی بیٹی تھی۔ اب تجھے یہ زیب نہیں دیتا کہ تو اپنے بیٹے عامر کی خاطر میری بیٹی کو لاؤد سے محروم رکھے۔ میں زیادہ سے بڑی نہیں اختیار کروں گا لیکن تجھے یہ یقین رکھنا چاہیے کہ میں سب کچھ جان چکا ہوں، ایک ایک بات۔“

ہارون نے پوچھا۔ ”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ ذرا کھل کر کہیے۔“

میزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”یہ کہ اب تو اپنی سازش میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ تجھ کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ تو میزہ کو چاہتا ہے یا نہیں؟ اگر تو میزہ کو واقعی چاہتا ہے تو، تو اس کو لاؤد سے، ورنہ دمشق واپس چلا جا اور عامر کو اپنے ساتھ لیتا جا۔“

ہارون نے کہا۔ ”یہ فیصلہ ہی شرط ہے، میں میزہ کو لینے آیا ہوں۔“

میزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”میزہ تیرے ساتھ جانے کی اور ضرور جائے گی لیکن اسی وقت جبکہ اس کی گردن میں اس کا اپنا بھی بچہ ہوگا۔ تو اس وقت تک محض ہی میں رہے گا جب تک کہ عامر کے علاوہ ایک اور بچہ کا باپ نہیں بن جاتا۔“

ہارون نے کہا۔ ”یہ تو بڑی بڑی شرط ہے۔ میں میزہ کو بڑا لے جاؤں گا۔“

میزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”اگر جبراً لے جاسکتے ہو تو ضرور لے جاؤ ورنہ نہ اپنی آسان بات بھی نہیں ہے۔“

ہارون نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”تو آپ اتنی سی بات کے لیے یہاں لائے تھے مجھے؟“

میزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”تیرے نزدیک یہ اتنی سی بات ہے تو ہوا کرے، میں تو اس کو بہت بڑی بات سمجھتا ہوں۔“

ہارون نے کہا۔ ”میزہ میری بیوی ہے، آپ اس کو اس کی مرضی کے خلاف نہیں روک سکتے۔ میں اس سلسلے میں پہلے میزہ سے بات کروں گا، اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔“

میزہ کے باپ نے کہا۔ ”تو میزہ سے بھی بات کر لے۔ میں نے کب منع کیا ہے۔“

وہ دونوں چپ چاپ اٹھے اور گھر کی طرف چل پڑے۔ دونوں میں سے کسی ایک نے بھی راستے میں کوئی بات نہ کی۔

میزہ کے باپ کو اس وقت بڑی شرمندگی ہوئی جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ میزہ اور ہارون کا بہنوئی دونوں کمرے

میں تنہا باتوں میں مشغول ہیں۔ عامر باہر کھڑا باپ کا انتظار کر رہا تھا۔ میزہ کے باپ نے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر ہارون نے اس کو پکڑ لیا اور سرکشی میں کہا۔ ”اس طرح نہیں پہلے ان دونوں کی باتیں سن لی جائیں گی کیونکہ میں اپنے شہادت کو یقین میں بدل دینا چاہتا ہوں۔ اگر ان دونوں میں کسی قسم کے عہد و پیمان ہو رہے ہیں تو مجھ کو کنارہ کشی اختیار کر لینا چاہیے۔“

میزہ کا باپ بہت شرمندہ تھا، بولا۔ ”لیکن رسول اللہؐ نے کسی کی جتنجو کرنے سے منع کیا ہے۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”لیکن میں کسی کی جتنجو کر رہی کب رہا ہوں، میں تو اپنی بیوی کی باتیں سننا چاہتا ہوں۔“

میزہ کے باپ نے کہا۔ ”ہارون! اگر تیرا شبہ یقین میں بدل گیا تو میں تیرا ساتھ دوں گا۔ کیونکہ میں ایک غیرت مند باپ ہوں اور میں یہ نہیں برداشت کر سکتا کہ میزہ ہم دونوں کو دھوکا دے۔“

ہارون نے اپنے سر کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”خاموش رہیے، ہماری سرکشی کی آواز کہیں اندر تک نہ پہنچ جائے۔“

وہ دونوں دروازے سے کان لگا کر کھڑے ہو گئے لیکن میزہ کے باپ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

اندر آکر ہارون نے ہاتھوں میں ہاتھ لگا کر میزہ کا بہنوئی کمرہ ہاتھ تھا۔ ”میزہ! بات بڑا نہیں چاہیے۔ میں ہارون کا بہنوئی رہ چکا ہوں اس لیے میں ہارون سے بھی محبت رکھتا ہوں۔ ہاں، اس سے ضرور اختلاف ہے کہ اس نے ایک سازش کے زیر اثر تجھ کو لاؤد سے محروم کر رکھا ہے۔“

میزہ نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ ”لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں، میں اس پر یقین نہ رکھتی ہوں لیکن میں ہارون کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی اور پھر عامر تو میرا اپنا ہی بیٹا ہے۔“

باہر میزہ کے باپ کا دھڑکنے والا دل کسی حد تک قابو میں آ گیا۔ وہ جو کچھ سن چکا تھا، اس سے وہ ایک بڑی شرمندگی سے بچ گیا تھا۔ لیکن دل میں کہیں یہ چور اب بھی موجود تھا کہ کہیں وہ دونوں ایسی باتیں نہ کر گئیں جو اس کے کان سننا نہیں چاہتے۔ میزہ کے باپ نے ہارون کو قاتماندہ انداز میں دیکھا، بولا۔ ”سن میں دونوں کی باتیں، ورنہ میں تو ڈری گیا تھا کہ کہیں آج میرے چہرے پر سیاہی نہ پڑ جائے۔“

ہارون نے کہا۔ ”ذرا توقف سے کام لیجیے۔ ابھی دستک نہ دیجیے گا۔“

لیکن اندرونیوں کو ان کی آہٹ مل چکی تھی۔ اندر سے

دروازہ کھل گیا اور دونوں ہارون اور میزہ کے باپ کو سامنے کھڑا دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

میزہ نے پوچھا۔ ”یہ آپ دونوں یہاں چوروں کی طرح کیوں کھڑے ہوئے ہیں؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”یہی سوال میں تجھ سے کر سکتا ہوں کہ میزہ یہ تم دونوں چوروں کی طرح اندر بند ہو کر کیسی باتیں کر رہے تھے؟“

دونوں کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ہارون کے بہنوئی نے کہا۔ ”ہم دونوں تجھے میں موجود ضرورتے لیکن باتیں تجھے کی نہیں ہو رہی تھیں۔“

میزہ البتہ شرمندہ تھی، باپ سے بولی۔ ”آپ دونوں اتنی جلدی واپس آ گئے؟“

ہارون نے طنزاً کہا۔ ”ہاں، حالانکہ تو سمجھ رہی ہوگی کہ ہم دونوں آدھا دن گزار کر واپس آئیں گے۔“

میزہ کھسکی ہوئی تھی، بولی۔ ”نہیں، میں ایسا نہیں سمجھ رہی تھی۔“

ہارون نے اپنے بہنوئی اور میزہ کے باپ سے کہا۔ ”آپ دونوں باہر چلے جائیں۔ میں میزہ سے فیصلہ کن باتیں اسی وقت کر لیتا چاہتا ہوں۔“

میزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”لیکن اس کا خیال رہے کہ میری بیٹی نے تیرے بہنوئی سے کوئی ایسی بات نہیں کی ہے جس کا تو قطعاً دے یا جواب طلب کرے۔ ہاں، وہ تجھے میں باتیں کرنے کی البتہ کناہ گار ہے۔“

میزہ کا باپ ہارون کے بہنوئی کو لے کر چلا گیا۔ راستے میں کہا۔ ”تو نے یہ ابھی بات نہیں کی۔ تو نے ہارون کو بلا وجہ شک و شبہ میں ڈال دیا۔“

اندر ہارون نے جب دروازہ بند کرنا چاہا تو میزہ نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ ”دروازہ بند نہ کرو۔ کیا کھلے کمرے میں باتیں نہیں ہو سکتیں؟“

ہارون نے میزہ کی خواہش پر کمرے کو بند نہیں کیا، بولا۔ ”تو مجھ سے خوفزدہ ہے؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”نہیں تو۔“

ہارون نے کہا۔ ”نہیں تو مجھ سے خوفزدہ ہے کیونکہ تو کمرے کو اندر سے بند کرنے میں خوف محسوس کر رہی ہے۔“

میزہ نے موضوع بدل دینا چاہا۔ ”ہارون! تجھے جو باتیں کرتا نہیں وہ کر، بے کار باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”میزہ! بات دراصل یہ ہے کہ اگر ہم دونوں تمہارے پاس آئیں اور کسی کو اپنے معاملات میں دخل

دینے کا موقع نہ دیں تو ہم دونوں زیادہ خوش رہیں گے۔ کم از کم میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔“

میزہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ لوگوں نے تو ازراہ ہمدردی بس یہ کیا ہے کہ میرے ساتھ جو زیادتی ہو رہی تھی، اس سے مطلع کر دیا اور اس سے میں نے نتیجہ اخذ کیا کہ خاندان کے لوگ بہت ضروری ہیں کیونکہ یہ لوگ غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کر کے تا دیران پر قائم نہیں رہتے۔“

ہارون نے کہا۔ ”اپنے اپنے تجربے ہیں۔ کوئی بات ایک کو نقصان پہنچاتی ہے تو دوسرے کے لیے سودمند ثابت ہوتی ہے۔“

میزہ نے کہا۔ ”اب کام کی بات کر تو نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“

ہارون نے پوچھا۔ ”کس مسئلے میں؟ کس بات کا فیصلہ؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”مجھے لوگ متعرض ہیں کہ شادی کے کئی سال بعد بھی میں اولاد سے محروم کیوں ہوں۔“

ہارون کو چاروں طرف سے ایک ہی بات سننا پڑ رہی تھی۔ وہ بوکھلا گیا۔ ”پھر تو نے اس کا کیا جواب دیا؟“

میزہ نے کہا۔ ”میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں، جواب تو تجھے دینا ہے۔“

ہارون نے کہا۔ ”لیکن جب تو نے عامر کو اپنا بیٹا مان لیا ہے تو پھر اس پر اتنا اصرار کیوں؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”اپنی اولاد کی بات ہی کچھ ہارون نے مجھے ہتھکے لیے میں کہا۔“

میزہ نے درغلانے میں نہیں آتا چاہیے ورنہ یہ طے ہے کہ وہ دونوں کے تعلقات میں خوشگواہی اسی وقت تک ہے جب تک کہ تو اپنے بچے کی ماں نہیں بن جاتی۔ تو اس بات کو سمجھ نہیں رہی ہے، لوگ وہ سب نہیں دیکھ سکتے جو میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔“

میزہ نے اٹل لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں بچہ چاہتی ہوں، اپنا بچہ۔۔۔۔۔ جو میری کوکھ سے پیدا ہوا ہو، جسے میں نے اپنے خون سے پالا ہو۔“

ہارون نے کہا۔ ”اگر میں انکار کر دوں تو؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”تب پھر میں عامر کو بھی اپنے پاس نہیں رکھوں گی۔“

ہارون ایک دم چونک پڑا۔ ”تو عامر کو اپنے پاس نہیں رکھے گی، کیوں؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”سچائی تلخ ہوتی ہے۔ میں اور

تقریباً سبھی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عامر کی وجہ سے اولاد سے محروم ہوں اور چونکہ یہ ایک حقیقت بھی ہے اس لیے میں اپنی بے اولادی کے سبب کو درد کر دوں گی۔“

ہارون نے حیرت سے رک رک کر کہا۔ ”لیکن ابھی کچھ دیر پہلے تو عامر کو اپنا بیٹا کہہ رہی تھی۔“

”ہاں، میں عامر کو اپنا بیٹا کہہ رہی تھی اور ہمیشہ اس کو اپنا بیٹا سمجھا بھی ہے لیکن میں اپنے حقیقی بیٹے کی خواہش میں عامر کی جدائی کو اکر لیں گی۔“

ہارون نے کہا۔ ”میزہ! تو جو فیصلہ بھی کرے یہ سوچ کے کر کہ اس کا خمیازہ جھگٹتا پڑے تو تو آسانی سے ٹھگت لے۔“

میزہ نے جواب دیا۔ ”ہارون! میں نے اس سے زیادہ سوچ رکھا ہے۔ میں اس وقت تک تجھ سے دور رہوں گی جب تک کہ میں تیرے بچے کی ماں نہ بن جاؤں۔ میں تجھ کو اپنے ساتھ رہنے کے لیے ایک ماہ دوں گی۔ اس کے بعد تو چلا جائے گا اور اس وقت تک تو میرے پاس نہیں آئے گا جب تک کہ میں ایک بچے کی ماں نہ بن جاؤں۔“

ہارون نے پوچھا۔ ”اگر میں تجھ کو مایوس کر کے چلا جاؤں تو؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”تو اس صورت میں، میں تیرا دو سال انتظار کر دوں گی کہ شاید تو اپنے فیصلہ بدل دے اور میری خواہش کے احترام میں عامر کو ایک سال یا دو سال عطا کر دے۔“

ہارون نے پوچھا۔ ”اور اگر میں دو سال بعد بھی اپنے فیصلے پر قائم رہا تو؟“

میزہ نے ایک سرد آہ بھری، بولی۔ ”تب پھر میں اپنی سوچ بدل دوں گی اور تجھ سے امیدیں ختم کر کے تیری جگہ کسی اور کو دینے کی کوشش کروں گی۔“

ہارون نے افسوس سے کہا۔ ”میزہ! افسوس کہ میں آج تک اس غلط فہمی یا خوش فہمی میں رہا کہ ہم دونوں میں ایک مثالی محبت پائی جاتی ہے۔ یعنی ہم دونوں کی روحیں محبت کے لطیف جذبوں سے سرشار ہیں لیکن اس وقت یہ سن کر بڑا دکھ پہنچا کہ تو میری جگہ کسی اور کو بھی دے سکتی ہے۔“

میزہ نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ ”افسوس کہ ابھی تک میں بھی اسی خوش فہمی میں تھی لیکن جب مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ تیری نظر میں عامر مجھ سے زیادہ اہم ہے تو میرا دل ٹوٹ گیا اور میں مایوسیوں کے گہرے سمندر میں بہنے لگی تھی اور مجھ کو مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑا جس کا ابھی ابھی میں نے ذکر کیا ہے۔“

ہارون اپنے مقدمے کو بہت مضبوط سمجھ رہا تھا مگر جب

دلائل اور براہین کی جنگ چھڑی تو وہ شکست کھا گیا۔ اس نے بے دلی سے پوچھا۔

”تو یہ تیرا ہی اور آخری فیصلہ ہے کہ اولاد سے محروم رہ کر تو مجھ سے علیحدگی اختیار کر لے گی؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”میں تجھ کو اپنے ساتھ ایک ماہ رکھ سکتی ہوں، اس کے بعد کوئی فیصلہ کر دوں گی۔“

ہارون نے کہا۔ ”لیکن میں بھی تجھے دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ میں تجھ کو کسی بچے کی ماں بنا کر عامر کی بد نصیبی کو آواز دینا پسند نہیں کرتا۔ میں یہاں ایک ماہ بھی کیوں رہوں جبکہ میں یہ قطعی فیصلہ کر چکا ہوں کہ جب تک عامر جوان نہ ہو جائے، میں کسی دوسرے بچے کا باپ نہیں بنوں گا۔“

میزہ نے دغور جذبات میں آنکھیں بند کر لیں، بولی۔ ”جب پھر تو اسی وقت چلا جا اور دو سال تک اپنی اس غلطی پر سوچتا رہ۔ اگر اس عرصے میں تو ندامت محسوس کرنے لگے اور میری گود بھی آباد کرنے پر آمادہ ہو جائے تو میں تیری واپسی پر خوش آمدید کہوں گی اور اگر دو سال بعد بھی تو خود کو بدل سکتے تو ازراہ مہربانی مجھ کو طلاق دے دینا تاکہ میں آزاد ہو جاؤں اور اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کروں۔“

ہارون نے دل میں سوچا کہ کیوں نہ وہ دو سال بعد والے فیصلے کا ابھی اسی وقت اعلان کر دے لیکن وہ میزہ کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ جب وہ یہ سوچا کہ اس کی میزہ کسی اور کی آغوش میں چلی جائے گی تو وہ ایک عجیب سا کرب محسوس کرنے لگا۔ دوسری طرف اس کا باپ اور بیکر

دونوں ہی خیالوں میں اس کو مچ کر رہے تھے اور ہاتھ کے اشاروں سے اس کو روک رہے تھے کہ خبردار جو تو نے میزہ کو اولاد دی کیونکہ جب بھی تو ایسا کرے گا عامر کی بد نصیبی کا آغاز ہو جائے گا۔

تیسری طرف دل کے اندر معلوم نہیں کون یہ مشورہ دے رہا تھا کہ دو سال تک صبر کر۔ ممکن ہے اس عرصے میں خود میزہ کو اپنی بے جا حسد پر افسوس ہو اور شرمندگی کا اظہار کر کے دوبارہ رجوع ہو جائے۔

میزہ اس کے چہرے پر نظریں گاڑے امید و بیم کی اذیت جھیل رہی تھی۔ وہ ہارون کو متاثر دیکھ کر پُر امید ہوئی تھی اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس کے کان ہارون سے جو کچھ سننا چاہتے تھے، دل وہ مفہوم پا چکا تھا۔

ہارون کی کچھ دیر کی خاموشی اس کے لیے ناقابل برداشت ہوئی۔ بے چینی سے بولی۔

”ہارون! مجھے پریشان نہ کر اور اپنے فیصلے سے فوراً

ہی آگاہ کر دے۔“

ہارون نے محبت بھری نظروں سے میزہ کو دیکھا اور مسکرایا گو کہ اس کی مسکراہٹ میں یاس اور ناکامی کا احساس بھی شامل تھا مگر اس احساس کو میزہ محسوس نہ کر سکی۔ ہارون نے پڑسکون اور باوقار لہجے میں کہا۔ ”میزہ! افسوس کہ میں تجھ کو بے حد چاہتا ہوں اور اس پر یقین رکھتا ہوں کہ اگر کسی وجہ سے تجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جانا پڑے تو میں زیادہ دن زندہ نہیں رہوں گا۔۔۔۔۔“

میزہ نے اس کی بات کاٹ دی، بے اختیار بولی۔ ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تو نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے اور اب میں اپنے بچے کی ماں بن جاؤں گی۔“ ہارون نے جواب دیا۔ ”نہیں، یہ بات نہیں۔ میں اپنے فیصلے پر اب بھی قائم ہوں۔ میں دوسال کے لیے تجھ سے جدا ہوا چاہتا ہوں۔ تو یہ دوسال اس امید میں گزرادے کہ شاید مجھ میں تبدیلی آجی ہو اور میں اس جبر کو یوں برداشت کر لوں گا کہ اگر تو مجھ سے واقعی محبت کرتی ہے تو یقیناً ممکن ہے کہ تو خود ہی اپنے فیصلے سے منحرف ہو جائے اور میرے پاس چلی آئے۔“

میزہ نے آنکھیں بند کر لیں اور بستر پر گر گئی، بولا۔ ”جب پھر تو یہاں سے اسی وقت چلا جاؤ دو سال بعد مجھ سے ملاقات کر لیکن میرے بارے میں مجھے اس یقین پر عمل کرنا کہ میں اولاد سے کم پر کوئی سمجھوتا کر لوں گی تو یہ تیری بھول ہوگی۔“

ہارون ایک دم کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”اچھا میزہ! اب میں یہاں نہیں ٹھہروں گا۔ میں عامر کو اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں۔ دوسال بعد تیرے فیصلے کے بارے میں معلوم کر لوں گا۔“ میزہ کو یہ یقین نہیں تھا کہ ہارون فوراً ہی رخصت سفر باندھ لے گا، بولی۔ ”لیکن اگر تو چاہے تو ابھی ایک ماہ تو رہ سکتا ہے۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”میں نے کہہ کر جو دیا کہ میں اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔ جب یہ فیصلہ بدلنا ہی نہیں تو پھر ایک ماہ بھی کیوں رہوں۔“ میزہ نے ہونٹ سمجھنے لیے، بولی۔ ”تیری مرضی، اب میں بھی اصرار نہیں کروں گی۔“

ہارون کمرے سے باہر نکلا تو اپنے بہنوئی اور میزہ کے باپ کے انداز سے سمجھ گیا کہ ان دونوں نے بھی اس کی باتیں سن لی ہیں کیونکہ دونوں میں سے کسی ایک نے بھی نہیں پوچھا کہ اندر کیا فیصلہ ہوا؟

اس نے عامر کا ہاتھ پکڑا اور بڑے دکھ سے کہا۔ ”آؤ بیٹے، دمشق چلیں اپنے دادا کے پاس۔“

عامر نے مصیبت سے پوچھا۔ ”اور میری مٹی ماں۔۔۔۔۔ کیا وہ نہیں چلیں گی؟“

ہارون نے اپنے غم کو سینے میں دبایا، بولا۔ ”ہاں بیٹے! میزہ نہیں آئے گی۔ وہ یقیناً رہے گی اور ممکن ہے کہ وہ اب ہمیشہ ہی ہمیں رہے اور ہماری پھر بھی اس سے ملاقات ہی نہ ہو۔“

میزہ کا باپ آگے بڑھا اور بولا۔ ”ہارون! میں تیرا انتظار کروں گا۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”بہر حال میں ابھی تک مایوس نہیں ہوا اور اس جدائی کو عارضی سمجھ رہا ہوں۔ میزہ تیری ہے اور ہمیشہ تیری ہی رہے گی۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”بہر حال یہ جو کچھ ہوا، اس میں ہاتھ تیرا ہی کارفرما ہے۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”اگر یہ شک تیرے دل میں بیٹھ گیا ہے کہ اس اختلاف اور انتشار میں میرا ہاتھ کام کر رہا ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔ تیری طرف سے میزہ اور تجھ کو ایک پیشکش ہے۔“

ہارون نے پوچھا۔ ”کون سی پیشکش ہے؟“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”تیرے گھر میں کوئی عورت نہیں ہے۔ اگر تو چاہے تو عامر کو میرے حوالے کر دے۔ میں اس کو بڑے پیار سے رکھوں گا۔ اس طرح تو میزہ کی خواہش بھی پوری کر سکتے گا۔“

ہارون نے پوچھا۔ ”پھر؟ یعنی اس سے مجھے کیا سہارا ملے گا؟“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”اس سے یہ سہارا ملے گا کہ تو عامر کی طرف سے بے نیاز ہو کر میزہ کو خوش رکھ سکے گا۔“

ہارون کے جی میں آئی کہ وہ اسی وقت عامر کو اپنے بہنوئی کے حوالے کر دے اور خود میزہ کے پاس چلا جائے اور اس کی یہ خوش خبری سنا دے کہ وہ میزہ کی ہر خواہش پوری کرنے کو تیار ہے لیکن پھر اچانک اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور عامر کو ساتھ لے کر چل دیا۔ اس وقت میزہ کمرے کے در پر کھڑی ہارون کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ میزہ کا باپ اور ہارون کا بہنوئی دونوں ہی اس کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میزہ بستر پر دوبارہ گر گئی اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

☆☆☆

عشق نا محامد

ہارون دمشق واپس گیا اور اپنے باپ کو پوری تفصیل بتادی۔ باپ ساری روداد تو جسے سن رہا، آخر میں پوچھا۔ ”پھر اب کیا ہوگا؟ میں تو یہ جانتا چاہتا ہوں۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”باوا جان! میں نے آپ کی ہدایت پر عمل کیا ہے، آپ ہی بتائے کہ میں کیا کروں؟“

باپ نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ”تو خراسان یا کسی اور محاذ پر چلا جائے گا عامر کی دیکھ بھال کون کرے گا؟“

ہارون نے کہا۔ ”میں خود بھی یہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں۔“

باپ نے کہا۔ ”تو نے میزہ سے کہہ دیا ہوتا کہ دو سال بعد بھی میں اپنے ارادوں پر قائم رہوں گا اس لیے جو فیصلہ کرنا ہے ابھی کر لے۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”باوا جان! میں نے یہ بات کہہ دی تھی مگر اس نے کہا کہ نہیں، میں اس فیصلے کو نہیں مانتی کیونکہ دو سال بعد یہ جذبات نہیں ہوں گے جو اس وقت ہیں اور جب یہ جذبات نہیں ہوں گے تو یہ فیصلہ بھی نہیں ہوگا۔ اس لیے اس وقتی ہنگامی اور جذباتی فیصلے کو میں نہیں مانتی۔“

باپ نے کہا۔ ”جب پھر تو میزہ کو طلاق دے دے اور دوسری شادی کر لے۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”نہیں دوسری شادی کیوں کر لوں؟ اس کا فائدہ؟“

باپ نے جواب دیا۔ ”اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ عامر کی پرورش اور نگہداشت اچھی طرح ہو جائے گی۔“

ہارون نے کہا۔ ”اور جب یہ دوسری بیوی بھی مجھ سے اولاد کی خواہش کرے گی تو اس وقت میں کیا کروں گا؟“

باپ پھر سوچ میں پڑ گیا، بولا۔ ”عامر کی فلاح اسی میں ہے کہ کسی اور لڑکی یا عورت سے تیری اولاد نہ ہو۔“

ہارون نے کہا۔ ”افسوس کہ میں خراسان واپس جاؤں گا، عامر اس کے پاس رہے گا؟ اس کو کس کے پاس چھوڑ جاؤں؟“

باپ کا دماغ بھی کام نہیں کر رہا تھا۔

ہارون کی عدم موجودگی میں اس کے بہنوئی نے بڑی کوشش کی کہ میزہ کو طلاق پر آمادہ کر لے لیکن وہ اس موضوع پر بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے باپ سے کہہ دیا کہ اگر یہ شخص اسی طرح باتیں کرتا رہا تو وہ دمشق میں اپنے شوہر ہارون کے پاس چلی جائے گی۔

ہارون نے خراسان جاتے ہوئے عامر کو اپنے ساتھ لیا کیونکہ وہ عامر کے سلسلے میں باپ کو پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ عامر کو لے کر خراسان کے چتے چتے میں ٹھوسا پھرنا

رہا۔ ہارون بمشکل ڈیڑھ سال باہر گزرا۔ اس کے بعد وہ سیدھا محض پہنچا اور میزہ کے سامنے وہ مال و زر و حیر کر دیا جو اس نے مختلف جنگوں میں انعام و کرام اور مال غنیمت سے حاصل کیا تھا۔ میزہ اس کا انتظار تو کر رہی تھی لیکن اتنی۔۔۔۔۔ بے چینی سے نہیں کیونکہ اس کے اپنے حساب کے مطابق ہارون کو ٹھیک دو سال بعد واپس آنا تھا۔ جب میزہ کے سامنے مال و زر کا ڈھیر لگ گیا تو اس کے باپ کی رال ٹپک پڑی اور اس نے بٹنی کو کھم دیا۔

”ہارون تھکا ہوا ہوگا اس کے لیے غسل اور آرام کا انتظام کر دے۔“

عامر بھی ان دونوں کے سامنے ہی تھا مگر اس پر دونوں میں سے کسی ایک نے بھی توجہ نہیں دی۔ ہارون نے عامر کو حکم دیا۔ ”عامر تو نے اپنی ماں کو سلام نہیں کیا۔“

عامر نے سمجھتے ہوئے نہایت تکلف سے میزہ کو سلام کیا۔ میزہ نے بھی کسی قدر تکلف سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سلام کا جواب دے کر پوچھا۔ ”تو ٹھیک ٹھاک تو ہے؟“

عامر نے گردن ہلا کر جواب دیا۔ ”بالکل ٹھیک ہوں ماں۔“ ہارون نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔

”میزہ، میرا بہنوئی کہاں چلا گیا؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”اس نے دوسری شادی کر لی۔“

ہارون نے اطمینان کی سانس لی، بولا۔ ”میزہ! تو نے بہت بڑی خوش خبری سنا لی ورنہ میں اس کی طرف سے بہت فکر مند رہتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم دونوں میں جو ناچاقیاں ہوئیں ان میں میرے بہنوئی کا بڑا ہاتھ تھا۔“

میزہ نے جواب دیا۔ ”لیکن میں ایسا نہیں سمجھتی۔“

ہارون نے پوچھا۔ ”وہ آج کل کہاں رہ رہا ہے؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”یہیں، اسی گھر میں میرے پاس ہی۔“

ہارون نے کہا۔ ”خوب۔۔۔۔۔ تو اس نے ابھی چچھا نہیں چھوڑا؟“

میزہ نے پوچھا۔ ”تو دمشق کیا تھا؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں ابھی دمشق نہیں گیا۔ سیدھا تیرے پاس آیا ہوں۔ اب یہاں سے تجھ کو لے کر دمشق جاؤں گا۔“

میزہ نے کہا۔ ”ہم دونوں میں دوسال کی مدت طے ہوئی تھی۔ تو نے کیا فیصلہ کیا؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھ کو

دشمن لے کر چلا جاؤں گا۔“

مینزہ نے کہا۔ ”لیکن میں اس وقت تک تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی جب تک میں اس پر یقین نہ کر لوں کہ اب میں بے اولاد نہیں رہوں گی۔“

ہارون نے عامر کی طرف دیکھ کر خفیف سا اشارہ کیا، بولا۔ ”مینزہ! کچھ لحاظ کر، اس موضوع پر پھر بات ہو جائے گی۔ اب ہم دونوں کے درمیان سے میرا بہنوئی نکل گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تجھے کلاب ضرور نہیں کرنی چاہیے۔“

مینزہ نے جواب دیا۔ ”یہ تو بار بار بہنوئی کا ذکرچ میں کیوں لے آتا ہے؟ میں اس کو نہیں جانتی میرا مطالبہ اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔“

مینزہ کا باپ جو ذرا سی دیر کے لیے ٹک گیا تھا، دوبارہ آگیا۔ ہارون نے اپنے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کو نہیں اندر رکھ دیجیے۔“

مینزہ کا باپ سامان اٹھانے لگا۔ ہارون کے آنے کی خبر سن کر پاس پڑوس کے لوگ بھی آگئے۔ ان میں اس کا بہنوئی بھی تھا۔ ہارون کو دیکھتے ہی فریاد جوش میں لپٹ گیا اور پوچھا۔ ”ہارون تو..... کب آیا.....؟“ اس کے بعد عامر کی طرف مڑ گیا۔ ”اور عامر تو کیا ہے؟“

عامر نے بھی کچھ کچھ بولنا شروع کیا۔ ”اچھا ہوا۔“ مینزہ اٹھ کر جانے لگی، ہارون نے پوچھا۔ ”کہاں؟“ مینزہ نے جواب دیا۔ ”میں ابھی آئی ہوں۔ تم لوگ باتیں کرو۔“

ہارون نے اپنے بہنوئی سے باتیں کرنے لگا، کہا۔ ”تم نے شادی کر لی؟“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں پوری زندگی تنہا تو نہیں گزار سکتا تھا اور مجھے اس شادی کی اطلاع دینا چاہتا تو کہاں دیتا؟“

ہارون نے کہا۔ ”یہ اچھا کیا۔“

بہنوئی ہنس دیا، کہا۔ ”ہاں، اچھا ہی کیا کیونکہ جب تک میں شادی نہ کرتا تو پریشان ہی رہتا۔ تلوار کی طرح تیرے سر پر لٹکا رہتا۔“

ہارون نے ٹھکرا کر جواب دیا۔ ”ایسی بات نہیں تھی بھائی لیکن میں کچھ شک و شبہ میں ضرور مبتلا ہو گیا تھا۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”بقیہ باتیں تو ہوتی رہیں گی لیکن اس وقت میں چند ایسی باتیں کرنا چاہتا ہوں جو مینزہ کی موجودگی میں شاید نہ کر سکوں۔“

ہارون نے کہا۔ ”ہاں ہاں، بھائی ضرور کرو۔ میں تیار ہوں۔“

بہنوئی نے پوچھا۔ ”میرا خیال ہے کہ تو مینزہ کی دلی ہوئی مدت سے پہلے ہی آگیا ہے؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”بھائی، میں مینزہ کو نہیں چھوڑ سکتا اور عامر سے نا انصافی بھی نہیں برداشت کر سکتا اس لیے تم ہی کوئی مشورہ دو کہ میں کیا کروں؟“

بہنوئی نے کہا۔ ”تو مینزہ کی خواہش پوری کرو۔ کیونکہ میں نے اس دوران ہر طرح ٹھول کر یہ اندازہ لگایا ہے کہ وہ جو چاہتی ہے، اس سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔“

ہارون نے پیشانی کو انگلیوں سے سہلایا، پوچھا۔ ”بھائی، اگر میں مینزہ کی خواہش پوری کر دوں تو کیا وہ اپنے بچے کی موجودگی میں عامر کو نظر انداز نہیں کر دے گی؟“

بہنوئی نے ذہن پر ذرا سا زور دے کر جواب دیا۔ ”اگر یہ خطرہ نہ ہوتا تو میں تجھے میں یہ مشورہ بھی نہ دیتا کہ تو مینزہ سے کوئی بچہ نہ ہونے دے لیکن اب صورت حال بدل چکی ہے اور مینزہ بچے کی خواہش میں دیوانی ہو رہی ہے۔“

اب اسے زیادہ دنوں تک نہیں بھلایا جاسکتا۔ اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ تو اس کی خواہش پوری کر دے۔ یہ گیا عامر تو اس کو میرے پاس چھوڑ دے۔ میں اس کو خوش رکھوں گا اور کوئی کمی نہیں محسوس ہونے دوں گا۔“

ہارون نے اپنے بہنوئی کی کئی بیوی کو بھی دیکھا جو بظاہر ایک سیدھی سادی عورت نظر آتی تھی۔

تین دن تک ہارون نے مینزہ سے مزید کوئی بات نہیں کی۔ اس کے اعزاز میں دعوتیں ہوتی رہیں اور ہارون انہیں اڑاتا رہا۔ بہنوئی نے عامر کی دل جوئی شروع کر دی اور اس کو اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ عامر بھی اپنے پھوپھا میں خلوص اور محبت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مینزہ کو اپنی طرف سے کھینچنا محسوس کیا تو پھر مینزہ کے پاس جانے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی۔

مینزہ نے چوتھے دن ہارون کو ایک بار پھر گھیر لیا اور پوچھا۔ ”ہارون! میں مستقل بے چینی محسوس کر رہی ہوں۔ تو نے ابھی تک مجھے نہیں بتایا کہ تو نے کیا فیصلہ کیا؟“

ہارون بہت خوش تھا۔ مگر اتنا ہوا مینزہ کے سامنے کھڑا ہو گیا، بولا۔ ”میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تجھے کو اپنے ساتھ لے کر دمشق چلا جاؤں گا اور خراسان واپس جانے کے منصوبہ کو ذہن سے نکال دوں گا۔“

مینزہ نے جواب دیا۔ ”لیکن میں دمشق اس وقت

نہیں جاؤں گی جب تک میں اولاد والی نہ ہو جاؤں۔“ ہارون نے کہا۔ ”اگر میں تیری خواہش پوری کر دوں تو تو یہ بتا کہ عامر کا کیا ہے گا، وہ کہاں رہے گا؟“

مینزہ نے جواب دیا۔ ”ہارون! یہ خدشہ تو اپنے ذہن سے نکال دے کہ میں اپنے بچے کی موجودگی میں عامر سے زیادتی کروں گی۔ میں نے عامر کو ہمیشہ اپنا ہی بیٹا سمجھا ہے اور ہمیشہ ہی سمجھتی رہوں گی۔ تجھ کو اس کی طرف سے فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔“

ہارون نے خوشی کا اظہار کیا، بولا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میرا فیصلہ بھی سن لے۔ جب میں یہاں آیا ہوں، اس وقت تک میں اس بچے پر پہنچ چکا ہوں کہ میں نے تیرے ساتھ واقعی بڑی زیادتی کی ہے اور اب اس کی تلافی چاہتا ہوں۔ عامر تیرے ہی پاس رہے گا اور یاد رکھ کہ اگر اس کو کوئی شکایت ہوئی تو میں بھی بے مروتی اختیار کر لوں گا۔“

یہ خبر مینزہ کے باپ کو بھی مل گئی، اس نے خوشی کا بے پایاں اظہار کیا۔

اب ہارون کی اس گھر میں جو قدر و منزلت تھی، اس سے پہلے اس کو کبھی نہ ہوئی تھی۔ مینزہ کے تقیے اور خوشیاں پھر عود کر آئی تھیں۔ مینزہ کا باپ ہارون کی ناز برداریوں میں لگا رہتا۔ ہارون کا بہنوئی بھی بہت حد خوش تھا۔ ہاں اگر ان سب میں کوئی رنجیدہ تھا تو وہ عامر تھا۔ وہ معلوم نہیں کس سوچ میں پڑ گیا تھا۔ مینزہ ہارون کو دکھانے کے لیے اگر کسی وقت عامر کی طرف پیار و محبت سے متوجہ بھی ہوتی تو اس میں وہ شدت اور گرمی نہ ہوتی جو پہلے بھی ہوا کرتی تھی۔ عامر اس کی کو محسوس کر رہا تھا لیکن خود ہارون اس سے غیبر تھا۔ ہارون کا بہنوئی بھی عامر کے خلا کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ بھی کبھی دے لفظوں میں عامر کو سمجھانے لگتا۔ ”بیٹے! عامر! تیرا باپ تجھ سے چھین گیا لیکن تو ذرا بھی فکر نہ کر میں جو موجود ہوں۔“

عامر کہا۔ ”لیکن پھوپھا جان، میری ہی ماں مینزہ پہلے تو ایسی تھی تھی۔ یہ اب اس کو کیا ہو گیا ہے؟“

پھوپھا جواب دیتا۔ ”ہاں، پہلے وہ بھی بے پیار کرتی تھی مگر اب وہ اپنی محبت کا ذخیرہ اپنے بچے کے لیے محفوظ کر رہی ہے۔ اپنے بچے کے لیے جو ہونے عدم میں ہے مگر آنے کے لیے باز و ہلار رہا ہے۔“

پھوپھا کی سمجھ میں عامر کی باتیں تو آ رہی تھیں مگر پھوپھا کی باتیں عامر کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی تھیں۔

☆☆☆

کئی ماہ محسوس میں رہنے کے بعد ہارون اور مینزہ نے

عشق کا تمام

دشمن جانے کا منصوبہ بنایا۔ اب مینزہ کے باپ کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ ہارون کو اب ایک ہی فکر تھی وہ یہ کہ اس کا باپ مینزہ کو دوبارہ دیکھ کر خوش نہیں ہوگا۔ اس نے کئی راتیں اس گھر اور توشیوں میں گزار دیں کہ وہ اس سلسلے میں اپنے باپ کو جواب کیا دے گا؟

جب جانے کی تیاریاں مکمل ہو گئیں تو مینزہ نے ہارون کو مشورہ دیا۔ ”ہارون! میں کئی دن سے تجھ کو ملوں اور فکر مند محسوس کر رہی ہوں۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”مینزہ! اب میں تجھ سے کوئی بات بھی نہیں چھپاؤں گا۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میرا باپ جب تجھ کو امید سے دیکھے گا تو مجھ پر بہت برہم ہوگا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ میں اس کے جواز میں کیا ہوں گا۔“

مینزہ کا منہ لٹک گیا، بولی۔ ”تیرے باپ کو یہ سوال کرنا ہی نہیں چاہیے۔“

ہارون نے کہا۔ ”میرے باپ کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے، یہ ان کو کون سمجھا سکتا ہے۔ سہر دست تو یہی سوچتا ہے کہ میرا باپ تجھ کو اس حال میں دیکھ کر خوش نہیں ہوگا۔“

مینزہ نے ہارون سے کہا۔ ”مجھ کو اس حال میں دیکھ کر اگر وہ خوش نہیں ہوتا تو نہ ہو۔ مجھ کو اس کی پروا بھی نہیں تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں دمشق میں زیادہ دن نہیں رہ سکوں گی۔“ ہارون نے تسلی دی۔ ”بہر حال میں کسی نہ کسی طرح اس کو سمجھا لوں گا اور ایک ڈر یہ بھی ہے کہ میرا باپ نہیں عامر کو اپنے پاس ہی نہ روک لے کیونکہ اس کو فوراً ہی یہ شبہ گزرے گا کہ اب عامر پر پوری تو چٹ نہیں دی جا رہی ہوگی۔ میں اپنے باپ کے دل سے یہ شبہ کس طرح نکالوں گا اور پھر یہ امکان بھی موجود ہے کہ میرا باپ عامر کو اپنے پاس ہی روک لے اور اس کو تیرے خلاف کرنا شروع کر دے۔ انہی فکروں نے مجھے ہلکان اور پریشان کر رکھا ہے۔“

مینزہ نے چٹکی بجائی۔ ”اس کا حل ہے میرے پاس۔ اس کا حل یہ ہے کہ دمشق میں زیادہ قیام ہی نہ کیا جائے اور عامر کو محسوس میں رکھا جائے۔ تیرا بہنوئی اس پر خصوصی توجہ دے رہا ہے۔“

ہارون نے اپنے ذہن پر ذرا سا زور دیا تو مینزہ کی یہ تجویز بہت اچھی لگی، بولا۔ ”لیکن اس میں ایک خرابی بھی ہے۔“

”کون سی خرابی؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”اس میں خرابی یہ ہے کہ اگر

چاہیے۔ مجھے اپنے معاملات کا خود ہی فیصلہ کرنا چاہیے۔“
باپ نے ہلکلا کر پوچھا۔ ”یعنی..... یعنی کیا مطلب؟“

ہارون نے میزہ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ دونوں ہی کے چہروں پر مسکراہٹ موجود تھی مگر باپ سے کہا۔ ”مطلب یہ کہ میں میزہ کو ناخوش نہیں کر سکتا۔ وہ جن کی عمریں ختم ہو چکیں اور عدم کی سرحد پر کھڑے ہیں ان لوگوں کو صبح مشورہ کس طرح دیں گے جو بظاہر عدم کی سرحدوں سے دور ہیں۔ میں میزہ کو اولاد سے محروم نہیں کر سکتا۔“
باپ نے ہارون کی باتیں بڑے عمل سے سنیں اور کسی قدر بے پروائی سے جواب دیا۔ ”اپنے غلط فیصلوں کے نتائج بھی تو خود ہی بھگتے گا۔ میں جانتا تھا کہ تو ایک نہ ایک دن بڑوں کے فیصلوں سے منحرف ہو جائے گا۔“
ہارون نے کہا۔ ”میں بڑوں کے فیصلے سے منحرف نہیں ہوا بلکہ فیصلوں کی غلطی سے بچنے کی کوشش کی ہے۔“
باپ نے ان دونوں میں دوچہنی ہی نہیں لی، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

اب ہارون اور میزہ کا بیشتر وقت ساتھ ساتھ گزر رہا تھا۔ ان کی محنتیں ایک دم جوان ہو گئی تھیں۔ احتیاط اور ہدایات کی کتابیں محل کی گلیں اور زمین کی بارگاہت اور آزادی کے نشے اور لذت کا صحیح علم ہوا تھا۔ وہ دونوں کچھ دن دمشق میں رہے پھر حمص چلے گئے۔ حمص میں بھی یہ دونوں آزادی سے ادھر ادھر گھومتے پھرتے رہے۔ ہارون کے بہنوئی نے عامر کی ذمہ داریاں بڑی محنت اور محبت سے نبھائیں۔ ہارون جب عامر کو اپنے بہنوئی کے پاس خوش و خرم دیکھتا تو اس کی طمانیت اور سکون میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا۔ دمشق میں ہارون کا باپ تنہا رہتا تھا۔ وہ اکثر ان حسین اور چہل پہل سے بھر پور دنوں کو یاد کرتا رہتا تھا جب اس گھر میں ہارون کی پہلی بیوی، عامر، ہارون کی بہن اور دوسرے لوگ سرگرم عمل رہتے تھے، انہی میں میزہ بھی یاد آ جاتی لیکن میزہ کی یاد سے وہ ملول ہو جاتا۔ ہارون نے اپنے باپ کو تقریباً نظر انداز کر دیا تھا۔ میزہ یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتی تھی کہ آخر کار اس نے اس بوڑھے سے بدلہ لے لیا۔

ایک سال بعد میزہ بھی ایک بچے کی ماں بن گئی۔ ہارون لڑکے کا نام عامر کے وزن پر قاہر رکھنا چاہتا تھا لیکن میزہ نے اس نام کو ناپسند کیا اور اس کا نام ابراہیم رکھ دیا۔ یہ بات عامر کو بھی معلوم ہوئی تو اس کو دکھ پہنچا۔ اس کی کچھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ میزہ اس سے نفرت کیوں کرنے لگی۔

ابراہیم کی ولادت کی خبر جب ہارون کے باپ کو پہنچی تو وہ رونے لگا اور ہارون کو خط لکھا کہ عامر کو اس کے پاس بھیج دیا جائے تاکہ اس کی تنہائی دور ہو جائے لیکن عامر کو اس کے پھوپھو نے بھیجے سے انکار کر دیا۔

ہارون کو ایک بار پھر حمص چھوڑنا پڑا لیکن اب اسے موصل کے آس پاس خارجیوں سے جنگ کرنا تھی۔ وہ غیر معینہ مدت کے لیے جزیرہ اور اس کے مضافات میں بھیج دیا گیا۔ ہارون کے بہنوئی نے عارضی طور پر سپاہ گری چھوڑ دی اور حمص کے حاکم کی ملازمت اختیار کر لی۔ وہ عامر پر بڑی توجہ دے رہا تھا۔ یہ عامر کی خوش قسمتی تھی یا بد قسمتی کہ اس کا پھوپھا اولاد سے محروم تھا چنانچہ دونوں میاں بیوی نے عامر کو اپنی اولاد کی طرح رکھا اور میزہ کی عدم توجہی کو گھون نہیں ہونے دیا مگر دونوں کی طرح عامر کے دل میں جھانک سکتے اور انہیں کوئی ایسا وسیلہ حاصل ہوتا جس سے دلوں کے احساسات معلوم کیے جاسکتے تو وہ عامر کے دل میں نفرت کا ایک ایسا شعلہ موجزن دیکھتے جو بڑھ کر بڑی سے بڑی شے کو جلا سکتا تھا۔

ہارون اپنی بیوی کو خطوں میں یہی لکھتا رہتا تھا کہ اب ابراہیم کی موجودگی میں میزہ پر یہ فرض عائد ہو گیا ہے کہ عامر کا بھی انسانی اختیار رکھنے والا ہونا چاہیے۔ وہ ابراہیم کے لیے جو کچھ بھیجتا، وہی عامر کے لیے بھیجتا لیکن میزہ اسے بھی رکھ لیتی اور عامر کو اس کی ہوائ تک نہ دیتی۔ وہ عامر کے ذکر پر یہی سوچنے لگتی کہ یہی وہ ذات ہے جس کی وجہ سے کئی سال تک اس کو اپنی اولاد سے محروم رکھا گیا۔ اس کا یہ انداز فکر اس کے دل میں عامر کے خلاف نفرتیں بڑھاتا جا رہا تھا اور جب اس نے یہ دیکھا کہ ہارون، ابراہیم کا تنہا ذکر بھی نہیں کرتا، اس کے ساتھ عامر کا ذکر ضرور کر دیتا ہے اس طرح سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ عامر کو اب حمص میں نہیں رہنا چاہیے کیونکہ عامر جب تک حمص میں رہے گا، ہارون اس کے بیٹے ابراہیم پر خاص توجہ نہیں دے سکے گا۔ لیکن اب مشکل یہ تھی کہ عامر اس کے ساتھ نہیں رہتا تھا۔ ہارون کے بہنوئی کے پاس رہ رہا تھا اور ہارون کے بہنوئی کو ترک سکونت پر مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔

دوسری طرف ہارون کا بہنوئی میزہ کے حسد کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔ میزہ، عامر سے جتنا زیادہ حسد کرتی، ہارون کا بہنوئی اسی قدر خوش ہوتا اور عامر پر نوازشوں اور عنایتوں کی بارش کر دیتا۔ وہ میزہ کو جلا کر ایک قسم کی لذت حاصل کر رہا تھا۔

عشق نام تمام

ایک دن جب وہ حمص کے حاکم کے پاس سے اٹھا تو گھر میں داخلے سے پہلے اس کی ایک اجنبی سے ملاقات ہو گئی۔ یہ شخص سامان کی پوٹلی سنبھالے میزہ کے باپ کا پتا پوچھ رہا تھا۔ میزہ کا باپ اس وقت گھر میں نہیں تھا۔ اس نے اس شخص کو عزت و احترام سے اپنے گھر میں بٹھایا اور اپنا تعارف کروایا۔

”میں ہارون کا بہنوئی ہوں۔ اگر ہارون کا کوئی پیغام تیرے پاس ہے تو مجھے دے دے۔“
اس شخص نے تپا کے ہاتھ ملایا اور پوٹلی اس کے حوالے کر دی۔ ”یہ ہارون نے بھجوائی ہے، اس میں ایک خط بھی ہے اور کچھ رقم بھی۔ اس کے علاوہ کچھ دے بھی ہیں۔“
اس نے پوٹلی لے لی اور ہارون کا خط پڑھنے لگا۔ اس میں میزہ کو لکھا گیا تھا۔

”صبح کی خلق کی طرح گھٹنا اور مشرقی افق پر سے طلوع ہونے والی تھوڑی سی طرح حسین میزہ! میں عنقریب واپس آ رہا ہوں لیکن ساتھ ہی یہ دھڑکا بھی لگا ہوا ہے کہ کہیں کوئی خارجی میرا کام تمام نہ کر دے کیونکہ دودن پہلے میں ایک خارجی کی زد میں آ گیا تھا۔ ہم تین ہزار سپاہی خارجیوں کی تلاش میں ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے تھے کہ

رات کو خارجیوں نے ہم پر شب خون بار دیا۔ ان کے اچانک اور خوف ناک حملے سے ہمیں اتنا بدحواس کر دیا تھا کہ ہم میں ان کا مقابلہ کرنے کی بہت ہی نہیں رہی۔ خارجی ہمیں بے دردی سے قتل کرتے رہے۔ ہمارے بیٹوں کی طنائیں کاٹ کر انہیں آگ لگا دی اور ہمارے گھوڑوں پر قبضہ کر لیا۔ میں نے ذرا سی دیر میں اپنے چاروں طرف خون کے فوارے چھوٹے دیکھے۔ ذبیحوں کی قحط و پکار نے قیامت مفری برپا کر رکھی تھی۔ جس نے بھی ہتھیار سنبھالا، خارجیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس پگھلے دارو گیر میں معلوم نہیں کس طرح میں نے یہ تدبیر کی کہ قتل ہونے والوں میں مردوں کی طرح لٹ گیا۔ خارجیوں نے مجھے بھی مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔

عجالت اور جوش میں میرے پاس سے گزرتے رہے لیکن مجھ پر شبہ نہیں کیا۔ ایک خارجی نے اپنا پاؤں میرے منہ پر رکھ دیا اور پکھلتا ہوا نکل گیا۔ میں دم سادھے اذیت کی پروا کیے بغیر مردے کی طرح ہزار ہا۔ میں نے اپنے آس پاس ملنے ہوئے زبیحوں کی پٹیں محسوس کیں مگر اس وقت تک اپنی جگہ سے حرکت تک نہ کی جب تک کہ مجھے یہ یقین نہیں ہو گیا کہ سارے خارجی چائے پینے اور اب وہ واپس نہیں آئیں گے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور بچتا بچتا چھپتا چھپتا موصل

پہنچا اور خارجیوں کے خوف ناک شب خون کی حکومت کو اطلاع دی۔

”میزہ! مجھے حیرت ہے کہ میں زندہ کس طرح بچ گیا۔ شاید تیری، عامر اور ابراہیم کی وجہ سے کیونکہ ان تینوں کو میری ضرورت ہے۔ حکومت نے مجھے انعام و اکرام سے نواز دیا ہے کیونکہ میں نے حکومت کو یہی تاثر دیا ہے کہ میں نے خارجیوں کا تنہا زبردست مقابلہ کیا اور ان کے خطر ناک محاصرے سے بزرگ و قوت بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

”میزہ! تو دعا کرتی رہ کہ میں خارجیوں سے محفوظ رہوں ورنہ یہ وہ جبری لوگ ہیں جن کے چند افراد یکلوں بلکہ ہزاروں کو شکست دے دیتے ہیں۔ بڑے بڑے تجربہ کاروں کا یہ قول ہے کہ ان جیسے بہادر روئے زمین پر نہیں ہیں، نہ پہلے بھی تھے۔

”مجھے تیری، ابراہیم اور عامر کی یاد آتی رہتی ہے۔ میں چند رشتہ کی کلک سے بھیج رہا ہوں ان میں دو خیلے پارچے عامر کے لیے ہیں کیونکہ عامر کو یہ رنگ بہت پسند ہے۔ بقیہ تو اپنے اور ابراہیم کے لیے رکھ لے۔ میں نے اس سے پہلے جو سیکر روانہ کی تھیں، وہ پسند آئیں یا نہیں؟ عامر کو اپنی سیکر کیسی لگی؟

”میزہ! میں تو خود اور سارا گھرانہ ہارون کے گھر کا خاص خیال رکھ۔ ابراہیم کی سفارش اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ وہ میرا بیٹا ہے اور اس کے لیے کچھ لکھوں یا نہ لکھوں تو اس کا خیال بہر حال رکھے گی مگر عامر کے لیے اس لیے لکھ رہا ہوں کہ وہ چند سالوں سے ہماری توجہ سے محروم ہے۔ میرے بہنوئی نے اس کی ذمہ داریاں قبول کر کے ہم دونوں کو کسی حد تک بے نیاز کر دیا ہے مگر میں اس بے نیازی کو ناپسند کرتا ہوں۔ میں نے تیری خواہش پوری کر دی اور ابراہیم سے تیری گود بھردی۔ اب تو بھی میری خواہش پوری کر اور عامر پر وہی نوازشیں برسا دے جو بھی دمشق میں برسا یا کرتی تھی۔

”میرے خوابوں اور خیالوں کی پر اسرار ساحرہ! کیا تو جانتی ہے کہ دمشق میں میرا باپ بیماری میں لپک رہا ہے؟ افسوس کہ اس وقت میں اس کے پاس نہیں لیکن حمص آتے ہی میں تجھے لے کر دمشق چلا جاؤں گا۔ اگر تو اپنے باپ کے ذریعے میرے پیار باپ کی خبر گیری کر سکے تو ضرور کر۔ میں تیرا عمر بھرا احسان مند رہوں گا۔“

ہارون کے بہنوئی نے اس شخص کو رخصت کر دیا پھر خط اور سامان کی پوٹلی میزہ کو پہنچا دی۔ اس نے میزہ پر یہ نہیں

ظاہر ہونے دیا کہ اس نے ہارون کا خط پڑھ لیا ہے۔ نیزہ خط کو لے کر کمرے میں چلی گئی اور کچھ دیر بعد جب باہر نکلی تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا، بہنوئی نے پوچھا۔

”کیا کوئی خاص بات ہوئی؟“

نیزہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، ہارون بہت جلد آنے والا ہے۔ وہ خارجیوں کے ہاتھوں قتل ہوتے ہوئے بچ گیا ہے۔“

اس نے پوچھا۔ ”اور کچھ؟“

نیزہ نے جواب دیا۔ ”اور یہ کہ ہارون کا باپ دمشق میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے تو عمار کو ساتھ لے کر فوراً دمشق چلا گیا کیونکہ یہ میری نہیں ہارون کی خواہش ہے۔“

وہ نیزہ کے جھوٹ پر حیران رہ گیا۔ پوچھا۔ ”اور کچھ؟“

نیزہ نے ہل کر جواب دیا۔ ”اور کچھ نہیں، کیا یہ کافی نہیں ہے؟“

وہ بڑی دیر تک نیزہ کے پاس ہی بیٹھا رہا کہ شاید ریشمی پارچے عمار کے حوالے کر دیے جائیں لیکن نیزہ نے ان کا ذکر تک نہیں کیا۔ عمار بھی یہ خبر سن کر وہیں آکر بیٹھ گیا تھا کہ اس کے باپ کا خط آیا ہوا ہے لیکن نیزہ نے اس کی موجودگی کو بالکل نظر انداز کر دیا اور کن کنکھوں تک سے دیکھتا ٹوڑا نہ دیا۔ اس نے عمار کو جانے کے لیے براہ راست گود میں اٹھالیا اور اس کو بچھتی بچھتی کر پیار کرتے ہوئے بولی۔ ”ابراہیم! تیرے باپ نے تجھ کو پیار لکھا ہے اور ہدایت کی ہے کہ میں تجھ کو خوب بچھتی بچھتی کر تیرے باپ کی طرف سے پیار کروں۔“

بہنوئی نے عمار کی طرف دیکھا جو کھوپا کھویا، گم گم یہ منظر دیکھ کر دل ہی دل میں رو رہا تھا۔ بہنوئی نے پوچھا۔

”کیا ہارون نے عمار کے لیے کچھ بھی نہیں لکھا؟“

نیزہ نے چونک کر باری باری دونوں کی طرف دیکھا اور عمار کے پھوپھا کو جواب دیا۔ ”نہیں، عمار کے لیے کچھ بھی نہیں لکھا اور پھر ابراہیم سے عمار کا کیا مقابلہ۔ عمار بلوغت کی طرف بڑھ رہا ہے اور ابراہیم ابھی مال کا دودھ پی رہا ہے۔ چنانچہ میرا شیر خوار جس محبت اور توجہ کا مستحق ہے، عمار تو اس توجہ اور محبت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”نیزہ! تیرا انداز فکر درست نہیں، ایک باپ کی نظر میں چھوٹے بڑے بچے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ ہارون عمار سے بھی بڑی محبت کرتا ہے اور اس نے اپنے خط میں عمار کی بابت کچھ نہیں لکھا تو حیرت ہے۔“

نیزہ نے براہمان کر کہا۔ ”میں تجھ سے ایک بات کچھ عرصے سے نہیں کہہ پاری ہوں لیکن اب کہہ ڈالوں گی۔“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”تو ضرور کہہ ڈال کیونکہ جب دلوں میں کدورت پیدا ہو جائے تو منافقت سے بچنا چاہیے۔“

نیزہ نے پوچھا۔ ”کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تو اس گھر میں کیوں رہ رہا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”میں اس لیے رہ رہا ہوں کہ تو نے اور تیرے باپ نے مجھ کو یہاں روک رکھا ہے۔“

نیزہ نے کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں اگر تو اس طرح سوچ رہا ہے تو غلط سوچ رہا ہے۔ اب تجھ کو یہاں سے چلے جانا چاہیے۔“

اس نے جواب دیا۔ ”میں تیرے کہنے سے تو ہرگز نہیں جاؤں گا۔ مجھے ایک عرصے سے شہ تھا کہ ایک نہ ایک دن تو مجھ سے اس قسم کی باتیں ضرور کرے گی اس لیے میں نے عمار کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اب جب تک عمار میرے ساتھ ہے، میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔“

نیزہ نے کہا۔ ”عمار کو میں اپنے پاس رکھ لوں گی۔ تو یہاں سے چلا جا۔“

بہنوئی نے عمار کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”اس کو تو اپنے پاس رکھ لے؟“ عمار کو تو بے گناہ تھا۔ عمار کو کوئی خیال ہے؟ میرا خیال ہے نہیں اور میں خود بھی عمار کو تیرے پاس نہیں چھوڑ سکتا۔“

نیزہ نے جواب دیا۔ ”اس کا فیصلہ بھی بہت جلد ہو جائے گا۔ ہارون کے آنے کی دیر ہے پھر میں عمار کو جہاز اپنے پاس رکھ لوں گی۔“

بہنوئی نے اڑ کر کہا۔ ”ہاں، صرف اس صورت میں کہ خود عمار بھی تیرے پاس رہنے پر آمادہ ہو جائے۔“

نیزہ نے تن کر کہا۔ ”میں عمار کو تجھ سے زیادہ محبت دے سکتی ہوں۔ تجھ سے زیادہ اچھی طرح رکھ سکتی ہوں۔“

بہنوئی ہنس دیا، بولا۔ ”بے شک، بے شک مجھ کو یقین ہے جو عورت عمار کی سلیپر کی غائب کر دے اور ریشمی پارچے اڑا دے وہ وہاں ہی بڑی محبت سے رکھ سکتی ہے۔“

نیزہ دنگ رہ گئی، کت گئی مگر ہموک بولی۔

”بداخلاق انسان! اس کا یہ مطلب ہوا کہ تو میرے خطوط پڑھ لیتا ہے۔ مجھ کو تو اس کا پہلے ہی شہ تھا اور اسی لیے سلیپر پارچوں کو دب کر بیچتی تھی اور یہ دیکھتا چاہتی تھی کہ تو میرے خطوط پڑھتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ آج اس کا انکشاف ہو گیا۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”اب فضول باتیں نہ کر جب تیری

عشقِ ناتمام

چوری پکڑی گئی تو تو اس قسم کی میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگی۔“

نیزہ نے عمار سے پوچھا۔ ”عمار! بچ بتا تو کس کے پاس رہنا گوارا کرے گا؟ میرے پاس یا اپنے پھوپھا کے پاس؟“

عمار نے کسی پس و پیش کے بغیر جواب دیا۔ ”پھوپھا کے پاس۔“

نیزہ نے غصے میں جھنجھلا کر پوچھا۔ ”یعنی میرے پاس نہیں؟“

عمار نے جواب دیا۔ ”ہاں، آپ کے پاس نہیں۔“

نیزہ غصے میں کھڑی ہوئی، بولی۔ ”کوئی بھی میرا نہیں، میں کتنی احمق تھی جواب تک تجھ کو اپنا بیٹا سمجھتی رہی۔“

عمار نے جواب دیا۔ ”آپ نے بھی اپنا سمجھا ہو مجھے تو وہ مجھے یاد نہیں لیکن یہ باتیں اچھی طرح یاد ہیں اور زندگی بھر یاد رہیں گی کہ آپ نے مجھ سے حسد کرنا شروع کر دیا ہے اور مجھ میں ایک قسم کا احساسِ محرومی پیدا کر دیا ہے۔“

پھوپھا کو اس کے جواب سے خوش ہوئی۔ نیزہ کو یہ کوفت کھانے جارہی تھی اگر عمار نہ ہوتا تو ہارون کا سب کچھ نیزہ اور ابراہیم کو ملتا لیکن اب یہ ناممکن تھا۔ نیزہ غصے میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور ہارون کا بہنوئی اور عمار دونوں اپنے گھر چلے گئے۔

☆☆☆

بہنوئی نے ازخود یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ عمار کے ساتھ دمشق چلا جائے گا اور وہاں ہارون کے والد کی تیار داری میں مشغول ہو جائے گا۔ اس کے اس منصوبے سے ہر شخص لاعلم ہی رہتا لیکن بہنوئی زیادہ گہرا نہیں تھا اس لیے اس نے ہر ایک کو روک کر بتانا شروع کر دیا۔ اس نے عمار کو دادا کی بیماری کی خبر دی اور کہا کہ ہم دونوں بلکہ میری بیوی کو بھی چند دنوں کے لیے دمشق چلا جانا ہے تاکہ تیرے بیمار دادا کی شاندار تیمارداری کی جائے۔ اس نے چپکے چپکے عمار کو نیزہ کی وہ ساری باتیں بتا دیں جو اس نے ہارون کے خط میں پڑھی تھیں۔ اس نے عمار سے کہا۔

”عمار! تجھ کو نیزہ اور اس کے پاس موجود مال و زر سے بالکل مایوس ہو جانا چاہیے کیونکہ اس حریف عورت کے پاس سے کچھ نکالنا بڑا مشکل کام ہے۔“

لیکن عمار اپنے باپ کی طرف سے بہت فکر مند تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”پھوپھا جان! یہ خارجی کون ہیں؟“

پھوپھا نے ہنس کر جواب دیا۔ ”یہ یکا یک تجھ کو خارجیوں کا کیا خیال آ گیا؟“

عمار نے جواب دیا۔ ”نیزہ! میں نے یہ فیصلہ کیا ہے

عمار نے جواب دیا۔ ”نیزہ! میں نے یہ فیصلہ کیا ہے

عمار نے جواب دیا۔ ”نیزہ! میں نے یہ فیصلہ کیا ہے

عمار نے جواب دیا۔ ”نیزہ! میں نے یہ فیصلہ کیا ہے

عمار نے جواب دیا۔ ”نیزہ! میں نے یہ فیصلہ کیا ہے

عمار نے جواب دیا۔ ”نیزہ! میں نے یہ فیصلہ کیا ہے

نے محض کو اچھی طرح دیکھا نہیں تھا۔ اب باپ کی موت کے بعد جب وہ خود کو ہلکا اور آزاد محسوس کرنے لگا تو تفریحات کی سوجھی۔ وہ میزہ اور ابراہیم کو ساتھ لے کر گھومنے لگا تو عامر کا خیال آگیا۔ میزہ سے کہا۔

”میزہ! میرا خیال ہے عامر کو بھی لے لیا جائے؟“

لیکن میزہ نے مخالفت کی، بولی۔ ”عامر اب بچہ نہیں ہے۔ وہ ہمارے ساتھ کہاں جائے گا۔ ابراہیم تو بچہ ہے۔ گود میں رہے گا۔ یہ بھی اگر عامر ہی جتنا ہوتا تو میں اسے بھی اپنے ساتھ نہ لے جاتی۔“

ہارون چپ ہو گیا لیکن بہنوئی ان دونوں کے سامنے آگیا اور پوچھا۔ ”ختم لوگ کہاں جا رہے ہو؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”میں ہارون کو محض کا خاص خاص چیزیں دکھانا چاہتی ہوں۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”میزہ! میں تجھ سے کوئی بات نہیں کروں گا، ہاں ہارون سے البتہ یہ کہنا ہے کہ اپنے ساتھ عامر کو بھی لیتا جا۔“

عامر بہنوئی کے پیچھے کھڑا تھا۔ ہارون نے عامر کو دیکھنا چاہا لیکن بہنوئی کے حائل ہونے کی وجہ سے وہ نہیں دیکھ سکا۔ بولا۔ ”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، عامر بھی چلے میرے ساتھ۔“

لیکن میزہ نے اسے منع کیا۔ ”اب عامر کو لے کر جاتی ہوں۔ میں نہیں جاؤں گی۔ پہلے تم گھوم پھراؤ، بعد میں، میں چلی جاؤں گی۔“

ہارون کو بھی غصہ آگیا، بولا۔ ”یہ کیا بات ہوئی میزہ؟ کیا تو عامر سے حسد کرتی ہے؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں حسد نہیں کرتی لیکن اگر لوگوں نے چاہا تو حسد بھی کرنے لگوں گی۔“

لیکن بہنوئی نے بڑک کر کہا۔ ”ہارون! تو نے میزہ کو بڑے اختیار دے دیے ہیں۔ میں اس عورت کے منہ پر ہتا ہوں کہ یہ عامر سے چلتی ہے، حسد کرتی ہے۔ میں خدا کا واسطہ دے کر تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ ان دونوں کے معاملے میں فریق نہ بن ورنہ پچھتاے گا۔“

ہارون نے میزہ کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔ ”تو تیرا کیا خیال ہے میزہ، عامر کو ساتھ کیوں نہ لے لیا جائے؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”میں نہیں جاؤں گی۔ تو عامر کو شوق سے لے جا۔“

ہارون نے میزہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میزہ! تو بھی ساتھ چل خند نہ کر، آخر عامر بھی تو میرا ہی بیٹا ہے۔“

میزہ نے چل کر جواب دیا۔ ”میں یہ کب کہتی ہوں

کہ عامر تیرا بیٹا نہیں ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ عامر ہی تیرا بیٹا ہے۔“ ہارون نے یہی محسوس کرنے لگا۔

بہنوئی نے پلٹ کر عامر کے سر پر ہاتھ رکھا دیا، بولا۔ ”میرے بچے! تو میرا کرنا نہیں جانے دے۔ تجھے پھر کسی دن گھما پھراؤں گا۔“

ہارون نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ”ہاں، اس دن میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا تو فکر نہ کر پھر کسی دن سہی۔“ اس کے بعد ہارون، میزہ اور ابراہیم گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

ہارون میزہ کی گھر میں تھا۔

بہنوئی عامر کو لے کر اپنے گھر چلا گیا۔ گھر میں داخل ہو جانے کے بعد بہنوئی نے عامر کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ وہ رو رہا تھا۔ پوچھنے پر عامر نے جواب دیا۔ ”پچو یا جان! اس عورت نے مجھ سے میرے باوا جان کو چھین لیا ہے۔“

پچو نے جواب دیا۔ ”تو فکر نہ کر عامر، میں اس عورت سے تیرے باوا کو چھین لوں گا۔“

میزہ، ہارون کو خوب خوب کھاتی پھرتی رہی۔ اس نے شہر کے وسط میں یوحنا کے کلیسا کی سیر کروائی۔ اس کا نصف حصہ مسجد تھا اور نصف کلیسا۔ مسجد کے دروازے پر ایک پتلا کھڑا تھا۔ ایک بلند دیوار، ستون پر کی آوی کی مورتی جونی کے غائب ہونے کی موت کی قدموں کی پچھو کی شکل بنی ہوئی تھی۔ اس جگہ پر میزہ نے زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہارون! اس بت کے قدموں سے مٹی اٹھا کر اس کے جسم پر مل دے کیونکہ اس سے تو ہمیشہ کے لیے بچھو کے زہر سے محفوظ ہو جائے گا۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”ہاں سنا تو میں نے بھی یہی ہے کہ یہ یہ مورتی نہیں ایک طلسم ہے اور اس کے قدموں میں مٹی ڈالنے والا ہمیشہ بچھو کے زہر سے محفوظ رہتا ہے۔“

ہارون اور میزہ نے ایک ساتھ مورتی کے قدموں کی خاک اٹھا کر مورتی کے قدموں پر ڈال دی۔ اس کے بعد میزہ نے ننھے ابراہیم کی منجی زبردستی کھول کر اس پر تھوڑی سی خاک رکھ دی اور ہارون نے یہ خاک مورتی کے پاؤں پر ڈال دی۔ اب وہ دونوں بہت خوش تھے۔ ہارون کو اس موقع پر عامر یاد آگیا، بولا۔ ”افسوس کہ عامر ہمارے ساتھ نہیں ورنہ وہ بھی مورتی کے قدموں میں خاک ڈال کر بچھو کے زہر سے محفوظ ہو جاتا۔“

میزہ نے غی سے کہا۔ ”ہارون! تو ہر جگہ عامر کا نام مت لیا کر۔ عامر کو اس کا پچو پاڑے ناز و نعم سے پال رہا

عشی نا تمام

ہے۔ اب اس پر تو نے بھی توجہ دی تو وہ بے جلاؤ پیار میں بگڑ جائے گا۔“

ابھی میزہ کی بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ہارون کا بہنوئی عامر کو لے کر ان کے سامنے پہنچ گیا۔ ہارون نے جوش مرست سے کہا۔ ”واہ تو آگیا عامر! اس وقت تو میں جو بھی دعا مانگا پوری ہوتی۔ میں تجھ کو یاد ہی کر رہا تھا۔“

میزہ کو ہارون کے بہنوئی پر بڑا غصہ آیا، بولی۔ ”تو بہت شری انسان نظر آتا ہے۔ اگر عامر کو کسی اور وقت لے آتا تو تیرا کیا بگڑ جاتا۔“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”میں کسی اور وقت کیوں لاتا، تم دونوں نے اس کو بہکا دیا تھا لیکن میں اس کا آرزو اور افسردہ چہرہ نہیں دیکھ سکا اور اس کو یہاں لے آیا۔ کیا تجھ کو عامر کا آنا پسند نہیں؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، یہ بات نہیں ہے میں تو ہارون سے یہ کہہ رہی تھی کہ دیکھ لیا تو نے۔ میں جو تجھ سے کہہ رہی تھی کہ عامر ہماری توجہ کا قطعاً بھوکا نہیں۔ اس کے پچو یا نے اس کو وہ آرام پہنچایا ہے کہ اب عامر کو ہماری فکری نہیں رہی۔“

بہنوئی نے ابراہیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ابراہیم کو دیکھا ہے؟ وہ تو اس کو بھی اپنے قابو میں لے لیا تو میرا نام نہیں۔“

بہنوئی نے عامر کے ہاتھ سے مورتی کے پاؤں کے پاس سے اٹھائی ہوئی مٹی مورتی کے قدموں میں ڈال دی۔

اب یہ چاروں ایک ساتھ چل پھر رہے تھے۔ ہارون نے ازراہ مذاق کہا۔ ”بھائی، تم نے تو عامر کو پوری طرح قابو میں لے لیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ آگے چل کر تو شاید مجھے پچھانے کا بھی نہیں۔“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”ابھی تو نے دیکھا ہی کیا ہے؟“

ہارون نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا ابھی کچھ اور بھی دیکھنا باقی ہے؟“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں اس کو اس لائق کروں گا کہ یہ گوارسمنٹ کے تیرے مقابلے میں آجائے گا۔“

ہارون نے ہنس کر کہا۔ ”تو گویا تو اس کو گستاخ کر دے گا۔“ پھر عامر سے پوچھا۔ ”کیوں بیٹے! کیا تو گوارسمنٹ کے میرے مقابلے پر آمکے ہے؟“

عامر نے شرما کر جواب دیا۔ ”نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔“

لیکن میزہ نے دبی آواز میں کہا۔ ”نہیں، ایسا بھی

اب اس کا بار بار ذکر ہی کیوں؟ میں معافی چاہتا ہوں۔
لیکن بہنوئی بات کو کسی میں اڑا دیتا۔ ہارون حیران
تھا کہ ایک طرف تو اس کا بہنوئی اس کا اتنا شاک ہے کہ
برسوں پرانی بات کا زخم یوں دکھا دیتا ہے گویا تازہ تازہ لگا
ہو اور دوسری طرف محبت اور انتہات کا یہ عالم کہ عامر کو اپنے
بیٹے کی طرح پال ڈالا۔

عامر کا یہ حال تھا کہ اس کی نظر میں دونوں ہی محترم
تھے۔ باپ بھی اور پھوپھا بھی چنانچہ جب عامر کو یہ فیصلہ کرنا
پڑا کہ وہ اپنی عملی زندگی کا آغاز کہاں سے اور کس طرح
کرے تو دونوں ہی سے مشورہ لیتا پڑا۔ پہلے اس نے اپنے
باپ ہارون سے مشورہ لیا، پوچھا۔ ”باوا جان! اب میں عملی
زندگی کا آغاز کرنا چاہتا ہوں، مجھے مشورہ دیجیے کہاں سے اور
کس طرح شروع کروں؟“

باپ نے جواب دیا۔ ”بیٹے! اگر تو یہ چاہتا ہے کہ کام
کے ساتھ ساتھ مال بھی کمائے تو بہترین موقع ہے میں تجھے
فوج میں ملازمت دلا دوں گا۔ آج کل خوارج نے بڑے
ہنگامے کر رکھے ہیں۔ اگر تو خوارج سے جہاد کرے گا تو
دینی فائدوں کے ساتھ ہی اخروی ثواب بھی کمائے گا۔“

لیکن عامر اپنے باپ کی رائے سے متاثر نہیں ہوا
کیونکہ وہ خارجیوں کی تائید وادی اور شیعہ کی بڑی
دستاویں بن چکا تھا اور اس کا پھوپھا اکثر و بیشتر خارجیوں کی
بڑی تحریکیں کر چکا تھا۔

باپ سے مشورہ لینے کے بعد وہ پھوپھا کے پاس پہنچا
اور اس سے بھی یہی مشورہ لیا، پوچھا۔ ”پھوپھا جان! میں عملی
زندگی کا آغاز کہاں سے اور کس طرح کروں؟ باوا جان کہتے
ہیں کہ میں خوارج سے جنگ کر کے دین اور دنیا کے
فائدے ایک ساتھ حاصل کروں، آپ کی کیا رائے ہے؟“

پھوپھا نے جواب دیا۔ ”عامر! مجھے تیرے باپ کی رائے
سے اختلاف ہے۔ خوارج دین دار لوگ ہیں۔ اگر مجھ کو دنیا اور
آخرت کی بھلائی واقعی مقصود ہے تو تو خوارج کا ساتھ دے۔ وہ
دنیا میں حق قائم کرنا چاہتے ہیں اور انہوں نے اپنی زندگیاں
آخرت کے عوض بیچ دی ہیں۔ چنانچہ اتنی عمر گزارنے کے بعد
میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خوارج حق پر ہیں اور ہر سچے اور
ایمان دار آدمی کو خوارج ہی کا ساتھ دینا چاہیے۔“

پھوپھا کا مشورہ کام کر گیا اور اس نے خوارج سے
رابطہ قائم کر لیا۔ عزیزوں رشتے داروں کا مارا ہوا اور زمانے
کے ہاتھوں ستایا ہوا عامر جب خوارج میں پہنچا اور ان کی
شاندار باتیں سنیں تو وہ انہی کا ہو گیا۔ اس نے اپنی شمولیت کو

دوسروں سے چھپائے رکھا لیکن پھوپھا کو اس کا علم تھا۔ اس
نے عامر کو مبارک باد دی کہ اس نے دین اور دنیا کی بھلائی
اور سرخ روئی کی منزل پائی ہے اور اب اس کو گمراہ نہیں کیا
جاسکتا۔

ہارون چاہتا تھا کہ عامر فوج میں داخل ہونے سے
پہلے شادی کر لے لیکن منیزہ اس کی مخالف تھی۔ وہ بار بار زور
دے کر یہی کہتی کہ عامر خود کمائے اس کے بعد شادی کرے۔
لیکن ہارون کہتا۔ ”جب تک میں موجود ہوں اس کی
ساری ذمہ داریاں میرے سر ہیں۔ اس لیے عامر کمائے یا
نہ کمائے، میں اس کی شادی ضرور کروں گا۔“

منیزہ نے جھنجھلا کر رائے دی۔ ”اگر یہ بات ہے تو
ابراہیم بھی جوان ہو چکا ہے، اس کی بھی شادی ہو جانا چاہیے۔“
ہارون نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”ہاں، اس کی
شادی بھی ہوگی لیکن عامر کی شادی کے بعد۔“

دونوں میں اس موضوع پر بڑی دیر تک بحث
و مباحثہ ہوتا رہا لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں برآمد ہوا۔ آخر
ہارون کا بہنوئی بھی اس بحث میں شامل ہو گیا اور اس نے کھلم
کھلا عامر کی طرف داری کی لیکن منیزہ کا بوڑھا باپ اپنے
نواسے ابراہیم کی طرف تھا۔

ہارون نے اپنے بہنوئی کو بھیجا۔ ”بھائی! اگر
عامر کو پالا پوسا ہے اس لیے بے ذمہ داری میں تمہارے
ہی سر ڈالتا ہوں کہ عامر کے لیے اچھی و بھلی تلاش کرو۔“

دوسری طرف منیزہ نے اپنے باپ سے کہہ دیا کہ وہ
ابراہیم کے لیے کوئی حسین بی لڑکی تلاش کرے۔ دونوں ہی
حسین لڑکی کی تلاش میں مشغول ہو گئے۔

آخر دو ماہ کی جدوجہد کے بعد ہارون کے بہنوئی نے
ایک لڑکی تلاش کر لی اور ہارون کو مطلع کیا کہ اگر تجھ کو یہ لڑکی
پسند ہو تو میں بات کروں۔

ہارون نے منیزہ سے کہا۔ ”منیزہ! میرے بہنوئی نے
عامر کے لیے ایک لڑکی دیکھ لی ہے۔ اس کو دیکھ کر تائید
کر دے کہ میں بات آگے بڑھاؤں۔“

منیزہ نے برا سمنہ بنایا اور جواب دیا۔ ”ہارون! تو
میرے زخموں پر نمک پاشی نہ کیا کر۔ عامر کی دہن کو میں
کیوں دیکھوں؟ تیرا کام ہے۔“

ہارون نے غصے میں کہا۔ ”اوشری عورت! تو میرے
بیٹے عامر سے اتنا جلتی ہے۔ افسوس کہ میں نے اس پر پہلے
بھی اتنا زیادہ غور نہیں کیا تھا۔“

منیزہ نے جواب دیا۔ ”صرف میں ہی نہیں جلتی،

عشقی ناتمام

عامر بھی مجھ سے جلتا ہے۔ جیسے کوئی سا۔ آخر میں اس کا جواب
کس طرح دوں؟“

ہارون نے سختی سے کہا۔ ”منیزہ! میں نے آج تک
تجھ کو حکم نہیں دیا لیکن اب میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو میرے
ساتھ چل اور عامر کی ہونے والی دہن کو دیکھ کر دیانت داری
سے بتا کہ یہ عامر کے لیے کیسی رہے گی۔“

منیزہ نے بھی بے پروائی سے جواب دیا۔ ”میں
اپنے بیٹے ابراہیم کے لیے تو بھاگ دوڑ کر نکلتی ہوں لیکن
عامر کے لیے یہ سب کیوں کروں؟“

ہارون نے ایک بار پھر حکم کیا۔ ”منیزہ! میں تجھے حکم
دیتا ہوں اگر تو نے میرا یہ حکم نہ مانا تو میں تجھے طلاق دے
دوں گا۔“

منیزہ کے باپ نے مداخلت کی، منیزہ کو سمجھایا۔
”منیزہ! تجھے اپنے شوہر کا حکم ماننا چاہیے۔ آخر عامر بھی تو
ہارون ہی کا بیٹا ہے۔“

منیزہ بے بس ہو گئی اور باپل ناخوستہ ہارون اور اس
کے بہنوئی کے ساتھ لڑکی کے گھر پہنچ گئی۔

لڑکی کا نام رابعہ تھا اور وہ اپنی شکل و صورت سے حور
گنتی تھی۔ بڑی بڑی پلکوں کے سائے میں بڑی بڑی یادام
چشمیں تھیں اور خونخوار لبوں پر مسکراتے مسکراتے
رنگ۔ سر تا پایف میں ڈھلی ہوئی کہ جو دیکھے اس پر نقشہ ہو
جائے۔ باتوں میں سلیقہ اور آواز میں موسیقی کی ٹھنک۔ منیزہ
کو یہ لڑکی بہت پسند آئی۔ رابعہ کے گھر والوں نے ان سب
کی بڑی تواضع کی۔

منیزہ نے لڑکی کی ماں سے پوچھا۔ ”محترم خاتون!
کیا تم نے عامر کو دیکھا ہے جس کو اتنی اچھی لڑکی سوئپ دینا
چاہتی ہو؟“

لڑکی کی ماں نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں نے لڑکا تو
ابھی تک نہیں دیکھا لیکن بھائی ہارون کو ایک عرصے سے جانتی
ہوں۔ ظاہر ہے ہارون کا بیٹا بھی ہارون جیسا ہی ہوگا۔“

منیزہ نے کہا۔ ”افسوس کہ یہاں یہ صورت حال ہرگز
نہیں۔ اگر تم میرا کہنا مانو تو عامر کے چچو نے بھائی ابراہیم سے
اس کا رشتہ کر دیا۔ اللہ نے چاہا تو بڑے سکون سے رہے گی۔“
لڑکی والوں نے بھی معاملے کی اہمیت اور نزاکت کو
اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔

لڑکی کی ماں نے پوچھا۔ ”کیا عامر اچھا لڑکا نہیں ہے؟“
منیزہ نے جواب دیا۔ ”عامر بیٹا نہیں ہے اس لیے
میں اس کی ضامن بھی نہیں ہو سکتی اور پھر یہ کہ عامر میرے

پاس رہا بھی نہیں، وہ ہمیشہ دور دور رہا ہے۔“
رابعہ کی ماں نے پوچھا۔ ”اگر ایسی بات تھی تو عامر کی
طرف سے میری لڑکی کو دیکھنے کیوں آئی تھی؟“
منیزہ نے جواب دیا۔ ”میں لڑکی دیکھنے نہیں، لڑکی
کے گھر والوں کو سب کچھ بتانے آئی تھی۔“

لڑکی کے گھر والوں نے ابراہیم کا رشتہ قبول کر لیا اور
رابعہ کے بڑوں نے باہر یہ اعلان کیا کہ ”رابعہ کو ابراہیم کے
لیے پسند کر لیا گیا ہے اور وہ اپنی بیٹی کو کسی ایسے لڑکے سے
ہرگز منسوب نہیں کریں گے جو اپنے باپ سے دور پھوپھا کے
گھر پلا بڑھا ہو۔ وہ یقیناً گستاخ اور سر پھرا لڑکا ہوگا۔“
اس غیر متوقع اعلان نے ہر کسی کو چونکا دیا۔ بہنوئی
نے حیرت سے کہا۔ ”یہ کیا بات ہوئی، یہاں ابراہیم کا رشتہ
لے کر کون آیا تھا؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”بھائی، میں سب کچھ سمجھ گیا۔“
وہ سب نڈھال اور افسردہ جب اپنے گھر میں داخل
ہوئے تو ان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ پھوپھا سنا جائے ہوئے
اپنے گھر چلا گیا۔ منیزہ کی بی پروا کے بغیر اپنے کمرے
میں چلی گئی۔ عامر کا کاغذ معاملے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔
وہ اپنی زبان سے کوئی سوال بھی نہیں کر رہا تھا۔ دوسری
طرف عامر کا باپ ہارون، منیزہ سے برا سمٹ رہا تھا۔ وہ بھی منیزہ
کے پیچھے ہی اندر داخل ہو گیا۔ منیزہ بے حد خوش تھی۔ وہ اپنا
لباس بدل رہی تھی۔ اس نے آئینے میں اپنے پیچھے ہارون کو
دیکھ لیا اور فوراً گھوم گئی، بولی، ”ہارون! آخریت تو ہے؟“
ہارون نے چمکی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ ”منیزہ!
یہ کیا ہو گیا؟“

منیزہ نے پوچھا۔ ”کیا ہو گیا، میں نہیں جانتی کہ تو کیا
چاہتا چاہتا ہے؟“

ہارون نے کہا۔ ”ہم لوگ عامر کے رشتے کی بات
کرنے گئے تھے۔“

منیزہ نے جواب دیا۔ ”بے شک لیکن وہ لوگ عامر
کے بجائے ابراہیم کو پسند کرنے لگے۔“

ہارون نے افسوس سے کہا۔ ”وہ خود عامر کے بجائے
ابراہیم کو نہیں پسند کرنے لگے بلکہ تو نے انہیں اس پر آمادہ کیا
ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“
منیزہ نے تاکن کی طرح مڑ کر جواب دیا۔ ”انہوں نے
مجھ سے پوچھا کہ کیا میں عامر کی ضامن بن رہی ہوں، میں
نے صاف صاف کہہ دیا کہ جو کچھ میرے پاس نہ رہا ہو، جسے
میں نے نہ پالا پوسا ہو اور جو اپنے ماں باپ سے دور پھوپھا کے

نوٹ

ایک انگریز اور ایک دیہاتی کا مہر کے کنارے آمنا سامنا ہو گیا تو انگریز نے انگریز کی دیہاتی سے کسی دوست کا ایڈریس پوچھا۔ دیہاتی بولا۔ ”میں تو تیری گل سمجھتی ہوں اور تو میری کیا کہتا ہے؟“ انگریز کو بھی دیہاتی کی پختائی گفتگو کی سمجھ نہیں آئی تو انگریز بولا۔ ”واٹ؟“

دیہاتی بولا۔ ”اچھا..... اچھا میں تیری گل سمجھ گیا ہوں تو اس شہری (کنارا) پھڑ سے سدھالنا چاہتا ہوں۔“ انگریز دیہاتی کی زبان سے نکلنے والی بات کو سمجھنے میں پر گیا اور بولا ”ٹوپٹ۔“ دیہاتی یہ سن کر غصے میں آ گیا اور سوچنے لگا۔ ”پاگل (پاکل) جیہا نہ ہووے تے۔“ ایوں ای کن کھادی جاندا اے۔ فوراً بولا۔ ”میں کیوں پٹاں اپنے دو کیاں نوں..... ٹوپٹ۔“

مرسلہ۔ شیر احمد بھٹی، بہاولپور

جانے کو تیار ہوں۔“

عمر نے جواب دیا۔ ”پچو پیا جان! میں خود کو اس ماحول میں اجنبی محسوس کرتا ہوں اس لیے میں یہاں سے چلا جانا چاہتا ہوں۔“

پچو پیا نے رائے دی۔ ”میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تیرے باپ کو مال و زر کی قسم پر آمادہ کر لوں کیونکہ میں نے میزہ کی فطرت اچھی طرح سمجھ لی ہے۔ ہارون کی عدم موجودگی میں یہ تجھ کو تیرے حق سے بھی محروم کر دے گی۔“

عمر نے جواب دیا۔ ”میں مال و زر کو مصیبت سمجھتا ہوں اس لیے میرے باپ کا مال و زر اس کو مبارک، مجھے اس میں سے کچھ نہیں چاہیے۔“

پچو پیا بڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ ”یعنی اب تو میری بات بھی نہیں مانے گا۔ مال و زر مصیبت نہیں کارآمد ہے۔ میں تجھ کو یوں مٹی انداز فکر پر قائم نہیں رہنے دوں گا۔“

لیکن عمر نہیں اس کا رد چلا گیا۔ اس کا پچو پیا سارا دن ہارون سے لڑتا جھگڑتا رہا کہ وہ اپنی زندگی میں ہی عمر کا حصہ الگ کر دے لیکن ہارون اس پر یوں تیار نہیں ہوتا تھا کہ وہ پہلے عمر کی شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد اس کو الگ کر کے خود اس کے ساتھ رہنے کا منصوبہ بنایا تھا۔

لیکن پچو پیا نے اس امر کو تسلیم نہیں کیا کہ عمر کی شادی اور انہیں اس کے ساتھ رہنے کا منصوبہ

کسی طرح میزہ کو بھی اس بحث و مباحثے کا علم ہو گیا۔ اس نے دونوں کو ڈانٹ دیا، بولی۔ ”جب تک میں موجود ہوں ایسا نہیں ہوگا۔ مال و زر نہیں تقسیم ہوگا۔ عمر شادی کرے گا تو وہ ساتھ رہے گا یا الگ، میں اپنے پاس سے اسے کچھ بھی نہ دوں گی کیونکہ مجھے اپنے ابراہیم کی فکر ہے۔“

لیکن ابراہیم نے صاف صاف کہہ دیا۔ ”ماں جس مال و زر کی بات میں آپ میرا سہارا لے کر بھائی کو ان کے حق سے محروم کرنا چاہتی ہیں، میں اس میں آپ کا ساتھ نہیں دوں گا۔“

میزہ نے ڈانٹ دیا۔ ”تو چپ رہ تاوان لڑ کے، تیری بہتری کو چننا بہتر میں سوچ سکتی ہوں کوئی اور نہیں سوچ سکتا۔ تیری ماں نے اس موجودہ مال و زر کو بڑی کوشش اور محنت سے محفوظ رکھا ہے۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو آج اس گھر میں خاک اڑ رہی ہوتی اور کسی کو بھی حق ادا نہ ملے گی باتوں کا موقع نہ ملتا۔“

ہارون نے اپنے بہنوئی کو مخاطب کیا۔ ”بھائی! تم عمر سے کہہ دو کہ میں اس کا حصہ ابھی سے دے دیتا چاہتا

کے سامنے میں لے گیا اور پوچھا۔ ”ابراہیم! یہ بتا عمر تجھے کیا لگتا ہے؟“

ابراہیم نے جواب دیا۔ ”بھائی عمر بہت اچھے ہیں، مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔“

ہارون اس جواب سے بہت خوش ہوا، بولا۔ ”بیٹے! میں تیری ماں کی مخالفت نہیں کر رہا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ دانستگی یا نادانستگی میں تیری ماں نے عمر پر ظلم کیے ہیں، زیادتی کی ہے۔“

ابراہیم کے چہرے پر افسوس اور ندامت کے تاثرات پائے جاتے تھے، بولا۔ ”لیکن وہ میری ماں ہے، میں اس کی مخالفت نہیں کر سکتا۔“

ہارون نے خوشامد انداز میں کہا۔ ”میں یہ نہیں کہتا کہ تو اپنی ماں کی مخالفت کر بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تو اس شادی سے انکار کر دے۔“

ابراہیم نے سر جھکائے ہی جھکائے جواب دیا۔ ”میں نے شادی پر آمادگی ہی کب ظاہر کی تھی، مجھے بھائی عمر سے ہمدردی ہے۔“

ہارون نے بے اختیار ابراہیم کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ ”جراک اللہ میرے بچے کو کتنا نیک اور صاف ہے۔“

عمر کا پچو پیا تیرہ کی حالت سے متاثر تھا اور اس نے دل برداشتہ تھا کہ میزہ کے خلاف کسی خطرناک سازش کا منصوبہ

تیار کرنے کی فکر میں تھا۔ اس عورت کے خلاف کوئی ایسا شاندار مگر خطرناک منصوبہ بنایا جائے کہ میزہ کو بس مزہ ہی آجائے۔ اس نے کئی رائےیں یوں بے چینی میں گزار دیں کہ میزہ کے خلاف ہی سوچتا رہا۔ اس دوران عمر بھی کچھ مضمحل رہا۔ وہ بھی معلوم نہیں کیا کچھ سوچتا رہا۔ پھر وہ گھر سے کافی کافی دیر تک غائب رہنے لگا اور آخر یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ وہ سارا سارا دن غائب رہتا۔ ہارون اور اس کا بہنوئی دونوں ہی عمر کی ان حرکتوں سے پریشان تھے۔ عمر کے چہرے پر سرکشی کے آثار دیکھ کر دونوں ہی خاموش رہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

ایک دن علی الصباح عمر باہر جانے لگا تو اس کے پچو پیا نے اس کو روک لیا، پوچھا۔ ”تو کہاں جا رہا ہے؟“ عمر نے جواب دیا۔ ”میں شام تک واپس آ جاؤں گا۔“

پچو پیا نے کہا۔ ”آج تو ہمیں نہ جاکر کیونکہ میں میزہ اور تیری چیخ و پکار میں مستقبل کے بھگے دیکھ رہا ہوں۔ اس خاموش ماحول کی مثال اس راگ جیسی ہے جس کے اندر چنگاریاں چھپی ہوں اور جو کسی بھی وقت آگ میں بدل

پاس رہا ہو، میں اس کی ضامن کس طرح بن سکتی ہوں۔“ ہارون نے تملاکر ٹھہرنا شروع کر دیا۔ ”تو نے غلط بیانی کی ہے۔ عمر ہم سے دور کبھی نہیں رہا۔ اس کا پچو پیا بھی ہمارے ساتھ ہی رہ رہا ہے اور پھر تو عمر کی ضامن نہ بن، میں تو ضامن بن سکتا ہوں۔“

میزہ نے آہستگی سے کہا۔ ”لیکن اب تو میں ابراہیم کی بات کر بھی آئی۔ عمر کی عمر زیادہ ہے جبکہ ابراہیم کے لیے بالکل موزوں ہے۔“

ہارون نے سختی سے کہا۔ ”لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ رشتہ عمر ہی سے ہوگا ورنہ ابراہیم سے بھی نہیں۔“

میزہ نے تیز یوں چڑھائیں۔ ”ہارون! میں نے کبھی کسی معاملے میں ضد نہیں کی لیکن جب میں نے ابراہیم کے لیے زبان دے دی ہے تو یہ رشتہ ابراہیم سے ہی ہو کر رہے گا۔“

ہارون چیخ پڑا۔ ”میں ایک عرصے سے تیری زیادتیاں دیکھ رہا ہوں۔ تو نے عمر پر جو ظلم کیے، میں خاموشی سے برداشت کرتا رہا ہوں لیکن اب تو ان زیادتیوں سے باز آ جا۔ ابراہیم اور عمر میں نفرتوں کی فلیج نہ پیدا کر کیونکہ ہم دونوں کے بعد انہیں مل جل کر زندگی گزارنی ہیں۔ اگر ان میں نفرتیں پیدا ہو گئیں تو یہ زندگی بھر تک ہی میں لڑتے جھگڑتے رہیں گے۔“

میزہ اپنے فیصلے پر قائم رہی، بولی۔ ”ہارون! تو میری عادت سے واقف ہے۔ میں نے ایک بار جو فیصلہ کر لیا، ہر گز اس میں فیصلے بدلنے کی قائل ہی نہیں۔ بہت عرصہ پہلے جب میں نے تجھ سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو اسے لوگوں کی مخالفت کی پروا کیے بغیر پورا کیا پھر جب تم نے لوگوں کی سازش کے ذریعے مجھے بے اولاد رکھنا چاہا اور میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں اپنے بچے کی ماں بن کر رہوں گی تو میں اپنا مقصد حاصل کر کے رہی اور اب میں نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ رابعہ کی شادی ابراہیم سے ہی ہوگی تو یہ شادی ابراہیم سے ہی ہو کر رہے گی۔“

ہارون نے بڑی ہی کسی سے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ گزشتہ تینوں کو بھلا دیا جائے اور خوشگوار ماحول پیدا کیا جائے۔“

میزہ نے جواب دیا۔ ”تو اس کے لیے بہترین طریقہ کار یہ ہوگا کہ رابعہ سے ابراہیم کی شادی کر دی جائے۔“

ہارون نے خوب اچھی طرح محسوس کر لیا کہ میزہ کسی طرح بھی اپنا فیصلہ نہیں بدلے گی تو اس نے ایک دوسری ترکیب پر عمل شروع کیا۔ ابراہیم کو گھر سے دور انگور کی بیلیوں

سے یہ کہتی ہوئی چلی گئی۔ ”مجھ کو جبیلے ہی سے معلوم تھا کہ ہارون کو دروغ یا جادو کا ہرگز کوئی پڑا نہیں۔ میں ہر ایک سے منٹ لوں گی۔“

ہارون اور اس کے بہنوئی نے بھی بحث ختم کر دی اور دونوں ہی عامر کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

شام ہو گئی مگر عامر نہیں آیا۔ رات ہوئی مگر عامر کا کوئی پتا نہیں تھا۔ پھر نصف رات ہو گئی۔ چھوپا کم گھر ہارون زیادہ غم مند ہوا۔ دوسری صبح نمودار ہوئی مگر عامر کا کہیں پتا نہ تھا۔ ہارون تھملا یا تھملا یا ادھر ادھر پھر تار پاتا۔ وہ عامر کی تلاش میں اپنا گھوڑا دوڑاتا رہا۔ میزہ بہت خوش تھی کہ ایک کاٹا جواس کے دل میں مستحق چہرہ ہا تھا اب دور ہو چکا تھا۔ وہ ہارون اور اس کے بہنوئی کی پریشانیوں سے بہت خوش ہو رہی تھی۔

ایک دن، دو دن، چار دن، ہفتہ، کئی مہینے، دو مہینے پھر چھ ماہ گزر گئے مگر عامر کا کہیں پتا نہ چلا۔ ہارون کا اضطراب بڑھتا رہا۔ اس کو غم نے مذہال اور بے مردہ کر دیا۔ پھر باہمی پریشان تھا مگر سب کچھ۔ اب ہارون کم ہو گیا تھا۔ باپ کے غم کو دیکھ کر ابراہیم، عامر کی تلاش میں نکل گیا۔ پھر وہ بھی واپس نہ آیا۔ ابراہیم کی گمشدگی نے میزہ کو بھی ہلا ڈالا۔

اب یہ گھر مستقل بیت الحزن بن چکا تھا۔ کسی کا کسی کو خبر نہ تھی۔ ہارون نے اپنے دل کی آواز سن کر غم سے بے فکر ہو کر رہنے لگا تھا۔ میزہ کو شہد کہ اس کا بیٹا ابراہیم کی سازش کا شکار ہوا ہے اور اس کے خیال میں اس سازش کا بانی مہابی ہارون کا بہنوئی تھا۔ میزہ کا بس چلتا تو وہ ہارون کے بہنوئی کو کچا چبا جاتی۔

دونوں بیٹوں کی گمشدگی نے ہارون کو مردہ کر دیا۔ اب اس کا کسی کام میں دل ہی نہ لگتا۔ میزہ بھی اکثر ویسٹر روٹی ہی ریتی۔ ہارون کا بہنوئی بھی اداس رہنے لگا تھا۔ میزہ کا باپ مرنے کی خواہش میں جی رہا تھا۔ ہارون اور میزہ گاہے بگاہے آپس میں جھگڑ پڑتے۔ ہارون کہتا۔ ”یہ سب تیری وجہ سے ہوا ہے۔ تیری خود غرضی نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔“

میزہ کہتی۔ ”ہارون! مجھے مورد الزام ٹھہرا کر میرے زخموں پر نمک نہ چھڑک۔ اگر زیادہ تنگ کیا تو میں گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے کہیں دفعان ہو جاؤں گی۔“

اور یہ تو تو میں میں کسی نتیجے کے بغیر ہی ختم ہو جاتی۔ ہارون نے اکتا کر بد رجبہ مجبوری اپنے ساتھ بیٹھے سے رجوع کیا اور کوثر روانہ کیا۔ ان دنوں کوثر اور لصرہ میں خلافت کی نیابت حجاج بن یوسف کو مل چکی تھی اور وہ خوارج

کے خلاف مہمات میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اس کو سہاویوں کی ضرورت تھی چنانچہ وہ بڑی آسانی سے فوج میں داخل کر لیا گیا۔

حجاج کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ ہارون وہی شخص ہے جس نے خراسان میں وہاں کے عامل امیہ کا ساتھ چھوڑ کر باغی کبیر کی حمایت کی تھی تو غضب ناک ہو گیا، بولا۔ ”اگر اس بار۔۔۔ بھی غداری کی تو یہ سمجھ لے کہ میں امیہ سے قطعی مختلف انسان ہوں۔ اگر ان دنوں خراسان میں امیہ کی جگہ میں ہوتا تو تو آج نظر نہ آتا۔ تیری خاک کا بھی پتہ نہ ہوتا کیونکہ میں غدار کو معاف نہیں کرتا۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”امیر! میں نے کوئی غداری نہیں کی تھی۔ اگر میں غدار ہوتا تو میرا شہر بھی غداروں کے ساتھ ہو چکا ہوتا لیکن میں وفادار انسان ہوں۔ اس لیے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے حکم کی تعمیل میں اپنی گردن تک کٹاؤں گا۔“

حجاج نے کہا۔ ”تب پھر ہمیش میں شامل ہو جا جو دشمنان خدا سے مصروف پیکار ہے۔ اگر تیری ہمیش نے انہیں شکست دے دی تو میں تجھے اور تیرے ساتھیوں کو انعام و اکرام سے نواز دوں گا۔“

ہارون نے انہیں دیکھ کر جواب دیا۔ ”امیر! میں لاپچی نہیں ہوں۔ اس لیے میں اپنی خدمات کا صلہ انعام و اکرام کی صورت میں نہیں لوں گا۔ محض سے چل کر یہاں آیا ہوں، چاہتا ہوں کہ جب میں انعام و اکرام کا مستحق ٹھہروں تو مجھے کوئی شے دینے کی جگہ دے دی جائے۔“

حجاج نے پوچھا۔ ”تجھ کو محض میں کیا تکلیف ہے جو کوئی میں منتقل ہو جانا چاہتا ہے؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”امیر! میرے دو بیٹے معلوم نہیں کہاں چلے گئے۔ اس لیے میں اس گھر میں روحانی اذیت محسوس کرتا ہوں جہاں میرے دونوں بیٹے رہتے اور اٹھتے بیٹھتے تھے۔“

حجاج نے کہا۔ ”تو فکر نہ کر، خوارج کے فتنے سے نجات مل جائے تو میں تیرا انتقام کوئی میں ہی کر دوں گا۔“

ہارون نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ محض واپس نہیں جائے گا۔ اس کو میزہ سے نفرت ہو گئی تھی کیونکہ وہ پورے لیے کا میزہ ہی کو ذمہ دار سمجھتا تھا۔ دونوں بیٹوں کی گمشدگی نے اس میں یابوئی اور توقیوت پیدا کر دی تھی۔ اس نے خدا سے لو لگائی تھی اور ہر وقت یہی دعا مانگتا رہتا تھا۔ ”خدا یا تو خوارج کے مقابلے میں مجھ کو کامیاب اور

عشق ناتمام

برق لپاس میں میرا مقابلہ کرنے آیا تھا تو جان لو کہ میں نے اسے قتل کر دیا اور تم سب اس کے خوف اور عذاب سے نجات پا چکے ہو۔“

حجاج نے دوسرے غلام کو حکم دیا۔ ”اب تو جا اور شہیب کے داؤد کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کو ہلاک کر دے۔ اگر تو اس میں کامیاب ہو گیا تو میں تجھے آزاد بھی کر دوں گا اور کسی بلند منصب پر فائز بھی کر دوں گا۔“

غلام جوش اور جذبے سے آگے بڑھا۔ شہیب نے ایک دوسرے شاندار شخص کو جھوٹے ہوئے آتے جو دیکھا تو یہ سمجھ بیٹھا کہ شاید حجاج وہ نہیں تھا جو ملکہ حجاج ہے جو اب اس کے مقابلے پر آیا ہے۔ وہ پچھلے جوش و خروش سے اس کی طرف بڑھا اور پے در پے وار کرنے لگا۔ غلام بھی معمولی شمشیر زن نہیں تھا۔ اس نے بھی بڑی ہوشیاری اور مہارت سے شہیب کا مقابلہ کیا۔ شہیب نے کہا۔ ”انہوں نے میں نے تجھ سے پہلے جس شخص کو حجاج کے دھوکے میں قتل کیا تھا، وہ وہ نہیں کوئی اور ہی تھا۔ لیکن خیر، اب تو مقابلے پر آیا ہے تو میری تلوار کا مزہ چکھ۔“

غلام نے بھی یہی تاثر دیا کہ وہ حجاج ہے، بولا۔ ”شہیب! کیا تو مجھے کوئی معمولی شخص سمجھتا ہے؟ یاد رکھ کہ میں جانی ہوں اور تیری موت میرے ہی ہاتھوں میں لگی ہوئی ہے۔“

شہیب نے کہا۔ ”انہوں نے تو انسان ہو کر خدائی کا دعوے دار ہے۔ ورنہ تو یہ فضول بات بھی نہ کہتا کہ میری موت تیرے ہاتھوں لکھی گئی ہے۔“

غلام نے ہنس کر جواب دیا۔ ”اس میں کیا ہے، ابھی پتا چلا جاتا ہے کہ کس کی موت کس کے ہاتھ لکھی گئی ہے۔“

حجاج ان کی باتوں اور جذبوں سے خاصا متاثر تھا۔ اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ”مجھے میری کرسی سمیت آگے بڑھاؤ۔ یہاں تک کہ میں اس مسجد کے قریب ہو جاؤں کیونکہ میں خوب جانتا ہوں کہ جب میں اس مسجد کے پاس پہنچ جاؤں گا تو گویا فتح میری ہی ہوگی۔“ اس کی کرسی ذرا آگے بڑھا دی گئی۔

حجاج کا غلام طہمان اور شہیب کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے سے ٹکرائے اور پھر شہیب نے اس کا بھی کام تمام کر دیا۔ حجاج کا غلام طہمان زخمی ہو کر جیسے ہی گرا، شہیب نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”دوستو! اگر یہ شخص حجاج تھا تو میں نے اسے بھی ہلاک کر دیا۔“

لیکن شہیب کے کسی ساتھی نے کرسی پر بیٹھے ہوئے حجاج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یا امیر! امومنین!

آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ حجاج تو دور رہا جو کرسی پر حکمت سے بیٹھا ہے۔

شہیب نے دور سے حجاج کو دیکھا اور بڑے اطمینان سے کہا۔ ”خیر اگر حجاج ابھی زندہ ہے تو شاید اپنے انجام کو پہنچنے کے لیے اور اللہ نے چاہا تو اس کو دکن قلعہ وغیرہ میں ہی نجات دلاؤں گا۔“

دوسری طرف حجاج اپنی فوج سے کہہ رہا تھا۔ ”اے اطاعت شعار اور فرماں بردار! تم ثابت قدم رہو اگر تم نے میرا کہنا مانا تو میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہمارے اور فوج کے درمیان کوئی شے حاصل نہیں رہے گی۔“

ابھی حجاج کا خطاب پورا بھی نہ ہوا تھا کہ شہیب نے ان پر ہنسنے لگا اور کہا۔ شہیب اپنے چہرہ پر مسکرتہ ہو کر آ رہا تھا لیکن حجاج کی موجودگی نے اس کی سیاہی کے حوصلے بلند کر دیے تھے۔ دھوپ کی چمک میں ہتھیار نظروں کو خیرہ کر رہے تھے۔ دونوں طرف سے تلواریں و نیزے اور تیر انسانوں کو ہلاک اور زخمی کر رہے تھے۔ شہیب اور اس کے ساتھیوں کی ساری کوشش حجاج نے خاک میں ملا دی تھی اور وہ خارجیوں کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ جیسے جیسے خارجی ہتھیاروں سے تھے، حجاج کی کمری ہتھیار کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ شہیب نے اپنے ساتھیوں کو جوش بولا۔

”اے اللہ کے دوستو! اب گھوڑوں کی پشت پر سوار رہنے کا وقت نہیں رہا۔ نیچے آ جاؤ اور حجاج کی سپاہ کو مسجد کی طرف بڑھنے سے روک دو۔“

ہارون نے حجاج سے اجازت طلب کی۔ ”امیر! میں اس خارجی سردار کو موت کے کھاتے اتار کر امر ہو جانا چاہتا ہوں۔“ حجاج نے جواب دیا۔ ”پھر انتظار کس بات کا ہے، آگے بڑھ اور آپ شجاعت سے اس شعلہ جوار کو سرد کر دے۔“

تلوار کی نوک اس کے سینے پر رکھ دی اور حکماً کہا۔ ”بھاگنے کی کوشش مت کر، چپ چاپ کھڑا رہ ورنہ ہلاک کر دیا جائے گا۔“

اس شناسا آواز نے ہارون کے دل کی دھڑکن تیز کر دی اور اس نے بے اختیار اس نوجوان کی طرف دیکھا اور خوشی میں چلا یا۔ ”ارے، عامر یہ تو ہے..... مگر تو یہاں کہاں؟“

عامر کی تلوار کی نوک اب بھی ہارون کے سینے میں چبھ رہی تھی۔ عامر نے جلدی جلدی کہا۔ ”افسوس کہ میں باپ ہونے کے باوجود تجھ کو معاف نہیں کر سکتا کیونکہ تو غلطی سے عبدالملک بن مروان کو مسلمانوں کا امیر المومنین بھجھتا ہے اور میں شہیب کو اپنا امام بھجھتا ہوں۔“

اتنی دیر میں دوسرے خارجی بھی ان دونوں کے آس پاس جمع ہو گئے اور ہارون پوری طرح ان کے قابو میں چلا گیا۔ عامر نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”دوستو! آؤں کہ ہر قسم کے امیر میرا باپ ہے اس لیے میں اس کو ہلاک نہیں کر سکتا۔ گرفتار کر کے امیر المومنین شہیب کے حوالے کر دوں گا وہ جو سزا تجھ پر کرے گی، وہ دے دی جائے گی۔“

لیکن انہی میں سے ایک اور شناسا نوجوان ہارون کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ یہ ابراہیم، عامر کی سوتیلی ماں کا بیٹا تھا۔ ہارون ایسا ہی ہتھیار بھجھتا تھا۔ وہ اللہ کی قسم کھاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں؟“

عامر نے پھر جواب دیا۔ ”ہاں، اب ابراہیم بھی ہمارے ہی ساتھ ہے۔ ہم لوگوں نے اپنی اپنی دنیا، آخرت کے لیے فروخت کر دی ہے اس لیے ہمارے دلوں سے رشتوں کا احترام بھی نکل گیا۔“

حجاج دور سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہارون کو گھوڑے سمیت گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ”اے اللہ کے بندو! تمہارا ایک بھائی مصیبت میں گھر گیا ہے، فوراً اس کی مدد کو پہنچو۔“

شامی سپاہ کا ایک دستہ دیوانہ وار آگے بڑھا اور آٹا قافا ہارون سمیت کئی خارجیوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ حجاج کے کئی اور دستے مختلف سمتوں سے بڑھ کر وہیں پہنچ گئے اور خارجیوں کو بھاگنے کا موقع نہیں دیا۔ اب اپنا سلیٹ چکا تھا۔ عامر نے اپنی تلوار کی نوک سینے سے ہٹا کر شامیوں سے مقابلہ کرنا چاہا مگر شامیوں نے کندیں چھیک چھیک کر انہیں گرفتار کر لیا۔ انہی میں عامر اور ابراہیم بھی شامل تھے۔ ہارون نے اپنے دونوں بیٹوں کو رسیوں میں جکڑا ہوا دیکھا تو بے چین ہو گیا۔

عشقِ نا تمام

شہیب نے اپنے آدمیوں کو گرفتار ہوتے دیکھ کر شامی دے پریلغار کر دی لیکن اتنی دیر میں حجاج شامیوں کو طاقت ور ملک پہنچا چکا تھا۔ اس کی کمک نے خوارج کو تلواروں کی دھار پر رکھ لیا اور اس میں شہیب کا بھائی مصداقل کر دیا گیا۔ خوارج نے خود کو جمع کر کے فیصلہ کن وار کیا مگر شامیوں نے انہیں شکست دے دی۔ شہیب نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ ”اے اللہ کے دوستو! اپنے بہترین وقت کی توقع میں بدترین محلوں سے منہ موڑ لو۔ شاید آنے والے لاکھ ہمارے لیے نفع بخش اور مفید ہو۔“

خوارج پیچھے ہٹے۔ حجاج اپنی کرسی کو آگے بڑھا تا رہا۔ یہاں تک کہ شہیب اپنے ساتھیوں سمیت پیچھے ہٹ گیا اور حجاج مسجد کے قریب پہنچ کر کرسی سے اتر پڑا۔ وہ مسجد کے قریب جا کھڑا ہوا اور اعلان کیا۔ ”اے اطاعت شعار! اس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں حجاج کی جان ہے۔ یہ پہلی فتح ہے جو ہمیں حاصل ہوئی۔“

پھر وہیں آدمیوں کے ساتھ مسجد میں داخل ہو گیا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ”دوستو! تم اپنے اپنے چلوں میں تیر لگائے رکھو اور جب یہ دیکھو کہ خارجی ہماری طرف بڑھ رہے ہیں تو انہیں تیروں کی پوچھاڑ سے روک دو۔“

شہیب نے حجاج کو مسجد میں داخل ہوتے دیکھا تو ہاتھوں کو ملوایا۔ وہ راتے جھڑنے دریا کی طرف بڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنے ساتھیوں سمیت دریا پار اتر گیا۔ جب وہ سب دریا پار اتر گئے تو شہیب نے ہلے خود ادا کیا تاکہ اموی سپاہ اس کا تعاقب نہ کر سکے۔

حجاج قیدیوں کو لے کر اپنے محل میں واپس چلا گیا۔ ہارون اپنے دونوں بیٹوں کی محبت میں حجاج سے جدا نہیں ہونا چاہتا تھا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ حجاج سخت ظالم اور سفاک انسان ہے، وہ معاف کرنے کا قائل ہی نہیں۔

حجاج نے امیر خوارج کو قید خانے میں ڈلوادیا اور خود آرام کرنے کے لیے اندر جانے لگا۔ اس نے اپنی سپاہ کا ایک طاقت ور دستہ طلبا یہ گردی کے لیے چھوڑ دیا اور اس طلبا یہ گردے کا سردار ہارون کو حشر کر دیا مگر ہارون نے یہ منصب قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حجاج یہ بات کہاں برداشت کر سکتا تھا۔ غضب ناک ہو کر بولا۔ ”ہارون! میں حکم عدولی کا سخت مخالف ہوں۔ تجھے منصب قبول کرنے میں تامل کیوں ہوا؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”امیر! جب تک گرفتار خوارج کا کوئی فیصلہ نہیں ہو جاتا، میں آپ سے دور نہیں رہ سکتا۔“

حجاج نے اپنی ران پر ہاتھ مارا۔ ”میں زبان درازی بھی پسند نہیں کرتا۔ یہ میرا حکم ہے کہ تو اسی وقت طلبا یہ گردے کو لے کر دریا کے کنارے کنارے چکر لگا تا رہ کیونکہ شہیب کا کوئی پھر وسا نہیں، وہ ہماری غفلت سے کسی وقت بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔“

لیکن ہارون نے اٹل لہجے میں جواب دیا۔ ”لیکن میں نے کہہ جو دریا میں اس وقت تک آپ کے قریب ہی رہوں گا جب تک گرفتار خوارج کا کوئی فیصلہ نہیں کر دیا جاتا۔“ حجاج نے کڑھکی سے پوچھا۔ ”ان سے تیرا تعلق، ان سے تیری دلچسپی کا سبب؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی داستان کا کچھ حصہ آپ کے گوش گزار دوں پھر آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ مجھے ان گرفتاروں سے دلچسپی کیوں ہے؟“ حجاج نے ہارون کو قہر کی نظروں سے دیکھا۔ ”اچھا بتا مگر مختصر اجمالاً کیونکہ میں داستان کوئی بالکل پسند نہیں کرتا۔“

ہارون نے نہایت اختصار سے اپنی روداد سنائی۔ حجاج بڑے انتہاک سے سنا رہا۔ آخر میں جلدی جلدی پلکیں جھپکائیں اور دشتی سے کہا۔ ”افسوس کہ تو فوج کی سرداری کا منصب کس طرح سنبھالے گا کیونکہ تو وہ تالاف نہیں ہے جو اس منصب کے لیے ضروری ہے۔“ حجاج نے جواب دیا۔ ”اب میں اپنے آپ پر بھی لعنت بھیجتا ہوں کہ میں نے تجھ کو مجھے میں اتنی بڑی غلطی کیوں کی۔ میں تجھے طلبا یہ گردے کی سرداری سے محروم کر رہا ہوں۔“ اس کے بعد اس نے ایک دوسرے شخص کو سردار بنا کر روانہ کر دیا اور ہارون سے کہا۔ ”اب تو یہاں سے وفغان ہو جا، میں تیرے سائے تک سے بچتا چاہتا ہوں، اپنی فوج سمیت۔“

ہارون نے حجاج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ حجاج نے اس کی آنکھوں میں تری محسوس کر لی، بولا۔ ”تو عورتوں کی طرح رویوں رہا ہے، ان آنسوؤں کا مطلب؟“ ہارون نے جواب دیا۔ ”امیر! میں اپنے دونوں بیٹوں کے سلسلے میں آپ کی نظر کرم کا خواہاں ہوں۔“ حجاج نے کہا۔ ”ہاں، میں ان پر رحم کروں گا۔ ان پر بھی اور تجھ پر بھی۔“

ہارون فرط خوشی سے مسکرا اٹھا۔ ”امیر! میں آپ کے رحم و کرم کا پیشگی شکر یہ ادا کرتا ہوں۔“

حجاج نے جواب دیا۔ ”کیسا شکر یہ؟ کیسا رحم؟ میں نے تو یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں ان دونوں تالاف اولادوں سے

تیرا چچا چھڑا دوں۔ میں کل صبح ہی ان دونوں کو قتل کروا دوں گا تاکہ تیرا دل ان دونوں کی طرف سے اور زیادہ سخت ہو جائے اور ان نالائقوں سے تیرا ہمیشہ کے لیے چچا جھوٹ جائے۔

ہارون تملکا کر کھڑا ہو گیا۔ ”امیر! میں ان دونوں کا باپ ہوں۔ میں یہ نہیں برداشت کر سکتا کہ میری دونوں اولادیں میری نظروں کے سامنے قتل کر دی جائیں۔“

حجاج نے سختی سے کہا۔ ”تو تمس واپس جا اور اپنے دونوں بیٹوں پر صبر کر لے۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”امیر! میں ان کی طرف سے رحم کی درخواست کر رہا ہوں۔“

بردار کھڑے تھے۔ ہارون اور چند دوسرے منصب دار حجاج کے محل کے در پر در بانوں کی طرح کھڑے اس کی آمد کے منتظر تھے کیونکہ یہ لوگ امیر خوارج کے لیے مقدمے سے پہلے ہی معافی کی یقین دہانی حاصل کر لیتا چاہتے تھے۔

کچھ دیر بعد جب پہرے دار ایک دم مستعد اور جاق و چوبند ہو گئے، ہارون اور دوسرے منصب داروں کو معلوم ہو گیا کہ حجاج کہیں قریب ہی موجود ہے اور مقرب نمودار ہونے والا ہے۔ کچھ دیر بعد حجاج اس طرح نمودار ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ نلے قدم اٹھاتا ہوا نلے نکل رہا تھا اور اس کے دائیں بائیں دو دو قدم پیچھے چار قاضی اپنے مخصوص لباس میں سر جھکا کر چل رہے تھے۔ ایک قاضی کے دائیں ہاتھ میں کاغذ کے چند روٹے دبے ہوئے تھے اور ایسے ہی چند اور روٹے ایک دوسرے قاضی کے بائیں ہاتھ میں تھے۔

ہارون اور اس کے پاس کھڑے ہوئے منصب داروں نے حجاج کا دامن پکڑنا چاہا مگر حجاج کے محافظوں نے انہیں مار مار کر روک دیا۔

حجاج کسی کی پروا کیے بغیر خوارج کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ایک خدمت گار نے اس کے پیچھے کرسی رکھ دی۔ حجاج اس پر بیٹھ گیا مگر چاروں قاضی محراب کھڑے رہے۔

حجاج نے ایک خدمت گار کو حکم دیا کہ باری باری تمام خارجی اس کے رو برو لائے جائیں۔ یہ کل ساتیس خارجی تھے۔

جب ایک خارجی حجاج کے رو برو کھڑا کیا تو حجاج نے پوچھا۔ ”او بے دین! دشمن خدا اور ہرگز نہ بدلتا تیرا شیب کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

خارجی نے جواب دیا۔ ”وہ امیر المومنین اور امام ہدای ہیں۔“

حجاج نے پوچھا۔ ”اور امیر المومنین حضرت عبدالملک بن مروان کے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟“

خارجی نے جواب دیا۔ ”خدا اس کو ذلیل اور رسوا کرے تو نے امام ہدای کے مقابلے میں کس گمراہ کا نام لے لیا۔“

حجاج نے بائیں ہاتھ کے روٹے والے قاضی سے ایک پرچہ لے لیا اور اس خارجی کے حوالے کر دیا اور کہا۔ ”اس میں تیری سزا لکھ دی گئی ہے۔ چند لمحہ صبر کر پھر میرا جلاہ کوئی درہ بردار اس پرڑے میں لکھی ہوئی سزا کے مطابق تجھے نواز دے گا۔“

اس کے بعد حجاج کے رو برو دوسرا قیدی پیش کیا گیا۔ حجاج نے اس سے بھی اسی قسم کے سوالات کیے۔ اس نے بھی بڑی دلیری سے ویسے ہی جوابات دیے جو اس کا پیش رو

دے چکا تھا۔

زخمی ہارون بھاگتا ہوا آیا اور اپنے بیٹوں کے پاس کھڑا ہو گیا۔ حجاج کے آدمیوں نے ایک بار پھر زد و کوب کرنا شروع کر دیا۔ وہ ہارون کو یہاں سے ہٹانا چاہتے تھے لیکن حجاج نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے آدمیوں کو منع کر دیا کہ وہ ہارون کو جہاں کھڑا ہے کھڑا رہتے دیں۔

ہارون نے سر کوئی میں اپنے دونوں بیٹوں کو سمجھایا۔ ”بیٹو! خبردار جو تم نے حجاج کی مخالفت کی۔ تم دونوں خوب سوچ سمجھ کر دیکھو دینا جس سے وہ خوش ہو جائے ورنہ حجاج سے رحم کی امید کرنا حماقت ہے۔“

عامر نے جواب دیا۔ ”لیکن باوا جان! میں جھوٹ نہیں بول سکتا کیونکہ جھوٹ بولنا زنا سے بڑا گناہ ہے۔“

ہارون نے ابراہیم سے پوچھا۔ ”ابراہیم! کیا تو نے میری بات سنی؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ہاں میں نے آپ کی باتیں سن لی ہیں۔“

ہارون نے کہا۔ ”چنانچہ حجاج کو اس کے سوالوں کے ویسے ہی جواب دینا جس سے وہ خوش ہو جائے۔“

ابراہیم نے جواب دیا۔ ”باوا جان! آپ کس دنیا میں رہتے ہیں؟ آپ لوگ وقتی فائدوں کے زیر اثر جھوٹے بول دینا آسان اور جاہل دیکھتے ہیں جبکہ ہمارا ایمان یہ ہے کہ گردن کوچ پر قربان کر دوں۔“

ہارون قہقہہ مار کر رو دیا۔ ”او اپنے باپ کی دشمن اولاد! میں جانتا ہوں کہ تم دونوں بے دین اور گمراہ ہو چکے ہو اور میری باتیں کسی طرح بھی نہیں مانو گے اور اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم دونوں کے ساتھ میں بھی مار دیا جاؤں گا۔“

حجاج نے دور ہی سے ڈانٹا۔ ”او ذلیل اور خائفان بر باد ہارون! تو کیا اور غلارہا ہے۔ ادھر میرے پاس آ جا ورنہ میں تیرے بیٹوں کو بدترین سزا دے بیٹھوں گا۔“

ہارون نے اپنے بیٹوں سے مزید کہا۔ ”بیٹو! مناسب تو یہی ہے کہ تم دونوں وہی کچھ کہو جو میں نے کہا ہے۔ ویسے تمہاری مرضی۔“ پھر آنکھوں سے آنسو پڑنے والے آنسوؤں کو اپنے دامن سے پونچھتا ہوا حجاج کے پاس چلا گیا۔

حجاج نے طنز کیا۔ ”او عالم انسان! جن بیٹوں کو تو شب دروز اپنے پاس رکھ کر خارجی بننے سے نہیں روک سکا، اب انہیں چند گھنٹوں کے ذریعے خارجیت سے منحرف کس طرح کر دے گا؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”آپ درست کہتے ہیں،

عشقی نامہ

میں غلطی پر ہوں۔“

حجاج باری باری خارجیوں کو بلاتا اور سوال کرتا رہا اور آخر میں کسی کو بائیں ہاتھ کا کاغذ تھما دیا اور کسی کو دائیں ہاتھ والا۔ یہاں تک کہ عامر کی نوبت آ گئی اور اس کو حجاج کے رو برو پیش کر دیا گیا۔ ہارون نے اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں اور دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں کیونکہ وہ حجاج اور عامر کے سوال و جواب کی اذیت سے بچنا چاہتا تھا اور ان دونوں کے چہروں کے تکلف دہ تاثرات کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھنا چاہتا تھا چنانچہ اس کو کچھ پتا نہ چلا کہ حجاج اور عامر میں کیا باتیں ہوئیں۔

کچھ دیر بعد جب ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں اور دونوں کانوں میں سے انگلیاں باہر نکال لیں تو اس نے دیکھا کہ عامر اور ابراہیم سزا کی پرچیاں سنبھالے دوسرے خارجیوں کے ساتھ کھڑے ہیں۔ حجاج نے ہارون سے کہا۔ ”او بزدل شخص! افسوس کہ تیرے دونوں بیٹے ہی خارجی نکلے۔ میں نے آج پہلی بار اپنی مرضی کے خلاف عامر کو سزا سے موت نہیں دی لیکن اسے معاف بھی نہیں کیا۔ میں نے ہر اس شخص کے ہاتھ میں اس کی سزا کا پرچہ تھما دیا ہے۔ افسوس کہ ابراہیم نے مجھ سے چند گستاخیاں کیں اور میں نے اس کو وہ سزا دے دی کہ وہ سزا دے کر بے رحمی یا در کھائے گا۔“

ہارون نے ڈرتے ڈرتے اجازت مانگی۔ ”یا امیر! کیا میں ان دونوں سے آخری باہل لوں؟“

حجاج نے جواب دیا۔ ”ضرور ملے، میں نے تجھ کو ملنے سے منع تو نہیں کیا۔“

ہارون لرزتا کانپتا ہوا آہستہ آہستہ اپنے بیٹوں کے پاس پہنچا اور عامر سے کہا۔ ”عامر! اپنی سزا کا پرچہ مجھے تو دکھانا۔“

عامر نے اپنا پرچہ باپ کو دے دیا۔ ہارون نے بڑی بے چینی سے اس کو کھولا۔ اس میں بس ایک فقرہ لکھا تھا۔ ”فقط پندرہ درے۔“

ہارون کے خوشی سے آنسو نکل آئے، سجدے میں گر گیا۔ کچھ دیر بعد سر اٹھا دیا اور ابراہیم سے کہا۔ ”ابراہیم! اپنا پرچہ تو دکھانا ذرا۔“

ابراہیم کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس نے مردہ دلی سے اپنا پرچہ باپ کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس میں بس ایک ہی لفظ لکھا تھا۔ ”قتل۔“

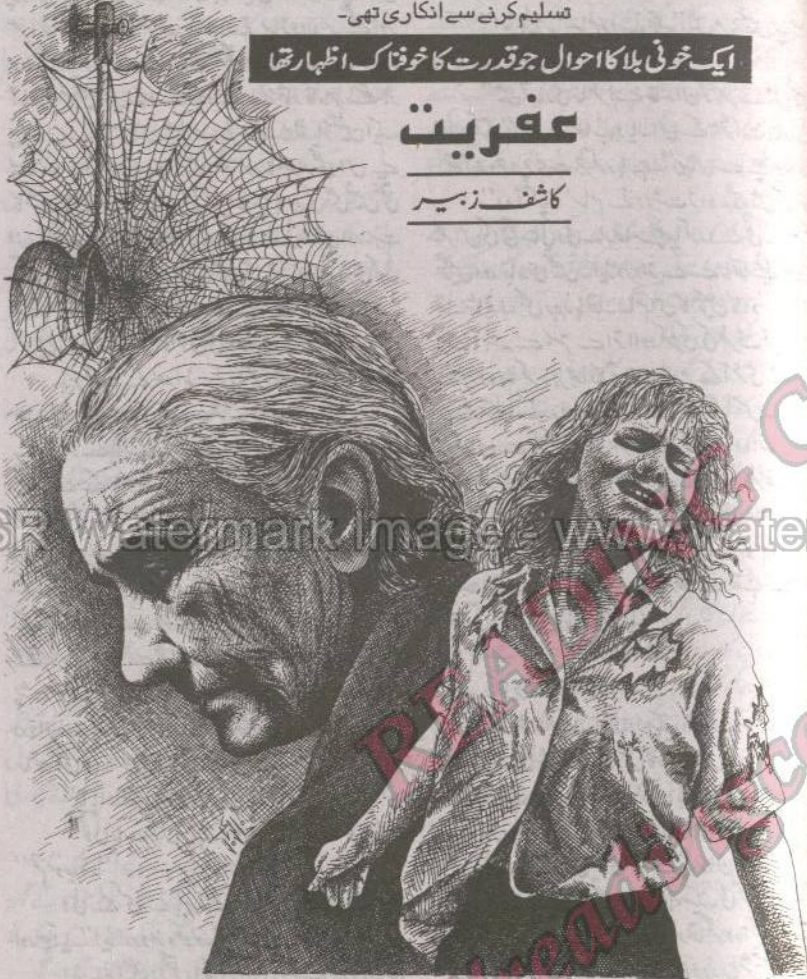
ہارون کا دل ڈوبنے لگا، آنکھوں تلے اندھیرا پھیلنے لگا۔ اس کے پیروں کی جان نکل گئی تھی اور پنڈلیاں بری طرح سنسنا رہی تھیں۔ اس نے ابراہیم کی ہمت بندھائی۔

ممتا چاہے انسان کی ہو یا کسی درندے کی... دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی اولاد کو کسی صورت چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتی۔ کچھ یہی حال اس کا بھی تھا جس نے ایک عفریت کو جنم دیا اور اس کی تمام مصیبتوں کو جھیلنے ہوئے اسے ہر حال میں زندہ رکھنا چاہتی تھی... لیکن زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر اس کی دیوانی ممتا اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری تھی۔

ایک خونی بلا کا احوال جو قدرت کا خوفناک اظہار تھا

عفریت

کاشفِ زبیر



اکتوبر 1956ء

چیک کیا اور اپنی بیوی ماتھا سے کہا۔ ”میں باہر جا رہا ہوں۔ تم دروازہ بند کر لو اور میری آواز سے بغیر دروازہ مت کھولنا۔“ ماتھا نے سر ہلایا۔ وہ خوف زدہ تھی مگر اس نے وہی کیا جو شوہر نے کہا تھا۔ ایڈ کے باہر جاتے ہی اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ باہر ہلکا سا طوفان آیا ہوا تھا۔

نخا حنیف دیکھ رہا تھا کہ اس کا باپ ایڈ سخت مضطرب ہے۔ اس نے تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کر دیے تھے۔ اگرچہ موسم کی وجہ سے کھڑکیاں پہلے ہی بند تھیں مگر اس نے ان کی پتھیاں بھی لگا دیں۔ پھر اس نے اپنی رائفل اٹھا کر اسے

اور اپنا پرچہ مجھے دے دے تاکہ میں تیرے لیے رحم کی درخواست کر کے حجاج کے پاس جاؤں۔“ ابراہیم نے اپنا پرچہ عامر کو دے دیا اور عامر کا پرچہ خود لے لیا۔

اتنی دیر میں قاضی حجاج کا حکم پہنچا چکا تھا اور درے بردار بڑی سرعت سے اس کی ٹیل میں لگ گئے تھے۔ قاضی ایک ایک کے ہاتھ سے پرچہ لیتا اور اس میں لکھی ہوئی سزا پڑھ کر جلا دیا اور درے بردار کی طرف بڑھاتا۔ جلا فوراً ہی گردن باریتا اور درے بردار درے لگنے لگتا۔

یہاں تک کہ ابراہیم کی باری بھی آگئی اور اس کا پرچہ پڑھ کر اسے درے بردار کے حوالے کر دیا گیا۔ دروں کی ضربات سے جو چیش نکل رہی تھیں، انہیں سن کر ہارون نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے بیک وقت دو منظر دیکھے۔ ایک تو دروں کی شاپ اور زنجیوں کے ادھر ادھر کرنے اور بھانسنے کا منظر اور دوسرا یہ کہ جلا بڑی سفاکی سے گردنیں مارنے کا فریضہ نہایت خشوع و خضوع سے انجام دے رہا تھا۔ ہارون نے حجاج سے درخواست کی۔ ”یا امیر! میرے بیٹے ابراہیم پر رحم بھیجیے۔“

حجاج نے اس کو ایک بار پھر ڈانٹا۔ ”تو خاموش بیٹھا رہ۔ میں جب تک سارے مقدموں کے فیصلے نہیں کر چکوں گا تیری درخواست پر غور نہیں کروں گا۔“ ہارون بدحواس، افسان و تیز اس شکل میں پہنچا۔ اس وقت جلا اپنی کٹواریں بند کر چکا تھا اور کٹواریں کے سائے میں عامر سر جھکاے کھڑا تھا۔ ایک جھپٹے میں کٹواریں پوری قوت سے نیچے آئی اور عامر کے سر کو تن سے جدا کر کے دوسری طرف پھل گئی۔ ہارون چیخ مار کر گر گیا۔ وہ بس ایک ہی فقرہ ادا کر سکا۔

”اس کو کیوں مارتے ہو، یہ تو قتل کا مستوجب نہیں تھا۔“ ہارون بے ہوش ہو گیا اور ابراہیم پندرہ درے کھا کر سسکیاں لیتا ہوا بے ہوش باپ اور بے سر کے بھائی کے لاشے پر بیٹھ گیا۔ وہ سسکیاں لے لے کر رو رہا تھا اور دیکھنے والوں کو کچھ پتا نہ تھا کہ یہ سسکیاں دروں کے زخم سے نکل رہی ہیں یا اپنے عقیم بھائی کے عقیم الشان ایثار پر دل کی گہرائیوں سے۔

(ختم شد)

”ابراہیم بیٹے! تم گھبرا مت۔ میں حجاج کے پاس واپس جا رہا ہوں۔ میں اس کے قدموں میں گر کر تیرے لیے رحم کی بیگ مانگوں گا۔“

ابراہیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہارون لوٹھراتا، ڈنگاتا حجاج کے پاس پہنچا اور بڑی رقت سے درخواست کی۔ ”امیر رحم! میرے بچے ابراہیم پر رحم کر۔ اس کی موت سے ہم دونوں ہی بے موت مرجائیں گے۔“ حجاج نے درشت آواز میں حکم دیا۔ ”ہارون! تو ایک طرف چپ چاپ بیٹھ جا۔ پہلے بقیے کے فیصلے بھی ان کے ہاتھوں میں تھا، اس کے بعد تیری درخواست پر غور کروں گا۔“

دل گرفتہ ہارون دل میں امید کی شمع جلا کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ فرط غم سے دونوں آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ معلوم نہیں کیا کیا سوچتا رہا۔

حجاج نے بے نیازی سے ہارون کی طرف دیکھا اور ایک قاضی کو اشارے سے پاس بلا کر اس کے کان میں کہا۔ ”جا اور جلا د اور درے والوں سے کہہ دے کہ جن جن کو سزاؤں کے پرچے مل چکے ہیں، ان پر فوراً عمل کیا جائے۔“

قاضی دبے قدموں جلا د اور درے برداروں کی طرف چل دیے۔ دوسری طرف عامر اور ابراہیم ایک دوسرے کو عجیب کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ عامر نے پوچھا۔ ”ابراہیم! کیا بات ہے تو بہت ڈرا سا نظر آتا ہے۔ کیا موت سے ڈر گیا؟“

ابراہیم واقعی رو رہا تھا، بولا۔ ”بھائی، میں موت سے نہیں ڈرتا۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ میری ماں تک جب میرے قتل کی خبر پہنچے گی تو اس کا کیا حال ہوگا۔“ عامر کو اپنی سوتیلی ماں میزہ کے ظلم و ستم یاد آئے اور ذرا سی دیر کے لیے میزہ کے بچکن چہرے سے اس نے ایک قسم کی خوش محسوس کی۔ وہ عکسین چہرہ تصور میں قبل از وقت ہی نظر آ رہا تھا۔

عامر نے پوچھا۔ ”پھر تو کیا چاہتا ہے؟“ ابراہیم نے جواب دیا۔ ”بھائی! میں اپنی ماں کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں، اپنی ماں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔“ عامر، ابراہیم کو کچھ دیر دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ اس کے بعد اپنا پرچہ ابراہیم کو دے دیا۔ ”لے، اسے رکھ لے“

بلا و فلسطین و شام، جی، ای اسٹریٹج، فتوح البلدان، بلاذری، تمدن اسلام، جرجی زیدان، تاریخ طبری، طبری، تاریخ ابن خلدون، ابن خلدون، تاریخ شام، فلپ کے حسی۔

ساختات

سو کھے پتے اڑ رہے تھے اور ہوا میں کاٹ دار ٹھنڈک تھی۔ چند منٹ بعد شاید موسم کی پہلی برف باری ہو جاتی۔ بولڈ ماؤنٹین نامی یہ علاقہ نیویڈا کی ریاست میں کیلیفورنیا کی ریاست کے ساتھ صحرا اور پہاڑوں کے ملاپ پر واقع تھا۔ ایک طرف خشک جھاڑیوں اور ریت پر مشتمل صحرا تھا اور دوسری طرف بلند ہوتے پہاڑوں پر گھنے اور اونچے درختوں والے دلدلی جنگل تھے۔ یہاں باقاعدہ آبادی کم تھی لیکن چھوٹے چھوٹے بے شمار فارمز تھے جو پہاڑوں کے دامن میں پھیلے ہوئے تھے۔ بولڈ ماؤنٹین ایک پسماندہ علاقہ تھا۔ یہاں زمین بخر اور ناہوار تھی اس لیے کاشت کاری محدود تھی اور کوئی صنعت یا کان کنی بھی نہیں تھی اس لیے علاقے میں غربت زیادہ تھی۔ دلدلی زمین اور بہت گھنے جنگلات کی وجہ سے سیاح نہیں آتے تھے اور نہ ہی کوئی ایسا جانور تھا جس کے شکار کے لیے شکاری یہاں کا رخ کریں۔ باہر سے آنے والوں کی تعداد بہت محدود تھی باہر آنے کے بعد ایڈ نے رائفل شانے پر لٹکا کی اور سب سے پہلے اپنے پیک اپ ٹرک کی چابیاں نکال کر اس کے دروازے لاک کر دیے پھر وہ باہر ریٹنگ سے بندھے گھوڑے کے پاس آیا جو بے چین سا تھا۔ اسے کھول کر وہ اندر اسٹبل میں لے گیا اسے فائدہ کھانے اور اسٹبل کا دروازہ باہر سے بند کیا اور پھر احاطے کا کھلا گیت بھی بند کر کے اس پر زنجیر لگا دی۔ آخر میں اس نے پورے فارم کا ایک چکر لگایا۔ اپنے مویشی اس نے پہلے ہی بند کر دیے تھے۔ موسم شام سے خراب تھا مگر اس کی احتیاط کے پس پشت صرف موسم کا فرما نہیں تھا۔ یہ کام نٹا کروہ اندر آیا اور دروازہ بند کر کے اس پر بلی بھی لگا دی۔ مارتھا جیف کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے ماں سے پوچھا۔

”کونسی بات نہیں ہے۔“ مارتھا نے اسے تسلی دی۔

”تم سو جاؤ۔“

اسی لمحے کسی نے باہر سے زور و شور سے دروازہ بجایا اور چلایا۔ ”ایڈ! دروازہ کھولو۔“

ایڈ نے اپنی رائفل اٹھائی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ باہر موجود آدھی پھر چلایا۔ ”ایڈ! یہ میں ہوں سام تمہارا دوست۔۔۔۔۔ خدا کے لیے دروازہ کھول دو۔“

”سام۔۔۔۔۔ یہ سام ہے۔“ مارتھا نے کہا۔

”چپ رہو اور جیف کو دیکھو۔“ ایڈ نے درشت لہجے میں کہا۔ سام مسلسل التجا میں کر رہا تھا۔

”پلیز ایڈ۔۔۔۔۔“ مارتھا نے کہا مگر ایڈ نے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ اس نے دروازے کے پاس جا کر بلند آواز سے کہا۔

”سام! یہاں سے چلے جاؤ۔ میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔“

”ایڈ پلیز۔“ سام رونے لگا۔ ”میں مرنا نہیں چاہتا۔ وہ میرے پیچھے ہے۔“

”میں تمہاری خاطر اپنے خاندان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔“ ایڈ نے جواب دیا۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ خود پر بہت جبر کر رہا ہے۔ ”یہاں سے چلے جاؤ۔“ وہ آگیا۔ ”سام نے وہشت زدہ لہجے میں کہا اور پھر اس کی چیخ سنائی دی۔ مارتھا متھپچھا کر رونے لگی۔ سام کی چیخیں دور جا رہی تھیں۔ ایڈ دروازے سے مارتھا کی طرف دیکھتا تھا۔ شاید وہ بھی رو رہا تھا۔ سام اس کا بچپن کا دوست تھا۔ جیف آہستہ سے بستر سے اتر اڑا اور کھڑکی کی طرف آیا۔ اس نے پردہ ہٹا کر باہر جھانکا تو اسے فارم کے آخری حصے میں بڑے پھل کے درخت کے ساتھ وہ نظر آگیا جس نے سام کو گردن سے پکڑ کر کچے کی طرح لٹکا رکھا تھا۔ وہ انسان جیسا ہی تھا مگر اس کا سر بہت بڑا تھا اور شانے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ اس کا سر اسٹبل کے دروازے سے باہر نکلا تھا۔ اس کی گرفت میں بڑپ رہا تھا۔ اچانک اس نے سام کو کھینچ کر درخت پر دے مارا اور اسی لمحے مارتھا نے عقب سے آکر جیف کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

☆☆☆

اکتوبر 1984ء

رک ڈرائیو کر رہا تھا اور میک اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ یہ میک کی شاندار اسپورٹس کار تھی۔ اس نے آگے مارش کی پیک اپ پر ان کی دودھ وٹریل بائیک سوار تھیں۔ ایک اب مارش چلا رہا تھا اور اس کے ساتھ اس کی گرل فرینڈ تھیں۔ میک کی کار میں پچھلی نشست پر رون اور ایملی بیٹھی آپس میں بات کر رہی تھیں۔ رون، میک کی گرل فرینڈ تھی جبکہ ایملی اور رک کے درمیان کچھ چکر تھا مگر وہ ابھی واضح ہو کر سامنے نہیں آئی تھا۔ رک اور ایملی دونوں شرمیلی فطرت کے تھے۔ رک اور میک کا کارن شی میں گاڑیوں کا شور دم وراشت میں ملتا تھا۔ سیٹ اپ اچھا تھا اور انہیں کاروبار میں زیادہ سرکھپا نہیں پڑتا تھا۔ دونوں بھائی تفریحات اور خاص طور سے بائیک رائیڈنگ کے دیوانے تھے۔ اس وقت بھی وہ بولڈ ماؤنٹین کی طرف جا رہے تھے جہاں ٹریل

بائیک چلانے کے لیے بہت سی شاندار جگہیں تھیں۔ پہاڑوں میں میک اور رک کا ہینک سین بھی تھا۔ کارن شی یہاں سے سو کو میٹر ز دور شمال مشرق میں تھا۔

ہائی وے سے اترنے کے بعد انہیں سڑک ذرا تنگ ملی تھی مگر یہ بڑا رستہ نہیں تھا۔ دو پہر کے قریب وہ بولڈ ماؤنٹین کے پاس پہنچ گئے تھے اور اب انہیں سامان لینا تھا۔ وہ پانچ دن کے لیے یہاں آئے تھے۔ وہ کسی گرومیری اسٹور کی تلاش میں تھے۔ اچانک ایملی نے عقب سے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ ان پہاڑوں میں بسنے والے لوگ کچھ پر اسرار سے ہیں۔ وہ باہر سے آنے والوں سے گھٹنا ملتا پنڈتیں کرتے۔“

”یہ مرض امریکا میں ہر جگہ ہے۔“ میک نے کہا۔ ”لوگ باہر سے آنے والوں کو خوش آمد نہیں کہتے۔“

”ان کا طرز زندگی بھی پرانا ہے۔“ ایملی پھر بولی۔ وہ ایک اسکول میں ٹیچر تھی۔

”میں نے بھی سنا ہے لیکن وہ دور جدید کی سہولتیں استعمال کرتے ہیں جیسے ان کے کھروں میں بجلی ہے اور وہ گاڑیاں بھی رکھتے ہیں۔“ رک نے کہا۔ ”ہاں، یہ ہے کہ وہ باہر سے آنے والوں سے گھٹنا ملتا پنڈتیں کرتے۔“

”وہ دیکھو بورڈ۔“ میک نے کہا مگر مارش نے اس سے پہلے دیکھ لیا تھا۔ اس نے پیک اپ اس سڑک پر مڑو تو جس طرف بورڈ اشارہ کر رہا تھا۔ یہاں لے گرومیری کا بورڈ تھا۔ وہ خوش تھے کہ انہیں گرومیری مل گئی تھی۔ وہ ہفتے بھر کے لیے کھانے پینے کا سامان ساتھ لے کر جانا چاہتے تھے۔ مینگ کین میں کچھ نہیں تھا۔ چند منٹ بعد وہ اس چھوٹے سے اور لکڑی کے کین میں بنے گرومیری اسٹور کے سامنے تھے جس میں پھل بیزی سے لے کر نارچز اور موسم بیاں تک سب دستیاب تھا۔ وہ نیچے آئے۔ اسٹور کے سامنے بیڑھیوں پر ایک سات آٹھ سال کا بچہ بیٹھا ہوا اپنے کتے سے کھیل رہا تھا۔ وہ بال ذرا دور پھینکا اور کین بھاگ کر بال لے آتا۔ ان کی گاڑیاں رکیں تو کتا جارحانہ انداز میں ان پر بھونکنے لگا۔ بچہ اسے روک رہا تھا۔ بالآخر وہ کتے کو پکڑ کر واپس لے گیا۔ بچہ کی آنکھوں پر دیرپہ شیشے والی عینک تھی۔ میک نے اسے دیکھ کر مسخرانہ انداز میں کہا۔

”کیا تم نے کوک کی بوتل کا شیشہ فریم میں لگوا دیا ہے؟“

”میک! یہ بچہ ہے۔“ رک نے اسے خبردار کیا۔ ”اس سے اس قسم کی بات کرنا مناسب نہیں ہے۔“

”میں نے کیا کہا ہے؟“ میک کا لہجہ بگڑ گیا۔

”تم نے بہت غلط بات کی ہے۔“ ایملی بولی اور بچے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے کہا۔ ”ہائے، میں ایملی ہوں۔“

”ہائے، میں باب ہارلے ہوں۔“ بچے نے متانت سے کہا۔ ”یہ میرے ڈیڈ کا اسٹور ہے۔“

اسی لمحے دروازہ کھلا اور ایک لمبا ترنگ آدھی باہر آیا۔ اس کا چہرہ اور جسم بتا رہا تھا کہ وہ جفاکشی کی زندگی گزارتا آیا ہے بھی اس ویرانے میں کامیابی سے یہ اسٹور چلا رہا تھا۔ اس نے آواز دی۔ ”باب! یہاں سے دور مت جانا۔“

”سٹ ڈیڈ۔“ بچے نے جواب دیا۔

میک اور رون اسٹور کی طرف بڑھ گئے۔ رک اور ایملی باب سے بات کر رہے تھے جبکہ مارش اور فیرو اس پاس کا جائزہ لے رہے تھے پھر مارش نے رک سے پوچھا۔ ”تمہارا کینین یہاں سے کتنی دور ہے؟“

”زیادہ دور نہیں ہے۔ شاید آدھے یا پونے گھنٹے کا سفر اور ہے مگر یہ گاڑیاں کینین تک نہیں جا سکتیں انہیں پیچھے ہی چھوڑنا ہوگا۔“

”یہ جگہ بہت خشک ہے۔“ فیرو بولی اور دور پہاڑیوں کی طرف دیکھا۔ ”وہاں ہریالی ہے۔“

اسی اثنا میں ایک پرانا کھٹارا سا لوڈنگ ٹرک ان کی طرف آیا اور اسٹور کے سامنے رک گیا۔ ڈرائیور اس کا سامان ہٹا کر اسٹور میں پہنچانے کے بجائے ٹرک کے پیچھے سے کوئی نصف درجن بچے نیچے آئے۔ وہ برآمدے میں رکے سامان میں چیمپر چھڑا کرنے لگے۔ ایک بچہ ٹرک کی طرف آیا تو ان میں سے سب سے بڑے لڑکے نے اسے پکڑ لیا۔ ”ہے جول۔۔۔۔۔ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟“

بچے نے چھپانے کی کوشش کی مگر لڑکے کے ساتھ بڑی عمر کی لڑکی نے زبردستی بچے کا ہاتھ آگے کر کے اس میں موجود سیب نکال لیا اور تیز لہجے میں بولی۔ ”تم نے چوری کی ہے۔“

”اب کدو کے سرو والا تمہارے لیے آئے گا۔“

بچے ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ وہ جول کے گرد دائرے میں گھومتے ہوئے لطم کے انداز میں گانے لگے۔ ”کدو کے سرو والا آئے گا۔۔۔۔۔ تم پر نشان لگائے گا۔۔۔۔۔ پھر تمہارے لیے آئے گا۔۔۔۔۔ تمہارا سر تار کر لے جائے گا۔“

”چپ کرو۔“ ایملی نے انہیں ڈانٹا کیونکہ بچہ انتہائی غمزو ہو گیا تھا۔ ”یہ سب کیواس ہے۔“

کدو کے سرو والا مغرب میں ایک روایتی سا کردار ہے جس کے سر کی جگہ گول بڑا کدو ہوتا ہے جس میں آنکھیں

اور منہ تراشا ہوتا ہے اور اس کے اندر آگ جلتی ہے۔ ہولو دین کے موقع پر اس کردار کا ماسک پہن کر لوگ گلیوں میں گھومتے ہیں۔ لڑکے نے آگے آکر ایملی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”یہ کیوں نہیں ہے۔“

”چیچے ہو۔“ رک نے کہا تو لڑکے نے سب والا ہاتھ یوں بلند کیا جیسے ایملی یا رک پر دے مارے گا مگر پھر اس نے آگے بڑھ کر سب باب کے حوالے کر دیا۔ لڑکا، لڑکی اور باقی بچے ٹرک پر سوار ہوئے اور اندر سے نکلنے والے دونوں افراد ڈرائیونگ کیمارٹ میں جا بیٹھے۔ ٹرک وہاں سے روانہ ہو گیا۔ رک نے ایملی سے کہا۔ ”بچے ڈر رہے تھے۔“

”نہیں، لڑکا سنجیدہ تھا۔“ ایملی نے تردید کی۔ اتنے میں میک اور رون اندر سے سامان کے تھیلے اٹھائے لکھے اور پک اپ کی پچھلی نشست پر رکھ دیے۔ پھر میک ایک ایک پرچہ ہر کارپنی بائیک کھولنے لگا۔ رک اس کی طرف آیا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”میں ذرا ان پہاڑیوں کا ایک چکر لگائوں۔“ میک نے کہا۔ ”تم آ رہے ہو؟“

رک ہنسی بھرا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں چلنا چاہیے۔“ جواب میں میک نے بائیک نیچے اتار کر اسٹارٹ کی، پہلے پہلے اور بائیں آگے بڑھا دی۔ گروسری کے پاس ہی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور گڑھے تھے۔ میک ان سے بائیک کو جب کرانے لگا۔ ایملی رک کے پاس آئی۔ ”یہ کیا حرکت ہے؟ ابھی ہمیں آگے نہیں جانا ہے؟“

”جانا تو ہے لیکن اگر یہاں کچھ رائیڈنگ کر لی جائے تو کیا حرج ہے؟“ رک نے کہا اور اپنی بائیک اتارنے لگا۔ پھر اس نے بھی ہیلمٹ پہنا اور میک کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ مارش اور فیرو ایک طرف بیٹھے بیڑے کن سے شغل کر رہے تھے۔ اتنے میں گروسری اسٹور کا مالک اندر سے نکلا اور اس نے باب سے کہا۔

”تم اور پیڈی اندر جاؤ اور جب تک میں نہ آؤں اندر ہی رہنا۔“ ٹھیک ہے؟“

”میں ڈیڈ۔“ باب نے کہا اور کتے کو آواز دی۔ ”پیڈی! ام آں بوائے۔“

باب اور کتا اندر چلے گئے۔ آدی نے اسٹور کے ساتھ کھڑا پتا پراپا کیا۔ اپنی ٹرک اسٹارٹ کیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ مارش، رون، ایملی اور فیرو، بائیک جمپنگ دیکھ رہے تھے۔ اچانک اسٹور کا دروازہ کھلا اور پیڈی بھونکنا ہوا باہر آیا۔ غالباً اسے اپنے سکون میں ٹرل بائیکس کا شور

ناگوار گزر رہا تھا اور وہ بھونکتا ہوا ان کی طرف بھاگا۔ اس کے پیچھے باب تھا۔ پہلے تو ان چاروں نے باب اور کتے کو دیکھا کہ کیونکہ اس جگہ کی فٹ اونچی جھاڑیاں اور گھاس تھی پھر ایملی کی نظر پیڈی اور وہ ان کے پیچھے بھاگی۔ وہ چلا جا کر باب سے رکے کو کھد ہی تھی کیونکہ وہ جمپنگ زون میں جا رہا تھا اور یہ بہت خطرناک تھا۔ مگر بائیکس کے انجن کے شور میں باب نے سنا نہیں۔ پیڈی اب ٹیلوں کے درمیان تھا۔ باب اس کے پیچھے بھاگتا ہوا ٹیلوں کے پاس پہنچ گیا تھا۔ ایملی کے بعد رون اور فیرو نے بھی دیکھ لیا تھا اور وہ بھی بھاگے آ رہے تھے۔

باب ایک نیلے رنگ کی بلیک بایک اس کے پیچھے تھیں۔ اچانک نیلے سے ایک بلیک اچھل کر آئی اور سوار نے باب کو بچانے کی کوشش کی۔ باب بلیک بایک سے ٹکرا کر ہونٹوں سے اپنی جگہ بچھڑ گیا تھا۔ پھر دوسری بلیک نیلے سے اچھل کر پیچھے آئی اور اس کا ناز باب کے سینے سے لگایا۔ وہ اچھل کر دوڑ جا کر۔ دوسری بلیک بھی سب ہونٹوں سے میک کی بلیک تھی۔ رک اپنا جیلمٹ اتار کر زمین پر ساکت پڑے باب کی طرف بھاگا۔ رون، ایملی اور فیرو بھی وہاں آگئے تھے۔ مارش جھک کر باب کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے رک سے کہا۔ ”نفس چل رہی ہے۔ اسے فوراً ہی اسپتال لے جانے کی ضرورت ہے۔“

”ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔“ میک نے کہا اور بایک اٹھا کر پک اپ کی طرف چل دیا۔ رک اس کے پیچھے لگا۔

”کیا مطلب ہے؟ بچے کو مدد کی ضرورت ہے۔“

”اگر ہم یہاں رکے تو مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔“

میک بولا اور بایک پک اپ پر چڑھا کر اسے باندھنے لگا۔

”تمہارا دماغ درست ہے؟ یہ مر گیا تو تمہارے خلاف کیس بنے گا۔“

”اب بھی میرے خلاف کیس بنے گا اور میرا لائسنس منسوخ ہو جائے گا۔“ میک نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

اس دوران میں مارش ایملی کے لیے کال کرنے اسٹور کی طرف بھاگا تھا مگر جب اس نے اسٹور میں دیکھا تو اسے کہیں بھی فون نظر نہیں آیا۔ اس نے باہر آ کر اطلاع دی۔ ”یہاں کہیں فون نہیں ہے۔“

”کیبن میں ہے۔“ رک نے کہا۔ ”ہمیں وہاں جانا ہوگا۔“

اس دوران میں میک اپنی اسپورٹس کار میں بیٹھ گیا اور اس نے چلا کر کہا۔ ”سب آؤ ہمیں یہاں سے جانا ہے۔“

رک نے ان سب سے کہا۔ ”تم لوگ جاؤ۔“

رون بھاگ کر میک کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا اور وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ رک نے مارش سے کہا۔ ”تم جا کر ٹیلین سے ایملی کے لیے کال کرو۔“

”میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔“ ایملی بولی۔ ”بچے کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ تم جا کر ایملی کے لیے کال کرو۔“

مارش نے سر ہلایا اور پک اپ کی طرف بھاگا۔ فیرو اس کے ساتھ تھی۔ رک نے ایملی سے کہا۔ ”تم بھی جاؤ۔ میں یہاں رکا ہوا ہوں۔“

”میں تمہارے ساتھ رکوں گی۔“

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے، تم جاؤ۔“

ایملی رک کے مجبور کرنے پر چل گئی۔ پک اپ کے جانے کے بعد رک نے بچے کو دیکھا۔ اس کا سانس رک رک کر آ رہا تھا۔ اس نے اپنی جیکٹ اتار کر اس پر ڈال دی۔ چند منٹ بعد ٹرک پر دخول کے ساتھ گروسری کے مالک کا ٹرک نمودار ہوا اور وہ اسٹور کے ایک طرف رک گیا۔ وہ اندر گیا اور باب اور کتے کو نہ پا کر باہر آیا۔ پھر اس نے دیکھا کہ رک

ہاتھ ہلا رہا ہے۔ وہ اس کی طرف بڑھا اور نزدیک آنے پر اسے جیکٹ تلے باب کے سنہری بال دکھائی دیے تو وہ بھاگا اور نزدیک آ کر اس نے جیکٹ اتار کر باب کو دیکھ کر اس کا چہرہ

بھریا سخت ہو گیا۔ اس نے زنی سے باب کو اٹھا کر اپنے سے لگا یا۔ رک نے اس کی گردن سے ہاتھ لگا کر اسے لگا کر اس نے لگا کر باب کی آنکھوں پر لگا دی۔ وہ اسے سینے سے لگے آگے بڑھا تو رک نے عقب سے کہا۔

”مسٹر ہارلے! یہ ایک حادثہ تھا۔“

وہ رک اور اس نے مڑ کر دیکھا تو رک کو اس کی آنکھوں میں شعلے سے دکھائی دیے۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”اگر میرے بچے کو کچھ ہوا تو میں تم میں سے کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔“

وہ باب کو لے کر اپنے ٹرک تک آیا اور اسے اس میں لٹا کر روانہ ہو گیا۔ رک اپنی بائیک کی طرف آیا، اسے اسٹارٹ کیا اور اپنے کیبن کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

مارش، فیرو اور ایملی پک اپ پیچھے چھوڑ کر دلہن کے اوپر بنے لکڑی کے چھوٹے سے محل سے ہوتے ہوئے کیبن تک آئے تھے۔ یہ لکڑی کا لیکن بہت نفاست سے بنا ہوا خوب صورت کیبن تھا۔ اس میں بجلی، پانی اور فون کی سہولت تھی۔ کیبن بلندی پر تھا اس لیے یہاں سے آس پاس کا منظر

صاف دکھائی دیتا تھا۔ مارش اندر آتے ہی فون کی طرف لپکا اور اس نے ریسپونڈ اٹھایا لیکن اس سے فون نہیں آ رہی تھی۔ تب اس نے دیکھا، میک کے ہاتھ میں فون کا ٹوٹا ہوا تار تھا۔ اس نے کھینچ کر تار توڑ دیا تھا۔ مارش اس کی طرف جھپٹا۔ ”یہ کیا کیا تم نے۔۔۔۔۔ ہمیں ایملی کو کال کرنی ہے۔“

”کوئی کال نہیں کرنی ہے۔“ میک نے سخت لہجے میں کہا تو مارش نے غصے سے بے قابو ہو کر اسے گھونسا مارا اور وہ پلٹ کر پیچھے جا کر۔ مارش نے پلٹ کر ایملی سے کہا۔ ”آؤ، ہمیں کہیں فون تلاش کرنا چاہیے۔“

مگر اسی لمحے میک نے عقب سے اٹھ کر اس کے سر پر پیپر ویٹ سے ضرب لگائی اور وہ فرش پر گر ساکت ہو گیا۔ چند منٹ بعد رک اندر آیا تو اس نے دیکھا کہ رون اور ایملی ایک طرف صوفے پر بیٹھی ہیں اور میک کھڑی سے لٹکا ہوا تھا۔ رک نے پوچھا۔ ”مارش اور فیرو کہاں ہیں؟“

اسٹور کا دروازہ اندر سے بند تھا اور فیرو کے چلانے کی آواز آئی۔ ”رک! اس نے ہمیں بند کر دیا ہے۔“

رک اسٹور کی طرف بڑھا تو میک راستے میں آ گیا۔ رک نے کہا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

”یہاں سے کوئی باہر نہیں جائے گا۔“ میک نے سخت لہجے میں کہا۔

رک مجبور ہو کر غاموش رہا۔ اس کے پاس کال کا پتہ نہ تھا۔ اس نے جاتے ہوئے مجھے دھکی دی ہے کہ اس کے بچے کو کچھ ہوا تو وہ ہمیں نہیں چھوڑے گا۔“

”وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“ میک نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”اب بات ختم ہو گئی ہے۔“

”تب ان لوگوں کو باہر آنے دو۔“ رک نے التجا کی۔ وہ میک سے دبتا تھا۔ وہ بڑا بھی تھا اور مزاج کا سخت بھی۔ میک نے دروازہ کھولا۔ مارش اور فیرو باہر آئے۔ انہوں نے سب سن لیا تھا۔ میک نے کہا۔

”بات ختم ہو گئی ہے اس لیے ہمیں اپنی پٹینک انجوائے کرنی چاہیے۔“

مارش نے ان دونوں کو دیکھا اور بولا۔ ”یہ سب اتنا آسان نہیں ہوگا۔“

☆☆☆

ہارلے ٹرک چلا رہا تھا۔ وہ اپنے گھر تک آیا۔ اس کا گھر سادہ سا تھا مگر ان باب بٹے کے لیے کافی تھا۔ اس کی بیوی کافی عرصے پہلے بیمار ہو کر مر گئی تھی تب سے وہ باب کی پرورش کر رہا تھا۔ اس کا دنیا میں بیٹے کے سوا اور کوئی نہیں

تھا۔ وہ اسے اٹھائے گھر کے اندر آیا اور بستر پر لٹا کر فون کی طرف جانے لگا تھا کہ رک گیا۔ باب جو راستے میں تھوڑا بہت بل رہا تھا، اب بالکل ساکت تھا۔ اس نے باب کی بغض اور پھر دل کی دھڑکن چیک کی۔ انہیں ساکت پا کر وہ غم سے نڈھال ہو کر فرش پر بیٹھ گیا اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور اپنی سسکیاں دھونے لگا۔ بہت دیر رونے کے بعد اس کے آنسو رک گئے تھے۔ مگر اس کے دل میں اب آگ جل رہی تھی۔ اس نے باب کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”میں انہیں معاف نہیں کروں گا۔ میرے بچے میں تمہارا انتقام لے کر رہوں گا۔“

کچھ دیر بعد اس نے باب کی لاش ایک چادر میں لپیٹ کر ٹوک میں ڈالی اور اسے لے کر روانہ ہو گیا۔ اس کا رخ بولڈ ماؤنٹین کی اس پرانی ہسپتال کی طرف تھا جہاں لوگ آج کے دور میں بھی خاصی قدامت پرستی کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے اور ان کا رکن بہن بہت سادہ تھا۔ آدھے گھنٹے بعد جب سورج ڈھل چکا تھا، وہ ہسپتال میں داخل ہوا اور اس نے رابرٹ کے مکان کے سامنے ٹوک روکا۔ انجن کی آواز سن کر وہ باہر آیا اور ٹوک کے عقب میں آنے کے قہقہے دیکھ کر اس نے اپنے پوتے کو آواز دی۔ ”بریزڈ! آکر یہ قہقہے اندر لے جاؤ۔“

بریزڈ وہی لڑکا تھا جس نے ابھی اور ٹوک کو کدو کے سر والے کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ آکر ٹوک کے عقب سے قہقہے اتارنے لگا۔ ہارلے نیچے آ گیا۔ اس نے رابرٹ سے کہا۔ ”مجھے اس عورت کا پتا چاہیے۔“

”کس عورت کا؟“ رابرٹ نے پوچھا۔

”جس کا تعلق کدو کے سر والے سے ہے۔“

”ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔“

”وہ ہے اور میں نے اسے خود دیکھا ہے۔“ جیف ہارلے نے یقین سے کہا۔ اسے وہ منظر یاد آیا جو اس نے بچپن میں دیکھا تھا جب اس کے باپ نے اپنے بچپن کے دوست سام کو پناہ دینے سے انکار کیا تھا اور وہ اس مخلوق کا شکار بن گیا تھا۔ جیف نے اپنی جیب سے رقم کی ایک چھوٹی گلدی نکال کر رابرٹ کی طرف بڑھائی۔ ”مجھے صرف اس کا پتا چاہیے۔“

”تمہارا دماغ خراب ہے۔“ رابرٹ نے غصے سے کہا۔ ”تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟“

جب جیف نے باب کی لاش سے کپڑا ہٹایا۔ ”یہ میرا چکا ہے۔ اسے کچھ لوگوں نے مارا ہے۔“

رابرٹ نے جھک کر دیکھا اور اس کا چہرہ نرم پڑ گیا مگر اس نے کہا۔ ”مجھے تمہارے بچے کا فوس ہے۔ اسے لے جا کر دفن کر دو۔ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔“

بریزڈ رک کر ان لوگوں کی باتیں سن رہا تھا مگر جب رابرٹ نے اسے گھورا تو وہ تیزی سے حرکت میں آیا اور آٹے کی بوریاں اٹھا کر لے جانے لگا۔ دس منٹ بعد جیف واپس جا رہا تھا کہ ایک تنگ گلی سے گزرتے ہوئے اچانک بریزڈ سامنے سے نمودار ہوا۔ وہ کسی شارٹ کٹ سے یہاں تک چلا آیا تھا۔ اس کے اشارے پر جیف نے ٹوک روک لیا۔ اس نے ٹوکری سے لٹک کر کہا۔ ”میں ہارلے! میں نے تمہاری اور بریزڈ کی بات سنی ہے۔ میں اس عورت کو جاننا ہوں۔ اس کا نام میگاٹ ہے۔“

جیف منظر تھا کہ وہ مزید کچھ بتانے کا مگر جب وہ خاموش رہا تو جیف نے ٹوکوں کی گلدی نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ اس نے لے کر جیب میں رکھی۔ جیف نے اسے کالے پتھر پر رکھ دیا۔ ”مجھے صرف نام نہیں پتا چاہیے۔“

”میں دکھا سکتا ہوں۔“ بریزڈ نے کہا اور اچھل کر ٹوک کے پیچھے سواری ہو گیا۔ اس نے جھک کر جیف سے کہا۔ ”بولڈ ماؤنٹین کے اوپری حصے کی طرف چلو جہاں پرانی دلدل ہے۔“

جیف نے ٹوک لے کر وہاں پہنچا تو وہاں دلدل، آگے بڑھ کر آباد علاقہ تھا اور یہاں کے لوگ بھی وہاں جانے سے گریز کرتے تھے کیونکہ وہاں اکثر دلدل سے زہریلی گیس خارج ہوتی تھی۔ کئی جان لیوا حادثات کے بعد لوگوں نے اس طرف کا رخ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ جب جیف اس کے اوپری حصے کے پاس پہنچا تو بریزڈ نے چھت پر ہاتھ مار کر اسے کہنے کا اشارہ کیا اور ٹوک رکھنے ہی وہ نیچے اتر آیا۔ اس نے جیف سے کہا۔ ”یہاں سے آگے تم خود جاؤ۔ یہ راستہ سیدھا میگاٹ کے گھر تک جاتا ہے۔“

”اوکے تم جا سکتے ہو لیکن وہ نہ ٹلی تو میں سیدھا تمہارے گھر آؤں گا۔“

”اگر وہ زندہ ہے تو یہیں ہے۔“ بریزڈ نے کہا اور پلٹ گیا۔ جیف نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ یہ دلدلی علاقہ تھا جہاں زمین بہت نرم تھی اور راستے سے ہٹنے کی صورت میں ٹوک کے ٹائر زمین میں دھنس سکتے تھے۔ بالآخر ایک جگہ راستہ ختم ہو گیا اور اسے نیچے اترنا پڑا۔ وہ پیل آگے بڑھا۔ سورج غروب ہونے کے بعد تاری ہوئی تھی مگر اب چاند نکل آیا تھا اور اس کی روشنی میں راست دکھائی دے رہا تھا۔ دلدل سے بخارات کے ساتھ گیس اور بدبو بھی اٹھ رہی تھی۔

عام حالات میں جیف یہاں آنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن باب کا انتقام لینے کے لیے اس وقت وہ جہنم جانے کو بھی تیار تھا۔ اسے کچھ دور ایک ٹیلے پر لکڑی کا بنا ہوا جھونپڑا دکھائی دیا جس کی چٹنی سے دھواں خارج ہو رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف پانی اور دلدل تھی اور جانے کا واحد راستہ لکڑی کا بنا ہوا تختہ حال میں تھا۔ وہ اس سے ہوتا ہوا جھونپڑے تک آیا اور دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

جھونپڑے کے اندر کا ماحول ویسا ہی تھا جیسے کسی جاو گرنی کے ٹھکانے کا ہو سکتا ہے۔ جگہ جگہ مردہ جانوروں کے ڈھانچے اور حنوط کیے جانور موجود تھے۔ ایک طرف ریک پر زندہ الو بیٹھا تھا جس نے جیف کے اندر آتے ہی بڑی کرہبی آواز نکالی۔ اس کے سامنے والے ریک پر چوہے کچھ کھا رہے تھے اور وہ الو کی موجودگی سے بے نیاز نظر آ رہے تھے۔ آتش دان کے سامنے سفید بکھرے بالوں والی میگاٹ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ ”کیوں آئے ہو؟“

جیف آگے آیا اور اس نے جیب سے ایک تھیلی نکالی اور اس میں موجود ہونے کے سیکے کرسی کے ساتھ رکھی میز پر موجود بوری گوگ میں ڈال دیے۔ پھر اس نے کہا۔ ”مجھے اپنے بچے کا انتقام لینا ہے۔ یہاں کا ماحول ہے۔“

”اب میگاٹ نے تمہارا اس کی طرف دیکھا تو جیف کا پٹ اٹھا۔ اس کے سامنے چھ بیلوں اور دالوں سے بھرا ہوا ایک انسانی چہرہ تھا جس کا اس نے بھی تصور میں بھی نہیں سوچا تھا۔ اس کی ایک آنکھ میں سفید جالا تھا اور دوسری خشک تھی۔ میگاٹ اس علاقے کا ایسا کردار تھی جس کے بارے لوگ بہت کم جانتے تھے اور اس سے بھی کم لوگوں نے اسے دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔ البتہ ایک بات پر سب متفق تھے کہ وہ چڑیل تھی اور کم سے کم ایک صدی سے یہاں موجود تھی۔ اسے دیکھ کر جیف کو لگا کہ اس کی عمر ایک صدی سے بھی زیادہ تھی۔ کدو کے سر والا اصل میں میگاٹ کا مہرہ تھا، وہی اسے زندہ کرتی تھی اور جن لوگوں کے لیے وہ زندہ ہوتا تھا انہیں ختم کیے بغیر نہیں رہتا تھا۔ یہ ساری کہانیاں تھیں جو اس علاقے میں ایک صدی سے سینہ بہ سینہ چلتی آ رہی تھیں۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

”میں چاہتا ہوں کدو کے سر والا میرے بچے کا انتقام لے۔“

عورت کچھ دیر اسے گھورتی رہی۔ ”سوچ لو، بعد میں کچھ نام نہاد۔“

”میرے پاس کھونے کو کچھ نہیں رہا ہے۔“

جیف جذباتی ہو گیا۔ ”میرا بچہ میری کل کا نسا تھا اور وہ مر

چکا ہے۔“

عورت نے سر ہلایا۔ ”بچے کو یہاں لے آؤ۔“

جیف جا کر باب کی لاش لے آیا۔ عورت نے اسے ایک طرف رکھی کرسی پر ڈالنے کو کہا اور بولی۔ ”اب تمہیں ایک اہم کام کرنا ہے۔ تم دلدل کے اوپری حصے میں جاؤ گے۔ وہاں ایک بڑے درخت کا کٹا ہوا تانا ہے۔ اس تنے کے اوپری حصے میں ایک لاش فٹن ہے۔ تم وہ نکال کر لاؤ گے۔“

جیف کچکا کچکا مگر تانی دیر میں عورت نے اسے پیچھے تھوڑا دیا تھا۔ وہ باہر نکلا اور دلدل کے اوپری حصے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے کٹا ہوا تانا تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ یہ بہت بڑا تھا اور اس کا قطر کم سے کم بھی دس فٹ تھا۔ وہ اس کے کھر درے حصے کو پکڑ کر اوپر آیا۔ کٹا ہوا تانا اوپر سے ہوا نہیں تھا اور اس کے وسط میں مٹی بھری ہوئی تھی۔ جیف نے کسی قدر تذبذب کے ساتھ پیچھے چلنا شروع کیا اور مٹی ہٹانے لگا۔ اس نے ابھی مشکل سے ایک فٹ مٹی ہٹائی ہوئی کہ پیچھے کسی چیز سے ٹکرایا۔ اس نے پیچھے رکھا اور ہاتھ سے مٹی ہٹانے لگا۔ جلد ایک سکڑا سا تانا ہوا ہاتھ سامنے آیا جس میں لمبی انگلیاں اور ان پر لمبے ناخن تھے۔ جیف مٹی ہٹانے لگا۔ جلد اس کے سامنے ایک عجیب الخفقت انسان کی لاش آ گئی۔ اس کا سر غم معمولی بڑا اور نیم چھوٹا سا تھا۔ بالکل کی آنکھوں کو سال کے لیے جڑا کر رکھی تھی انسانی سر سے کہیں بڑا تھا۔ اس سے بدبو کے بجائے اٹھ رہے تھے۔ لاش تقریباً ڈھانچا ہوئی تھی مگر اس کی ساخت واضح تھی۔ جیف نے اباکیاں روکتے ہوئے اسے باہر نکالا اور اٹھا کر میگاٹ کے جھونپڑے میں لے آیا جو باب کی لاش پر جھکی کرسی پر تھی۔ اس نے جیف سے کہا۔

”آسے میز پر ڈال دو۔“

میز صاف تھی۔ میگاٹ نے اس سے تمام چیزیں اٹھا لی تھیں۔ جیف نے بڑے سر والے کی لاش میز پر ڈال ڈالی۔ میگاٹ مزی تو اس کے ہاتھ میں شیشے کا ایک پھیلے کناروں والا جام تھا اور اس میں کوئی سرخ سی چیز تھی۔ وہ جیف کے پاس آئی اور مطالبہ کیا۔ ”ہاتھ آگے کرو۔“

جیف نے ہاتھ آگے کیا تھا کہ اس نے نہایت پھرتی سے اس پر اپنا ناخن مارا۔ جیف کی تھیلی پر کٹ ٹموردار ہوا اور اس سے خون بہنے لگا جو میگاٹ جام میں جمع کرنے لگی۔ اب جام نصف کے قریب بھر گیا تھا۔ وہ کھوی اور اس نے بہت محنت سے جام لاش کے منہ سے لگا دیا اور اس کا سر اٹھاتے ہوئے جام اس کے حلق میں انڈیل دیا۔ جیسے ہی خون اس

کہیں آپ کو اعصابی کمزوری تو نہیں؟

آجکل تو ہر انسان ذہنی تفکرات، ناقص غذاؤں بے صبری، بے احتیاطی اور بد پرہیزی کی وجہ سے اعصابی کمزوری کا شکار ہو چکا ہے۔ اعصابی طور پر کمزور لوگ تو ہمیشہ ندامت کی زندگی گزارتے ہیں۔ آپ کی اعصابی کمزوری ختم کرنے، بے پناہ اعصابی قوت دینے کیلئے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں اور کستوری، عنبر، زعفران سے ایک حاصل قسم کا ہر بلر اعصابی کورس مقوی اعصاب کورس کے نام سے تیار کیا ہے۔ اپنے ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کر کے لطف کو دوبالا کرنے کیلئے اور اپنے خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کے لئے آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP مقوی اعصاب کورس منگو لیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

کرتی ہوگی۔“ پپلیتم نے دھوکے سے مجھ پر قابو پایا مگر اب تم میرے پاس نہیں آ سکتے۔“
مارش باہر جانے لگا تو رک اس کی طرف لپکا۔ ”ابھی مت جاؤ، دیکھو موسم خراب ہو رہا ہے۔“
”میرا ٹک ہر موسم میں سفر کر سکتا ہے۔“ مارش نے فخر سے کہا اور باہر نکل آیا۔ فیرواس کے ساتھ تھی۔ وہ سب بھی باہر آ گئے۔ ہوا میں کاٹ بھی اور سوکے پتے اڑ رہے تھے۔ رک اور ایملی انہیں روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔
میک کے ساتھ رون اعلاتی سے ایک طرف کھڑی تھی۔ مارش انکار کرتا ہوا آندے سے اتر کر نیچے آ گیا۔ اس نے کہا۔ ”میں نہیں رک سکتا۔“
ابھی اس کا جملہ منہ میں تھا کہ چھت سے ایک بڑا سا ہاتھ آیا اور اس نے مارش کا سر پکڑ کر اسے کی گھونٹنے کی طرح اوپر کھینچ لیا۔ ایملی، فیرو اور رون کی چیخیں نکل گئیں۔
میک اور رک بھاگے مگر جب انہوں نے ڈھلان والی چھت پر دیکھا تو انہیں ایک سایہ دوسری طرف غائب ہوتا نظر آیا۔ وہ پیچھے کی طرف بھاگے تھے مگر اتنی دیر میں وہ نامعلوم جانور مارش کو کسی بچے کی طرح ایک کر لے جانے والا غائب ہو گیا تھا۔ کم سے کم انہیں لگا بھی تھا کہ وہ کوئی جانور ہے۔
”پتا نہیں..... مگر کچھ یہاں نہیں پایا جاتا۔“ میک نے کہا اور اندر کی طرف بھاگا۔ ”میں داخل لینے جا رہا ہوں۔ تم تلاش کرو۔“
رک پاگلوں کی طرح چاروں طرف دوڑ رہا تھا۔ مکان کی طرف سے لڑکیوں کے چیخنے اور رونے کی آواز آرہی تھی۔ اب آسمان پر بجلی چمکنے لگی تھی۔ ایک بار بجلی چمکی تو رک نے دیکھا دور ڈھلان پر ایک عجیب المانت مخلوق نے مارش کو ٹانگ سے پکڑ کر اٹالٹکا یا ہوا تھا اور وہ بے قابو بے حرکت تھا۔ اس کا سر بہت بڑا تھا۔ رک کو کدو کے والے کا خیال آیا۔ دوسری بار بجلی چمکی تو وہ غائب تھا۔ اس دوران میں میک اندر سے داخل لے آیا اور وہ اس طرف بھاگے جہاں رک کو مارش اور وہ چہرہ نظر آئی تھی۔ رک، میک کو بتا رہا تھا کہ اس نے کیا دیکھا ہے مگر میک نے ماننے سے انکار کر دیا۔ ”وہ کوئی بڑے سرو والا آدمی ہوگا۔ کدو کے والا صرف ایک ماورائی کردار ہے۔“
رک اسے یقین دلانے لگا کہ اس نے خود دیکھا تھا۔ انہوں نے آس پاس ہر جگہ دیکھ لیا مگر انہیں مارش یا کدو کے سرو والا نظر نہیں آیا تھا۔ رک نے کہا۔ ”ہمیں پولیس کو کال کرنی ہوگی۔“
”پولیس کیا کر لے گی؟“ میک بولا۔ ”ہمیں خود تلاش کرنا ہوگا۔“
اچانک انہیں کین کی طرف سے لڑکیوں کے چلانے کی آواز آئی تو وہ پلٹ کر بھاگے اور جب وہ کین کے سامنے پہنچے تو انہوں نے مارش کو بری طرح اڑھایا ہوا پڑا پایا۔ فیرو روئی تھی اور کدو کے تھی۔ ”مارش مر گیا ہے۔“
رک نے اس کی بغض دیکھی۔ مارش واپسی کر چکا تھا۔ اس نے جھکے ہوئے انداز میں کہا۔ ”اسے اندر لے چلو۔“
میک اور رک مارش کی لاش اٹھا کر اندر لے جا رہے تھے کہ اچانک فیرو کی چیخ سنائی دی۔ اس کا سراپی بڑے سے ہاتھ نے پکڑا ہوا تھا جو مارش کو لے گیا تھا اور پھر وہ فیرو کو بھی مارش کی طرح اچک کر چھت پر لے گیا۔ رک اور میک لاش چھوڑ کر بھاگے اور کین کے چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھنے لگے کہ فیرو کہاں ہے۔ رون اور ایملی ان کے ساتھ تھیں۔ اچانک ایملی چلائی۔ ”وہ دیکھو۔“
کین کے ساتھ بنے ایک بہت بلند درخت کے اوپر کی جھمبے میں بڑے سرو والا فیرو سمیت موجود تھا۔ اس کا چہرہ حیوانی تھا اور وہ بھانکے انداز میں ہنس رہا تھا۔ اچانک اس نے فیرو کو پکڑ لیا اور وہ ایک طویل چیخ کے ساتھ نیچے موجود چھت پر گر کر اور فوراً مری ہوئی حالت میں گر پڑا۔
بڑی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ اس کی طرف بھاگے۔ لڑکیاں رو رہی تھیں اور وہ دونوں غصے میں تھے۔ میک نے جب داخل ہو کر اوپر کی تو بڑے سرو والا درخت سے غائب تھا۔ رک کی حالت بری تھی۔ اس نے میک سے کہا۔ ”میں یہاں سے لکھا ہوگا۔ یہ وہی بلا ہے۔ ہم سب کو مار دے گی۔“
وہ فیرو کی لاش بھی اٹھا کر اندر لے آئے اور اسے مارش کی لاش کے ساتھ رکھ کر ایک ہی چادر سے ڈھانپ دیا۔ چند منٹ میں وہ اپنے دوستوں سے محروم ہو گئے تھے۔ انہوں نے کین کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر دی تھیں۔ ان کے پاس ایک داخل اور ایک پتول تھا۔ پتول رک نے لے لیا۔ میک نے کہا۔ ”ہمیں گاڑیوں تک پہنچنا ہوگا۔ ایک بار ہم وہاں پہنچ گئے تو پھر یہاں سے نکل سکیں گے۔“
”تو انتظار کس کا ہے، ہمیں فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔“ رون بولی۔ وہ زیادہ گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ چاروں محتاط انداز میں باہر آئے۔ اچانک رون نے کہا۔ ”میرا پرک اندر ہے۔“

کے منہ میں گیا، اس کے ہاتھوں میں حرکت ہوئی اور اسی لمحے چیخ کو لگا کہ اس کا سر پکڑا رہا ہے۔ وہ سر ہٹا کر پیچھے گیا اور پھر اس نے دھنلائی آنکھوں سے دیکھا کہ لاش میں حرکت پیدا ہوئی تھی۔ صرف حرکت نہیں بلکہ وہ بڑھ رہی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ قد اور غریبہ میں بدل گئی۔ چیخ اسے بھولا نہیں تھا حالانکہ اسے دیکھتے ہوئے اٹھائیس سال گزر چکے تھے۔ پھر وہ پکڑا کر پیچھے گرا تو اسے ہوش نہیں رہا۔ پتا نہیں کب اسے ہوش آیا تو کرسی پر بیٹھی میٹک نے کہا۔ ”تمہارا کام ہو گیا ہے۔ اپنے بچے کو لے جا کر دفنا دو اور دیکھو، اس کے قاتل کیسے مارے جاتے ہیں۔“
بڑے سرو والا غائب تھا۔ وہ یہاں سے جا چکا تھا۔ چیخ نے اٹھ کر باب کی لاش اٹھائی اور بہ مشکل اپنی گاڑی تک آیا۔ اس کا سر اب بھی پکڑا رہا تھا۔ اس نے باب کی لاش ٹرک کی نشست پر ڈالی اور روانہ ہو گیا۔ رات گہری ہو رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی سردی بھی بڑھ رہی تھی کیونکہ پہاڑوں کی طرف سے تیز ہوا چلتی شروع ہوئی تھی۔ اچانک اس کا سر زور سے پکڑا اور اس نے بریک لگائے۔ گاڑی رکی تو جھمکے سے اسے ہوش آیا اور تب اس نے دیکھا کہ باب برابر والی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے اٹھا تو اسے آلودہ سر تھا کہ چیخ کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”ڈیڈی! ہم یہاں کیسے رہ گئے؟“
وہ چونکا اور پھر اس نے دیکھا تو باب کی لاش بدستور کپڑے میں لپیٹی ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ بولڈ ماؤنٹین کے قبرستان میں باب کے لیے قبر کھود رہا تھا۔ موسم کو دیکھتے ہوئے اسے اٹھائیس سال پہلے والی رات یاد آگئی، تب بھی موسم ایسا ہی طوفانی ہو رہا تھا۔ باب کی لاش دفناتے ہوئے وہ خود سے سوال کر رہا تھا کہ یہ میں نے کیا کیا؟
☆☆☆
رک غم زدہ تھا۔ اس نے میک سے کہا۔ ”تم نے بہت بڑا ظلم کیا ہے۔“
”اپنا منہ بند رکھو۔“ میک کا موڈ خراب ہو گیا۔ ”یہ حادثہ تھا۔“
”لیکن اس کے بعد تم نے جو کیا وہ حادثہ نہیں تھا۔“ مارش بھی بولا۔ ”میرا خیال ہے اب اس پکنک کا کوئی جواز نہیں ہے اور ہمیں واپس جانا چاہیے۔“
”کوئی نہیں جائے گا۔“ میک نے سخت لہجے میں کہا۔ ”ہر کل فیصلہ کریں گے۔“
”تم فیصلہ کرتے رہنا۔“ مارش کا لہجہ بھی بدل

”جلدی لے آؤ۔“ رک نے کہا۔ رون اندر چلی گئی۔ اسے زیادہ سے زیادہ ایک منٹ میں آجانا چاہیے تھا مگر اس سے اوپر وقفہ ہو گیا اور اس کی واپسی نہیں ہوئی تو رک اندر گیا۔ لاڈلے جیج میں سنا تھا اور وہاں صرف مارش اور فیرو کی لائشیں چادر تلے پڑی تھیں۔ اچانک ایک بیڈروم کا دروازہ کھلا اور رون اس سے حزام سے آکر باہر گری۔ اس نے رک کو دیکھا اور چلائی۔ ”مجھے بچاؤ۔“

تب رک نے اس کے پیچھے اسی بڑے سردالے عفریت کو دیکھا۔ وہ نہ جانے کہاں سے اندر آیا تھا اور اس نے رون کو دیو بچ لیا تھا۔ اس نے ہنک کر رون کی ٹانگیں پکڑیں اور اسے پیچھے کر لے گیا۔ اس کی چیخ و پکار سن کر میک اور ایملی دوڑے ہوئے آئے تھے۔ میک نے سکتے میں کھڑے رک کو سمجھوڑا۔ ”کیا ہوا؟“

”وہ..... وہ رون کو لے گیا۔“ رک نے بہ مشکل کہا۔ بیڈروم کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔ ایملی نے اندر آتے ہوئے سینہ کا دروازہ بھی بند کر دیا تھا اور اب انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے چھت پر کوئی چیز چل رہی ہو۔ پھر عفریت رون سمیت بین والی طرف سے نیچے کودا۔ اس نے رون کا سر پکڑ رکھا تھا اور اس کا چہرہ چکن کی کھڑکی کے شیشے سے دبا رہا تھا۔ وہ کرب سے چلا رہی تھی مگر اس کی آواز نہیں نکلتی تھی۔ ”کیا چلا رہی ہے؟“ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیوں ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے؟

اچانک عفریت نے رون کو پیچھے کیا اور پھر زور سے کھڑکی پر بار آور وہ کھڑکی توڑتی ہوئی اندر آ گئی۔ میک کے منہ سے چیخ نکلی، وہ رون کی طرف بھاگا۔ اس نے خون میں ڈوبی رون کو سیدھا کیا مگر وہ مرجی گئی۔ شیشوں نے اسے بڑی طرح کاٹ دیا تھا۔ میک دھاڑیں مار کر رونے لگا تو باہر سے عفریت نے حیوانی تہقیر لگایا۔ ایملی رو رہی تھی اور رک ساکت کھڑا ہوا تھا۔ اچانک وہ چونکا۔ ”ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔“

”میں نہیں جاؤں گا۔ جب تک اس درندے کو مار نہیں دوں گا۔“ میک نے کہا اور رون کی لاش فرش پر ڈال کر اس نے اپنی رائفل اٹھائی۔ رک نے اس کا بازو پکڑ کر سمجھوڑا۔ ”وہ درندہ نہیں ہے، وہ کدو کے سروالا ہے۔ ہم یا کوئی انسان اسے مار نہیں سکتا۔“

”صرف وہی انسان اسے مار سکتا ہے جس کا خون اسے زندہ کرتا ہے۔“ ایملی بولی۔ ”میں نے اس کے بارے میں پڑھا ہوا ہے۔ رک ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں اپنی جان بچا کر یہاں سے لگنا چاہیے۔“

”چلو۔“ رک نے میک کو پکڑ کر کھینچا اور وہ تینوں کھینچے سے باہر نکل آئے اور پھر تیزی سے اس جگہ کی طرف بھاگے جہاں ان کی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں مگر جب وہ گاڑیوں کے پاس آئے تو خشک گئے۔ دونوں گاڑیوں کی حالت بری تھی۔ ان کی باڈی پچک گئی تھی اور سارے ٹائر تباہ ہو گئے تھے۔ شیشے ٹوٹ چکے تھے۔ رک کی پانچ جیسے وہ یہاں چھوڑ گیا تھا، اس کی حالت زیادہ خراب تھی وہ ترمز کر گئی تھی صورت میں ہو گئی تھی۔ میک نے پک اپ پر کھڑی اپنی پانچ اتاری اور لگ مار کر اسے اسٹارٹ کیا تو وہ اسٹارٹ ہوئی مگر جب اس نے اسٹیل ٹیر دیا تو پانچ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں سرکی۔ یہ انہیں وہی حیوانی ہنسی سنائی دی اور انہوں نے ایک طرف کھڑے عفریت کو دیکھا۔ پانچ کی چین اس کے ہاتھ میں تھی۔ ایملی ہڈیانی انداز میں چلانے لگی۔ عفریت نے ہاتھ میں موجود زنجیر ہما کر میک ماری۔ وہ پانچ سے الٹ کر دوڑ جا کر ا۔ اسے شدید خطرہ آئی تھی مگر وہ ہمت کر کے کھڑا ہو گیا اور اس نے رائفل اٹھاتے ہوئے عفریت کا نشانہ لیا اور گولی چلائی۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے گیا۔ میک نے دوبارہ گولی چلائی۔ اس بار بھی عفریت پیچھے گیا۔ مگر پھر وہ ان کی طرف بڑھنے لگا۔ ایملی کی چیخیں ایک بار پھر تیز ہو گئیں۔

جیف نے قبر ہمواری اور بیچل ایک طرف پھینک کر ہاتھوں سے تمام لیا۔ ”یہ میں کیا کر رہا ہوں؟“ جب تک وہ باب کی قبر کھود کر اسے دفن کرتا، اسے رہ کر سر پکڑانے کے دورے پڑتے رہے۔ اس وقت اسے لگتا جیسے اس کا تعلق آس پاس کے ماحول سے کٹ رہا ہے۔ چند منٹ میں وہ ٹھیک ہو جاتا۔ اس دورے میں اسے لگتا کہ وہ کچھ کر رہا ہے اور جیسے کسی کو مار رہا ہے لیکن اسے کچھ دکھائی یا سنائی نہیں دیتا تھا۔

اچانک اسے چلانے کی آواز آئی۔ ایسا لگتا جیسے بہت سے مرد اور عورتیں چلا رہے ہوں۔ اس کے بعد فائر کی آواز آنے لگی۔ جیف تیزی سے اس طرف بڑھا۔ اس نے اپنے ٹرک میں موجود شاٹ گن نکالی اور درختوں میں سے کسی جہاں سے آوازیں آ رہی تھیں۔ آوازیں نزدیک آگئی تھیں اور ان میں ایک عورت کی چیخوں کی آواز نمایاں تھی۔

☆☆☆
”اس پر گولی کا اثر نہیں ہو رہا۔“ رک بولا۔ ”یہاں سے نکلو۔“

مگر عفریت اس دوران میں ان کے پاس آ گیا تھا۔ اس نے میک کا گلا دیو بچ لیا۔ پھر وہ جھٹکے سے پیچھے گیا۔ فائر کی آواز آئی تو انہوں نے دیکھا کہ کچھ دور کھڑا جیف شاٹ گن سے عفریت پر فائر کر رہا تھا۔ شاٹ گن کی گولی زیادہ گنتی سے عفریت کے پیچھے سے میک کا گلا چھوٹ گیا۔ دوسرے فائر پر وہ مزید پیچھے گیا اور تیسرے فائر پر وہ دھڑام سے نیچے گر اور ساکت ہو گیا۔ جیف نے شاٹ گن میں خالی ہونے والے کارٹوس کی جگہ نئے کارٹوس ڈالے ہوئے پوچھا۔ ”کیا ہوا ہے؟“

”اس درندے نے ہمارے تین ساتھی مار دیے ہیں۔“ رک بولا پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”مسٹر ہارلے! تین کرو تہارے بچے کے ساتھ حادثہ پیش آیا تھا۔ وہ اپنے بچے کے پیچھے بھاگتا ہوا رائفلنگ رینج میں آ گیا تھا اور ہمیں بالکل تباہ کر چلا۔“

جیف کا چہرہ ست گیا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ رونے کے چند سیکنڈے کے ایک ایسا عفریت حاصل کر لے گا جو اس کے بچے کے قاتلوں سے اتنا بھیا تک انتقام لے رہا تھا۔ میک نے رک کی طرف دیکھا اور سرد لہجے میں بولا۔ ”اتنی وضاحت دینے کی کیا ضرورت ہے؟“

ایک ماورائی کردار ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے آتا ہے جن پر نشان لگایا جائے۔ یہ ہمارے پیچھے کیوں آیا ہے؟ ”میں نہیں جانتا۔“ جیف نے آہستہ سے کہا۔ ”اب یہ مر چکا ہے۔“

”یہ نہیں مرا ہے۔“ ایملی بولی۔ ”یہ زندہ ہے اور اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک اس کا شین پورا نہیں ہو جاتا یا اس کا ماسٹر نہیں مرجاتا۔“

جیف چونکا۔ اسے خیال آیا کہ کیا اس عفریت کا ماسٹر وہ تھا؟ اس نے ایملی سے کہا۔ ”لگتا ہے تم اس کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہو۔ اس کا ماسٹر کون ہو سکتا ہے؟“

”وہ جس کا خون اسے زندگی بخشتا ہے۔“ ایملی بولی۔ اس دوران میں میک عفریت کے پاس چلا گیا تھا۔ رک نے اس سے کہا۔

”آگ مت جاؤ۔“
”میک! واپس آؤ۔“ ایملی بولی۔ ”یہ مر نہیں ہے۔“
میک نے رائفل کی نال کا رخ عفریت کے بڑے سے سر کی طرف کر کے گولی چلا دی اور ان کی طرف دیکھا۔ ”اب یہ مر چکا ہے۔“

مگر اسی لمحے عفریت نے اس کی ٹانگ پکڑ کر جھٹکا دیا تو وہ الٹ کر گر اور اس سے پہلے کہ وہ کھڑا ہوتا عفریت نے اٹھتے ہوئے اس سے رائفل چھین لی۔ رک اور ایملی چلا رہے تھے۔ جیف نے دوبارہ شاٹ گن عفریت کی طرف سیدھی کی تھی کہ اسے جھٹکا سا لگا اور ماحول اس کی آنکھوں کے سامنے ڈولنے لگا۔ عفریت نے اس کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے رائفل میک کے سینے کی طرف کی لیکن گولی چلانے کے بجائے اچانک رائفل کی نال بہت قوت سے اس کے سینے میں اتار دی اور پھر اسے نال میں پرو کر اوپر اٹھالیا۔ رک چلا یا اور میک کی طرف جانے کی کوشش کی مگر ایملی اس سے چٹ گئی تھی۔ وہ چلا کر اس سے وہاں سے بھاگ جانے کو کہہ رہی تھی۔ عفریت دم توڑتے میک کو اوپر کیے ہوئے اپنی مخصوص شیطانی ہنسی ہنس رہا تھا۔ جیف چلا کر گرا تو عفریت نے میک کو رائفل سمیت ایک طرف پھینک دیا۔

ایملی اور رک ایک طرف بھاگ نکلے تھے۔ وہ درختوں کے درمیان اندھا دھند دوڑ رہے تھے اور انہیں قطعی علم نہیں تھا کہ وہ کس طرف جا رہے ہیں۔ ایملی کے منہ سے سسکیاں نکلتی رہی تھیں اور رک بھی بھائی کا سوگ منا رہا تھا مگر وہ کب تک نہیں گئے تھے۔ اور اب اس کے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ ہر صورت عفریت سے دور جانا تھا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ شاٹ گن کی مہلک گولیاں بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھیں۔ ایسے میں اس کے سامنے رکنا حماقت اور خودکشی ہی ہوتی۔ اچانک انہیں کچھ دور روشتیاں نظر آئیں۔ ایملی نے کہا۔ ”وہ..... اس طرف آبادی ہے۔“

وہ بھاگتے ہوئے اس قصبے تک پہنچے جو تدرت ڈھلان پر آباد تھا۔ یہاں مکان قدیم طرز کے تھے اور خاصے خستہ حال تھے۔ گاڑیاں بھی پرانی کھڑی تھیں۔ ایملی نے راپتے میں آنے والا پہلا دروازہ بنجایا اور مدد کے لیے نکارنے لگی۔ مگر اندر سے کوئی جواب ملنے کے بجائے مکان کی روشتیاں بھی بند ہو گئیں۔ رک اور ایملی دوسرے مکانوں کی طرف بڑھے۔ وہ باری باری دروازے بجار رہے تھے اور اپنے اوپر گزرنے والی روداد سنا تے ہوئے پناہ مانگ رہے تھے۔ مگر کسی مکان سے نہ تو کوئی نکلا اور نہ ہی کسی نے جواب دیا۔ وہ رابرٹ کے مکان کے سامنے پہنچے تو اندر پیچھے کے کمرے میں موجود ریڈ نے اپنی بہن مار یا سے کہا۔ ”میں انہیں جانتا ہوں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ہمیں ہارلے کے اسٹور پر ملے تھے۔“

”ان کے پیچھے کون ہے؟“
 بریڈ نے گہری سانس لی اور بولا۔ ”کدو کے سروالا۔“
 ماریا بہت زیادہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ بریڈ نے اسے
 نہیں بتایا کہ اسی نے جیف کی میگاٹ کے ٹھکانے تک
 راہنمائی کی تھی اور اس کے بدلے رقم لی تھی۔ اب وہ پچھتا رہا
 تھا اور پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ان لوگوں کی مدد کرے گا۔
 اس نے اپنا اور آل اور جوتے پہنے۔ ماریا بے چین ہو
 گئی۔ ”تم کہاں جا رہے ہو؟“
 ”باہر لیکن تم کسی کو بتاؤ گی نہیں۔“ اس نے کہا اور
 چھوٹی سی کھڑکی کھول کر باہر نکل گیا۔ وہ گھوم کر مکان کے
 سامنے والے حصے میں آیا اور ہلکی سی آواز نکال کر رک اور
 ایٹمی کو متوجہ کیا۔ انہوں نے اسے دیکھا تو لپک کر آئے۔
 رک نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔
 ”یہاں کیسے گھنٹی لوگ رہتے ہیں جو کسی کی مدد بھی نہیں
 کر سکتے۔“

”کوئی اس وقت باہر نہیں نکلے گا۔“ بریڈ نے
 کہا۔ ”لیکن میں تمہاری مدد کے لیے آیا ہوں۔“
 ”کوئی کیوں ہماری مدد کے لیے باہر نہیں آ رہا؟“
 ”کیونکہ وہ سب بڑے سروالے سے ڈرتے
 ہیں۔ بریڈ نے مجیدی سے کہا۔ ”جو اس کے اور اس کے
 شکار کے درمیان میں آتا ہے، وہ اسے بھی ختم کر دیتا ہے۔
 جو اپنے گھر میں رہتا ہے وہ اسے کچھ نہیں کہتا۔ اس لیے کوئی
 اس وقت باہر نہیں آئے گا۔“
 ”تب تم کیوں آئے ہو؟“
 ”شاید میں تمہیں بچا سکتا ہوں۔“ اس نے کہا اور
 مڑ گیا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“
 ”لیکن کہاں؟“

”تم دیکھ لو گے، وقت کم ہے جلدی آؤ۔“
 ”اس کے پیچھے چلو۔“ ایٹمی نے کہا تو رک مجبور ہو
 گیا۔ وہ اس کے پیچھے روانہ ہوئے۔ بریڈ بھاگتے ہوئے
 آگے جا رہا تھا۔ چند منٹ بعد وہ قصبے سے نکل کر اوپری جنگل
 کی طرف آیا۔ وہ دونوں ٹھہر مند ہو گئے۔ رک نے کہا۔
 ”یہ کہاں نے جا رہا ہے؟ کہیں ہمیں پھنسانہ دے۔“
 اسی لمحے انہیں لکڑی کا بنا ہوا غیر آباد ہو جانے والا
 چرچ و گھائی دیا۔ اس کی دیواریں اور چھت کی بیشتر لکڑی گر
 گئی تھی اور چاروں طرف خلا تھے۔ سامنے کا دروازہ سرے
 سے قاصر تھا۔ بریڈ اس کے دروازے پر رکا اور مڑ کر
 بولا۔ ”آؤ جلدی آؤ۔“

وہ اس کے پاس آ کر ہانپتے ہوئے بولے۔
 ”تمہارے خیال میں یہ محفوظ جگہ ہے؟“
 ”ہاں، وہ یہاں نہیں آ سکتا۔“ بریڈ نے یقین سے کہا
 اور چرچ کے اندر داخل ہو گیا۔ رک کو ہرگز یقین نہیں تھا کہ
 یہ کھنڈر جو انہیں ہوا بارش اور سردی سے نہیں بچا سکتا تھا، وہ
 اس خون آشام غفریت سے بچائے گا۔ مگر ان کے پاس بریڈ
 پر اعتماد کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ اندر آئے اور ایک
 سلامت بچ پر بیٹھ گئے۔ ایٹمی نے پوچھا۔
 ”یہ کیا چکر ہے؟ وہ ہمارے پیچھے کیوں ہے؟“
 ”تم کو نشان زدہ ہوئے۔“ بریڈ بولا۔
 ”نشان زدہ کیا مطلب؟“
 ”میں نہیں جانتا لیکن سنا ہے کہ میگاٹ جن لوگوں
 کے لیے بڑے سروالے کو زندہ کرتی ہے، وہ نشان زدہ
 ہوتے ہیں۔ وہ ان سب کو ختم کر دیتا ہے۔“
 ”میکاٹ کون ہے؟“

”ایک بوڑھی عورت ہے جس کو سو سال سے اوپر
 ہوئے پھر زندہ ہے۔“ بریڈ نے اعتراف کیا۔ ”بڑے سروالا
 اصل میں اس کا بیٹا ہے۔“
 ایٹمی چوکی۔ ”کیا مطلب؟ وہ کچھ عجیب انسان ہے؟“
 ”جی ہاں، وہ ایک عجیب انسان ہے۔“ بریڈ نے کہا۔
 بات ہے۔ میگاٹ کا شوہر یورپ جنگ لڑنے گیا تھا، جب
 اس کے ہاں بڑے سروالے کے عجیب اختلاف بچے کی پیدائش
 ہوئی۔ مقامی لوگوں نے اسے کدو کے سروالہ قرار دیا۔
 انہوں نے میگاٹ سے مطالبہ کیا کہ وہ قصبہ چھوڑ کر چلی
 جائے۔ وہ بچے کو لے کر دلدل کے علاقے میں چلی گئی تھی
 اس پر بھی لوگوں کو چین نہیں آیا۔ تب ایک دن انہوں نے
 رات کو اس کے جھوپڑے پر حملہ کر کے اسے آگ لگا دی۔
 اتفاق سے میگاٹ بیمار بچے کی دوا لینے پاس موجود ایک
 انڈین ویج ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔ وہ واپس آئی تو جھوپڑا
 اور اس میں موجود اس کا بیٹا جل چکا تھا۔ میگاٹ نے بے گئے
 وہیں کہیں دفن کر دیا اور اس کے بعد وہ انڈین ڈاکٹر سے
 جادوگری سیکھنے لگی۔ جب اس کا شوہر جنگ سے واپس آیا
 اور اسے پتا چلا کہ اس کے خاندان پر کیا گزری ہے تو وہ
 پاگل ہو گیا اور اس نے ان لوگوں کو مارنے کی کوشش کی
 جنہوں نے اس کے گھر پر حملہ کر کے اسے جلا دیا تھا۔ قاتلوں
 کو مارنے کی کوشش میں میگاٹ کا شوہر اپنی جان سے گیا اور
 اس کا قاتل وہاں سے بھاگ گیا۔
 ”پھر ایک طوفانی رات بولڈ ماؤنٹین کے لوگوں نے

بڑے سروالے کو دیکھا۔ وہ جن جن کران لوگوں کو مار رہا تھا
 جنہوں نے میگاٹ کے جھوپڑے پر حملہ کر کے اسے آگ
 لگا دی تھی۔ اس رات بولڈ ماؤنٹین میں بارہ افراد مارے گئے
 تھے۔ مگر مقامی لوگوں نے کسی ایک کی بھی پولیس رپورٹ
 نہیں کرانی اور ان کو خاموشی سے دفن کیا گیا۔ پھر برسوں گزر
 گئے اور کدو کے سروالے کا نام سننے میں نہیں آ سکا۔ میگاٹ
 کے شوہر کا قاتل جو یہاں سے بھاگ گیا تھا، وہ برسوں بعد
 آیا۔ اس نے شادی کر لی تھی اور اس کا ایک بیٹا تھا۔ اس کے
 آنے کے کچھ عرصے بعد لوگوں نے پھر بڑے سروالے کو
 دیکھا اور اس نے قاتل کو مار دیا۔ البتہ اس کا بیٹا اور بیوی
 علاقے سے باہر ہونے کی وجہ سے بچ گئے۔ پھر قاتل کا بیٹا
 سام واپس آیا اور یہاں رہنے لگا مگر جب وہ چالیس سال کا
 تھا، تب اس نے میگاٹ کو مارنے کی کوشش کی۔ وہ اسے
 اپنے باپ کا قاتل سمجھتا تھا۔ سام کا نام رہا اور پھر بڑے سرو
 والا آیا اور اس نے سام کو مار دیا۔ اس بات کو اٹھائیس برس
 گزر چکے ہیں۔ اس کے بعد وہ اب آیا ہے۔“

”مگر کیوں؟ وہ ہمارا دشمن کیوں ہو رہا ہے؟ ہم نے
 کیا کیا ہے؟“ ٹوک بولا۔ ”اس نے میک، مارش، فیرو اور
 رون کو مار دیا۔ ہمارے سامنے انہیں لے گیا اور پھر تل کر
 ایٹمی نے رک کی طرف دیکھا۔ ”میرا خیال ہے میں
 سمجھتی ہوں کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟“
 رک نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر اسے بھی اس
 معصوم بچے کا خیال آیا۔ اس نے بے یقینی سے کہا۔ ”لیکن
 وہ صرف حادثہ تھا۔“
 ”ہاں لیکن اس شخص کا سوچو جس کی کل کائنات یہی
 ایک بچہ تھا۔“ ایٹمی بولی۔ ”آخر اسے کیسے پتا چلا کہ ہمارے
 ساتھ کیا ضرورت ہے اور وہ مدد کے لیے آ گیا تھا۔“
 ”مگر یہ اس نے کیا ہے تو وہ مدد کے لیے کیوں آیا؟“
 ”شاید وہ بچہ بچا رہا ہے۔“ ایٹمی بولی۔ اسی لمحے بادل
 زور سے گرے اور آسمان روشن ہو گیا۔ تب انہوں نے
 دیکھا کہ عفریت چرچ کے سامنے کھڑا ہے۔

☆☆☆

جیف پشیل چل رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس
 کے جسم میں کوئی چیز ہے جو رہ رہ کر اسے اندر سے میں کر رہی
 ہے۔ تکلیف اور سر جھکانے کی وجہ سے اس کے لیے چلنا
 محال ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی پک اب نہیں لی تھی۔ وہ پیدل
 ہی دلدل کے درمیان راستوں سے گزر رہا تھا۔ درحقیقت

بولڈ ماؤنٹین کا سارا علاقہ پاس پاس ہی ہے، صرف گاڑی
 سے سفر کے لیے طویل راستوں کو اختیار کرنا پڑتا ہے کیونکہ
 دلدل میں ہر جگہ گاڑی گزرنے کا راستہ نہیں بن
 سکتا۔ درختوں کے نیچے اندھیرا تھا اور انجلی رہ رہ کر نہ
 چمک رہی ہوتی تو اسے راستہ نظر نہ آتا۔ اس کا رخ دلدل
 کے اوپری حصے کی طرف تھا۔ بالآخر وہ میگاٹ کے
 جھوپڑے تک پہنچ گیا۔ اس نے دروازہ کھولا اور اندر کی
 طرف گیا۔ اس کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ میگاٹ بدستور اپنی
 کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس نے دیکھے بغیر پوچھا۔
 ”اب کیوں آئے ہو؟“

”میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔“ جیف نے اپنا
 پیٹ پکڑ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اسے روکو۔“
 ”اسے اب کوئی نہیں روک سکتا۔“ میگاٹ نے
 جواب دیا۔ ”جب وہ ایک بار زندہ ہو جائے تو اپنا کام مکمل
 کرنے تک نہ مڑتا ہے، نہ واپس جاتا ہے۔“
 ”میں کیا کروں؟“
 ”تم گھر جاؤ اور آرام کرو۔“

جیف نے شاٹ گن کا رخ میگاٹ کے سر کی طرف کر
 دیا، اس کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ اس کا کوئی فائدہ
 نہیں تھا۔ ”جیسا کہ تم نے کہا، میں اسے مار سکتا ہوں۔“
 لیکن اسے نہیں روک سکتے۔“

جیف نے گہری سانس لی اور شاٹ گن شانے پر
 لٹکاتے ہوئے جھوپڑے سے نکل گیا۔ اس کا رخ اب اپنے
 گھر کی طرف تھا۔ اس بار بھی وہ دلدل کے درمیان موجود
 شاٹ کٹ راستوں سے گزر رہا تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد
 وہ اپنے گھر کے سامنے تھا۔ کسی زمانے میں یہاں اس کے
 باپ کا قلم ہوتا تھا مگر پھر دلدل نے زمین خراب کر دی اور
 اسے فارم ختم کرنا پڑا تھا۔ اس نے ہائی وے پر گھر دوسری
 اسٹور کھول لیا۔ اس کے بعد جیف یہ اسٹور چلانے لگا تھا مگر
 اس کے بعد اسے چلانے والا کوئی نہیں تھا۔ شاید اسے بھی
 اب چلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ باب کے لیے ہی تو
 سب کرتا تھا۔ جیف گھر کے بجائے اصطبل کی طرف بڑھا۔
 اب اصطبل کی جگہ جیف کی ورکشاپ تھی جہاں وہ مختلف کام
 کرتا تھا۔ وہ لٹکھڑاتا ہوا اندر آیا اور ایک کونے میں رکھے
 فائر سیلنڈر کی طرف بڑھا۔ وہ اس کی مدد سے اپنے گھر اور
 فارم کے آس پاس آگ آنے والی فالتو جھاڑیاں جلا دیتا
 تھا۔ ڈبل سیلنڈر اٹھا کر اس نے چیک کیا۔ آئینجن والا
 سیلنڈر خالی تھا۔ وہ اس کے کنٹ بولٹ کھولنے لگا۔ اس کی جگہ

دوبل فلورائیڈ، ڈبل طاقت



facebook.com/snscares

EBP-02-14

قدم رکھا، وہ تینوں دوسری سمت سے نکل بھاگے۔ رک آگے تھا اور وہ اسے پہلی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔ بریڈ ان کے پیچھے تھا۔ وہ اپنی نیچے کی طرف جارہے تھے۔ تیز ہوا کی وجہ سے مٹی اڑ رہی تھی اور انہیں آنکھیں کھولے رکھنا بھی مشکل ہو رہا تھا مگر وہ نہ تو رک سکتے تھے اور نہ آنکھیں بند کر سکتے تھے۔ اس لیے تکلیف برداشت کرتے اور گرتے پڑتے بھاگے جارہے تھے۔ جیسے جیسے وہ نیچے آ رہے تھے، دلدلی زمین کم ہوتی جا رہی تھی اور درختوں کے بجائے خشک صحرائی جھاڑیاں زیادہ نظر آنے لگی تھیں۔ جن میں کہیں کہیں اکا دکا درخت بھی لگے ہوئے تھے۔ پہلی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“
”ہمیں کسی سڑک تک یا ایسی جگہ پہنچنا چاہیے جہاں سے ہم پولیس کو کال کر سکیں۔“ رک نے جواب دیا اور سڑک دیکھا۔ بریڈ ان سے کچھ دور تھا۔ کیونکہ عفریت نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے انہوں نے رفتار ڈرام کر لی۔ ورنہ اس سے پہلے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے تھے۔ ان کی ہمت جواب دے نہ تھی۔ بریڈ ان کے پاس آ گیا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”روستے بھاگ رہے ہیں۔ اس سے ڈرو اور نکل سکتے ہو۔“
”نکل جاؤ۔“
”مگر کیسے؟ ہم مسلسل نہیں بھاگ سکتے اور یہاں کوئی گاڑی نہیں ہے۔“
”وہ رہی گاڑی۔“ بریڈ نے دور سڑک پر کھڑے جیف کے ٹرک کی طرف اشارہ کیا۔ وہ تینوں اس کی طرف بھاگے۔ ان کا خیال تھا کہ جیف بھی ٹرک میں ہوگا مگر ٹرک خالی تھا۔ وہ تینوں ٹرک کے کبین میں گھسے۔ انکیشن میں چابی نہیں تھی۔ انہوں نے تلاشی لی تو ڈیش بورڈ کے خانے سے ایک اضافی چابی نکل آئی۔ رک نے جلدی سے اسے انکیشن میں لگا دیا اور پھر انکیشن اشارت کیا تھا کہ اس کی طرف کا شیشہ ٹوٹا اور عفریت کا ہاتھ اندر آیا۔ اس نے رک کا سر پکڑا اور اسے کھلونے کی طرح باہر کھینچ لیا۔ پہلی چلانے لگی۔ وہ دوسری طرف سے اترنے لگی مگر بریڈ نے اسے پکڑ لیا۔ ”نہیں، وہ اسے لے گیا ہے۔ تم بھی ماری جاؤ گی۔ ٹرک اشارت ہے۔ یہاں سے نکل۔“

پہلی کی حالت بری تھی مگر بریڈ ٹھیک کہہ رہا تھا کہ انہیں یہاں سے نکلنا تھا۔ وہ رک کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ

اسے دوسرا سیٹ پر لگاتا تھا۔ اچانک اس کا سر ڈولنے لگا اور آنکھوں کے آگے ماحول سرخ سا ہو گیا۔

☆☆☆

بوڑھی میگاٹ آنکھیں بند کیے زیر لب کہہ رہی تھی۔ ”میرے بچے، اب وقت آ گیا ہے۔ تم ہمیشہ کی زندگی حاصل کر لو گے۔ بس دو شکار اور ہیں۔ اس کے بعد تمہیں پھر کوئی نہیں مار سکے گا اور اس علاقے پر تمہاری حکومت ہوگی۔ یہاں کا ہر شخص تمہارا غلام ہوگا۔“
یہ کہہ کر میگاٹ کچھ پڑھنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ یہاں بیٹھ کر عفریت کی راہنمائی کر رہی ہے۔

☆☆☆

پہلی کی چوڑ نکل گئی۔ وہ ان کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آ گیا تھا۔ اس نے رک سے کہا۔ ”ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔“

رک اس سے متفق تھا۔ اس نے بریڈ سے کہا۔ ”تمہارا خیال تھا کہ یہ یہاں تک نہیں آ سکے گا مگر یہ آ گیا ہے۔“

”یہ شاید اندر نہ آ سکے۔“ بریڈ نے ہونٹوں پر زبان کھینچی۔ ”میں خود اس کے بارے میں نہیں نکل جاتا۔ صرف دوسروں سے سنا ہے۔“

عفریت چرچ کے سامنے کھڑا تھا اور اس کے عقب میں مسلسل بجلی چمکنے سے ماحول نیلگوں روشنی میں نہایا ہوا لگ رہا تھا۔ پہلی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اشارہ کیا۔ ”اس کا چہرہ دیکھو، پہلے یہ درندوں جیسا تھا مگر اب اس پر انسانوں جیسے نقوش آ گئے ہیں۔“

رک نے غور کیا تو واقعی اس کا چہرہ اب انسانوں جیسا ہو رہا تھا۔ اسے اس کے نقوش جانے پہچانے لگ رہے تھے۔ اچانک وہ بولا۔ ”میرے خدا! اس کا چہرہ تو مسٹر ہارلے جیسا ہو رہا ہے۔“

”تب یقیناً اسے جیف ہارلے کے خون سے زندہ کیا گیا ہے۔“ بریڈ بولا۔ ”وہی اس کا ماسٹر ہے۔“
”یعنی وہ اسے قابو کر رہا ہے۔“

”نہیں، ماسٹر سے مراد یہ ہے کہ اس کی زندگی جیف کی وجہ سے ہے۔ جب تک جیف زندہ ہے، وہ بھی زندہ رہے گا اور جیف مر جائے گا تو وہ بھی مر جائے گا۔“ بریڈ نے کہا۔

”وہ آ رہا ہے۔“ رک چلا یا کیونکہ عفریت آگے بڑھ رہا تھا۔ پہلے وہ پچھلے رہا تھا مگر اب ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے فیصلہ کر لیا ہے۔ جیسے ہی اس نے چرچ کی حدیں

سنبھالی اور گیزرنگ کر ڈک آگے بڑھا دیا۔ بریڈ مڑ کر دیکھ رہا تھا اور اس نے دیکھا کہ عفریت رک کو سرے پکڑ کر کھینچتا ہوا ان کے پیچھے آ رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ ”جلدی کرو، وہ پیچھے آ رہا ہے۔“

یہ راستہ جیف کے فارم کی طرف جا رہا تھا اور چند منٹ بعد وہ فارم تک پہنچ گئے۔ بریڈ نے ایملی کو بتایا۔ ”یہ جیف کا فارم ہے۔“

”شاید وہ یہیں ہے۔“ ایملی نے ٹوک روک دیا۔ ”وہی اس عفریت کو زندہ کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اب جیف کو ہی اسے روکنا ہوگا۔“

وہ دونوں نیچے آئے اور پھر اصطبل کا کھلا دروازہ دیکھ کر آگے بڑھے۔ اندر معمولی سی روشنی تھی اور کہیں کہیں اندھیرا تھا۔ بریڈ نے آواز دی۔ ”مسٹر ہارلے۔۔۔ کیا تم یہاں ہو؟“

مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ ایملی آگے بڑھی تو اس نے دیکھا کہ جیف ایک کونے میں کھڑا ہوا کچھ کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”جیف۔۔۔۔۔“

”تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔“ جیف مڑے بغیر بولا۔ ”وہ دروازہ لے ہوئے سیلنڈر بدل رہا تھا۔ اس کی آواز عجیب سی ہو رہی تھی۔“

”ہم کہاں جائیں؟ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔“ ایملی بولی۔ ”وہ ہمارے پیچھے آ رہا ہے۔ اس نے رک کو بھی پکڑ لیا ہے۔“

جیف اس کی طرف مڑا۔ ”مجھے افسوس ہے۔“

”صرف تمہارے افسوس سے کام نہیں چلے گا۔“ ایملی نے تیز لہجے میں کہا۔ ”تم نے اسے زندہ کیا ہے اور اب تم ہی اسے مار سکتے ہو۔“

”میں اسی کی تیاری کر رہا ہوں۔“ جیف نے سیلنڈر کا آخری نٹ بھی لگا لیا اور اس کا نوزل پائپ اٹھا کر اسے تیلی سے آگ دکھائی۔ فوراً ہی سرسرا تا ہوا تیز شعلہ نوزل سے نکلنے لگا۔ ”میں اسے جلا کر ختم کر دوں گا۔“

”شاید آگ اسے ختم کر دے۔“ ایملی بولی۔ ”اس کی اصل موت بھی جلنے سے واقع ہوئی تھی۔“

جیف نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”مجھے بریڈ نے بتایا ہے۔“ ایملی نے کہا اور مڑ کر دیکھا۔ ”وہ میرے ساتھ ہے۔“

مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ بریڈ شاید بھاگ نکلا۔

تھا۔ باہر اب بجلی بہت تیزی سے چمکنے لگی تھی۔ جیف نے باہر کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”وہ آگیا ہے۔“

اس نے سیلنڈر اٹھا کر نشانے پر ٹانگا اور باہر کی طرف بڑھا تھا کہ اچانک اسے پکڑا تا شروع ہو گئے اور وہ خود کو کرنے سے بچانے کے لیے میز کا سہارا لے کر اس پر چمک گیا۔

بریڈ نے عفریت کو آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ خاموشی سے اصطبل سے نکلا اور اس کے برابر میں موجود اسٹور روم میں گھس گیا۔ عفریت نے رک کو چھوڑ دیا۔ وہ زخمی اور نیم بے ہوش تھا۔ اسٹور کا دروازہ بجا تو عفریت نے چونک کر اس طرف دیکھا اور پھر اسٹور کی طرف بڑھا۔ بریڈ اندر گھس کر ایک الماری میں چھپ گیا۔ اس کا روال روال کانپ رہا تھا اور اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا کہ کوئی آواز نہ نکلے۔ اسٹور کا دروازہ آواز سے کھلا اور

الماری کے دروازے کے رختوں سے بریڈ نے عفریت کا بڑا سا سر اندر آتے دیکھا۔ اس پر انسانی خدو خال بہت نمایاں ہو گئے تھے اور یہ تقریباً جیف جیسے تھے۔

فرق صرف سبکی مٹی سرخ کھال اور سائز کا تھا۔ اس کا سر کسی بھی انسانی سر سے دو گنا بڑا تھا۔ اس کی آنکھیں مڑھکتی ہوئی تھیں۔ عفریت نے جیف کی آواز سنی تھی۔ اچانک باہر سے ایملی کے چلانے کی آواز آئی تو

عفریت نے سر گھما کر دیکھا۔ ایملی نے رک کو دیکھ لیا تھا اور اس کی طرف بھاگ رہی تھی۔ عفریت غرایا اور اس نے اچانک الماری کا دروازہ کھول کر بریڈ کو باہر کھینچ لیا۔

وہ خوف سے بچا اٹھا مگر عفریت نے اسے کچھ کہا نہیں۔ صرف کھینچتا ہوا باہر لایا اور میدان کی طرف پیچھ دیا۔

ایملی نیم بے ہوش رک کو اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بریڈ اٹھ کر ایک طرف بھاگ مگر عفریت نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ ایملی اور رک کی طرف بڑھا۔

ایملی چلا رہی تھی اور رک سے ہوش میں آنے کو کہہ رہی تھی۔ عفریت کو نزدیک آتے دیکھ کر ایملی نے رک کو چھوڑ دیا۔ وہ نیچے گرا۔ عفریت نے اسے سر سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ ایملی اصطبل کی طرف بھاگی جہاں جیف ابھی تک میز پر جھکا ہوا تھا۔ ایملی نے چلا کر کہا۔ ”خدا کے لیے وہ رک مار دے گا۔“

مگر جیف میز پر جھکا ہوا عجیب سی آوازیں نکال رہا تھا۔ ایملی ڈرتے ڈرتے اس کی طرف بڑھی۔ ”جیف! تم سن رہے ہو؟“

”ہاں۔“ جیف نے عجیب سی آوازیں کہا اور اچانک گھوما تو ایملی خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی کیونکہ جیف کی آنکھیں بالکل عفریت جیسی ہو رہی تھیں اور چہرے کے تاثرات حیوانی تھے۔ ”اب سن رہی ہو۔“

ایملی باہر کی طرف بھاگی۔ جیف اس کے پیچھے نکل آیا تھا۔ اس نے سیلنڈر اٹھا رکھا تھا۔ وہ عفریت کی طرف بڑھا مگر وہ عفریت کے لیے نہیں جا رہا تھا۔ اس نے نوزل کا شعلہ تیز کیا اور آگے بڑھا تھا کہ اس کا ہاتھ وہاں دسٹے کلانی میں گھس گیا۔۔۔۔۔ یہ گندم اور ریشے الگ کرنے کے کام آتا تھا۔ جیسے ہی کاٹا جیف کی کلانی میں گھسا، عفریت نے دھاڑ ماری اور اپنا ہاتھ دیکھا۔ اسی ہاتھ سے اس نے رک کا سر تھا ہوا تھا۔ اس سے سر چھوٹا تو رک نیچے گرا اور رینگ کر اس سے دور جانے لگا۔ جیف کو درد کا احساس ہوا تو اس نے اپنی کلانی دیکھی اور پھر اسے آزاد کرانے کے لیے کوشش کرنے لگا۔ جیسے جیسے وہ بازو ہلا رہا تھا، عفریت کا بازو بھی ویسے ہی ہل رہا تھا۔ کوشش میں ناکامی کے بعد جیف نے سیلنڈر اتار پھینکا اور پھر دوسرے ہاتھ سے زور لگا کر اپنا پتھرا ہوا ہاتھ کانٹے سے نکال لیا۔

ایملی نے سیدھ دیکھ کر چیخ ماری تھی۔ اس نے دوڑ کر سیلنڈر اٹھا لیا اور شعلے کا رخ عفریت کی جانب کر دیا۔ جواب ایملی کے پاس آ رہا تھا۔ شعلے اس سے ٹکرانے لگے مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ جیف ہاتھ تھام کر لوٹھراتا ہوا اصطبل کی طرف چلا گیا۔ ایملی پیچھے ہوتے ہوئے عفریت پر شعلے پر سارا ہی مٹی اور یہ آگ اس کا کچھ کاٹنے سے قاصر تھی۔ اس کی صورت بالکل جیف جیسی ہو گئی تھی۔ اچانک اس نے ہاتھ مارا اور ایملی کے ہاتھ سے پائپ نکل گیا۔ اس نے گردن سے دو بوج کر ایملی کو آگے کیا اور اس کے شانے سے سیلنڈر اتار لیا۔ پھر اس نے پائپ اٹھا لیا جس سے بدستور شعلہ نکل رہا تھا۔ اس نے ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ ایملی کو دیکھا تو وہ اس کے عزائم بھانپ کر لرز اٹھی۔

جیف لوٹھراتا اور کراہتا ہوا اندر آیا۔ اس نے اوزاروں والی دروازہ کھولی اور اس میں رکھا ہوا چھوٹا سا ریو اور نکال لیا۔ اس نے باہر کی طرف دیکھا اور ریو اندر سے لگا کر فائر کر دیا۔ فائر کی آواز باہر تک آئی اور عفریت جس نے ایملی کا گلا دیوچا ہوا تھا اور شعلہ اس کے چہرے کی طرف لا رہا تھا، اس نے عجیب سی آواز نکالی اور نیچے گر

کر ساکت ہو گیا۔ ایملی لوٹھڑا کر پیچھے ہٹی اور اپنی سانس بحال کرنے لگی۔ اسے حیرت تھی کہ عفریت اچانک کیوں گرا اور اندر سے فائر کس نے کیا تھا۔ کوئی عفریت کو نہیں لگی تھی اور گئی بھی تو بیکار تھی کیونکہ اس پر گولی کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ اسی اثنا میں اندر سے جیف لوٹھڑاتے قدموں سے باہر آیا اور ایملی کے سامنے زمین پر بالکل اسی انداز میں ڈھیر ہو گیا جیسے عفریت گرا ہوا تھا۔ ایملی نے دیکھا اس کا چہرہ بھی ویسا ہی ہو رہا تھا۔ اس کی کپٹی میں گولی کا سوراخ تھا مگر وہ ابھی زندہ تھا۔

اب ایملی کی سمجھ میں آیا کہ عفریت کیوں گرا تھا۔ یہ بات درست ثابت ہو رہی تھی کہ وہ اپنے ماسٹر کی موت تک زندہ رہتا تھا اور اب اس کا ماسٹر مرنے والا تھا اس لیے وہ بھی مر رہا تھا۔ ایملی نے ہمت کر کے اس کے ہاتھ سے ریو اور نکال لیا اور اس کا رخ جیف کی طرف کر دیا۔ وہ ہمت کر رہی تھی کہ اس پر گولی چلائے۔ اچانک جیف نے حرکت کی۔ اس نے سر اٹھا کر ایملی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”اے مارو۔“

جیف کا ہاتھ عفریت کی طرف اٹھا ہوا تھا مگر جب عفریت اچانک اٹھا تو ایملی کی سمجھ میں آیا۔ جیف عفریت کے کمر پر ہاتھ رکھا۔ اسے مار دے۔ عفریت نے اپنی طرف بڑھا تھا کہ ایملی نے جیف پر فائر کیا اور پھر بتوں بو کر اس وقت تک فائر کرتی رہی جب تک ریو اور خالی نہیں ہو گیا۔ اس بار جیف یقینی موت کے گھاٹ اتر گیا تھا۔ وہ گر کر ساکت ہو گیا اور عفریت بھی اسی کی طرح گر کر ساکت ہو گیا۔ ایملی نے دوڑ کر رک کو اٹھا لیا۔ وہ زخمی تھا مگر اس کی حالت زیادہ خراب نہیں تھی۔ بریڈ بھی آگیا۔ ایملی رک کے زخم دیکھ رہی تھی کہ جھک کی آواز کے ساتھ عفریت کی لاش سے شعلے اٹھنے لگے اور چند منٹ بعد شعلے بجھے تو لاش کی جگہ بلبوں کا ڈھانچا رہ گیا تھا۔ ایملی اور بریڈ نے سہارا دے کر رک کو ڈنگ میں سوار کیا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد درختوں سے میگاٹ نمودار ہوئی۔ اس نے عفریت کی لاش دیکھی اور بولی۔

”مجھے معاف کرنا میرے بچے لیکن میں تمہیں زندہ کرنے سے پہلے نہیں مروں گی۔“

میگاٹ نے عفریت کی سکر جانے والی لاش اٹھالی اور کچھ دیر بعد وہ اسے اسی بڑے تنے والے درخت میں دفن کر رہی تھی۔

سپنس ڈائجسٹ 75 جنوری 2015

سپنس ڈائجسٹ 76 جنوری 2015

سودا جنوں

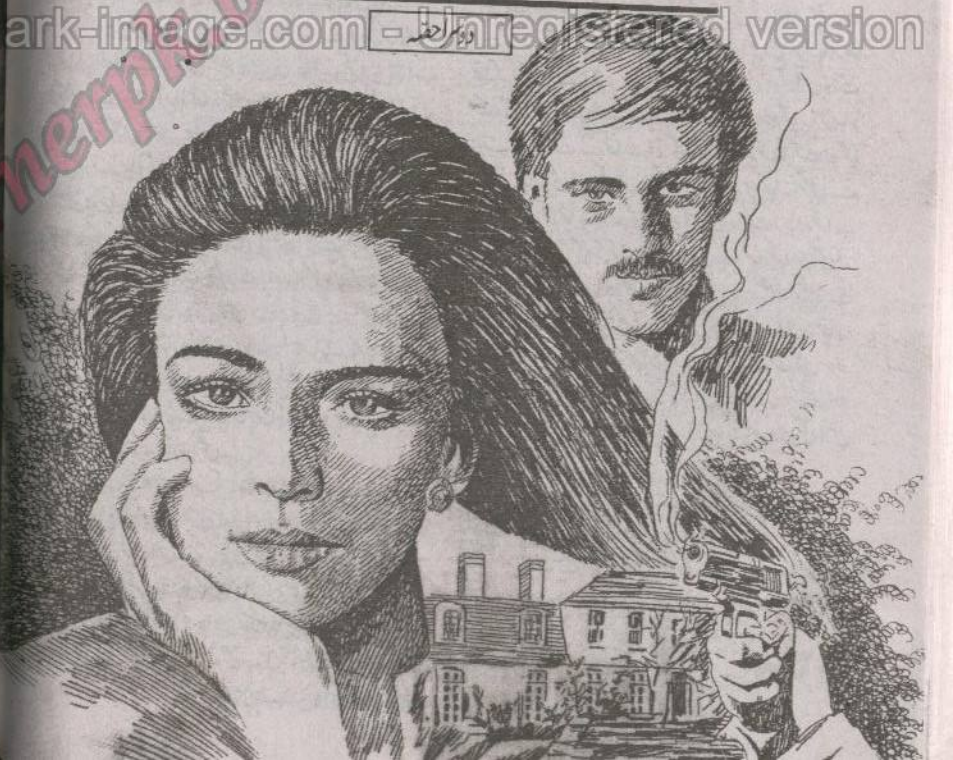
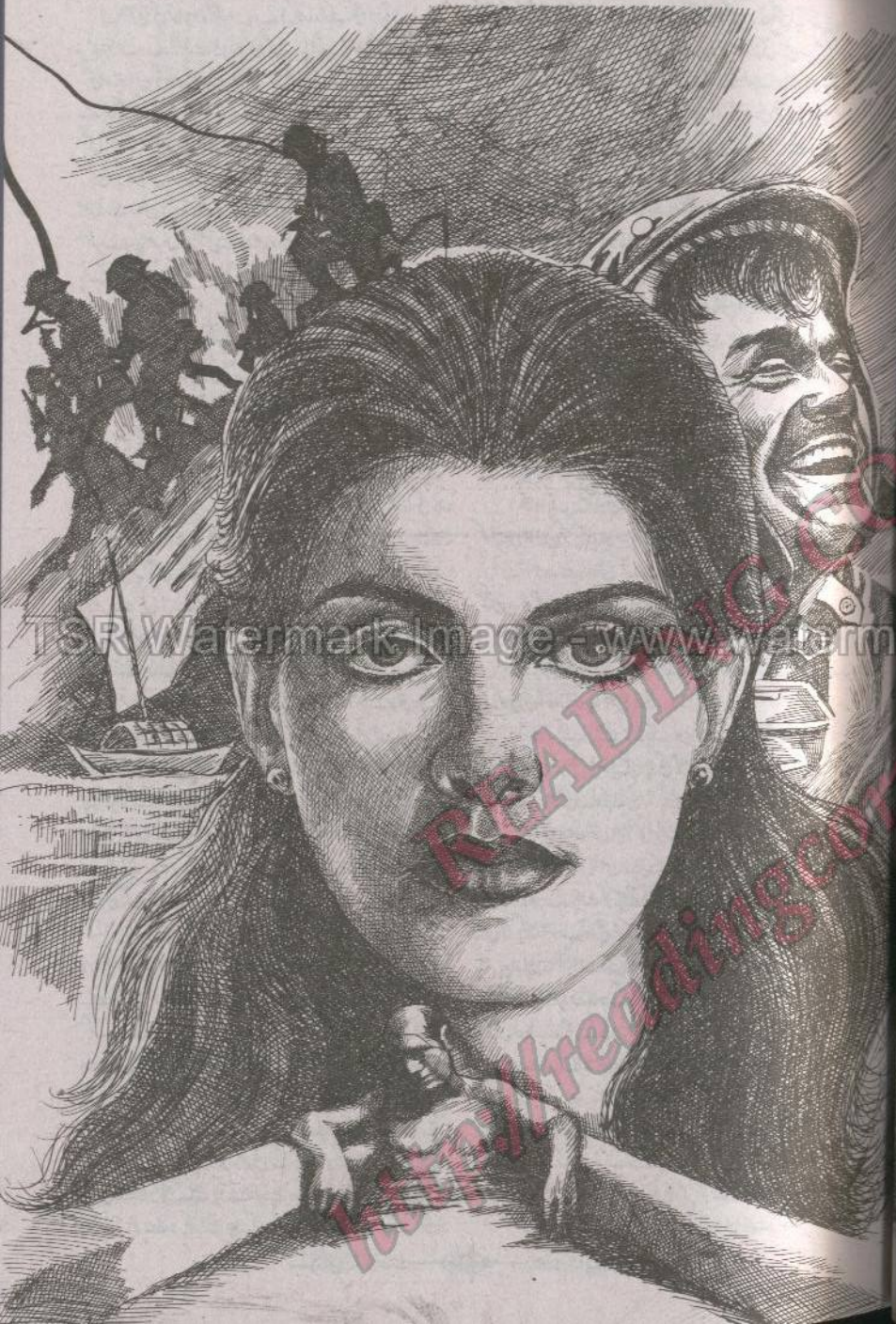
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

عرصہ دراز سے صیہونی قوتیں امت مسلمہ کے عزم و حوصلے کو سبوتاژ کرنے کی سازشوں میں مصروفِ عمل ہیں۔ اس رپ کائنات کا بھی کیسا انوکھا انصاف ہے۔ ہر دور میں فرعون پیدا کرتا ہے اور پر دور کا موسیٰ بھی الگ بناتا ہے جوانی کے درمیان رہ کر پرورش پاتا ہے اور فرعونی طاقتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ آج بین الاقوامی منظر نامہ جو داستان دل گیر سناتا ہے اس نے تمام عالم اسلام میں دکھ کی ایک لہر پیدا کی ہوئی ہے۔ حساس دلوں میں آج بھی ارض مقدس میں صیہونی یلغار ان کی چیرہ دستیوں کے خلاف نفرت و غیظ کی آگ بھری ہوئی ہے کیونکہ غاصب یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کو نذرِ آتش کر کے پیکل سلیمانی تعمیر کرنے کی مضموم اور ناپاک سازش تیار کی تھی۔ جسے روکنے کے جرم میں اسرائیلی فوجیوں نے نادار اور مجبور فلسطینی عوام کو اپنی چنگیزیت اور بربریت کا نشانہ بنانا شروع کیا اور فلسطینی بستیوں میں خون کی بولی کھیلی۔ اسرائیلی سازشوں کے تانے بانے کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ آج بھی موت وہاں گلی گلی دروازوں پر دستک دیتی گھوم رہی ہے لیکن... آج بھی کچھ پاگل لوگ عصمتوں کے محافظ بنے ایک سوداے جنوں میں مبتلا ہیں...

اب اس بازی کا انجام...

اجلی رنگت اور مکروہ چہروں والی شیطانی قوتوں کی بربریت کا لرزہ خیز منظر

دورِ حاضر



”کیا مطلب..... کیا اس میں ہمارا قصور ہے؟“ اس بار نامہ نے شیخ رمضان کی طرف دیکھتے ہوئے تڑپ سے کہا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ شیخ خود اسرائیلی خفیہ ایجنسی جس موساد کا ہی جاسوس تھا، ابھی ان کے درمیان یہ بحث ہو رہی تھی کہ ایک غصے قد کا مگر چوڑے اور مضبوط شانے والا شخص چار اسرائیلی پولیس اہلکاروں کے ساتھ وہاں آن پہنچا۔ یہ اسرائیلی پولیس چیف تھا۔ اس کے چہرے پر سختی کھنڈی ہوئی تھی اور چندی چندی آنکھوں میں مکاری دکھائی دے رہی تھی۔ جب نامہ اور عابد نے بھی اس سے بحث میں الجھنا چاہا تو اس نے تمکیر اور کرحت آواز میں ان سے قہقہا اٹھایا۔

”ہم آپ کو مجرم کی حیثیت سے پھانسیاں ڈال کر نہیں لے جا رہے ہیں..... ضابطہ کی ایک معمولی کارروائی کے بعد آپ کو اسی طرح یا عزت طریقے سے یہاں دوبارہ پھوڑ دیا جائے گا۔“

ناچار دونوں کو اس کی بات ماننا پڑی۔ اس دوران جب عابد اور نامہ پولیس چیف کے ساتھ روانہ ہو رہے تھے، شیخ رمضان نے معنی خیز نظروں سے اسرائیلی پولیس چیف کی طرف دیکھا۔ پولیس چیف کے بدہیت ہونوں پہ بڑی غصیت مسکراہٹ تھی۔

رمضان نے اپنے دل میں سوچا کہ اس شخص کے ساتھ کیا ہو گا؟ موساد کے کسی ذمہ دار اہلکار سے رابطہ کر کے اسے نامہ اور عابد سے متعلق تازہ ترین رپورٹ دینے لگا۔

اس رپورٹ کے اختتام کے چند منٹوں بعد موساد کے پانچ ٹاپ ایجنٹ فوراً حرکت میں آ گئے، ان میں دو ایجنٹ وہ بھی شامل تھے جنہوں نے قبرص میں سیما سول کی بندرگاہ میں دو جلاوطن فلسطینی آفسیروں احسن الزہروی اور ابو جواد اعزیر کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔

منصوبہ یہ تھا کہ یہ پانچوں اسرائیلی ٹاپ ایجنٹ فلسطینی حریت پسندوں کے گھیس بھر کے پولیس کی اس جیب پر حملہ آور ہوں گے اور نامہ اور عابد کو ان کی کسٹڈی سے چھڑا کر... فی الفور موساد کے ہیڈ کوارٹر کا رخ کریں گے اور مشہور کر دیا جائے گا کہ یہ کارروائی حریت پسند عظیم بی فرنت کے کمانڈوز کی تھی جبکہ اس ”ڈرائے“ کا پہلے سے ہی مذکورہ اسرائیلی پولیس چیف کو بھی پتا تھا اور محض مکرورہ ڈرائے میں رنگ بھرنے کے لیے وہ ان کا جعلی مقابلہ بھی کریں گے۔ مقصد یہی تھا کہ کوئی یہ نہ جان سکے کہ نامہ اور عابد کو ایک سازش کے تحت درحقیقت موساد کی قید میں ڈالا گیا ہے۔ بہر طور دونوں اس کربہ حقیقت سے بے خبر تھے، سفر اپنے

ہونے کے نصف گھنٹے بعد شمال جنوب کے ”ریڈ زون“ میں داخل ہو چکے تھے، جمال ٹرک ڈرائیور کا ہاتھ اور بائیں سر کے برابر والی سیٹ پر موجود تھا۔ ان کے جسموں پر ان دونوں جہنم واصل اسرائیلی فوجیوں کی وردی بھی اور ایک بڑا امتحان ان کے سر پہ تھا۔ اب کسی بھی وقت وہ اس مورچہ چڑھ چکی تھیں۔

والے تھے، جسے ابھرنے ”پوائنٹ تھری“ کا نام دیا تھا۔

پوائنٹ تھری کی بتیاں دور سے چمکی ہوئی نظر آ رہی تھیں اور دونوں کے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے اور اعصاب تن چکے تھے، فوجی نوپیاں انہوں نے دانستہ پیشانی سے ذرا نیچے جھکا کر آئی ڈی کارڈز ہاتھوں میں تمام لیے تھے۔ بالآخر جب وہ قریب پہنچے تو انہیں چوکی کے گیٹ سے ذرا فاصلے پر پارہری روک لیا گیا۔ گویا فیصلہ کن گھڑی سر پہ آچکی تھی۔

☆☆☆

سیما سول بندرگاہ کے قریب واقع ہوئی پورٹ لینڈ کے گیٹ کے قریب جو بھاری گاڑیاں پہنچی تھیں، وہ اسرائیلی پولیس کی تھیں..... خنجر کی پریشانی کی وجہ یہی تھی کہ ان کے دونوں عرب مہمانوں نامہ اور عابد شیخ رمضان کی انتظامیہ پولیس کسٹڈی میں دینے کا فیصلہ کر چکی تھی اور خنجر جاتا تھا کہ ان کے دونوں مہمانوں کو اسرائیلی پولیس کے قہقہے مل جانے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے اس لیے خنجر نے اپنے دونوں ساتھیوں معید اور حارث کی مدد سے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ جیسے ہی پولیس نامہ اور عابد کو لے کر روانہ ہوگی، ان پر راستے ہی میں حملہ کر کے انہیں چھڑا لیا جائے گا۔ وہ اپنے اس منصوبے کی جھلکی رپورٹ اپنے سینکڈ ان کمانڈ خالد حسین کو دے چکا تھا۔

نامہ کی طبیعت اب تک کافی تسکین چکی تھی، پوری طرح ہوش میں آنے کے بعد وہ خاصی ہراساں رہی پھر عابد شکری کو ساتھ دیکھ کر اسے کچھ تسکین ہوئی مگر عابد خاصا پریشان اور متشکر نظر آ رہا تھا۔ کیونکہ یہ معاملہ پولیس کا بن چکا تھا اور انہیں دائرہ تفتیش میں لانے کے لیے اسرائیلی پولیس کا سامنا کرنا پڑتا..... اور پھر جب اسے یہ معلوم ہوا کہ ان دونوں کو ساتھ لے جانے کے لیے پولیس کی دو گاڑیاں آچکی ہیں تو عابد نے ان کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا۔ ہوں گا شیخ رمضان اپنے چہرے پر پیشہ وارانہ مسکراہٹ تمکیر سے ہوئے عابد سے بولا۔

”آپ دونوں ہمارے معزز مہمان ہیں لیکن میرا آپ کو قانون کے مطابق اس کارروائی سے تو گزرنا پڑے گا۔ آپ دیکھ کر رہے ہیں یہاں آپ دونوں ہی کی وجہ سے کس قدر ہنگامہ اور خون ریزی ہو چکی ہے۔“

”کرو.....“ برابر کی سیٹ پر بیٹھے اس کے ساتھی نے بھی یہ سب کچھ تقریباً دیکھ لیا تھا اور ابھی اس نے بہ سرعت اپنی گن سیدی ہی کی تھی کہ ساعت شکن دھماکا ہوا۔ ٹرک کو زبردست جھٹکا لگا۔ وہ بدست ہاتھی کی طرح ڈونڈے لگا۔ دونوں فوجی بری طرح یوگلا گئے مگر جلد ہی اپنے حواسوں پر قابو پایا اور ٹرک کو اٹھنے سے بچانے کی پوری کوشش کرتے ہوئے بریک لگا دیے۔ گردوغبار کا عقب سے طوفانی بھولا نمودار ہوا جس نے چند ثانیوں کے لیے دونوں کو اندھا کر دیا۔ اس اثنا میں ڈرائیور فوجی نے بھی پھرتی کے ساتھ اپنا پستول نکال لیا تھا۔ پھر دفعتاً ہی ان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ڈرائیور فوجی کی پچھلی پٹائی آنکھوں نے پہلے اپنے برابر میں بیٹھے اپنے ساتھی کا صدمہ نامک انجام ہوتے دیکھا۔ اسے خاموش پستول کی گولی سے کسی نے نشانہ بنایا اس کا بھیجا کھو پڑی سمیت چمک گیا تھا۔ اس نے پستول سیدھا کیا تو دوسری طرف سے باقر نے اپنے خاموش ریولور کی گولی سے اس کی گردن پر فائر کر دیا۔ وہ بھی آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔

نفساً ایک لمحے کو یکدم ساکت ہوتی محسوس ہونے لگی، جیسے کوئی بڑا طوفان گزر گیا ہو۔ یہ پانچوں ایک جگہ کھٹے ہوئے۔

”صورت حال خراب ہوتے ہوئے بچی ہے.....“

لیکن..... نازر برست ہونے کا دھماکا بھی کم نہیں تھا..... لیکن پانچویں ہولی آواز شمال کی جانب سے آئی۔ وہ بھی ایک جگہ کھٹے ہوئے۔

”عزیزم سہیلی، عمومی دھماکا سمجھا جا سکتا ہے۔ شکر ہے کہ گولی کی آواز نہیں ابھری۔“

”دور تک پھیلے تاریک ویرانے میں معمولی دھماکا بھی..... کسی قریبی اسرائیلی چوکی کو متوجہ کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔“ جمال نے کہا۔

”میں جلد ہی اپنا کام نشتا ہو گا۔ جو ہو کم سے کم ہی ہوا، مزید تاخیر..... منصوبے کے لیے نقصان دہ ہوگی۔“ انجیل کے قاسم عمر نے بحث کو سینے کی غرض سے کہا اور پھر بحر حرکت میں آ گئے، حسب توقع ٹرک میں فاضل نازم موجود تھا۔ لیکن اور باقر چاروں اطراف میں نظر رکھے ہوئے تھے، دوسرا ساتھی نازر بدلنے میں مصروف ہو گئے جبکہ باقی دو نے اسرائیلی فوجیوں کی لاشیں ٹھکانے لگانے کا بیڑا اٹھایا۔

یہ سارے کام بہت تھلیل وقت میں مشترکہ طور پر نشتائے گئے اس کے بعد منصوبے کے مطابق جمال اور باقر نے اسرائیلی فوجیوں کی وردی پائین کر ٹرک کا ڈرائیونگ کین سنبھال لیا، باقی چار ساتھی ٹرک کے عقبی حصے میں کھانے پینے کے اسباب کی آڑ سے چھپنے۔ ذرا دیر میں ٹرک روانہ ہو گیا۔

یہ لوگ شہرہ منصوبے ”بلینک پوائنٹ“ سے روانہ

ان کی خوفزدہ نظروں نے دیکھا، ٹرک کی رفتار بجائے کم ہونے کے یکثرت تیز ہوئی تھی۔ ایک خطرناک جوشن تھی، جو ان کی توقع کے بالکل خلاف بھی تھی، اس طرح ان کے ساتھی کی جان خطرے میں تو تھی ہی، مگر ان کا یہ خفیہ مشن بھی متاثر ہو سکتا تھا جبکہ حالات کا تقاضا تھا کہ..... اس اہم مشن کو انتہائی رازداری کے ساتھ نشتا جائے لیکن یہاں صورت حال اس کے عکس ہوئی تھی۔ اس اعصاب شکن خطرے کی طرف بڑھتی ہوئی صورت حال پر فوری طور پر قابو پانے کے لیے گروپ کی کمانڈوز کو ”ایڈ“ کرنے والی دلیر مجاہدہ..... لیلی آفندی نے ہل کے مل میں ہی ایک جارحانہ فیصلہ کر لیا اور جلی کی ہی سرعت کے ساتھ اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی..... اور چلائی۔

”سائنس رپورٹوں سے نازر کا ایک مائز برست کر ڈالو اور ڈرائیونگ کین برٹ پڑو۔“

ٹرک دھڑ دھڑاتا ہوا تیزی کے ساتھ سچ راستے پر لینے ان کے ساتھی کی طرف بڑھ رہا تھا، صورت حال کی سفاکی کا احساس اس وقت زیادہ ہوا جب ٹرک دھاڑتا ہوا اس کے عین سر پہ آن پہنچا۔ یہ صرف ایک ہل کے لیے ہوا اور دوسرے مل میں اسے لپٹ لگے تھے کہ اسے اپنے دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر پوری قوت کے ساتھ راستے سے ہٹا لیا ہوا اور دھاڑتے ہوئے ٹرک کے چوڑے موٹے نائز اس کے بالکل سر کے قریب سے گزرتے چلے گئے اور پھر دوسرے ہی لمحے ایک ساعت شکن دھماکا ہوا اور ٹرک جیسے ایک طرف جھک کر زمیں بوس ہو گیا پھر تانہوار کچے راستے پر دور تک کھسکا چلا گیا۔ گردوغبار کا یو قیامت مرغولہ اٹھا، لیلی کی ہدایت کے مطابق اس کے ساتھیوں نے ٹرک کے ایک نازک نشانہ بنایا تھا۔ ٹرک کے رستے ہی ان سب نے بیک وقت ٹرک کے ڈرائیونگ کین پر ہلا بول دیا۔

اسرائیلی ایجنسی بجلی گھر کو رسد سلائی کرنے والے ٹرک ڈرائیور بھی عام آدمی نہیں تھے، دونوں تربیت یافتہ فوجی ہی تھے، اول خطرے کو بھانپتے ہی انہوں نے ٹرک کی رفتار آہستہ کرنے کے بجائے مزید بڑھا دی تھی، ساتھ ہی اس نے اپنے برابر میں بیٹھے ساتھی کو کن الرٹ ہونے کا بھی اشارہ کیا تھا، ابھی اس کا دوسرا ساتھی تسکین ہی ہاتھ لگا ڈرائیور نے ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں کسی کو راستے پر پڑنے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے ٹھٹک گیا۔ اس نے لیلی کو بڑی پھرتی کے ساتھ راستے کے پیچوں سچ ابھرتے اور پھر لینے ہوئے اپنے ساتھی کو ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے دیکھا تو چلا کر اپنے ساتھی سے بولا۔ ”ناز“

الجماد کے ساتھیوں اور دو بی ایل ایس او کے محسن اور زبیر کے ساتھ تیونائی کی طرف گامزن ہو چکی تھی۔

تیونائی اپنی مخصوص جغرافیائی ساخت اور بناوٹ کے باعث پہاڑیوں اور گھنے جنگلات پر مشتمل تھا۔ اس کے وسط میں ڈیوڈ اسٹار کا ہیڈ کوارٹر تھا اور وہیں ڈیوڈ اسٹار کے سربراہ جنرل آئزک فرناش اور اس کے نائب میجر ایہود شامک کی پرنسپل رہائش گاہیں بھی تھیں۔ ڈیوڈ اسٹار کا ہیڈ کوارٹر ایک قلعہ نما عمارت پر مشتمل تھا۔ موساد کے ہیڈ کوارٹر کی طرح یہاں بھی ایک بڑا منظم فائلنگ کپائل سسٹم موجود تھا۔ جہاں دنیا بھر کے کما لک کے اہم خفیہ رازروں پر مشتمل کاغذات، ہم فائلوں کی صورت میں موجود تھے، جہاں سے ایک کاغذ کا ٹکڑا بھی اڑانا ناممکن حد تک مشکل نظر آتا تھا۔ یہاں کی سکیورٹی کو دیکھ کر صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اس عمارت کو خالص جنگی بنیادوں پر استوار کیا گیا تھا۔ یہاں بیلی پیڈ، رن وے، طیارے، ایئر ولف نامی جدید ہتھیار میزائل سے لیس بیلی کا پٹر بھی تھے، پوری بریگیڈ اپنی بیلیٹن سمیت یہاں تعینات تھی اور جویش عیسائی جو کہ رہتی تھی۔

الجماد کے مٹی بھر سرفروش جانناڑوں کا شب خون مارنا تو یہ ظاہر ایک بڑے بڑے خواب ہی نظر آتا تھا لیکن اپنی سرزمین قلعہ بن کر ان خاصہ یہودیوں کے ناپاک وجود سے خالی کروانے کے لیے اس سرزمین اور سوتلے جنوں جیسے بلند حوصلوں کے حامل مجاہدوں نے اپنے سے کئی گنا طاقت ور دشمنوں کو قوت ایمانی اور اللہ واحد کی مدد کے سہارے شکست دینے کا عزم کر رکھا تھا۔ سودنیا کی کوئی طاقت انہیں ان کے نیک مقاصد سے نہیں ہٹا سکتی تھی۔

زہیدہ کو ڈیوڈ اسٹار کی قوت کا اندازہ تھا۔ اس لیے اس نے گروپ بی کے مشن کو سب سے زیادہ اہم کام سوچا تھا کہ وہ صحرائے نجف میں ڈیمون اسٹیجنگی گھر (ریسرچ پلانٹ) کو اڑانے کی کامیاب کوشش کر ڈالے تو یلکھت پورا۔۔۔ یروشلم اور تل ابیب نہ صرف گھناؤں تاریکی کی زد میں آجائے بلکہ گریٹر اسرائیل کے پلان کا اہم ترین جزو کا بھی خاتمہ ہو جاتا اور بے عرصے تک اسرائیل کی کمرٹوٹ کر رہ جاتی۔ جیسا کہ مذکورہ اسٹیجنگی گھر کی آڑ میں ایک ان ڈائریکٹ خفیہ معاہدے کے تحت فرانس کی مدد سے اسرائیل یہاں بجلی گھر کی آڑ میں یورپیہ افزودگی کا پلانٹ قائم کرنا چاہ رہا تھا۔ اس طرح وہ اسٹیجنگی ہتھیاروں کے سلسلے میں طویل عرصے تک خود کفیل ہو جاتا۔ اس کی کامیابی کے بعد اگلا مرحلہ یہودی اور جرمانی ہتھیار بنانے کا تھا۔

تھا کہ جام شہادت نوش کرنے والے وہ تینوں مجاہد انہی کی وجہ سے اسرائیلی پولیس ٹیم سے نکلے تھے۔ وہ یقیناً انہیں اسرائیلی پولیس کے چنگل سے چھڑانا چاہتے تھے، ان سب باتوں کے باوجود عابد شیکری کو یلکھت ہی کسی گہری سازش کی جو محسوس ہونے لگی، اس کی چھٹی حس بار بار کسی خطرے کا احساس دلارہی تھی، کچھ ہونے والا تھا۔

مطلوبہ مقام پر گاڑی پہنچنے ہی موساد کے پانچوں ٹاپ ایجنٹ حرکت میں آئے۔ وہ ایک بندوین میں تھے جس کا رنگ سیاہ تھا، ایک دوسری ذیلی سڑک سے اچانک ہی یہ سیاہ فاس وین نمودار ہوئی اور سڑک کے پیچوں سے اس طرح کھڑی ہوئی کہ آنے والی پولیس گاڑی کا راستہ بلاک ہو چکا تھا۔ پانچوں ایجنٹ جنہوں نے سروں پر عربی صافہ باندھ رکھا تھا اور ہاتھوں میں جدید گنیں تھیں۔ فائرنگ کر کے پہلے پولیس گاڑی کے ٹائر برسٹ کر دیے اس کے بعد سب کو گن پوائنٹ پر لے لیا۔ دکھاوے کی خاطر اسرائیلی پولیس اور ان کے چیف نے برائے نام مزاحمت بھی کی مگر پھر انہوں نے نامہ اور عابد شیکری کو ان کے حوالے کرنے کا درست حکم دیا۔

یہ ساڈرا مارا دائرہ طور پر شہر کے معروف اور معروف جوہر ہے۔ یہ تمام دیکھا گیا تھا اور اس دوران موساد کے ایجنٹوں نے ہوائی فائرنگ بھی کی تھی جس سے وہاں اطراف میں خاصی جگہ زلزلہ مچ گئی، نیز انہوں نے نہ آواز بلند مخصوص قسم کے ٹی اور اسلامی نعرے بھی بلند کیے تاکہ ڈرامے میں حقیقی رنگ بھر دیا جائے۔ اگلے چند منٹوں کے بعد یہ پانچوں ٹاپ ایجنٹ نامہ اور عابد کو اپنی گاڑی میں ڈالے نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔ نامہ خوش تھی کہ مجاہدوں کے دوسرے گروپ کو کامیابی ہوئی تھی لیکن عابد شیکری کا معاملہ اور تھا۔ وہ پہلے ہی خطرے کی بو سونگھ چکا تھا اور پھر بعد میں اس کی تصدیق بھی ہوئی لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ ان سے کوئی سوال کرتے ان کے چہروں پہ ایک مخصوص ٹھول کا سپرے کر دیا گیا۔ دونوں بے سدھ ہو کر لڑھک گئے، دونوں کو بین کی عقیبی سیٹوں پر لٹا دیا گیا۔

☆☆☆

”الجماد“ کی لیڈر زہیدہ قیسری کا ”گریڈ پلان“ کے عمل کا دارومدار اگرچہ گروپ بی کی کامیاب کارروائی پر منحصر تھا لیکن ایک مقررہ وقت تک اس کے بعد زہیدہ نے اپنے منصوبے پر عمل شروع کر دینا تھا۔ وہ اپنے پانچ

کے بیک وقت چار برسٹ ان کی کار پر پڑے۔ حادثہ کی گردن میں دو گولیاں ہیوسٹ ہوئیں وہ موقع پر ہی جام شہادت نوش کر گیا۔ کار کا اسٹیرنگ اس کے ہاتھوں میں تھا۔ اس کے لڑھک جانے کے باعث کار نے لہراٹا شروع کر دیا۔ خضر کے شانے میں تین گولیاں لگی تھیں جبکہ معید غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیچھے جھک گیا تھا۔ اس وقت کار کا ٹائر بلاسٹ ہو گیا۔ عام ٹریک روال تھا۔ کار ڈول رہی تھی، معید چونکہ حادثہ کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا اس لیے اس نے فوراً اسٹیرنگ پر مقدور ہمر گرفت جمانے کی کوشش چاہی مگر کار کا ایک ٹائر برسٹ ہونے کے باعث اس کا توازن بگڑ گیا۔ وہ پہلے تین پارسی تھی، معید کو اپنا مشن ناکام ہوتا محسوس ہوا تو اسے اور تو کچھ نہ سوچا۔ اس نے فوراً اسٹیرنگ بائیں جانب موڑ دیا۔ نتیجتاً اس کی ڈوٹی ہوئی کار ایک دھماکے سے پولیس گاڑی سے ٹکرائی، عقب میں کئی گاڑیوں کے بارن کی پر شور آوازیں اچھرنے لگیں جبکہ دونوں گاڑیاں سے سڑک پر پھرتی کی طرح کھینچنے لگیں اور سڑک کے کنارے کی سیڈ منڈ پر توڑتی ہوئی گھاس کے میدان میں جا گئیں۔ معیدہ نے اپنی گن سنبھالنے ہی خاطر گن کی جگہ عقب کی سیٹ میں موجود خضر کی حالت میں پڑا تھا۔ اہم خطرے کو آخر پر بھانپتے ہی وہ اپنی گن سنبھالنے لگا۔

پولیس گاڑی میں موجود نامہ اور عابد شیکری بری طرح پریشان اور متوش تھے جبکہ اسرائیلی پولیس نے پھرتی کے ساتھ اتر کر معید کی کار کو فائرنگ کر کے چھٹا بنا ڈالا۔ خضر اور معید موقع پر ہی دم توڑ گئے، تھوڑی دیر بعد یہودی پولیس چیف وائس سیٹ پر ہیڈ کوارٹر میں رابطہ کر رہا تھا۔ اس کے ذرا دیر بعد گاڑی روانہ ہوئی، مگر ان کے باعث گاڑی کی ایک سائڈ پر خاصا بڑا ڈینٹ پڑ گیا تھا۔ تاہم کار کے مقابلے میں یہ گاڑی بڑی اور مضبوط تھی، اس لیے اس پر کچھ خاص اثر نہیں ہوا تھا، اندر موجود پریشان حال نامہ اور عابد پولیس چیف سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے لیکن وہ ان کے جوابات آنا کافی سے دے رہا تھا، وہ جلد سے جلد اس مقام کے قریب پہنچنا چاہتا تھا جہر ایسا ہی ایک جملی ڈراما ”پلے“ کیا جانے والا تھا، اندر سے یہ مکار یہودی خزاہ پولیس چیف سرور تھا کہ کار والے ان تینوں حریت پسند مجاہدوں کے ناکام حملے کے باعث ان کے اگلے ڈرامے میں حقیقی رنگ بھر جائے گا۔

جبکہ یہاں تک تو نامہ اور عابد کو بھی اندازہ ہوئی چکا

اندکئی طوفان بلائیں چھپائے یہ ظاہر خاموشی سے جاری تھا۔ اور خضر اپنے دونوں مجاہد ساتھیوں معید اور عابد کے ساتھ ایک کار میں ان دونوں پولیس گاڑیوں کے روانہ ہوتے ہی تعاقب میں لگ گیا۔ ان کے شاید سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ عین ایسا ہی ایک خطرناک منصوبہ موساد کے پانچ ٹاپ ایجنٹ بھی..... مسلطی حریت پسندوں کے گیمس میں بنا چکے تھے چونکہ ان کا منصوبہ طے شدہ تھا اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ دونوں گاڑیاں کس وقت اور کہاں سے کس راستے سے گزریں گی، اس لیے اس Fake Action کے لیے وہ پہلے ہی سے گھات لگائے موجود تھے۔

سفر جاری تھا۔ پورٹ روڈ پر گاڑیوں کا رش تھا، تاہم پولیس کی دونوں گاڑیاں تیزی سے سائرن بجاتی ہوئی دوڑی جا رہی تھیں، اور ان کے لیے راستہ صاف اور آسان تھا۔ ان کے تعاقب میں ذرا فاصلے سے پی فرنٹ کے تینوں مجاہدوں کی کاررواں دواں تھی، ایک برج پارک کے نسبتاً کھلی اور کم رش والی جگہ پر سڑک نوے ڈگری کے قوس نما موڑ پر تھی۔ حادثہ نے کار کا اسٹیرنگ سنبھالا ہوا تھا یکدم بروڈ لائن تبدیل کی اور اسی وقت عقیبی سیٹ پر براجمان خضر کے ہاتھوں نے اپنی گن سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس کی کچھ دیر پہلے ہی اس نے ٹریک میں پل کی بجائے ہی وہ اپنی گن سنبھالنے لگا۔ پولیس گاڑی میں موجود نامہ اور عابد شیکری بری طرح پریشان اور متوش تھے جبکہ اسرائیلی پولیس نے پھرتی کے ساتھ اتر کر معید کی کار کو فائرنگ کر کے چھٹا بنا ڈالا۔ خضر اور معید موقع پر ہی دم توڑ گئے، تھوڑی دیر بعد یہودی پولیس چیف وائس سیٹ پر ہیڈ کوارٹر میں رابطہ کر رہا تھا۔ اس کے ذرا دیر بعد گاڑی روانہ ہوئی، مگر ان کے باعث گاڑی کی ایک سائڈ پر خاصا بڑا ڈینٹ پڑ گیا تھا۔ تاہم کار کے مقابلے میں یہ گاڑی بڑی اور مضبوط تھی، اس لیے اس پر کچھ خاص اثر نہیں ہوا تھا، اندر موجود پریشان حال نامہ اور عابد پولیس چیف سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے لیکن وہ ان کے جوابات آنا کافی سے دے رہا تھا، وہ جلد سے جلد اس مقام کے قریب پہنچنا چاہتا تھا جہر ایسا ہی ایک جملی ڈراما ”پلے“ کیا جانے والا تھا، اندر سے یہ مکار یہودی خزاہ پولیس چیف سرور تھا کہ کار والے ان تینوں حریت پسند مجاہدوں کے ناکام حملے کے باعث ان کے اگلے ڈرامے میں حقیقی رنگ بھر جائے گا۔

ایک برست فائر ہوتا۔ لیکن کا تیسرا ساتھی بھی اس کی زد میں آ گیا۔ اس کے سینے پر تاریکی لکیر پڑی تو اسے حرکت کرنے کا بھی موقع نہ ملا اور اس کے حلق سے ابھرنے والی آخری چیخ بڑی تھرا دینے والی تھی۔

”بگر کے اندر بند کر بیٹھ چھو۔ جلدی۔۔۔۔۔ ورنہ چشم زدن میں سب مارے جاؤ گے۔“ لیکن پھر چلائی۔ سب سے پہلے اس نے ہی اپنی کانڈوکت سے ایک دتی بم نکال کر بگر کی طرف اچھالا تھا۔ جمال اور باقر نے بھی چشم زدن میں اس کی تقلید کی مگر جمال نے جیسے ہی دتی بم پھینکنے کے لیے لیٹے لیٹے اپنا ایک ہاتھ بلند کیا۔ موت کا رخص کرتی تھری قاتل ریز کی ریت میں اس کا وہ ہاتھ آ گیا۔ اسے بم اچھالنے کا بھی موقع نہ ملا۔ ایک قاتل برست فائر ہوا جمال کا ہاتھ بھی کی طرف سے اڑ گیا اور وہاں سے خون آلود ٹنڈو منڈ بازو کی پٹی جھانکنے لگی۔ جمال درد کی اذیت سے تڑپ اٹھا، اپنے ساتھی کا یہ جشہ دیکھ کر باقر پرچھے جنون سوار ہو گیا۔ اس نے درے مزید دو تین بم بگر کی طرف اچھال دیے۔ وہاں کئی دھماکے ہونے لگے۔ سسٹم میں گڑبڑ پیدا ہونے لگی۔ موت کا قصہ کرتی ہوئی قاتل ریز زبچنے لگیں اور پھر رفتہ رفتہ غائب ہو گئیں۔

یہ موقع کی زنجی ساتھی کو سنبھالنے کا نہیں تھا مگر باقر اپنے ساتھی جمال کو اس حال میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ فوراً اس کی طرف دوڑا اور اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ جمال جانتا تھا کہ اس وقت کیا صورت حال ہے۔ اپنے ساتھی پر بوجھ بٹا مشن کو کھٹائی میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ ابھی اس کا دایاں ہاتھ باقی تھا۔ اس نے اس ہاتھ میں گن پکڑی۔ بائیں بازو کے درد کو۔۔۔۔۔ دانتوں تلے پیچ کر لی گیا اور باقر سے پیچھی پھٹی آواز میں بولا۔ ”تمہیں دوست! میں شیک ہوں۔ آگے بڑھو۔ مجھے نہیں۔۔۔۔۔ مشن سنبھالو۔“

لیکن نے اپنے بہادر مجاہد کی یہ درد و جوش میں ڈوبی آواز سن لی تھی، حالانکہ وہ مضبوط دل گردے اور آہنی اعصاب کی مالک تھی مگر جمال کی بات پر اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

خطرناک بنگر تباہ ہو چکا تھا۔ پوائنٹ تھری کی چوکی سر ہو چکی تھی مگر گروپ کے تین مجاہد بھی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر چکے تھے، جبکہ۔۔۔۔۔ جمال، باقر اپنے ساتھیوں کی قربانی ضائع نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔

تینوں آگے بڑھے اور فائرنگ کرتے پلانٹ کے گیٹ تک جا پہنچے۔ وہاں سے بھاری بوٹوں اور وردی پوش

سامنے چوکی پر جدھر سرچ لائٹ ان کے ٹرک پر پڑ رہی تھی ایک چٹان تھی، وہاں موجود چار فوجیوں نے خطرے کا احساس ہوتے ہی گنوں کے منہ نکول دیے مگر اس سے پہلے ہی جمال ٹرک کا ایک سیسلر میٹر پوری قوت سے دبا چکا تھا۔ ٹرک دھاڑتا ہوا آگے بڑھا اور چٹان سے جا ٹکرایا مگر اس سے پہلے جمال اور باقر بجلی کی پھرتی کے ساتھ اپنی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے گر چکے تھے اور سنبھلے ہی انہوں نے پوزیشنز سنبھال لیں۔ ٹرک چٹان کے دو دستوں سے ٹکرایا اور چٹان بری طرح لرز کر رہ گئی، تاریک فضا میں گولیوں کی دل خراش تڑتڑاہٹ کی آواز ابھری مگر توازن بگڑنے کے باعث اوپر موجود چاروں فوجیوں کا نشانہ نہ خطا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ دو فوجی جو شاید بالکل چٹان کی دیوار کے کنارے کھڑے تھے چٹان کے بری طرح لرزنے پر نیچے آ گئے۔ حاد اور باقر کی گنوں نے انہیں بھون ڈالا۔ اوپر موجود دو باقی فوجیوں کو ٹرک کے عقبی حصے میں پیچھے ہونے مجاہدوں نے جنم واصل کر دیا۔ چٹان خاصی مضبوط تھی تاہم ٹرک کے ٹکرانے سے تھوڑا جھک ضرور ہوئی۔

لیکن اپنے تینوں ساتھیوں سمیت ٹرک سے اتر آئی تھی۔ تقاضا اب فوری پیش قدمی کا تھا۔ جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ پوائنٹ تھری کو اس کے سر کے اندر داخل ہو گئے۔ وہاں چند فوجیوں سے ان کا سامنا ہوا۔ حمران کی گولیوں نے انہیں بھی بھون کے رکھ دیا۔ یہ لوگ مزید آگے بڑھے۔ ٹھیک اس وقت انہیں تاریکی لکیریں حرکت کرتی دکھائی دیں۔ لیکن کادل اچھل کر حلق میں آن کا مگر دوسرے ہی لمحے وہ حلق کے بل پیچتی۔ ”خبردار! ان لکیروں کی زد میں مت آنا۔“

پوائنٹ تھری کی خفیہ بنگر میں نصب آٹومیٹک سرچنگ اینڈ لارم سسٹم کا لیڈر گاڈو فائرنگ میگزین آن ہو چکا تھا، بدقسمتی سے لیکن کے دوست بھی اس کی زد میں آ گئے۔ اگلے ہی لمحے گولیوں کی ترخا تہ ابھری۔۔۔۔۔ اور مذکورہ دونوں ساتھی کرب ناک چٹپٹوں کے ساتھ زمین بوس ہو گئے۔ یہ سسٹم اتنا فاسٹ اور خطرناک تھا کہ باقیوں کے لیے ان قاتل تاریکی شعاؤں کی ہلاکت خیزی سے بچنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ آگے دوڑ گئیں سازن بھی پیچھے نہ تھا۔ صورت حال بگڑتی چلی مگر اب اس بگڑی ہوئی خطرناک صورت حال میں انہیں کس نے دوش کی حالت میں ہر صورت اپنا مشن مکمل کرنا تھا۔

یہ لوگ زمین پر لیٹ کر لوٹھکنا کھانے لگے۔ قاتل ریز کی گین خاموش تھیں، مگر جیسے ہی کوئی ان کی زد میں آتا

بھڑ جانے کی صورت میں یہ مشن نامکن حد تک مشکل بھی ہو سکتا تھا۔ ٹرک رکتے ہی دو گن بردار وردی پوش اسرائیلی دونوں طرف سے ان کی کھڑکیوں کی طرف بڑی مستعدی کے ساتھ بڑھے تھے۔ جمال اور باقر نے اپنے آئی ڈی کارڈز ڈالے ہاتھ کھڑکی سے باہر کر دیے۔ یہ ظاہر دونوں ساکت تھے مگر اندر سے ان کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے گویا کسی بھی وقت کچھ بھی ہو جانے جیسی خطرناک چویشن کو فیس کرنے کے لیے الرٹ تھے۔

دونوں فوجیوں نے ایک سردی نگاہ ان کے نصف ٹوپی سے ڈھکے بشروں پر اور پھر ان کے آئی ڈی کارڈز پر ڈالی۔ باقر کی کھڑکی کی طرف والے فوجی نے تو کی حد تک مطمئن ہو کے دھیرے سے اپنے سر کو تیش دی تھی مگر جمال کی طرف والے فوجی کو جانے کس بات کا شبہ ہوا تھا کہ اس نے اپنی گن کی نال سے جمال کے چہرے سے پھنکی ہوئی ٹوپی کو ڈرا دھیرے دھیرے اور کیا۔ جمال کی رگوں میں دوڑنے لگیوں کی لکھت تیز ہوئی۔ چہرہ قدرے واضح ہوا تو اس فوجی نے سخت لہجے میں اس سے پوچھا۔ ”اس کارڈ میں تمہاری تصویر کیوں بدلی ہوئی ہے؟“

جمال بولیں۔ ”میرا اپنی تصویر بدلنے کی ضرورت تھی۔“ بلا تامل بولا۔ ”سرا! اپنی تصویر بدلنے کی ضرورت تھی۔“ ”تصویر تو اس کی بھی بدلی ہوئی ہے۔“ مجا دوسرے فوجی کے منہ سے بھی بے اختیار نکلا جس نے باقر کا آئی ڈی کارڈ دیکھنے کے بعد مطمئن ہو کر سر ہلادیا تھا لیکن پھر مختصر ہنکار پر وہ چونک کر دوبارہ باقر کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے نہ صرف آئی ڈی کارڈ کی تصویر چیک کی بلکہ اپنی گن کی نال سے اس کی ٹوپی کو بھی اوپر اٹھا دیا تھا۔

دونوں فوجی یکدم دو قدم پیچھے ہٹ گئے اور ان پر گتیں تان لیں اور پھر انہیں مزید چیکنگ کے لیے نیچے اترنے کا حکم دیا۔ جمال اور باقر کے دل یکلخت سامنے سامنے کرتی کنپیٹوں سے دھڑکنے لگے۔ ہر قسم کی متوقع وغیر متوقع خطرناک چویشن پر انہیں فوری طور پر کیا قدم اٹھانا تھا، یہ طے شدہ تھا لہذا جمال اور باقر نے ان دونوں فوجیوں کی کنپیٹوں سے ایک وقت خون کے چھینٹے اچھلتے دیکھے اور دونوں ہی تھوڑا کر گز گئے۔

ٹرک کے عقبی حصے میں موجود ان کے ساتھیوں نے خاموش پستول کے ذریعے دونوں کو جنم واصل کر ڈالا تھا۔

تو بانی کی طرف ان کا سفر رات کو شروع ہوا تھا اور یہ دو تیز رفتار گاڑیوں میں ایک مقررہ مقام پر پہنچ کر اتر گئے تھے، دونوں گاڑیاں انہیں ایک کھٹے جنگل اور پہاڑیوں کے سرے میں اتار کر وہاں پلٹ چکی تھیں۔ یہ گوریل پلانٹ تھا اور بہت اہم ترین بھی۔ یہ سب ایک دوسرے کو فالو کرتے ہوئے تاریک کھٹے جنگل میں داخل ہو گئے تھے۔ انہوں نے چست کانڈو ڈرائیگ کر رہی تھی اور تھیریوں کے زیور سچا کر جانیں پھیل پر رہی ہوئی تھیں خود کوسرے پاؤں تک کیونفلاں کر رکھا تھا۔ اس طرح وہ رات کی سیاہی کا ہی ایک جزو نظر آتے تھے، اس گروپ کی کانڈو بڑیہ ہی کے ہاتھ میں تھی جبکہ گروپ میں اپنا نائب اس نے جس کو ہی بنایا ہوا تھا اور اسے کچھ صواب دینی اختیار دے رکھے تھے، یہی سبب تھا کہ پیدل تھوڑا سفر کرنے کے بعد جب یہ لوگ ایک مقام پر رک کر آگے پیش قدمی کی پلاننگ کرنے لگے تو حسن نے زبیدہ کو مشورہ دیا کہ انہیں دو مختلف حصوں میں بٹ کر مشن کو آگے بڑھانا چاہیے۔ زبیدہ کو اس کی تجویز اچھی لگی۔ وہ پہلے ہی انہیں ڈیوڈ اشارے کے ہیڈ کوارٹر کے محل وقوع سے اچھی طرح آگاہ کر چکی تھی۔ چنانچہ حسن اور زبیر کے ساتھ المجاہد کے دو تھوڑے خال ہو گئے اور دونوں گروپوں نے اپنے ایک ”پوائنٹ“ طے کرنے کے بعد اپنی راہ لی۔ ایک دوسرے سے رابطے کے لیے ان کے پاس ٹرانسمیٹر موجود تھے۔

تھوڑی دیر بعد یہ دونوں الگ گروپیں میں بڑے کراہے بڑھنے لگے۔ ان دونوں گروپوں کو ایک مقررہ وقت میں ہیڈ کوارٹر کے قریب پہنچنا تھا اور بجلی کے شٹ ڈاؤن ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ بالآخر یہ دونوں تھوڑی دیر کی کامیاب گوریل پیش قدمی کے بعد ہیڈ کوارٹر کے قریب ایک مطلوبہ مقام پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

☆☆☆ چیکنگ معمول کی تھی۔ ایٹمی معلومات کے مطابق یہ ڈیون ریسرچ پلانٹ کی سب سے اہم چوکی پوائنٹ تھری تھی، جو ایک طرح کا اہم موزیچا بھی تھی، ظاہر ہے یہاں کی چیکنگ بھی سخت تھی، اب یہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ انہیں مطمئن ہو کر آگے جانے دیا جاتا یا پھر کسی مزید تفتیش کے لیے کسی شے کی بنا پر روکا بھی جاسکتا تھا اور یہ دوسری صورت خطرناک بھی ہو سکتی تھی جبکہ سرائے کے مالک ہمدرد البصر نے انہیں اسرائیلی ایٹمی بجلی گھر کا نقشہ سمجھاتے ہوئے تاکید کی تھی، ”پوائنٹ تھری“ سے یہ خبر و عافیت گزر جانے کے بعد ان کا یہ خطرناک مشن نصف حد تک آسان ہو جاتا جبکہ

سپینس ڈائجسٹ — 84 — جنوری 2015ء

”مجھے حیرت ہوئی اس طرح دھوکے سے اپنے یہاں آنے کی۔“ جواباً عابد شیکھری نے شیفیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”تمہاری پولیس کے قبضے میں تو ہم آہی چکے تھے..... پھر یہ سارا کھڑاگ پالنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”اوہ..... خاصے چالاک ہو لیکن تمہاری خرمستی دور کرنے کے لیے مجھے بتانا پڑے گا کہ ہم نے تم پر کس طرح محفوظ طریقے سے ہاتھ ڈالا کہ لاٹھی بھینے نہ توئے اور سانپ بھی مر جائے۔“ شیفیل بولا۔ پھر اس نے اسے اس ڈرائے کے بارے میں صاف صاف بتا دیا۔ اگرچہ عابد کو بھی کافی حد تک اس قسے کا اندازہ ہو ہی گیا تھا، تاہم ان کے منہ سے بھی حقیقت سننا چاہتا تھا۔ کم از کم عابد نے اپنی ذہنی فراست سے اتنا اندازہ ضرور لگایا تھا کہ یہ لوگ انہیں زندہ چھوڑنے کے سوڈ میں ہرگز نہیں تھے۔

شیفیل ایک کٹر یہودی تھا۔ وہ اپنی مکاری، سفاکی اور ظلم کی داستانیں کسی عرب کو بتا کر جانے اپنے کون سے جذبے کی تسکین چاہتا تھا۔ اس نے اس بات کا بھی عابد اور نائمہ کے سامنے اعتراف کر لیا کہ سہما سول کی بندرگاہ میں جن دو جلاوطن فلسطینیوں کی ٹارگٹ کلنگ کی تھی ان میں وہ اور اس کا ساسی ڈیوڈ شامل تھے۔

نائمہ نے اسے اس کی جانب سے شکریہ ادا کیا۔ بالآخر عابد شیکھری نے دانست اپنی آواز اور اپنے لہجے کو گھسٹ خود رو بناتے ہوئے اس سے پوچھا تو اس کا دوسرا ساتھی ڈیوڈ آنکھیں نکال کر اس سے بولا۔ ”تم دونوں کی موت۔“

”کس جرم میں..... ہمارا تو کسی فلسطینی حریت پسند سے کوئی تعلق نہیں۔“ عابد نے یہ ظاہر عام سے لہجے میں کہا۔

اس کا ذہن اب تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔ ”جرم.....!“ شیفیل اسے گھورتے ہوئے درشت لہجے میں بولا۔ ”تمہارا یہ جرم کافی نہیں کہ تم نے ہمارا قبرص آپریشن بری طرح ناکام کر ڈالا۔ ان دونوں جلاوطن فلسطینیوں کی ہمارے ہاتھوں ہلاکت کے باوجود تم نے ان کے اہم مشن کو پورا کرنے کے بعد جو بیڑا اٹھایا، اس پر عمل بھی کر ڈالا اور ساڑھے سات سو فریوچر فلسطینیوں کو اپنی کمپنی کے دو بحری جہازوں میں لاکر دوبارہ انہیں ان کی سرزمین میں آباد کرانے کا سبب بنے۔ یہ ناقابل معافی جرم ہے تمہارا۔“

عابد بولا۔ ”یہ میرا کاروبار ہے۔ اگر کوئی مجھے زیادہ

رقم دینے کا لالچ دیتا تو میں فلسطینی مہاجرین سے بھرے اپنے ان دونوں جہازوں کو خود ہی ڈبو بھی دیتا۔“ اس کی بات پر پہلی بار شیفیل اور اس کے ساتھی کمانڈو ایجنٹ کے چہروں پر درشتی کی جگہ ابھرنی لگی۔ عابد نے دانست خود کو لاپچی اور کاروباری ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ ان یہودی کتوں کے ذہنوں میں یہ بات تشکیک کا شکار ہو جائے کہ اس نیک مقصد میں عابد کا اپنے مظلوم بھائیوں کی ہمدردی اور مدد کا جواز لی جڈ یہ کارفرما تھا کہ آشکار ہو سکے۔

”کیا مطلب؟“ اس بار ڈیوڈ نے قدرے اچھے ہوئے لہجے میں کہا تو عابد متنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔ ”میں ایک عرصے سے اپنی ”لچر“ جہازوں کی کمپنی کی آڈٹ میں خطیر معاوضہ لے کر انسانوں کی اسفلنگ کا کاروبار کر رہا ہوں۔ اب تم لوگوں نے خود کو ظاہر کر دیا ہے تو میں کیوں خود کو چھپاؤں؟ یہ میرے کاروباری اصولوں کے معافی ہوگا کیونکہ کاروباری ذیل تو کسی بھی وقت اور کسی بھی حالت میں ممکن ہے۔“

”تو پھر ان ساڑھے سات سو مہاجر فلسطینیوں کو دوبارہ یہاں حریف پہنچانے کے لیے تمہیں کس نے ٹارگٹ دیا تھا؟“ شیفیل نے برائی نظروں سے عابد کے چہرے کی طرف گھورتے ہوئے پوچھا۔

”وہ اس تربیت پسند عابد کا لہجہ تھا۔“ عابد نے جواب دیا۔ ”میں نے اسے نہیں آیا۔ صرف فون پر مجھ سے کام کی ڈیلنگ کرتا تھا اور میرا سوس اکاؤنٹ بھرتا تھا۔“ عابد نے جواب دیا۔ اس کا لہجہ حکم اور اعتادے پر تھا۔

”لیکن ان فلسطینی آزاد پسند گروپوں کے پاس اتنا سارا روپیہ کبھی نہیں آیا تو وہ تمہیں اتنی خطیر رقم کہاں سے ادا کرتے ہوں گے؟“ شیفیل نے تشکیک بھرے لہجے میں پوچھا تو عابد ہلکا سا ہنسنے لگا۔ ”تم لوگوں کی عقل شاید صرف آگ و خون کا کھیل کھیلنے میں ہی کام کرتی ہے۔ تم ان خفیہ کاروباری معاملات کو کیا جانو۔ کیا تم لوگوں کی تاج میں اتنا بھی نہیں کہ بعض غیر فلسطینی یا آسودہ حال عرب مسلم جذبہ ہمدردی کے تحت ان لوگوں کی درپردہ مالی امداد کرتے رہتے ہیں۔ ایسا ہی ایک دولت مند عرب خاندان آزادی فلسطین کے دو بڑے گروپوں پی فرنٹ اور الحجاب کی خفیہ مالی مدد کرنے میں مصروف ہے۔“

اس کی بات پر شیفیل اور ڈیوڈ نے پرسوج نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور عابد دزدیدہ نظروں

سے ان کے چہروں کے تاثرات سے اندازہ قائم کرتا رہا کہ اس کا اندھیرے میں پھینکا ہوا تھیک ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ یہی سب تھا کہ شیفیل یہود نے خبیثانہ مسکراہٹ سے عابد شیکھری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اگر تم ہم سے یہ کہیں کہ تم اس دولت مند خاندان کی نشاندہی کر دو جو خفیہ طور پر ان حریت پسند تنظیموں کو مالی سپورٹ کر رہا ہے اور اس کے صلے میں ہم مزہ مانی رقم دیں گے تو تمہارا کیا جواب ہوگا؟“

”میرا جواب یقیناً اثبات میں ہی ہونا چاہیے۔“ عابد شیکھری نے لیکھت اپنے چہرے پہ خوشی اور حیرانہ تاثرات سموتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا اور پھر اچانک جیسے نائمہ پر ایک دورہ سا پڑا وہ پھری ہوئی شیرنی کی طرح اپنے ہی ساتھی عابد شیکھری پر بھیجی اور اپنے لالچے لالچے ناخنوں سے اس کے خوب رو چہرے پر چند کھروچے ڈال دیے۔

”ذلیل..... کتے، لاپچی انسان..... غدار مسلم..... تو تمہارا یہ تھا اصل روپ۔“ تم چند گون کے لالچ میں..... اپنے مسلم بھائیوں کے خلاف اپنا حیران یہودی کتوں کے ہاتھوں سے دوکے..... میں..... میں..... میں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

عابد شیکھری نے نائمہ کے اس اچانک حملے پر کمال بھرا ہوا اور خوف زدہ ہو کر اپنی اس اداکاری کی مزاحمت کرتے ہوئے اسے زیادہ سے زیادہ خود پر حملہ آور ہونے کے لیے اس کا ہاتھ اور پھر اس کا مقصد پورا ہو گیا۔ شیفیل اور ڈیوڈ..... نائمہ کو سنبھالنے اور عابد شیکھری کو اس کی گرفت سے چھڑانے کے لیے غیر ارادی طور پر آگے بڑھے تو..... عابد شیکھری نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ ڈیوڈ کے ہاتھ پر پستول بھیج لیا اور ایک لمحہ بھی ضائع کے بغیر ٹریگر دبا دیا۔ گولی جلنے کا دھماکا ہوا اور ڈیوڈ کریمہ انگیر چیخ کے ساتھ الٹ گیا۔ شیفیل کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے پھرتی سے پستول نکالا مگر عابد کی ٹانگ حرکت میں آئی۔ جو اس کے چہرے پر بڑی جگہ اس کے پستول کی دوسری گولی اس کے تیسرے ساتھی کو چاٹ گئی، جو اس پر اسلحہ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شیفیل لات کھا کے دیوار سے جا ٹکرایا، پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دروازہ جا گرا۔ عابد اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ غیظ و غضب کے مارے سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں سے غلغلے نکل رہے تھے، شیفیل کو اپنے رحم و کرم پر دیکھتے ہوئے بار بار اس کے چشم تصور میں وہ دونوں جلاوطن فلسطینی آفیسرز کے چہرے دکھائے ہوئے جن کو ان سفاک لوگوں نے بے دردی

کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے شہید کیا تھا پھر دوسرے ہی لمحے عابد نے شیفیل کی پیشانی کی طرف نال کر کے ٹریگر دبا دیا۔ گولی چلی اور شیفیل کا سر چٹخ گیا۔

”آج میں نے ان دونوں بے گناہ فلسطینی آفیسروں کے خون کا بدلہ لے لیا۔“ وہ جوش غیظ سے بڑبڑایا۔ نائمہ جو ہلکا سا کس رہی تھی، یکدم اٹھ کر عابد شیکھری کی طرف بڑھی اور اس سے بے اختیار لپٹ گئی پھر اس کے تیز کیلے ناخنوں نے عابد کے چہرے کو جھاں جھاں سے زخمی کیا تھا وہاں وہاں وہ دیوانہ وار اپنے نرم و نازک لبوں کے مرہم رکھنے لگی۔ عابد شیکھری کے جلنے سکتے وجود میں جیسے ٹھنڈی پھوار پڑنے لگی۔ پھر وہ سنبھلا۔

”نائمہ! جس طرح انہوں نے ہمارے ساتھ ڈراما کیا تھا۔ اسی طرح میں نے بھی ان کے ساتھ وہی کیا، یہ سب ضروری تھا کیونکہ یہ لوگ ہمیں یہاں موت کے گھاٹ ہی اتارنے آئے تھے، چلو وقت کم ہے۔“

نائمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تاہم وہ سنبھلی۔ پھر مردہ اسرائیلی ایجنٹوں کی لاشوں کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”ہمیں یہاں سے نکلنے کے لیے ہتھیاروں کی ضرورت پڑے گی۔“ عابد اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ وہ جتنی جلدی لاشوں سے ہتھیار اٹھا سکتے تھے، وہ اٹھا لیے۔

نائمہ نے اسے اس کی جانب سے شکریہ ادا کیا۔ عابد نے نکتہ بخت کی حلات آمیز مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا تو وہ پر جوش لہجے میں بولی۔ ”مجھے ہتھیار چلانے آتے ہیں۔ میں ایک کرائم رپورٹر بھی ہوں اور یہ سب میری تربیت کا حصہ رہا ہے۔“

دفعتاً دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی دھمک ابھری۔ عابد نے رائل سیدھی کر لی تھی، نائمہ کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔ سردست یہ لوگ یہی اٹھا کے اور دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازہ کھولا تو باریک جھری پنا کر عابد نے دیکھا، سامنے پچھلے فرش والے کوریڈور میں وردی پوش چار پانچ شخص افراد دوڑتے ہوئے اس طرف آتے دکھائی دیے۔ عابد کے تیزی سے کام کرتے ہوئے ذہن نے پل کے پل ایک خطرناک اور جارحانہ فیصلہ کیا۔ اس وقت یہ سب اس کے نشانے پر تھے، اس نے سوچا۔ اگر وہ قریب آگئے تو ان پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا اور خطرناک بھی..... چنانچہ اس نے آؤ دیکھا۔ تاؤ۔ دروازے کو تھوڑا مزید کھول دیا اور گن کارخ ان کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ وہ پانچوں اسرائیلی قرض اجل کرتے زمیں بوس ہوئے

جہانگیر بکس

91

شیم جازی کے شاہکار تاریخی ناول

450/-	انسان اور دیوتا	475/-	معظم علی	550/-	اورنگزادہ ٹوٹ گئی	550/-	آخری معرکہ
300/-	پاکستان سے دیوار تک	550/-	خاک اور خون	500/-	گمشدہ قافلے	475/-	ثقافت کی تلاش
450/-	آخری چٹان	450/-	کیلیسا اور آگ	300/-	داستانِ مجاہد	300/-	اندھیری رات کے مسافر
225/-	سومال بعد	599/-	قافلہ جاز	450/-	پروسیہ درخت	625/-	قیصر و کسری
325/-	سفید جزیرہ	425/-	محمد بن قاسم	500/-	یوسف بن تاشقین		
475/-	شاہین	300/-	پورس کے ہاتھی				

لگے۔ دفعتاً تیز سائرن بجنے کی آواز ابھری۔ عابد نے تاخیر کو بچنے کے اشارہ کیا اور دروازہ پار کر کے وہ دائیں جانب کی راہداری کی طرف دوڑ پڑا۔ ایک ساتھ کئی بھاری بولوں کی دھمک ابھری۔ انہیں یوں لگا جیسے وہ اسرائیلی کمانڈوز کے گھرے میں آنے والے ہوں اور عابد کو اس سفاک حقیقت کا بخوبی احساس تھا کہ اگر اس بار وہ دشمنوں کے ہتھے چڑھے تو یقینی سنگین موت سے انہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔ انہیں اپنے گرد گھیرا انگ موتا محسوس ہو رہا تھا جبکہ فرار کی کوئی راہ سردست چھائی نہیں دے رہی تھی، تب اچانک ہی سامنے سے انہیں سچ دشمنوں کا پورا دستہ نمودار ہوتا دکھائی دیا۔ انہوں نے فوراً راستہ بدلا اور نسبتاً ایک دوسری چھوٹی راہداری میں آگئے، جو ان کے بائیں بازو کے رخ پر چھٹی گروہاں پہلے ہی سے تین چار کے فاصلے پر دشمن ان پر نہیں سیدھی گئے اور پوزیشنیں منہجائے ہوئے تھے، اب کوئی کچھ جانتا تھا کہ ان پر دونوں طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ کی جانے والی تھی۔

☆☆☆

اپنے مطلوبہ مقامات پر پہنچنے کے بعد زبیدہ اور محسن نے ایک دوسرے سے رابطہ کر کے اپنی موجودہ پوزیشنوں کے بارے میں آگاہ کیا۔ اب انہیں جس موقع کا انتظار تھا وہ بھی قریب پر ہو گیا تھا۔ ایک فیروز اسرائیلی فوجی نے عمارت تاریکی میں ڈوب گئی، یہی نہیں سارا علاقہ گھٹا نوپ تاریکی میں غرق ہو گیا۔ محسن کا دل زور سے دھڑکا۔ گویا..... لیلیٰ والا ہی گروپ اپنے مشن میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس بات نے اس کے اندر جوش بھریا۔

عاضی بکلی دینے والا پورا پلانٹ ان کے نشانے پر تھا جدھر خود کار نظام کے تحت اسٹینڈر ہائی جریٹر ز دھیرے دھیرے اشارت ہونے لگے تھے لیکن محسن اور اس کے ساتھیوں نے منصوبے کے مطابق پہلے ہی اسے اپنے نشانے پر لے رکھا تھا۔ ان کے پاس فقط ایک ہی راکٹ لاچر تھا جو زبیر نے اپنے کاندھے پر لٹکا رکھا تھا پھر محسن کا اشارہ پاتے ہی وہ اس نے فائر کر دیا۔ دم بہ خود فضا میں "سائیکس" کی آواز ابھری، عاضی پاور روم کی کنٹرول اور سینٹ سے بنی دیواریں لرز اٹھیں۔ سماعت ٹھن دھاکے کے ساتھ ہی پاور روم میں آگ بھڑک اٹھی اور پھر یہ لوگ عمارت کے بیرونی گیٹ کی طرف دوڑے۔ جدھر برائے نام ہی سکیورٹی کا بندوبست نظر آتا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہی کہ اندر تھوڑی دیر پہلے اسرائیلی افسران صادق الخیری کی

شہادت پر جشن منانے میں مصروف تھے نیز کسی کے گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی یہاں آنے کی جرأت بھی کر سکے گا۔ خدا جب کسی قوم پر زوال لاتا ہے تو سب سے پہلے انہیں غفلت میں ڈال دیتا ہے، ادھر زبیدہ نے بھی اپنے تئیں ساتھیوں کے ساتھ ڈیوڈ اسٹار کی عمارت کی طرف حرکت کی، انہوں نے ضرورت کی حد تک نارنج روشن کر رکھی تھی۔ دونوں گروپ ایک میٹنگ پوائنٹ پر پہنچ کر ملے اور گیٹ پر دھاوا بول دیا۔ کچھ دہائی بھی چھپنے لگی اسرائیلی دشمنوں کی کرپہ انگیز چٹخیں ابھریں۔ گیٹ ٹوٹ گیا تھا۔ یہ سب اندر داخل ہو گئے، زبیدہ کے دل و دماغ میں جوش بھرا ہوا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس وقت اس کے سارے اہم شکار اور اٹھنے تھے، یہ شکار نہیں بلکہ ہتھیار تھے۔ اسے قاتل شیطان جن کی گروہوں پر صادق الخیری اور قیصر ایسی سمیت جانے سکتے حریت پسند رہنماؤں اور محسوس بے گناہ فلسطینیوں کے خون سے تھہر گئے ہوتے تھے۔

اندھ داخل ہوتے ہی یہ اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بار پھر دائیں بائیں دو حصوں میں بٹ گئے اور مرکزی دروازے کی طرف دوڑے۔ اپنی ٹارچوں کی ٹھن ضرورتاً ایک "جھبک" مارتے پھر بجھا دیتے اور اندازے سے پیش قدمی کرتے مگر..... محسن کے قریبی ساتھی زبیر سے ایک قاتل غشی ہوئی۔ اسے ایک منٹ کے اندر ہی جلا کر ضرورت محسوس ہوئی اور اسے ایک منٹ حرکت کرتا دکھائی دیا۔ اس نے فوراً نارنج بجھا دی مگر دشمن دستانے روشنی کا سہارا لے کر اس جانب ایک مختلط اندازے سے اپنی گن کا منہ کھول دیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ ابھری اور تاریک گہری سیاہ چادر میں لپکتے فتنے چھ گئے، زبیر کو یوں لگا جیسے ان گنت سگت ہوئی سلاخیں اس کے وجود میں کسی نے اتار دی ہوں۔ اس کے حلق سے ابھرنے والی آخری چیخ بڑی کرب انگیز تھی، ایک دوسرا ساتھی بھی ان گولیوں کی زد میں آ گیا اور زبیر کی طرح اس نے بھی جام شہادت نوش کر لیا۔ محسن کا دل لبو سے بھر گیا۔ اس نے زبیر کو آوازیں دیں مگر جواب نہ دار۔ زبیر اور اس کے ساتھی کی چیخوں پر دوبارہ قاتل دستانے نے ان پر فائرنگ کی مگر تب تک انہیں بھی اپنی خطرناک پوزیشن کا اندازہ ہو چکا تھا۔ بہت تیزی کے ساتھ انہوں نے گر کر اپنی جگہ بدلی اور ہتھتے ہی جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ موجود تھے وہاں گولیوں کی پوری باڑ پڑی۔ اگر انہیں جگہ بدلنے میں چند ثانیوں کی بھی تاخیر ہو جاتی تو محسن سمیت سب چھلنی ہو چکے ہوتے، اندھیرے

ادولفت



ادولفت

(جامعہ تشرین)

مفتاحیہ سے تالیف کا تذکرہ کے ساتھ اور ذرا سے کہیں بکلافت

جہانگیر بک ڈپو

042-35757086

022-2780128

021-32765086

051-5539609

042-37220879

اٹھی... اور وہ دھڑا دھڑا شعلوں کی لپیٹ میں آگیا۔ یوں لگتا تھا جیسے آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔ آس پاس کا ماحول دور تک سرخ تاریکی میں قمری روشنی میں نہا گیا تھا۔ پلانٹ عمل طور پر تباہ ہو گیا تھا اور اپنے ساتھ ان دونوں اسرائیلی جنگی جہازوں کا پٹرول اور ان کے سواروں کو بھی نکل چکا تھا۔ اس عظیم رخ کی خوشی میں لڑائی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ان میں اپنے ساتھیوں اور بالخصوص جمال کی عین آخری فیصلہ کن لمحات میں دیئے والی بے دریغ قربانی کا جذبہ بھی شامل تھا۔

”اشوعلی!..... اللہ نے ہمیں کامیابی سے ہمکنار کر دیا ہے۔“ باقر نے بولے سے کہا اور پھر دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا رخ ایوبصر کی سرائے کی طرف تھا۔ ایوبصر نے کہا تھا کہ وہ ان کی کامیاب واپسی کا منتظر ہوگا اور موقع ملا تو وہ انہیں لینے کے لیے بھی آئے گا اور وہی ہوا۔ انہوں نے ابھی چند فرلانگ کا سفر طے کیا ہوگا کہ ایوبصر ایک اونٹ ریزے میں انہیں لینے آنا پہنچا تھا۔ اسے باقی ساتھیوں کی موت کا دکھ بھی تھا۔ تاہم خوشی بھی تھی کہ انہوں نے اسرائیلی کی کڑوڑ دی تھی۔ ان کا مستقبل کا ایک بڑا خفیہ منصوبہ مکمل ہونے سے پہلے سبوتاژ کر ڈالا تھا بلکہ ان کا سب سے بڑا جنگی گھر بھی تباہ کر دیا تھا۔ جہاں اسرائیل کے چند سناٹا شعلوں کو کھل چلائی کرتا تھا۔

یہ لوگ بہ خیر و عافیت سرائے پہنچے لیکن ایوبصر نے انہیں رکتے نہیں دیا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی بھی وقت یہاں بڑے پیمانے پر تھلائی اور اکٹھا ہونا کمال عمل شروع ہو جائے گا۔ اس لیے اس نے انہیں عرب بدو کا بھیج بھر کے آگے روانہ کر دیا۔

ان کا رخ بیت صفائے کی پہاڑیوں کی طرف تھا، جہاں ”الجباد“ کا خفیہ شکار تھا۔ اس شکار نے تک پہنچنے کے لیے لڑائی کو محفوظ اور خفیہ گزرگا ہوں کا بہ خوبی علم تھا۔ باقر اور لیلیٰ دونوں ایک اونٹ پر سوار تھے۔ اونٹ سدھایا ہوا تھا جو مسافر کو چھوڑ کر خود ہی واپسی کا رخ کرتا ہے۔ خشک ویران تاریک رات دبے پاؤں سرک رہی تھی۔ اوپر تاروں بھرے آسمان پر کلاطیق چاند گر دوپیش میں طلسماتی چاندنی چھاؤں کر رہا تھا۔ دونوں خاموش تھے تاہم دل ہی دل میں زبیدہ اور اپنے ساتھیوں کی ہم کی کامیابی کی دعا مانگ رہے تھے۔ باقر کے دل میں لیلیٰ کے لیے جو جذبات تھے وہ رات کی اس طلسماتی فضا میں اپنا اثر دکھانے لگے۔ باقر بھی ایک جوان مرد تھا۔ اس کے دل میں بھی جذبات تھے، پھر وہ لیلیٰ

مطالعہ کیا تھا، اب تک اسے اسلام سے بڑھ کر کوئی مذہب ایسا محسوس نہیں ہوا تھا جس نے سب سے انسانیت اور انسان سے محبت کا درس دیا تھا۔ علم، زیادتی اور نفرتوں کو فساد کی جز کہا تھا جبکہ بازغ خود اپنی آنکھوں سے اپنی یہودی قوم کو بنے فلسطینیوں پر ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑتا دیکھتی آتی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ بازغ کو ایک یہودی ہونے کے ناتے خود اپنے آپ سے بھی شرم آ رہی تھی۔

جزل فرناش کے اس اعلان کی تائید ہجیر ایوبدر شاہک اور بارق شحون وغیرہ نے بھی کی تھی۔ جنہیں اختلاف تھا وہ اپنا اعتراض کرنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔

فائرنگ کی آواز قریب آتی جا رہی تھی، دقتی بہر بھی چھٹکے جا رہے تھے، جزل فرناش اور اس کے ہمنوا چونے ہو گئے تھے اور اپنے ارد گرد دوڑتوں اور بچوں کو زبردستی اکٹھا کر لیا گیا تھا۔ اسی وقت دھڑ سے دروازہ کھلا۔

☆☆☆

سوچنے کا وقت نہیں تھا ان کے پاس..... دونوں نے تیزی کے ساتھ حرکت کی اور جھٹکے جھٹکے انداز میں دوڑتے ہوئے عمارت کے جنوبی حصے کی دیوار کی جانب بڑھ گئے۔ لیلیٰ نے یہاں آگے پیش قدمی کرنا چاہی تو باقر نے اسے بازغ سے قہراً روک دیا اور بولا۔ ”اٹھی ہم آگے نہیں بڑھ سکتے، دونوں جنگی کا پٹرول ختم ہو چکا ہے۔“

”تم پاگل ہو گئے ہو؟“ لیلیٰ بولی۔ ”اندر میں ناظم ہم فٹ کر چکی ہوں اور صرف تین منٹ کا ناظم فٹن کیا ہے میں نے۔ یہ عمارت تباہ ہونے والی ہے۔ ہم بھی.....“

”لیلیٰ!..... صبر کرو۔ میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے، تھوڑا انتظار کرو۔“ باقر نے پر جوش لہجے میں کہا۔ لیلیٰ ابھی۔ ”باقر کی ذہانت سے وہ واقف تھی، اس لیے وہ بھی.....“ ٹھہرتے وقت کا خاموشی سے انتظار کرنے لگی۔ دونوں جنگی کا پٹرول ختم ہو چکا تھا۔ عمارت کے اوپر منڈلاتے رہے اور نیچے سرخ لائٹ پھینکتے رہے۔ اس کے بعد وسیع و عریض احاطے میں اتر گئے۔ ادھر ہم پھٹنے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے، جیسے ہی لیلیٰ کا پٹرول ختم ہوئے، باقر نے لیلیٰ کا بازو پکڑا اور ایک طرف دوڑنے لگا۔ دونوں جتنی تیز دوڑ سکتے تھے، دوڑتے رہے، تیز.....

بہت..... تیز اور پھر ان کے عقب میں ذرا دور کے بعد دیگرے دھماکے ہونے لگے۔ انہیں اپنے پیروں کے نیچے زمین تک لرزتی محسوس ہوئی۔ دونوں اندھا دھند دوڑتے دوڑتے زمیں بوس ہو گئے اور اسی بجلی گھر میں آگ بھڑک

سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”جزل فرناش..... کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔ فوراً عورتوں اور بچوں کو دوسرے کمرے میں منتقل کرنے کا بندوبست کرو۔ ان کی جانیں خطرے میں ہیں۔“ اس وقت جزل فرناش کے ایک ہاتھ میں پستول چھپنے لگا۔ جس کی نال کا رخ اس حکومتی افسر کی طرف تھا۔ دوسرے ہی لمحے نال سے ایک دھماکا ہوا اور گولی اس جینٹے چلائے حکومتی اہلکار کی پیشانی میں پیوست ہو کر اس کا بھینجا چلا گئی۔ وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ کئی خواتین اور بچوں کی دلی دلی سسکیاں خارج ہو گئیں۔ جزل فرناش کے سفاکانہ اقدام پر جیسے لکھتے سب کو سناپ سو گھبرا گیا اور اس خوفناک ماحول میں جزل آنرک فرناش کی بھیڑ بے ہمتی غراہٹ سے مشابہ آواز ابھری۔

”یہاں صرف میرا حکم چلے گا۔ جزل آنرک فرناش کا حکم..... یہودی قوم اور گریٹر اسرائیل کے وسیع تر مفادات میں کسی بھی مصلحت کی کوئی متجاش نہیں۔ کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلے گا بھی نہیں اور ہم یقین دلاتے ہیں کہ کسی کو کچھ بھی نہیں ہوگا، اس لیے کہ ہم ان فلسطینی حریت پسندوں کی فطرت کو جانتے ہیں یہ لوگ بھی عورتوں اور بچوں کو نقصان نہیں پہنچاتے ان کی موجودگی ہمیں تحفظ دے گی۔“

یہودی کشمکش پر بازغ کا جواب یہاں لڑائی پھٹنے سے غور سے ڈیوڈ اسٹار کے سربراہ جزل آنرک فرناش کی بات سن رہی تھی اور اس سفاک اور منافق شخص سے سخت نفرت بھی محسوس کرنے لگی تھی، جو اپنے منہ سے حریت پسندوں کی نیک فطرت کا خود اعتراف کر رہا تھا۔ بازغ کا بھی تو چاہا کہ وہ جزل فرناش سے پوچھے کہ جب فلسطینی حریت پسند عورتوں اور بچوں کا اتنا لحاظ کرتے ہیں تو پھر اسرائیلی بمبار طیاروں نے غزہ، جھذا و نامکس کی فلسطینی آبادیوں میں، حتیٰ کہ اسپتالوں میں وحشیانہ گولہ باری کیوں کی تھی جس کے نتیجے میں ہزاروں عورتیں اور بچے ہلاک ہوئے تھے مگر بازغ باوجود اپنی شدید خواہش کے جزل آنرک فرناش سے یہ کڑوا سوال نہ کر سکی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اس ہیما تک انسان کی بربریت کا مظاہرہ دیکھ چکی تھی۔ وہ اسے اور اس کے باپ ہجیر یزناون کو بھی گولی مار سکتا تھا۔

لہذا بازغ نے چپ سا دھ لے مگر حقیقت یہی تھی کہ اسے اب جزل فرناش وغیرہ سے ہی نہیں اپنی مکار، دغا باز اور منافق قوم سے بھی نفرت ہو چلی تھی۔ بازغ نے نیویارک یونیورسٹی میں صرف اعلیٰ تعلیم ہی حاصل نہیں کی تھی بلکہ اس نے مختلف اقوام اور مذاہب سے متعلق ہسٹریکل بکس کا بھی

کی وجہ سے اب تاریکی کے پردے میں جھٹکتے شعلوں کے تبادلوں کا اندازہ کر کے موت و زندگی کا یہ ”جوا“ کھیلنا جا رہا تھا۔ زبیدہ کے گروپ نے اپنا داؤ پھینکا۔ جہڑ سے شعلے چمکے تھے اس طرف اس نے فائرنگ داغ دی۔ کئی دشمنوں کی کمریہ انگلیز جینیں ابھری تھیں اور اس دوران زبیدہ حلق کے بل شیرینی کی طرح گرجی۔ ”اندر داخل ہونے کی کوشش کرو۔ جلدی.....“

اس وقت جانے کیوں بار بار اس کی ہورنگ آنکھوں کے سامنے ہزاروں بے گناہ فلسطینی عورتیں بچوں کی آہیں و سسکیاں گونجنے لگیں اور ان شہداء کے چہرے بھی جن میں صادق الخیری اور قیصر الخلیل کے چہرے بھی شامل تھے، صادق الخیری کی وحش پیدردی اور بربریت کا ڈیوڈ اسٹار اور موساد کے مشترکہ جیوش آپریشن میں نشانہ بنایا گیا تھا، زبیدہ آج جلد سے جلد وہ حساب بے باق کرنے کے لیے بیٹھ چکی تھی۔ ادھر عمارت کے اندر بری طرح کھلی چمک رہی تھی، عورتوں اور بچوں نے رو نہ چلا تا شروع کر دیا تھا۔ جزل فرناش، ایوبدر شاہک، اشحاق شامیر، بارق شحون اور دیگر حکومتی افسران بری طرح بولکھا ہٹ کا شکار ہو گئے تھے، مگر اس کے بعد صورت حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے انہوں نے فوراً اس عمارت میں گھسنے کیلئے اپنے اسٹار کے ساتھ پھنپ چھاپا ماروں کے حملے کی اطلاع..... اسرائیلی جی ایچ کیو کو دے دی تھی کسی بھی وقت وہاں سے کمک کی آمد متوقع تھی مگر دھماکوں سے عمارت کے دروازے لڑ رہے تھے۔ اس دوران چارج لائینیں اور جینی انٹر جینی لائینیں موجود تھیں وہ روشن کر لی گئی تھیں..... بازغ بھی فکر مند نظر آ رہی تھی، یہودی کشمکش پر یزناون کو اپنی بیٹی کی بھی فکر لاحق ہو رہی تھی۔ جانے کس حکومتی اہلکار نے چلا کے کہا۔

”عورتوں اور بچوں کو ایک کمرے میں لے جا کر محفوظ کر دیا جائے فوراً.....“

”نہیں۔“ دفعتاً جزل فرناش کی تھمکانہ اور کرخ آواز گونجی۔ ”یہ عورتیں اور بچے..... ہمارے لیے تحفظ کا باعث نہیں گے۔“ جزل فرناش کے کمرہ لہجے سے ہلاکی عیاری پھونکی پڑ رہی تھی۔

ٹھیک اسی وقت چند اہلکاروں نے اندر آ کر بدحواسی میں اعلان کر دیا۔ ”حریت پسند چھاپا ماروں کا پلڑا ہماری ہور ہا ہے۔ ہمیں فوراً کمک کی ضرورت ہے۔ وہ کسی بھی وقت یہاں در انداز ہو سکتے ہیں۔“

اطلاع پر وہی حکومتی اہلکار پھر چلا یا اور جزل فرناش

سے محبت بھی کرتا تھا۔ بے شک یہ کیٹرف اور خاموش محبت تھی مگر لیٹی بہر حال اس کی پسند تھی، لیٹی کو ابھی اس کا احساس نہیں ہوا تھا کہ باقر چپکے چپکے اسے پسند کرتا ہے مگر جانے کیوں ایسے میں اسے کسی کی یاد آنے لگی تھی اور اس کی دلچسپ آنکھوں میں نمی چپکنے لگی۔ اس نے اپنا چہرہ باقر کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کی مگر باقر پہلے ہی گاہے گاہے اس کے سین چہرے کو دیکھ جاتا تھا۔ اس نے بھی لیٹی کی کشادہ آنکھوں میں چپکنے کی دیکھ لی تھی اور جب لیٹی نے ایک ہلکی سی کراہٹ اٹھانے پر روشنی چہرہ دوسری طرف کیا تو باقر تڑپ اٹھا۔ اس نے ہونے سے لیٹی کی شہواری پر اپنا ہاتھ رکھ کے آہستگی سے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا تو وہ آنسوؤں سے لبریز تھا۔ اسے دیکھی اور افسردہ دیکھ کر باقر سے ندر ہا گیا اور بے اختیار دل کی تپیں گہرائیوں سے بولا۔

”لیٹی! تم رو کیوں رہی ہو؟“

”بس!..... یوں ہی دل بھرا آیا تھا۔“ لیٹی نے بہانہ بنانا چاہا مگر باقر کو لیٹی کے بیک گراؤ کا علم تھا۔

”لیٹی!..... ایک مخلص ساتھی کی حیثیت سے میں تمہارے دکھ سے واقف ہوں۔ تم نے واقعی ارض فلسطین کے لیے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ پہلے تمہارا بھائی شہید ہوا پھر تمہارا بھائی شہید ہوا۔ تم خود بھی ارض فلسطین کے لیے بڑی قربانیاں دی ہو لیکن لیٹی!..... میں سمجھتا ہوں انسان کے سینے میں جھوٹا ہوا دل بعض فطری جذبات تلے گزراور دھڑکتا ہی ہونے لگتا ہے۔ جس کا شہوت آج میں تمہاری آنکھوں میں دیکھ رہا ہوں۔“

باقر کی آواز اور لہجے میں جانے ایسا کیا سارنٹوں تھا کہ جس نے لیٹی کے جذبات کے تاروں کو چھیر ڈالا اور وہ پہلی بار قدرے چونک کر..... سوچتی نظروں سے..... یہ غور باقر کا چہرہ کتنے لگی اور تب ہی اسے باقر کی آنکھوں میں مہر و وفا کا ایک ٹھٹھٹھ مارنا سمندر موجزن نظر آیا۔ لیٹی کے نسوانی وجدان اور اس کی تلاطم خیزی نے بری طرح بھنجوڑ دیا۔ بے اختیار لیٹی کے لبوں سے رز یہ برآمد ہوں۔

”باقر!..... کیا تم بھی کسی کو پسند کرتے تھے؟“

”ہاں!..... پسند کرتا تھا نہیں۔ پسند کرتا ہوں۔“ باقر بھی ایک بحر انگیزی کی کیفیات تلے جوا با لیٹی کی گہری اور کشادہ آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کسے؟“ بے اختیار لیٹی کے عنابی لبوں سے برآمد ہوا۔ باقر نے زحمت کے عالم میں کہا۔

”لیٹی! آنکھیں بھی تو ایک آئینہ ہوتی ہیں..... جس میں ایک جی محبت کا کمال دکھاتا ہے۔“

”لیٹی!..... یوں ہی دل بھرا آیا تھا۔“ لیٹی نے بہانہ بنانا چاہا مگر باقر کو لیٹی کے بیک گراؤ کا علم تھا۔

”لیٹی!..... ایک مخلص ساتھی کی حیثیت سے میں تمہارے دکھ سے واقف ہوں۔ تم نے واقعی ارض فلسطین کے لیے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ پہلے تمہارا بھائی شہید ہوا پھر تمہارا بھائی شہید ہوا۔ تم خود بھی ارض فلسطین کے لیے بڑی قربانیاں دی ہو لیکن لیٹی!..... میں سمجھتا ہوں انسان کے سینے میں جھوٹا ہوا دل بعض فطری جذبات تلے گزراور دھڑکتا ہی ہونے لگتا ہے۔ جس کا شہوت آج میں تمہاری آنکھوں میں دیکھ رہا ہوں۔“

باقر کی آواز اور لہجے میں جانے ایسا کیا سارنٹوں تھا کہ جس نے لیٹی کے جذبات کے تاروں کو چھیر ڈالا اور وہ پہلی بار قدرے چونک کر..... سوچتی نظروں سے..... یہ غور باقر کا چہرہ کتنے لگی اور تب ہی اسے باقر کی آنکھوں میں مہر و وفا کا ایک ٹھٹھٹھ مارنا سمندر موجزن نظر آیا۔ لیٹی کے نسوانی وجدان اور اس کی تلاطم خیزی نے بری طرح بھنجوڑ دیا۔ بے اختیار لیٹی کے لبوں سے رز یہ برآمد ہوں۔

”باقر!..... کیا تم بھی کسی کو پسند کرتے تھے؟“

”ہاں!..... پسند کرتا تھا نہیں۔ پسند کرتا ہوں۔“ باقر بھی ایک بحر انگیزی کی کیفیات تلے جوا با لیٹی کی گہری اور کشادہ آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کسے؟“ بے اختیار لیٹی کے عنابی لبوں سے برآمد ہوا۔ باقر نے زحمت کے عالم میں کہا۔

”لیٹی! آنکھیں بھی تو ایک آئینہ ہوتی ہیں..... جس میں ایک جی محبت کا کمال دکھاتا ہے۔“

پھر دفعتاً اسے اپنے کردارے مگر مضبوط ہاتھوں میں کسی کے نرم و نازک ہاتھ کا پیار بھرا لمس محسوس ہوا۔ یہ لیٹی کا ہاتھ تھا جس سے باقر کا دل ہی نہیں روح تک سرشار ہو گئی۔

☆☆☆

آج بھی موت تھی اور پیچھے بھی۔ زندگی کی راہ مسدود ہو چکی تھی کہ اچانک ہر سوتاری کی پھیل گئی۔ ناغمہ پریشان اور متوش ہوئی مگر عابد کھینچ کر اسے اس موقع سے فوری طور پر فائدہ اٹھانے کا ارادہ کیا اور فوراً ناغمہ کو جکھے جکھے انداز میں واپس پلٹنے اور عقب میں اس جگہ مرنے کی سرکوشی میں تاکید کی، جدر سے یہ آئے تھے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ دونوں اسرائیلی سح دتے اندھیرے میں اندھا دھند فائرنگ کرنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ اس طرح اپنے آدمیوں کی جانوں کے زیاں کا بھی خدشہ تھا تاہم انہوں نے پیش قدمی کے طور پر دوڑ لگا دی۔ اندھیرے میں دونوں دستے ایک دوسرے سے ٹکرائے، ان کا خیال تھا وہ درمیان میں اپنے شکار کو دیوچ لیں گے مگر بعد میں عقدہ کھلا کہ وہ تو انہیں جل دے کر اور فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

ادھر وہ دونوں تاریکی میں خض اندازوں سے دیواروں کے ساتھ ٹکرائے فرار کی کوشش میں مصروف کار تھے۔ لیٹی ایک ہلکی ٹھٹھٹھ کی آواز سنائی دی اور لائٹ آن ہوئی۔ شاید جیڑن ان کو دیے گئے تھے۔ سائرن بھی بج اٹھے تھے۔ عابد، ناغمہ دونوں دوڑتے ہوئے ایک زینے کے قریب پہنچے۔ اس عمارت کے محل وقوع کے بارے میں انہیں کوئی اندازہ نہ تھا کہ کون سا راستہ کہاں جاتا تھا؟ اور نکاسی کا راستہ کہاں تھا؟ تاہم ایک محتاط اندازے میں گرد و پیش کے جائزے کے دوران عابد کو کچھ اندازہ ہوا تھا کہ وہ گراؤنڈ فلور میں ہی تھے لیکن پھر ایک نیچے جانے والے زینے کو دیکھ کر وہ شش و پنج کا شکار ہو گیا۔ اس دوران ناغمہ کا ذہن بھی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”ابھی ہمارا پا پر لکنا ناممکن ہی ہوگا۔ یہاں سب ہمارے سلسلے میں ہائی الٹرن ہو چکے ہوں گے جلد بازی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔“

”تمہارا خیال ہے، ہمیں نہیں چپ جانا چاہیے؟“

”ہاں! ناممکن ہے وہ یہ ہمیں کب ہم فرار ہو چکے ہیں، معاملہ کچھ خنڈا پڑ جائے گا تو ہنگامی کوشش کریں گے۔“

”سوچ لو، ہمیں یہ عمارت قید خانہ ہی نہ بن جائے ہمارے لیے۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔“ ناغمہ مسکرائی۔ ان حالات میں بھی اس کی زندہ دلی عابد کو مسکرائے پر مجبور کر گئی۔

”میرا خیال ہے یہ زینہ کسی ہیمنٹ کی طرف جاتا ہے۔ ادھر ہی چھپنے کی کوئی جگہ ڈھونڈتے ہیں۔“ عابد نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ عقب سے بھاری دوڑتے قدموں کی دھمک ابھری۔ دونوں ایک لمحہ ضائع کے بغیر زینے اترنے انہیں خوشگوار حیرت ہوئی۔ یہاں ہر طرح کی چھوٹی بڑی گاڑیاں اور چند ٹرک بھی کھڑے تھے۔

”یہ عمارت کی پارکنگ گتی ہے۔ آؤ اس کا گیٹ دیکھتے ہیں۔“ عابد نے جوش سے کہا کہ آگے قدم بڑھایا ہی تھا کہ یکدم زینہ بھاری قدموں کی دھمک سے گوج اٹھا۔ دونوں کی خوشی کا نور ہوئی اور اس کی جگہ تشویش نے لے لی۔

”وہ نیچے آ رہے ہیں۔“ ناغمہ نے سرکش سرگوشی میں کہا۔ عابد نے تیزی سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ اسے یہاں چھپنے کی کوئی معمول جگہ نظر نہیں آ رہی تھی پھر وقت بھی کم تھا، سح دشمن کی بھی وقت ہیمنٹ میں آ سکتے تھے، ایک لمحے کو تو دونوں کو یوں لگا وہ خود ہی کسی چوہے دان میں آن چھپے ہوں۔ تب دفعتاً عابد کے ذہن میں ایک خیال جھماکے سے ابھرا۔ وہ خیال اور واقعہ پھر ہی انہیں کی قید خانہ کے درمیان کھڑے ٹرک کو دیکھ کر کچھ ابھرا تھا اور پھر اس نے آگے بڑھنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائی۔

اب ہیمنٹ کا فرش دوڑتے بھاری یوں کے شور سے گونجنے لگا تھا۔ آنے والے دایم بائیں پھیل رہے تھے۔ ان دونوں کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے اور سائیکل پھولی ہوئی تھیں۔ تاہم مطلوبہ ٹرک کے پاس پہنچ کر یہ اس کے اوپر سوار ہونے کے بجائے نیچے سرک گئے۔ عابد ٹرک کے نیچے کا جائزہ لینے لگا اور پھر اسے ایک خلا دکھائی دے گیا۔ ناغمہ سے بولا۔ ”جلدی کرو، خود کو اس خلا میں ایڈجسٹ کرو۔۔۔۔۔ ہری اپ۔“

”مم۔۔۔۔۔ مگر..... ت..... تم۔“ وہ ہلکائی۔

”دیر مت کرو۔۔۔۔۔ میں بھی اپنا کوئی بندوبست کرتا ہوں۔“ عابد بولا پھر جیسے ناغمہ نے عابد کی مدد سے خود کو ٹرک کے نچلے خلا میں بھنسا یا۔ عابد تیزی سے نکلا۔ پاس کی ایک بڑی سی جیب کے نیچے سرک گیا۔ ٹھٹھٹھ اسی وقت اسے اس رد میں بھاری یوں کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے جیب کے نیچے خلا تلاش کیا مگر بہت تنگ تھا۔ اس کے اندر خود کو

خون کا فوارہ اس کی گردن سے اٹھ پڑا۔ گوئی زبیدہ نے...
ایہودشاہک... پرتاک کر فائر کی تھی۔
ایہودشاہک درحقیقت محسن کو خاموشی سے اپنے ہتھول
کی گوئی کا نشانہ بنانا چاہ رہا تھا۔ زبیدہ کی عقابانی نگاہوں نے
اس کی مکارانہ اور سفاکانہ حرکت کو بروقت تازیانا تھا مگر پھر تو
جیسے جھگڑکھڑکھ گئی۔ ایہودشاہک کی موت نے فرناش اور
شمعون وغیرہ کو بلبلہ کر دکھ دیا۔ انہوں نے غورتوں بچوں کی
پروا کے بغیر زبیدہ اور اس کے ساتھیوں پر فائرنگ کر دی۔
اندھا دھند فائرنگ میں زبیدہ کا ایک ساتھی شہید ہو گیا۔ زبیدہ
نے چلا کر اپنے ساتھیوں کو واپس پلٹنے کا حکم دیا اور وہ خود بھی
پلٹی۔ محسن بھی بازغہ کو چھوڑ کر دوڑا۔ اس کے بازو سے ہونز
خون جاری تھا مگر اسے اس کی کب پروا تھی۔ یہ لوگ...
کمرے سے باہر ایک راہداری میں کھڑے ہو گئے۔
”ان کی ملک کسی بھی وقت پہنچنے والی ہے۔ تاخیر
مشکل کا سبب بنے گی بلکہ ہم بھی مارے جائیں گے۔۔۔۔۔“
ہمیں جلد ہی کچھ کرنا ہوگا۔“ محسن نے کہا۔ اس کے بازو
والے زخم پر کسی ساتھی نے رومال باندھ دیا تھا۔ ابھی اس
نے اتنا ہی کہا تھا کہ دفعتاً ایک آواز پر ان کے کان کھڑے
ہو گئے۔ یہ مخصوص قسم کی گڑگڑاہٹ تھی۔
”ہلی کا پڑا۔۔۔۔۔“ دفعتاً زبیدہ کے ایک ساتھی کے منہ
سے برآمد ہوا۔ لگتا ہے ان کی ملک آئی ہے۔
ان سب کے چہروں پر تشویش کے آثار مزید گہرے
ہو گئے۔ محسن نے جلدی سے کہا۔
”زبیدہ! آپ دو ساتھیوں کے ساتھ ہال سے ملحقہ
کسی کمرے سے جزل فرناش اور بارق شمعون کو ہٹ کرنے
کی کوشش کریں۔ میں ایک ساتھی کے ساتھ یہاں ملک کو
روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔“
”مگر۔۔۔۔۔“ زبیدہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن محسن اپنے
ایک ساتھی کے ساتھ باہر کی طرف لپک چکا تھا۔ محسن ابھی
اپنے ساتھی کے ساتھ مرکزی دروازے کے قریب پہنچا ہی
تھا کہ خشک کر رک گیا۔ اس کے سامنے وہی یہودی لڑکی
بازغہ کھڑی تھی، محسن اسے دیکھ کر چونکا۔ بازغہ محسن کے قریب
آ کے بولی۔
”تم لوگ... سخت خطرے میں ہو۔ باہر ملک پہنچ
چکی ہے۔ تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بہتر یہی ہے کہ جزل
فرناش اور بارق شمعون پر قابو پانے کی کوشش کرو۔“
”ان بزدلوں نے غورتوں اور بچوں کی آڑ لے رکھی
ہے۔“ محسن نے جلدی سے کہا تو وہ بولی۔

”میرے ساتھ آؤ مجھے معلوم ہے وہ تمہارے نکلتے ہی
کس کمرے میں گئے ہیں۔“ بازغہ نے انکشاف کیا۔ اس کا
سرخ و سپید حسین چہرہ جوش سے لرز رہا تھا پھر واپس پلٹی۔ محسن اور
اس کا ساتھی عیداس کے عقب میں چل پڑے۔ بازغہ ان کے
مختلف راہداریوں سے گزرتی ہوئی ایک ایک کمرے کے
سامنے والی راہداری میں لے آئی۔ جو در و درم ہلکا تھا۔
”اس کمرے کے اندر وہ دونوں شیطان
موجود ہیں۔“ بازغہ نے مذکورہ کمرے کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے کہا۔ خشک اسی وقت ہماری قدموں کی آواز
ابھری۔۔۔۔۔ اور ساتھ ہی گولیوں کی بھینک تڑتڑاہٹ سے
کورینڈور گونج اٹھا اس میں محسن کے ساتھی عیداس کی چیخ بھی
شامل تھی۔ محسن نے عقب میں محکمہ گردیواری آڑ لیتے ہی
اپنی گن کا رخ سیدھا کر کے بلی وہاں دیا۔ ایک گرجتا ہوا
برسٹ فائر ہوا اور کئی وردی پوش اسرائیلی فوجی کمرے میں
پینچیں مار کر زمین یوں ہو گئے۔ محسن ان کی نفری کا اندازہ
سلک تھا اور یہ بھی کہ وہ زیادہ دیر ان کے سامنے نہیں ٹک
سکتا۔ آگے بڑھا اور بازغہ سے بولا۔ ”تم چل جاؤ۔ ورنہ
میرے ساتھ تمہاری جان بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔“
”میں نے اپنے لوگوں اور اپنے باپ کا روپ دیکھ لیا
ہے۔ اب میری کوئی نہیں۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔“
بازغہ بولی۔ ”اس کمرے کا دروازہ توڑو اور اندر جاؤ۔“
محسن نے ایسا ہی کیا۔ مذکورہ دروازے پر اس نے اپنی ٹان
کارخ کر کے برسٹ فائر کر دیا۔ دروازے کا لاک اڑ گیا۔
محسن نے اسے لات دے ماری۔ پھر بازغہ سے بولا۔
”تم کسی طرح غورتوں اور بچوں کو عمارت سے نکال
دو۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔“ بازغہ نے سن کر پلٹ گئی۔
محسن اندر داخل ہوا۔ سامنے اسے مختلف تھیل کے
پاس۔۔۔۔۔ جزل فرناش اور بارق شمعون نظر آ گئے۔
برسٹ چلنے کی آواز پر بری طرح چونک کر اٹھے تھے پھر
یکدم اِدھر اُدھر پھینچنے لگے۔ محسن نے ان پر اندھا دھند
فائرنگ کر دی۔ کئی تھیل اور اسکرین ترخ گئے۔ جزل
فرناش جانے کس دروازے سے غائب ہو چکا تھا جبکہ بارق
شمعون اس کے نرے میں آ گیا۔ ”خبردار۔۔۔۔۔! کتے!
پلٹنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ ورنہ بھون کر رکھ دوں گا۔“
بارق شمعون نے شکست خوردہ انداز میں اپنے
دونوں ہاتھ بلند کر دیے۔ خشک اسی وقت کئی مسلح وردی پوش
اندروں آئے۔

☆☆☆

زبیدہ نے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ جھرجھار کیا
تھا وہاں اس کی زد میں اشحاق شامیر آ گیا جو ہال کمرے کے
ایک پتلی دروازے سے عمارت کے کچلے اندرونی گوشے کی
طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔
”رک جا۔۔۔۔۔ یہودی کتے۔۔۔۔۔! ورنہ گولیوں سے
بھون ڈالوں گی۔“ زبیدہ کی گرجتی آواز پر اشحاق شامیر لرز
اٹھا۔ اس نے فوراً اپنی جیب سے پستول نکال لیا مگر اسے
فائر کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ زبیدہ نے اپنی گن کی بلیبی دبا
دی۔ گولیوں کی بوچھاڑ نے اشحاق شامیر کو جھلٹی کر کے رکھ
دیا۔ وہ چیخا ہوا فرش پر گر۔ زبیدہ نے اپنے تینوں ساتھیوں
کے ساتھ آگے پیش قدمی کرنا چاہی تو یکایک عقب میں کئی
دوڑتے قدموں کی آواز ابھری۔ زبیدہ پری طرح ٹھٹھی۔
اسے جزل فرناش اور بارق شمعون کی تلاش تھی۔۔۔۔۔ وہ جانتی
تھی کہ یہ دونوں اسرائیل بلکہ یہودیوں کے لیے کس قدر
اہمیت رکھتے تھے مگر پہنچنے والی ملک نے ان کے منصوبے کو
مشکل میں ڈال دیا۔ ابھی وہ اسی تذبذب میں مبتلا تھی کہ
اچانک عقب سے ہالت ہالت کی آوازیں ابھریں اور اس
کے ساتھ ہی اندھا دھند گولیاں چلیں۔
زبیدہ اور اس کے تینوں ساتھیوں نے فوراً حرکت کی۔

وہ دونوں ساتھیوں کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے منصوبے پر
لپکتے ہوئے تھے۔ بازغہ نے اپنے تینوں ساتھیوں کی قادی کر کے
کی نشانہ بنی تھی، وہ اس طرف ہی دوڑ پڑے۔

☆☆☆

پوچھنے تک وہ بیت صفائی کی پہاڑیوں میں پہنچ چکے
تھے۔ ایک مقام پر اتر کر انہوں نے اونٹ کو واپس روانہ
کر دیا۔ دونوں اب نسبتاً محفوظ گزرگاہ سے پیدل جانے
لگے۔ پہاڑیوں کے ”الجابہ“ کا ٹھکانا زیادہ دور نہ تھا۔ چنانچہ وہ
کچھ چلے ہی خود بخود سستے رستے بالآخر الجابہ کے ٹھکانے
پر پہنچے۔ پھر وہ ٹھکانے کے قریب گئے جہاں ان کا پر جوش
انداز میں زبیدہ کے ساتھیوں نے استقبال کیا تھا اور انہیں
محسن کی کامیابی کی مبارکباد بھی دی گئی۔ ٹھکانے پر انہیں
اوتی کا دودھ پینے کو دیا گیا اور روتی کے ساتھ کھجور کھانے کو
دی۔ وہاں موجود زبیدہ کے نائب عارف حبیب سے ان کی
بابت ہوئی، وہ جوش مسرت سے بولا۔ ”ہمیں اس ہم میں
ساتھیوں کی جدائی کا دکھ بھی ہے، مگر خوش بھی ہوئی کہ ان کی
قربانیاں شاخ نہیں گئیں۔“

”اب دعا کرو جیسی کہ عزیز کی زبیدہ اور چارے
دوسرے مجاہدوں کا تیمانی آپریشن کامیاب ہو جائے تو

غاصب صہیونیوں کی لیے عرصے تک کمر ٹوٹ جائے گی۔“
محسن نے کہا تو عارف حبیب کے ایک ساتھی نے کہا۔
”انشاء اللہ وہ بھی ضرور کامیاب ہوں گے۔ ویسے تم
لوگوں نے اسرائیل کے ایسی کئی کھڑکوتاہ کر کے بڑا کارنامہ
انجام دیا ہے۔ اس سے اسرائیلی خفیہ ایجنسی پر وگرام کو کافی
دھچکا لگا۔ لیکن جانے کیوں میرا دل سے چینن ہو رہا ہے۔“
باتر نے گوگو سے لہجہ میں کہا۔ ”کاش ہم بھی عزیزی
زبیدہ اور اپنے دوسرے گروپ اسے کی مدد کر سکتے۔“

”اطمینان رکھو دوست! اور اللہ سے ان کی کامیابی
کی دعا کرو۔“ عارف حبیب نے کہا۔ اچانک باہر دور کہیں
گولیوں کی ترتراہٹ ابھری۔ وہ سب چونک پڑے اور
ابھی سنبھلتے ہی محسن پائے تھے کہ انہیں جیٹ۔۔۔۔۔ طیاروں کی
خوفناک گڑگڑاہٹ سنائی دی اور اگلے ہی لمحے یکے بعد
دیگر کئی ساعت شکن اور لرزا دینے والے دھماکوں کی
آوازیں ابھریں۔۔۔۔۔ جس گھپا میں یہ لوگ موجود تھے، وہ
بھی انہیں لرزی محسوس ہوئی، ایک بم شاید ان کی گھپا کے
کے قریب گر گیا تھا۔

”دشمنوں نے حملہ کر دیا۔۔۔۔۔ ہوشیار۔۔۔۔۔“ باہر سے کسی
ساتھی نے خبردار کیا اور یہ سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، محسن
اور باقیوں کو اندازہ ہوا کہ یہ حملہ محسن کی قادی کا بدلہ ہے۔
بہر طور وہ سب اٹھ سنبھال کے باہر دوڑے۔ عارف آگے
تھا وہ جیسے ہی گھپا سے باہر نکلا اس پر گولیوں کی بوچھاڑ پڑی۔
وہ وہیں دم توڑ گیا۔ محسن اور باقی کادل دکھ اور جوش انتقام
سے بھر گیا۔ ان کی اسلحہ کٹوں میں جس قدر ایمونیٹن سہاسکا
تھا وہ انہوں نے بھرا لیا اور باقیوں نے عارف۔۔۔۔۔ کا انجام
دیکھتے ہوئے گھپا سے نکلنے میں جلد بازی سے کام نہ لیا بلکہ گھپا
کے حفاظت دہانے کے سرے سے کھڑے ہو کر پوزیشنز
سنبھال لیں۔ بیت صفائی کی پہاڑیاں اس وقت گولہ باری
اور دھماکوں سے لرز رہی تھیں۔ آسمان پر کئی اسرائیلی فوجی
طیارے گردش کرتے نظر آئے تھے اور پہاڑیوں میں جیسے
فلسطینی مجاہد ایئر کرافٹ اور راکٹ لانچرز سے انہیں
گرانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ اسرائیلی طیاروں
میں مشین گنیں بھی فٹ تھیں، ان کا بھی ایک ساتھی راکٹ
لانچر کا نشانہ بن کر ہوا۔ باقر اور محسن نے بڑی
مستعدی کے ساتھ گروپش کا جائزہ لیا اور انہیں احساس
ہو گیا کہ اسرائیل کی طرف سے یہ ان پر فضائی حملہ کیا گیا
تھا۔ یہ لوگ اسرائیل کے اس بزدلانہ جیٹ انداز سے واقف
تھے۔ یہ ان کی اولین شکست محلی ہوئی تھی۔ وہ پہلے فضائی

جلد کے دشمن کو کمزور کرنے کی کوشش کرتے تھے اس کے
بعد دوسرے مرحلے میں وہ اپنے کمانڈرز روانہ کرتے تھے۔
پاقر نے راکٹ لانچر سمجھ لیا اور پہلی کے ساتھ باہر
آگیا۔ اس وقت انہوں نے ایک اسرائیلی طیارے کی دم
سے گاڑھا دھاواں ڈالتے دیکھا اور فوجی بمبیر بلند کر دیا۔ مجاہدین
دشمن کا ایک طیارہ مار گرائے میں کامیاب ہو گئے تھے جو
آگے جا کر شنگار پہاڑیوں کے دامن میں ٹکر دھا کے سے
تباہ ہو گیا تھا۔

نے کچھ فاصلے پر چٹانی آڑ میں اوندھی پڑی سی کوہری طرح
رہا کر رکھ دیا۔ وہ شدت کرب سے تقریباً چٹنی ہوئی
پتھر کی زمین پر خون میں تر ہو کر رہا کہ باقی کی طرف
دوڑی اور اسے سنبلایا۔

گوئیوں دھماکوں کی آوازیں یہ دستور گوئیوں
تھیں، تاہم گولہ باری میں کچھ کی آتی محسوس ہوئی، شاید
مجاہدین دشمنوں کے کچھ طیارے مار گرانے میں کامیاب
ہو چکے تھے۔

ہوئے تھے۔ باقر کو اسرائیلی طیارے مار گرانے کی زیادہ فکر تھی، محض راکٹ لانچر سے وہ ان طیاروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا جبکہ طیارے زیادہ تر اس علاقے میں گولہ باری کر رہے تھے حریت پسند..... اگر چنانچہ ایئر کرافٹ نٹوں سے ان کا زور توڑنے کی کوشش میں مصروف تھے اور کسی حد تک کامیاب بھی رہے تھے مگر کتنا آج کے ایجنٹی گھڑکی جانی نے اسرائیلیوں کو بری طرح تھملا دیا تھا۔ وہ اپنی اس برادری پر غم خوردہ تھے اور مجاہدوں کے مکنتیہ شکاروں پر بول دیا تھا۔

راکش لا انجرا بل لئی نے سنیال رکھا تھا۔ دور راکش اس کی جنگی کٹ میں موجود تھے، باقر بھی حتی المقدور پیش کر رہا تھا کہ وہ لیلیٰ کے سہارے کے بجائے اپنے قدموں پر چلے۔ اس نے رائفل اب اپنے دائیں ہاتھ میں لے لی تھی۔ اس دوران چند مسلح مجاہد ان سے آنے لے۔ انہیں پہچان کر کہا۔ ”اس طرف سے پیچھے ہٹنے کی کوشش کرو۔۔۔۔۔۔ دشمن بھاری تعداد میں پیدل اس طرف آرہے ہیں۔“

”ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ ہمیں دشمنوں سے مقابلہ کرنا ہوگا۔“ لیلیٰ نے پرجوش لہجے میں کہا تو باقر نے بھی اسی انداز میں تاکید کی۔

”دشمن چاہے کتنی ہی تعداد میں ہوں ہم ان کے ڈنٹ چاہیں گے۔“

دلچسپ معلومات

ٹھیک اسی وقت ایک طیارے نے اس سمت ہم گرایا۔
 مجاہدوں نے ادھر ادھر کر کر حملے سے بچنے کی کوشش کی۔ ہم
 گرا اور دو دروازا دھماکے سے ارد گرد کی پہاڑیاں لرزائیں یہ
 نیا نام ”جنگ کلسر“ تھا، ہم جس کے گرد تھے دھماکے کے
 ساتھ گئی بھڑکتے ہوئے شعلے اچھل کر دائیں بائیں خاصی
 دور تک گئے اور ہر شعلہ ہم کی طرح دوبارہ پلاٹ ہوا اور
 حریت پسندوں کو چاٹ لیا۔ ان کی چیخیں کرب ناک تھیں۔
 ”ایک اور راکٹ فائر کرو۔“ باقر چٹا۔ اسے اپنے ساتھی
 حریت پسندوں کی موت پر ٹیس آگیا۔ لیکن ابھی کیے بعد
 دیگرے دو راکٹ چلا دیے۔ ”اس طرف بڑھو.....“ باقر
 ایک طرف اشارہ کر کے بولا۔ لیکن خالی لا لچر ایک طرف
 پھینک کر رائفل سنبھال لی۔ باقر مذکورہ سمت کی طرف بڑھ
 گیا۔ ابھی چند قدم ہی دونوں نے طے کیے ہوں گے کہ بری
 طرح ٹھٹک گئے۔ مجاہدین کے ایک مورچے پر انہیں

تین عنایات

- اللہ نے اپنے بندوں پر تین عنایات کی ہیں۔
- (1) گندم، اناج میں کیڑے پیدا کر کے۔
ورنہ انسان اسے سونے چاندی کی طرح ذخیرہ کر لیتا اور لوگ بھوکے مر جاتے۔
- (2) موت کے بعد مردے کے جسم میں بدبو پیدا کر دی۔ ورنہ کوئی اپنے پیاروں کو دفن نہ کرتا۔
- (3) مصیبت کے بعد اہل خانہ کو صبر دیا ورنہ ان کی زندگی کبھی خوشگوار نہ ہوتی، تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو بھلاؤ گے۔

کا آدمی تھا اور اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ وہاں کئی سالوں سے مقیم تھا۔ عابد نے نامہ سے اس کا تعارف کروایا پھر اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی اس سے کہا کہ وہ ان دونوں کے یہاں چھ سے نکلنے کا کوئی بندوبست کرے۔ اس نے ان کے کھانے پینے کا بھی اچھا بندوبست کر دیا تھا۔

..... کبھی کے کبھی جہاز میں انہیں عام مسافروں کی طرح یہاں سے نکالنے کی کوشش کرے گا۔

”میرا خیال ہے اس میں خطرہ ہے۔“ نامہ نے اعتراض کیا۔ ”بندرگاہ پر ہماری تلاش کے سلسلے میں بہت سخت پہرا ہوگا۔ بالخصوص ”البحر“ کے جہازوں کی خصوصی چیکنگ کی جائے گی۔“ عابد کے ذہن میں پہلے سے یہ بات تھی وہ خاموش رہا جبکہ طلحہ نے احساس دلایا کہ اب مزید..... اس کے حوالہ اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔

”مجھے نہیں لگتا کہ..... میری تازہ ترین مہم جوئی کے بعد اسرائیلی کوست میری کمپنی کے جہازوں کو اب یہاں لنگر انداز ہونے کا پرمٹ جاری کرے گی۔ تاہم یہ بعد کا مسئلہ ہے۔“ عابد پر سوچ لگے میں بولا۔ ”ہمیں کسی اور کمپنی کے بحری جہاز میں سفر کرنا ہوگا۔“

”خطرہ اس میں بھی ہے..... اور اگر چیکنگ ہوئی تو معاملہ خراب ہو جائے گا۔ میرے ذہن میں ایک اور مہم جوئی تو آئی ہے۔“ طلحہ نے کچھ سوچنے کے انداز میں کہا تو عابد اور نامہ مشتعلانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ طلحہ

کے ساتھ نکاسی کے راستے کی متلاشی تھیں جو جلد ہی اسے نظر بھی آ گیا مگر اس سمت اس نے چار پانچ دشمنوں کو ہتھیار۔ بدست نمودار ہوتے بھی دیکھا۔ عابد کے بیدار مغز میں ایک خیال چمکا۔ اسے معلوم تھا وہ جب تک انہیں اپنے ٹرک سے روندنے کے لیے ان کے قریب پہنچے گا وہ ان پر بیک وقت اپنی گولیوں کا منہ کھول دیں گے۔ اس کی عقلی نظروں نے اس گاڑی کو چھاپ لیا جو ان کے بالکل قریب پارک تھی۔ عابد نے تیزی سے موڑ کاٹا۔ دشمنوں نے یہ سرعت اپنی نہیں سیدھی کر لیں۔ عابد کے ٹرک نے ایک گاڑی کو سانسٹا ٹھوکر ماری اور مطلوبہ گاڑی کے قریب پہنچے ہی اس نے ٹرک کو ”مر فٹنگ“ کے انداز میں گول گھمادی۔ ٹرک کا عقبی حصہ پوری قوت سے مطلوبہ گاڑی سے ٹکرایا اور وہ گاڑی ایک دھماکے سے لرزی اور دھن دستے سے جا گرائی، ان کی چیخیں گونج اٹھیں۔ ٹرک سیدھا کرتے ہی عابد نے ایکسپلرٹ..... پر پاؤں رکھ دیا۔ طاقت ور انجن والے ٹرک نے دھاڑ ماری اور سولہ ڈھلان پر تیزی کے ساتھ چڑھنا شروع کر دیا۔ سامنے پارکنگ کے آہنی دروازے کا شٹر تھا ٹرک اس سے ٹکرایا اور توڑا ہوا باہر نکل گیا۔ پھر عابد نے کچھ نہیں دیکھا اور احوالے کا کبھی گت توڑا ہوا باہر مڑ کر آیا گیا۔

..... ایک عابد نے دیکھا کہ ایک گاڑی عابد جانتا تھا کہ جلد ہی بیسیوں گاڑیاں اس کے قریب میں پھینکیں گی۔ اس لیے اس نے دانستہ شہر کے وسط کارخ کا ایک اور ایک جگہ پہنچ کر اس نے گاڑی ہتھیار سمیت چھوڑ کر نامہ کو لے کر اتر گیا۔ وہ ایک معروف بازار میں آگئے اور ایک گارنٹن کی بڑی سی شاخ کارخ کیا۔ یہاں دونوں نے اپنی ڈریسنگ وغیرہ تبدیل کی اور وہاں سے نکل کر ایک سیلون پارلر میں گئے۔ وہاں دونوں نے اپنے چہروں کی مخصوص لپیا پونی کروائی اور دو عدد دیکس بھی خریدیں، نامہ نے اپنے سیاہ بالوں پر ”ہیٹر کولڈ“ ڈگ چڑھائی تھی۔ دونوں اب..... یورپین لوور پیل کی صورت میں نظر آنے لگے تھے۔ ان چند اہم کاموں کو فوری نمٹانے کے بعد عابد شیکری نے ایک قریبی پبلک ٹیلی فون بوتھ سے اپنے ایک ہم وطن کمپنی بزنس ایجنٹ سے رابطہ کیا۔ جس کا نام طلحہ تھا۔ وہ یہاں قریب ہی ٹورائی بلڈنگ اپارٹمنٹ کے ایک گٹھری کشادہ فلیٹ میں رہائش پذیر تھا۔ اس نے انہیں وہیں رکنے کا کہا اور تھوڑی دیر بعد وہ اپنی کار میں انہیں لینے بھی آ گیا۔ اگلے نصف گھنٹے بعد دونوں طلحہ کے فلیٹ میں تھے اور انہوں نے قدرے سکون کی سانس لی۔ طلحہ ایک چالیس پینتالیس سالہ ساتویں رنگت

اس بار میں یقینی موت کی سرگوشیاں بھی شامل تھیں۔ عابد نے خود کو گاڑی کے خلاف سے نیچے فرش پر گر لیا اور اپنے پہلو سے بندھی گن سنبھالی اور بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ لوہائی رکے لینے لینے نامہ کے قریب جا پہنچا پھر تیزی سے اس کے کان میں کچھ کہا اور نامہ نے بھی اپنی گن پہلو سے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی اور پھر دونوں نے اسی طرح فرش پر لینے لینے اپنی پشت ملا دیں۔ انہیں دشمنوں کے بھاری جوتے..... اس ٹرک کے قریب آ کر رکتے ہوئے نظر آئے پھر جیسے ہی دشمنوں نے جھک کر نیچے جھانکا۔ دونوں نے فائر کھول دیا۔ دشمن ٹرک کے دائیں بائیں گھیرا ڈالنے لگے۔ تھے، گولیوں نے ان کے سروں کو چھتی کر کے رکھ دیا۔ وہ فرش بوس ہو گئے۔ دونوں ٹرک کے نیچے سے نکلے۔ بیمنٹ میں برست فائر ہوا اور گولیوں کی بوچھاڑ ٹرک کے کچھوں پر پڑی۔ ایک زوردار چمکانے سے اس کی ونڈ اسٹیکرین اور کچھ دشمن دوسری سمت انہیں تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف تھے مگر اس طرف گولیاں چلنے اور اپنے ساتھیوں کی کمر باندھنے میں اس طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ دونوں جھکے جھکے انداز میں گاڑیوں کی آڑ لینے ہوئے ایک طرف کو دوڑے۔ عابد کو احساس تھا کہ صورت حال خطرناک حد تک خندوش ہو چکی ہے۔ کیونکہ ان کی جگہ میں موجود ایک گاڑی کا پتہ ہوئے ہی سب ادھر کا ہی رہا۔ اس لیے اس نے اور ان کے موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔

اجانک ایک ذیل کمین ٹرک کے قریب سے گزرتے ہوئے عابد شیکری ششک کر رہا۔ اسے اس کے آئینہ میں ایک بڑے بڑے بچے کی صورت میں چابی لگی نظر آئی۔ اس نے بجلی کی سرعت کے ساتھ ٹرک کا دروازہ کھولا اور نامہ پہلے سوار کر لیا۔ ششک اسی وقت ایک برست فائر ہوا وہ نیچے جھک گیا۔ اس نے عقل مندی کی تھی کہ نامہ کے فوراً بعد خود بھی سوار ہونے کی جلد بازی نہیں کی تھی، ورنہ..... چلائے ہوئے اندھے برست کی زد میں آ جاتا۔ سنبھلتے ہی مذکورہ سمت کی طرف پلٹا اور جو نظر آیا اس پر جوابی برست فائر کر دیا۔ ایک چٹائی سے بھی سائی دی تھی، دشمن کا ہدف توڑنے کے فوراً ہی بعد لپک کر ٹرک میں سوار ہو گیا۔ یہ ایک اب ٹرک تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی اس نے آئینوں سوچ میں لگی چابی گھمادی..... بیمنٹ میں گاڑی کے آئین کی گھر گھرائی آواز ابھری، اور اگلے ہی لمحے تازوں کی خراش آواز کا شور ابھرا۔ ایک اب ٹرک ایک جھٹکے سے آگے بڑھا۔ عابد شیکری کی عقلی نظرس ایک مختار انداز سے

دشمنوں کا قبضہ ملا۔ یہاں ابھی کر لٹ گن نصب تھی، جسے دشمنوں نے تباہ کر ڈالا تھا۔ یہاں کچھ دشمنوں اور مجاہدوں کی ادھر ادھر لائیں بھی پڑی دکھائی دی تھیں۔ ششک اسی وقت باقر نے دیکھا بنیام ہم بھینکتے والا وہ مہلک طیارہ دوبارہ ایک طویل گول چکر کاٹ کر اس سمت آ رہا تھا اور اس بار اس کی پرواز قدرے نیچی تھی۔ اس نے لیلی کو قریب ہی ایک نسبتاً بلند ٹیکری پر چڑھنے کا کہا اور بتایا کہ اس طیارے کو تباہ کرنا ضروری ہے..... پھر دونوں مذکورہ ٹیکری پر چڑھنے لگے، طیارہ خوفناک انداز میں گڑگڑاتا ہوا عفریت نما آہنی پرندے کی طرح اس طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ دونوں اپنی سی جان توڑ کوشش کے ساتھ ٹیکری پر پہنچ گئے..... اس کی سنگناخ ڈھلان پر پشت کے بل لیٹ گئے اور اپنی طاقتور گتیں اوپر کر لیں۔ طیارہ ان کے قریب آیا اور انہوں نے ٹریگر دبا دیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ طیارے کے نچلے حصے میں ایک تواتر کے ساتھ بیوست ہوتی چلی گئی اور طیارہ ان کے اوپر سے گزر گیا مگر انہوں نے جیسے ہی سرگھما کے دیکھا تو مسرت سے ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ طیارے کی دم سے دو ٹیوں کا سیاہ بادل اٹھ رہا تھا اور وہ توازن کھو رہا تھا..... پھر دوڑتے چوٹیوں میں غائب ہو گیا، ششک اسی وقت ایک تباہ کن دھماکے کی آواز ابھری۔ طیارہ گر کر تباہ ہو گیا تھا۔ دونوں ٹیوں کو اسے قریب سوچنے میں کچھ دھنوں نے انہیں تازہ لیا اور وہ سب بیک وقت حرکت میں آ گئے۔ اس وقت لیلی اور باقر خطرناک پوزیشن میں تھے۔ دونوں نے ایک ساتھ دائیں جانب لوہائی لگائی، اسرا لیلی دستانے ایک راکٹ فائر کیا جو اس جگہ پر گرا جیسے تھوڑی دیر پہلے لیلی اور باقر موجود تھے، دونوں نے سر دست ان سے خبر داؤا ہونے کا ارادہ ترک کیا اور ایک سنگناخ آڑ کے قریب آ کر ٹیک گئے۔

ابھی وہاں نکلے انہیں تھوڑی ہی دیر گزری ہوئی کہ اچانک ارد گرد کی پہاڑیاں لغوہ بھیر سے گونج اٹھیں۔ لیلی اور باقر نے پر مسرت جوش سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ انہیں یہ اندازہ ہو چلا تھا کہ مجاہدین کی بھی شاید ہی ٹکی اس طرف پہنچ چکی ہے۔

☆☆☆

دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی آوازیں تیزی سے قریب آ رہی تھیں اور نامہ کی زندگی اس وقت شدید خطرے سے دو چار تھی، اس کے لیے عابد شیکری کا فوری حرکت میں آنا ضروری تھا۔ جیتی ہوئی بازی یکدم الٹ گئی تھی اور

”میرا خیال ہے میں ان لوگوں کے ہتھے سرے سے چڑھتا نہیں جاؤں۔ جانے اب تک انہوں نے کتنے مشکوک لوگوں کو گرفتار بھی کر لیا ہوگا۔“

عابد نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ان کے قلیق کا دروازہ زور زور سے دھڑکنا شروع ہو گیا۔ ان کے چہرے فق ہو گئے۔ ”دروازہ کھلو۔۔۔۔۔ جلدی۔۔۔۔۔ ورنہ توڑ دیا جائے گا۔ پولیس۔“ باہر ایک سخت اور ہماری آواز ابھری تھی۔

☆☆☆

محسن اب اکیلا تھا مگر اندر محصلوں کی یلغاری جاری تھی۔ اس کا بازو زخمی بھی تھا مگر اسے اپنے درودی پرواکب تھی۔ دو آنے والے سب اسرائیلی فوجیوں پر اس نے برست چلایا۔ ان کی پیش قدمی کو روکنے ہی وہ مختلف پستل بورڈ کی آڑ لیتا ہوا راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بارق شمعون پر چھینا اور چیم زدن میں اسے گن پوائنٹ پر لے لیا۔ فوجیوں نے موساد کے اہم افسر کو محسن کی گن پوائنٹ پر دیکھا تو اپنی ٹیمیں اس پر تان لیں مگر وہ محسن پر فائر کرنے سے قاصر ہی رہے کیونکہ اس نے بارق شمعون کو اپنی ڈھال بنائے رکھا تھا۔

”خردار۔۔۔۔۔ اگر کسی نے گولی چلائی۔ میری گن اس کے پائیک لچوکے پر چڑھ کر اسے مارے گی۔ اپنی ٹیمیں فرش پر گرادو۔ جلدی۔۔۔۔۔“ محسن خون خوار انداز میں غرایا۔ بارق شمعون کا مکروہ چہرہ موت کے خوف سے تاریک پڑتا جا رہا تھا جبکہ اسرائیلی دستہ شدید تذبذب کا شکار نظر آنے لگا۔ محسن نے بارق شمعون کی پشت پر اپنی گن کی ٹال چبھوتے ہوئے اس بار اس کے ذریعے ہدایت دلوائی۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

”جیسے یہ کہہ رہا ہے ویسے ہی کرو۔۔۔۔۔ ورنہ یہ مار ڈالے گا جان سے۔“

فوجیوں نے اپنی ٹیمیں فرش پر ڈال دیں اور اس وقت محسن نے خود کو سنبھالتے ہوئے بارق شمعون سمیت فرار کے لیے دروازے کی طرف رخ کیا۔ وہ زخمی تھا۔ مگر یہ جوش و خروش تھا جس نے اسے پامردی کے ساتھ اپنی جگہ ڈٹے ہوئے رکھا تھا۔ اسرائیلی فوجیوں نے طوعاً و کرہاً اس کی پیروی کی تھی۔ دوسرا محکم محسن نے انہیں دیوار کی طرف اپنا رخ پھیرنے کا دیا۔ بارق شمعون کی مکار آنکھیں تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ وہ زخمی محسن کی ”کنڈیشن“ کو نوٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اس کی طرف سے مزاحمت کے جواب میں اپنے اندر کتنی طاقت رکھتا تھا۔ بارق شمعون

خود بھی ماضی میں ایک ٹاپ ایجنٹ رہ چکا تھا۔ جسے قابلیت اور ”سیناریو“ کے بل بوتے پر۔۔۔۔۔ موساد کا اسٹنٹ ڈپٹی اور اب اسٹنٹ ڈائریکٹر بنا دیا گیا تھا۔۔۔۔۔ اس کی تیز بھانپتی ہوئی مکار نگاہوں نے فوراً تاثر لیا کہ اس کا زخمی حریف اب۔۔۔۔۔ اپنی پہلے جیسی تیزی یعنی ”لانگ آف فاسٹ ایکشن“ کھو چکا ہے اور موقع ملے ہی کسی بھی وقت اسے برست چلا کے ختم کر دینے کے درپے ہے۔۔۔۔۔ بارق شمعون نے اسی لیے فوجیوں کو مستعد کیا تھا کہ وہ بلا چون و چرا محسن کا حکم مانتے رہیں۔۔۔۔۔ جس کے باعث محسن کے انداز و اطوار میں وہ تیزی نہ رہی اور پہلی کروری بارق شمعون کے اندر کے ٹاپ ایجنٹ نے فوراً بھانپ لی تھی، وہ اب اس سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں تھا کہ ایک موقع پر جب محسن نے دروازے سے اس سمیت باہر قدم رکھا اور محسن کی آنکھوں میں غیظ کا شعلہ چمکا۔ وہ بارق شمعون کو جنم دہاں کر کے آگے کی راہ لیتا جا رہا تھا کہ دفعتاً دروازے کی غیر معمولی چوڑی چوکھٹ پار کرتے وقت بارق شمعون نے دانستہ اس طرح چھٹکا کھایا جیسے چوکھٹ پار کرتے وقت اس کا پاؤں رہتا ہو۔ اس طرح وہ اپنی غیر ارادی حرکت کو ظاہر کرنے کی غرض سے دانستہ طوراً الجھ گیا اور بل کے بل جیسے وہ اس کی پوائنٹ سے آگے بڑھتا ہوا اس کی ٹال کی تیزی سے حرکت میں آئی جس کی ضرب محسن کی زخمی ران پر لگی، محسن اس کی چالاکیاں نہ سمجھ پایا۔ زخمی ٹیمیں نے اسے ایک لمحے کے لیے لرزادیا اور اس دوسرے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بارق نے اسے اپنے ہماری بھر کم کاٹنے کی زوردار شوکر بھی رسید کر ڈالی۔ محسن جب تک اس پر اپنی گن سیدھی کرنے کی کوشش کرتا، وہ خود لکھڑا کر دور جا کر۔ بارق شمعون نے اس دوران ایک اور خطرناک حرکت کی۔۔۔۔۔ محسن کے لڑکھانے کے باعث اس کے ہاتھ سے چھوٹی گن پر بھی گرفت جمانی چاہی مگر گرتے ہوئے محسن کی خوش قسمتی یہ رہی تھی کہ وہ راہداری کی دیوار سے ٹکرا کر گرا تو گن بھی چھوٹ کر اس کے پاس ہی گری، اسے زخموں کی تاب کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ان اعصاب شکن لمحات میں بھی محسن نے جرات مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی گن بھی چھینا مارا۔ ادھر بارق شمعون شکاری کو ”شکار“ بننے دیکھنے کی حسرت لیے اپنی جان بچانے پر ہی۔۔۔۔۔ موقوف ہونا پڑا اور فوراً حلقے کے بل چھٹا ہوا کرے کے اندر دوڑ گیا۔

”بھتیجا رستہ نالو۔ شکار سامنے ہے۔“ فوجی جیسے جالی بھرے کھلونے کی طرح حرکت میں آ گئے۔ محسن کو خطرناکی

سودا کے جنوں

کا احساس ہوا اور اس نے سنبھلتے سنبھلتے اندر برست فائر کر دیا پھر ایک ہاتھ سے گن سنبھالتا ہوا کریدوری دیوار کا سہارا لیتے ہوئے ایک طرف دوڑ پڑا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کی گن اب بیکار ہو چکی تھی، اس کا خالی بوجھ اسے گراں گزرنے لگا۔ وہ اس نے سپیک دی۔

وہ ابھی چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اس کا بازو سے سامنا ہو گیا۔ اس کی محسن پر نگاہ پڑی اور اسے نہتا اور زخمی پاکر بازو کی آنکھوں میں تشویش و فطری لہریں سمٹ آئیں، اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر محسن کو سنبھالا، محسن پر بھی اب نیم غشی سی طاری ہوئے لگی تھی، بازو کے نرم سہارے سے اسے کچھ طمانیت محسوس ہوئی تھی جبکہ بازو اسے لیے۔۔۔۔۔ ایک کمرے کا دروازہ دھلیکتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔

”تم کسی طرح ایک عدد ہتھیار کا بندوبست کر سکتی ہو؟“ محسن نے ہانپتی ہوئی آواز میں بازو سے کہا تو بازو نے بولی۔

”تم شدید زخمی ہو۔۔۔۔۔ تمہارا بازو اور ٹانگ بری طرح کھال ہیں۔ اپنی جان کی فکر کرو۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔ تمہیں ہتھیار کی ٹیمیں مرہم پٹی کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔ آؤ میرے ساتھ۔۔۔۔۔“ محسن کی حالت غیر ہونے لگی تھی، تاہم اس نے نیم لڑائی لڑائی سے کمرے کے کمرے کا کھانا کھانا۔ بازو اسے لیے ایک اندرونی دروازے سے دوسری طرف ایک ایسی جگہ لے آئی۔۔۔۔۔ جدھر ایک دیوار میں سرنگ سے مشابہ خرابی دہانہ دکھائی دیا۔ یہ زمین دوز جگہ معلوم ہوئی تھی، یا پھر اس کا اندرونی گوشہ کسی طویل تسمت سے جڑا تھا کیونکہ یہ کمرہ ہر قسم کے فرنیچر سے عاری تھا مگر یہاں اسے بہت سی موٹر ٹرالیوں کا موجود نظر آئیں اور ایک پڑی سرنگ کے اندر غائب ہو رہی تھی۔ بازو نے ٹرائی سنبھالی اور محسن کو سنبھال کے اس پر سوار کر دیا پھر خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئی اور ٹرائی کے چھوٹے سے قیبل پر لگے چند بینوں کے ساتھ پچھڑ چھاڑ کرنے لگی۔ دوسرے ہی نے ٹرائی حرکت میں آ چکی تھی۔

”ہم کدھر جا رہے ہیں؟“ محسن نے پوچھا۔ اس کے لیے میں بلکی سی ایجنٹ آ میز حیرت کا شائبہ تھا۔ بازو جواب دیا۔

”اپنے گھر۔۔۔۔۔ میں اس ٹرائی کے ذریعے اپنے پاپا کے ساتھ یہاں آئی تھی۔“

ان کی ٹرائی نیم تاریک سرنگ میں آگے کی طرف اپنے سفر پر گامزن تھی، سرنگ کی گول چھت پر کہیں کہیں بلب روشن تھے۔۔۔۔۔ محسن ہونٹ سینچنے چند ثانیے پر سوچ اور

تلاش تھی۔ اسے حالات کا اندازہ بھی ہو رہا تھا جو تیزی کے ساتھ مخالف سمت کا رخ اختیار کیے ہوئے تھے، اگرچہ اس کے گریڈ پلان کا ایک حصہ کامیابی سے ہٹا کر ہوا تھا مگر اس کے پلان کا دوسرا حصہ نسبتاً زیادہ اہم تھا جو کرب لہی کے کامیاب ایکشن پلان اور کارروائی کے بعد فوری عمل کرنے کا متقاضی تھا، جو بد قسمتی سے نہ ہو پایا اور اب زبیدہ کے پلان کا یہ دوسرا اور نہایت اہم مشن تاکائی کے دورا ہے پر تھا بلکہ اب تو انہیں خود اپنی جان کے لالے پڑنے لگے تھے مگر جان جو قسم میں ڈال کر اندھا دھند کارروائی کرنے کی زبیدہ بھی کچھ زیادہ قائل نہ تھی، جب تک کہ اصل ہدف حاصل نہیں ہو جاتا۔

نئی اسرائیلی ملک پہنچے ہی زبیدہ اور اس کے دونوں ساتھی پستی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے مگر..... زبیدہ کو محسن کی بھی فکر تھی۔ نجانے وہ کہاں اور کن حالات کا شکار تھا؟ فرہاد اور عامر اس کے ہمراہ تھے نئی ملک کی آمد کے ساتھ ہی ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے کونے کونے میں ملک الموت بن کے پھیل چکے تھے، ناچار زبیدہ کو پناہ اہم مشن ادھورا چھوڑ کے فرار ہونے کی حکمت عملی پر مجبور ہونا پڑا، جو درست مشکل ہی نظر آ رہا تھا۔ یہی سب تھا کہ انہوں نے وہاں پورے مشن اختیار کر کے اپنے جانوش کے ساتھ پیچھے ہٹنا شروع کر دیا تھا۔ ایک مقام پر ان تینوں کو اسرائیلی دستے نے گھیر لیا..... یہ عمارت کا قطعی اور آخری گوشہ تھا..... دونوں طرف سے فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا تو ناچار فرہاد نے زبیدہ سے کہا۔

”عزیزی زبیدہ!..... آپ یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں، میں اور عامر دشمنوں کو کور کئے ہوئے ہیں۔“

”ہرگز نہیں۔ میں اپنے ساتھیوں کو موت کے منہ میں چھوڑ کر نہیں لوٹ سکتی۔ نکلنے کے تو ساتھ ہی۔“ زبیدہ نے حتیٰ لوجہ اختیار کرتے ہوئے جواب دیا تو عامر کو بھی بولا پڑا۔

”فرہاد ٹھیک کہہ رہا ہے عزیزی زبیدہ!..... آپ ہمارے لیے نہیں پوری فلسطینی قوم کے لیے اہم ہیں۔ آپ کا بیج نکلتا ہم سے زیادہ ضروری ہے..... خدا کے لیے اپنی قوم اپنے آدرش کی خاطر..... مان لیں ہماری بات۔ یہ یہودی کہنے آپ کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ ان کے لیے ہم اہم نہیں آپ ہیں۔“ زبیدہ نے اندرونی کرب سے اپنے ہونٹ دانتوں تلے سمجھ لیے۔

”سوچنے کا وقت نہیں..... عزیزی!..... آپ پوری

فلسطینی قوم کی ہی نہیں امت مسلمہ کی بھی امانت ہیں۔ ابھی ہم سب کو آپ کی ضرورت ہے۔“ فرہاد نے بھی مڑتے ہی لہجے میں کہا۔ ”آپ کو زندہ رہنا ہے ابھی..... ہم سب کے لیے..... صادق الجیری اور قیصر انٹیلی جیسے جاں باز مجاہد کا دم بھی ابھی ہمارے سینوں میں تازہ ہے۔ ہم آپ جیسی عظیم مجاہد کے مزید کسی ایسے دھم کے ہرگز تحمل نہیں ہو سکتے..... جو خدا نواستہ ہماری کمر توڑ ڈالیں۔“

زبیدہ نے ایک گہری سانس لی۔ ایک بھڑکی دھج اپنے دونوں ساتھی مجاہدوں پر ڈالی اور وہاں سے رخصت ہو گئی۔ فرہاد اور عامر اسرائیلی فوجیوں کے سامنے اس وقت تک ڈٹے رہے، جب تک ان کے ہتھیار ساتھ دیتے رہے اور زبیدہ ان کی پیچھے سے دور نہیں ہو گئی۔ اس کے بعد دونوں نے بالآخر جام شہادت نوش کر لیا۔ اس امید فرما کے ساتھ کہ بہت جلد ان کی دلیر لیڈر زبیدہ تازہ دم ہو کر اسرائیلی غاصبوں کو خاک چاٹنے پر مجبور کر دے گی۔

☆☆☆

نئی فلسطین کے لیے ایک ارض فلسطین کے لیے بولہوائے پو پھٹنے لگی تھی مگر ابھی اس بیج کی سپیدی حرم میں مظلوموں اور نیتے بے گناہوں کے فریادی بولی سرخی شامل تھی جو ابھی اصل سپیدی کی حرم میں گھس چکی تھی۔ یہاں وہاں کچھ اور بھی ہونے کی آس باقی تھی۔ ابھی کل لالہ کا دامن دل و جان اپنے ہی لہو سے خوں رنگ تھا۔ ابھی محض بھر سفر دشان وطن کے اسلام کے سوائے جنوں خیزی کی رفوگری جاری تھی تو دوسری جانب انسان نما شیطانی ٹولوں کی چال مگر بھی عروج پر تھی۔ حق و باطل کی جنگ کے میدان کارزار میں اگر ایک طرف رقص اٹلیں نظر آتے تو دوسری طرف آبروئے وطن اور اسلام کی سر بلندی کی خاطر جام شہادت نوش کرنے والے پرچم اسلام کے نام پر رقص و خیمہ چین کر رہی کرتے نظر آتے ہیں۔ غلط ہے ان کی سوچ جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جنگ صرف فلسطین کی جنگ ہے۔ ہرگز نہیں..... یہ تو پورے عالم اسلام کی جنگ ہے۔

جنرل آئزک فرناش کی حالت اس وقت خارش زدہ کتے کی سی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے ہی بال نوپے پر مجبور ہو رہا تھا۔ یہی حال بارق شمعون کا بھی تھا۔ دونوں اپنے اہم ساتھیوں، ایہود شاہک اور امحاق شامیر سے محروم ہو چکے تھے مگر اس سے زیادہ ان کی خارش زدہ حالت ہونے کی وجہ حریت پسندوں کا اسرائیلی ایٹمی بجلی گھر پر کامیاب حملہ تھا۔ جس کے باعث ان کی اس قدر مکی اور رسوائی ہوئی کہ

ان کے دیرینہ خواب ”عظیم تر اسرائیل“ کو عالمی سطح پر سخت ذلت و ہزیمت اٹھانی پڑی۔ یہی نہیں ایٹمی بجلی گھر کی آڑ میں ان کا پر نیم افزو دگی کا پلانٹ بھی تباہ ہو گیا تھا پھر جینیائی میں ڈیوڈ اسٹار کی عمارت پر چھاپا مار مجاہدوں کا حملہ بھی کم نہ تھا۔ جس میں اگرچہ فلسطینی مجاہد کے دوسرے گروپ کو خاطر خواہ کامیابی تو نہیں ہوئی تھی لیکن یہ حملہ بھی پوری یہودی قوم اور اسرائیل کی اوچی ناک کو کاٹنے کے ہی مترادف تھا۔ چونکہ یہودیت کا خیر ہی مکاری اور دغا بازی سے اٹھا تھا اس لیے انہوں نے حتیٰ الوسع کوشش کرتے ہوئے ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر پر فلسطینی چھاپا ماروں کے حملہ کارز میں رہنے دیا مگر ڈیوڈ اسٹار حملہ اور ایٹمی بجلی گھر کی تباہی کے واقعے کو چھپانے سے قاصر رہے تھے کیونکہ اس کی تباہی سے پورا یروشلیم اور تل ابیب اندھیروں میں ڈوب گیا تھا۔ تاہم اسے بھی محض خرابی کا تام ڈے کر اپنے تئیں چھپانے کی ناکام کوشش کی تھی مگر وہ اس زخم کا اندھا اقام لہا جاتے تھے۔ فلسطینی اور عرب بستیوں کے مظلوم اور نیتے..... محسوم لوگوں پر گولہ باری اس طرح کی بزدلانہ کارروائی یہودیت کا بنیادی شیوا تھا۔ اس پر فی الفور عمل پیرا ہونے کے لیے اسرائیلی اتحادی نے فوراً چار بڑوں کی ایک بین الاقوامی جنگ کال کر دی۔ ان چار بڑوں میں ایک ڈیوڈ اسٹار کا سربراہ جنرل آئزک فرناش تھا۔ دوسرا موساد کا ڈپٹی چیف بارق شمعون، تیسرا یہودی ایٹمی جنس یونٹ ”ہگانہ“ کا ڈائریکٹر آئزک ریشن ہیمر اور چوتھا انٹرویشن سینٹر کا چیف انچارج شمیر گویان تھا۔ جبکہ ہگانہ کے ڈائریکٹر آئزک ریشن کو ”شن بیت“ نامی اسرائیلی کاؤنٹر ایٹمی جنس کی بھی فیس واریاں سونپی گئی تھیں جو ”الیاہ“ (aliyah beth) کا بانی بھی تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ موساد اور ڈیوڈ اسٹار درحقیقت ”ہگانہ“ اور ”شن بیت“ کا بانی ایک پولینڈ نژاد یہودی آئزک ریشن ہیمر ہی تھا جو صرف بیس سال کی عمر میں 1901ء میں پہلی مرتبہ فلسطین آیا تھا، وہ اس یہودی تحریک کا خفیہ جاں نثار تھا جو بڑی خاموشی سے ایک سازش کے تحت دنیا بھر سے یہودیوں کو فلسطین پہنچ کر آباد ہونے کا مشورہ دیا کرتی اور پھر اس کا بندوبست بھی کرتی تھی۔

آئزک ریشن نے حیف سے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک رائج مستری کی حیثیت سے کیا اور جلد ہی اس نے اپنی کنسٹرکشن یعنی قائم کی لیکن چند سالوں میں اس کا دوایا نکل گیا تو وہ واپس پولینڈ آ گیا۔ پھر یکا یک اس کی زندگی میں انقلاب آیا اور 1938ء میں جب وہ دوبارہ اسرائیل آیا تو وہ یہودیوں کی خفیہ فوج کا جاں نثار سپاہی تھا۔ 1948ء میں آئزک ریشن کی لفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی پا چکا تھا اور ”ہگانہ“ (یہودی ایٹمی جنس یونٹ) کی باقاعدہ داروغہ تیل ڈال کر اس کا بانی اور چیف بن گیا۔ مکاری میں یکٹائے روزگار ہونے کے سبب وہ خفیہ امور کا پیچہ پیچھا جاتا اور اس کا شمار ہگانہ آری کے معزز افسران میں ہوتا تھا۔ جب اسرائیل کے قیام کے ساتھ ہی جنگ کا آغاز ہو گیا تو اسرائیل کی بقا کی فتنہ داری بھی ایک طرح سے آئزک کے کاندھوں پر آن پڑی۔ اس پر ہر طرف سے دباؤ بڑھ رہا تھا۔ ہگانہ چیف ہونے کی حیثیت سے اس کی ذمہ داریوں میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا لیکن دہلے نکلے اور لمبے قد کے آئزک ریشن نے جیسے حالات سے ٹھکت کھانا سکھائی نہیں تھا۔ اس نے چند دنوں میں ہی اپنے ایجنٹوں کا جال دور دور تک پھیلا دیا تھا۔ جرمن نازی۔ کمپوں سے نکالے گئے یہودیوں کو بھی اسرائیل اور فلسطین میں لاکر بسانا اس ملعون شخص کا کام تھا۔ اب ہگانہ کا ڈائریکٹر آئزک ریشن لہو اپنے پڑدادا کا ہم نام ہی نہیں بلکہ اس جیسی ناپاک اور مکروہ صلت کا مالک بھی تھا۔ اس نے آگے چل کر ہگانہ کی دو ذیلی شاخیں نکالیں، جن میں ایک الیاہ Aliya Beth اور دوسری شون بیت Shun Beth تھیں جو یہودی اسرائیل کی جدید کاؤنٹر ایٹمی جنس ایٹمی کا کام کرتی تھی۔ ان میں مشن بیتہ وہ قسمی جو مغربی ممالک کی یونیورسٹیوں اور ڈگری یافتہ درس گاہوں میں اسکا لری بنیاد پر آتے ہوئے ان مسلم طالب علموں پر کڑی نگاہ رکھتی تھی جن کا تعلق مسلم ممالک سے تھا۔ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت وہ ان ہونہار مسلم طالب علموں کے درخشاں مستقبل کے آگے روڑے لگانے اور انہیں مختلف جھوٹے الزامات میں پھنسا کر ایسے جدید تعلیمی اداروں سے رسوا کر کے بے دخل کرنے کا مشن انہیں سونپا گیا تھا۔ بالخصوص امریکا کی اعلیٰ اور جدید درس گاہوں میں ایسے مسلم ہونہار اسکا لرز طالب علموں کو بے دخل کرنے کے مشن پر یہ ملعون کنسٹرکشن یہودی باقاعدہ خود بھی اسرائیلی سفیری حیثیت سے کچھ عرصہ امریکا میں مقیم رہا جس نے امریکا میں موجود مسلم طالب علموں کے خلاف جعلی ثبوت اکٹھے کر کے امریکی حکام کو گمراہ کیا لیکن آئزک ریشن کا اصل ٹارگٹ پاکستان اور پاکستانی طلبا ہوتے تھے، ان کا تعلیمی مستقبل داؤ پر لگانا اور انہیں برباد کرنے میں وہ اپنی طرف سے کوئی بھی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتا تھا۔ امریکا کے بعد اسرائیل کا دوسرا ہمنوا برطانیہ تھا۔ آئزک ریشن کی شن بیتہ

دوست کی خاطر

ملنگی بہت ظالم ڈاکو تھا اس کے خوف کے پیش نظر لوگ کہتے تھے۔ دے راج فرنگی داتے رانی راج ملنگی دا۔ عدالت سے سزا کے طور پر جس دن اس کو اور اس کے ساتھیوں کو پھانسی دی جانی تھی۔ توج سویرے جیل پر شینڈلٹ اس کے پاس پہنچا اور کہا۔ ”ملنگی کٹھن منزل آگئی ہے اپنے آپ کو اس سفر کے لیے تیار کرو۔“ ملنگی نے جواب میں یہ کہا کہ ملنگی موت کو دوسری معمولی خراش سے زیادہ وقت نہیں دیتا۔ جیل پر شینڈلٹ نے گرفتاری کا سبب پوچھا تو ملنگی نے گرفتاری کا سبب بتایا کہ ہمارا ساتھی جواب بھی اگلی کھڑی میں قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہے گرفتاری سے پہلے جنگل میں ایک محفوظ مقام پر بیٹھے تھے ہمارا یہ ساتھی اس وقت بھی قرآن مجید کی تلاوت میں مصروف تھا اچانک ہمارے جاسوس نے پولیس آنے کی اطلاع دی ہم بھاگنے کو تیار ہو گئے اگر ہم اس وقت بھاگ کھڑے ہوتے تو کبھی گرفتار نہ ہو سکتے لیکن مارے ساتھی نے کہا ”میں جب تک قرآن مجید کا یہ پارہ ختم نہ کروں تلاوت نہیں چھوڑ سکتا۔“ ایک طرف اس ساتھی کے ساتھ موت اور دوسری طرف زندگی کے لیے فرار۔ ان دو صورتوں میں کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ چنانچہ میں نے دوست کے ساتھ مرنا گوارہ کر لیا کہ جو شخص قرآن دوستی کے مقابلے میں اپنی جان کی پروا نہیں کرتا ایسے دوست پر اپنی جان بھی قربان کر دینی چاہیے۔

مرسلہ: محمد جاوید شبیر بربرہ، علی پور مظفر گڑھ

چنگیزیت کی سمجھت چڑھا دیا گیا۔ ہزاروں لاکھوں نے گناہ معصوم شہریوں کا بڑی سفاکی سے گویا قتل عام کیا گیا اور یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ ہر طرف انسانی لاشیں، پتھرتوں کی صورت نظر آنے لگیں کہیں معصوم۔۔۔ شیر خوار بچوں کے اجڑے بچھوے اعضا بکھرے نظر آتے تو کہیں صرف پر گوشت کے ٹکڑے۔ اسرائیل کی اس جنگی جارحیت سے زمین و آسمان تھراٹھسے مگر کرب ناک الیہ تو یہ تھا کہ اس قلم اور مسافرانہ بربریت کے انسانیت سوز شیطانی کھیل کی عالمی سطح پر پور ننگ اور پی وی کو بھجی کی جی مگر باوصف اس کے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل اور عالمی امن کے داعی امریکا کے سر پہ جوں تک نہ رہ سکی۔ اسی کے بعد سب ”ناٹھا“ پڑ گیا۔ حکومتی سطح پر احتجاج، ریکارڈ کروا دیا گیا تو ڈرتے ڈرتے.....

یوں جیسے کسی چودھری کی بیٹھک میں کوئی غریب مزارعہ
دورے دورے اپنی عرضی پیش کر رہا ہو..... عرب کنٹرلز کے
طعام خانوں میں ٹھٹھے کے لمبے لمبے دسترخوان..... بھانت
بھانت کے من و سلوٹی کھانوں سے بھرتے رہے لیکن کسی
نے خاطر خواہ طریقے اور ذرائع سے اسرائیل کی ریشہ
دوازیوں کے آگے سینہ سپر ہونے کی کوشش نہ کی۔ اقتدار کے
جموے گرجے، مردہ خوری کے ہی فخر رہے مگر کسی نے اسرائیل
کے لے پاکستان، اسرائیل یا غیرہ دوسروں کو اس طرح نہ سنا
کیا، جو حالات کے تقاضی تھا۔

ادھر فلسطینی مظلوموں کی اجڑی بچھڑی بے گور و کفن لاشیں..... بہ ظاہر مردہ آنکھوں سے آسمان کو کھنکھاتی رہیں اور خالق کائنات سے ہی انصاف مانگتی رہیں۔

ابھی فلسطین اپنے ہی خون میں نہایا تڑپ رہا تھا کہ
 مسجد نبیوں نے ان کی غیرت و حمیت پر ایک اور چمکا لگایا۔
 آئرشین ہیری کے اگلے مکروہ پلان کے مطابق یہودیوں
 نے مسلمانوں کے قبلہ اول مسجد اقصیٰ میں کھس کر اپنی مذہبی
 رسومات اور ان کا شروع کر دیں۔ اس کے بعد بھی بے حرمتی
 کرنے والوں میں اکثریت اسرائیلی فوجیوں اور قسندہ
 یہودی آبادکاروں کی تھی جو پہلے بھی مختلف رسومات کی
 ادائیگی کے بہانے سے مسجد میں کھس کر بے حرمتی کے مرتکب
 ہوئے۔ ان میں اسرائیل کے ایٹمی جنس انکار بھی شامل
 تھے۔ جو بڑی تعداد میں مسجد کے اندر مسلمانوں کی
 سرگرمیاں مایوس کرنے اور پیکل سلیما کی تعمیر کے یہودی
 منصوبے کی تکمیل کے لیے وہاں موجود رہتے تھے۔

آج بھی مسجد کے اندر دراندازی کے دوران
 یہودیوں نے کئی ایسی کارروائیاں کر ڈالیں جن سے اسلامی

مجرع کا ضروری تھا، یہ ان کا دہرا انتقام لینے کا پیمانہ
مذموم طریقہ کا تھا مگر ساتھ ہی آخر زمین بیری جوئیر نے
ایک نیا بیج اُٹھی بھی کر دیا۔ جسے اس کیلے کا بینک کے اراکان
نے فوراً منظور کر لیا۔ اس کے بعد آخر زمین نے اپنی بد بینیت
آواز میں میٹنگ کے شرکا سے خطاب ہو کے کہنا شروع کیا۔
”حریت پسندوں کی ایسی کارروائیاں ہمارے
کر شیئر اس کیلے پان کو ہمیشہ سے ہی سبوتاژ کرتی آئی ہیں
لیکن ہمیں اس کا منہ توڑ جواب بھی دیتے رہنا ہو گا ہر مصلحت
سے بالاتر ہو کر ہمیں اس پالیسی پر عمل کرنا ہو گا جو فلسطینیوں کو
بریں طرح کیلئے اور عرب بستیوں اور علاقوں پر ہمارے قدم
مقبوضہ کرنے میں معاون ثابت ہوں۔“ سب نے اس کی
بات پر اثبات میں سر ہلایا تھا۔

آذربائین کے اس نئے ایجنڈے سے مسلمان اردوں کی مرحد سے متصل مسلمانوں کے تاریخی و فلاحی علاقے "وادئ اردوں" (انوار) کو کیسوی بی ریاست میں ضم کرنا تھا۔ اس قانون کی منظوری کے بعد اسرائیل مشرقی بیت المقدس اور وادی یولان کی طرف اس علاقے میں بھی اپنے قوانین لا کرے گا۔ اس مقدس وادی میں امت مسلمہ کے اہل حضرت عبید بن جراحؓ اور علیل المقدس صحنی معاون بن جلیلؓ کی مقبرہ اور مسجد واقع ہیں۔ یہاں پر مسلمانوں کی آرام گاہیں ہیں۔ یہ مقام کی تاریخی اور تہذیبی حوالوں سے پوری امت مسلمہ کے لیے منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

اس ناپاک اور متنازعہ سودہ قانون وہاں موجود
اسرائیلی حکمران جماعت ”لیکود“ اور اس کی اتحادی ”جیوش
ہوم“ کے وزرا کی پہلے ہی سے حمایت اور تائید حاصل تھی،
جس کے مطابق مقبوضہ وادی اردن کو مغربی کنارے اور
مشرقی بیت المقدس کی طرح اپنے انتظامی کنٹرول میں لانے
کا اختیار دیا گیا تھا۔ کابینہ یعنی میں لیکود اور جیوش ہوم کے
آٹھ وزرا نے اس متنازعہ قانون کی حمایت کر ڈالی۔ ان
وزرا میں رکن پارلیمنٹ میری ریکیو بھی تھا جو اس سے قبل
وادی اردن میں یہودی بستیوں کی تعمیرات سے متعلق قانون
سازی پر عمل درآمد کی بھی نگرانی کر چکا تھا۔ اس متنازعہ سودہ
قانون کی منظوری اور میٹنگ کے اختتام کے بعد اسرائیل کا
شمناک اور انسانیت سوز شیطانی فیصل شروع ہو گیا۔

چینے چٹھاڑتے دیوقامت اسرائیلی جنگی طیاروں نے فلسطینی اور عرب بستیوں پر وحشیانہ گولہ باری کا آغاز کر دیا۔ غزہ کو کھنڈر بنا دیا۔ نئے معصوم اور بے گناہ فلسطینیوں کو جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے، صیہونی

وہاں بھی اس کا ز پر مصروف رہا کھائی۔ مشن بیتھہ بانصوب
امریکا اور برطانیہ کی یونیورسٹیوں میں مختلف اسلامی ممالک
سے اسکالرشپ پُرکارا سٹی کے لیے آئے ہوئے مسلمان
طالب علموں پر کڑی نگاہ رکھتی تھی اور ان کے مستقبل کو سبوتاژ
کرنے کے لیے ہر اوجھا بھنگنا استعمال کرتی تھی جیلی
الزامات کے ساتھ ساتھ وہ حسین یہودی عورتوں کو بھی
استعمال کرتے تھے، جو انہیں بے راہ روی میں جھلا کر کے
اپنے مقصد سے ہٹانے کا باعث بنی نہیں بلکہ اپنے ملک
اور قوم کی بھی بدنامی کا سبب بنتے۔

آئرمین کے لیے بھی یہ ایک بڑا فتح تھا۔ PLS اور المجاہدین نے اسے تیونانی اور جغرافیائی کی صورت میں دیا تھا۔ بین الاقوامی طور پر موساد اور ڈی آئی کے ساتھ مشکل فورس نے اسرائیل اور ڈی آئی کے ذریعے جیٹس آپریشن کے دوران غصہ خدا کے فلسطینی مجاہدین بنائے۔ وزیر اور بی فرسٹ کے صادق النوری کو شہید کر کے فلسطینیوں کو زخم دیا تھا۔

اس ہنگامی مینگ میں اسرائیلی حکومت کی پارلیمانی کمیٹی بھی موجود تھی اور ان سب کے چہرے بری طرح تھے ہوئے تھے، ہگانہ آرمی کے آنکر زمین پھری جو نیز کو اسرائیلی قہ کے ہر وہ "سورہ" جسے حاصل تھی اور اس کا حکومتی عمل داری میں بھی موساد اور ڈیوڈ اسٹار سے زیادہ دخل تھا۔

آزرمین میری جو نیز ایک لسانِ تنگ اور کالی رنقت کا
گول چہرے والا کثر یہودی تھا۔ سر بالکل گنجا، ناک قدرے
پچی ہوئی تھی جبکہ چند ہی چند آنکھوں میں بلا کی مکاری
ایک خواست لے ہوئے تھی۔

اٹھیں لیس اٹھیں راڈز کی ساٹھ میزکریوں پر یہ
سارے اکابرین نے ظاہر خاموش بیٹھے تھے مگر ان کے تاباں
اڈھان میں خونِ مسلم بہانے کے لیے چینی پھیلی ہوئی تھی،
آج یہ صفتِ فرعون و ایلکس انتقام کے نشے میں اندھے ہو کر
بیت المقدس قبلہ اول اور ارضِ فلسطین کے خلاف مذموم اور
بھانک فیلہ کرنے والے تھے۔

میٹنگ کی ابتدا پہلے تو دھواں دھار انداز میں ہوئی اور وہاں موجود سب ہی گویا پہلے سے اس بات پر متفق ہوئے بیٹھے تھے کہ الحیاد اور PLSO کی ان چھاپا مار کارروائیوں کا بدلہ یہ لوگ فلسطین کے معصوم اور مجتہ قوم سے لیں گے لیکن وہ سمجھتے تھے کہ صرف مارا ماری میں پورا انتقام نہ ہوگا۔ انتقام کے ساتھ مسلمانوں کے جذبات بھی

2015ء

”کیا تم ہی وہ بڑ بولے اور تعصبی پاکستانی مسلم ڈاکٹر کمال ہو جو آئے روز ہائیڈ پارک پہ جا کر اسرائیلیوں کے خلاف کچڑا پھلاتے ہو؟..... یہ خیال کے بغیر کہ جس ملک (برطانیہ) نے اپنی اعلیٰ تعلیمی درس گاہ میں تم جیسے پھینچر پاکستانی کوائڈیشن دیا اور لندن جیسے جدید شہر میں تمہیں رہنے کا موقع دیا جس کے تم لوگ صرف خواب ہی دیکھ سکتے ہو۔ وہاں آکر..... تم اس طرح کا انتشار پھیلاتے ہو اور اس کی فضا کو خراب کرتے ہو۔ شرم آتی ہے تمہیں۔“

متعصب اور بے ترنگے کالے یہودی کی آواز کسی افریقی تیل کی طرح سینٹرل کینٹین میں گونج رہی تھی اور وہاں موجود بھانت بھانت کے ممالک سے آئے ہوئے طلباء یکدم خاموشی سے ان کی طرف نکتے میں محو ہو گئے۔ ان میں مسلم بھی تھے اور مقامی گورے بھی..... مکار یہودی کارلو نے ان کو روں کو بھی خوش کرنے اور اسکاٹے کے لیے..... برطانیہ (لندن) کی بھی تعریف کر ڈالی تھی۔ کئی ایک کے چہروں پر استہزائیہ مسکراہٹ تھی اور آنکھوں سے شرارت آمیز شوق بھی مترشح تھا۔ جینی پریشان نظر آنے لگی۔ ڈاکٹر کمال نے یہ ظاہر بڑے تحمل سے یہ سب سنا پھر اپنی شفاف عدسے کی بینک درست کرتا ہوا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جینی بھی اسی ہی طرح اس کے سامنے کھڑی ہوئی کہ شاید کمال ان سے منہ لگے بغیر وہاں سے جانا چاہتا ہے۔

ڈی کارلو اور اس کے ساتھی ٹولے کا ہی نہیں بلکہ وہاں موجود دیگر لوگوں کا بھی یہی خیال تھا کہ ڈاکٹر کمال بھی دیگر مسلم طلباء کی طرح ڈی کارلو کی ہرزہ سرائی کا جواب دیے بغیر وہاں سے ٹھکے کی کوشش کرے گا۔ کیونکہ یہ ان بے چارے ان پسند اور ذہین اسکالرز مسلم طلباء کی مجبوری تھی کہ وہ اس طرح کے شر اور گفتگو سے بچنے ہی کی کوشش کرتے تھے لیکن دوسرے ہی لمحے کینٹین کے ہال میں سرگوشیوں کی سرسراہٹیں بلند ہونے لگیں اور پھر اس وقت سب کو یکدم سانپ سوکھ گیا جب انہوں نے ہال میں ڈاکٹر کمال کی پرچوں آواز گونجی تھی۔

”تم مجھے تعصبی پاکستانی مسلم ڈاکٹر کہہ کر یہاں کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟“ ڈاکٹر کمال نے ایک ہاتھ سے اپنی آنکھوں سے بینک اتارتے ہوئے ڈی کارلو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت ہلکے ہلکے کمر کے کوٹ پیٹ میں ملیوں تھا جبکہ ڈی کارلو نے نائٹ چٹلون پر صرف شرٹ پہن رکھی تھی اور کہیں سے بھی مہذب طالب علم نظر نہیں آتا تھا۔ وہ آگے بولا۔ ”تمہاری اس ہرزہ سرائی

میں یونیورسٹی کیسپس میں پوری یکسوئی کے ساتھ تعلیم پر اچھی توجہ دے جاسکتی تھی۔

کچھ دن گزرے تھے کہ یونیورسٹی کی آرٹ اینڈ ہنری کی فیکلٹی میں ایک اسکالر کا رکا اضافہ ہوا۔ یہ ایک برطانوی نژاد لبرٹراگ کالا یہودی ڈی کارلو تھا۔ انتہائی متعصب ذہنیت کا مالک ڈی کارلو ایک شری پسند یہودی تھا۔ اس نے یہاں آتے ہی سب سے پہلے مسلمان طلباء کا جینا حرام کر دیا۔ آئے روز وہ یونیورسٹی، سینٹرل کینٹین، ہاسٹل غرضیکہ جہاں اور جہاں سے موقع ملتا وہ مسلمان طلباء کو تعذیب کا نشانہ بنانے کی کوشش کرتا۔ اس نے کچھ ہم خیال گوروں کا بھی ٹولہ بنا رکھا تھا۔ وہ ڈاکٹر کمال کا ہم عمر ہی تھا اور کہا جاتا تھا کہ اس کا باپ فرینڈ کارلو..... برٹش پارلیمنٹ کا رکن اور اقلیتی امور کا وزیر بھی رہ چکا تھا اور برطانیہ کی مقتدرہ شخصیت میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ بڑے اثر و رسوخ کا حامل تھا۔

متعصب ڈی کارلو..... سے امن پسند مسلم طلباء کئی کئی بارنے کی کوشش کرتے، وہ جانتے تھے کہ اس کے منہ لگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ نہ وہ اس کی ہرزہ سرائی کی شکایت کرنے کی ہمت کرتے تھے، ڈی کارلو دانستہ جہر مسلم طلباء کی ٹولی کو دیکھتا اپنے ٹولے کے ساتھ وہاں پہنچ جاتا اور مسلمان اور اسلام کے خلاف بغاوتیں مکتا شورشیں مچا دیتا۔ ایک دن اس کی مذہبی ڈاکٹر کمال سے ہوئی۔ دونوں ہم عمر اور یکساں قد و قامت کے تھے..... ڈاکٹر کمال کے بارے میں ڈی کارلو نے بھی بہت کچھ سن رکھا تھا اور بڑی شہود کے ساتھ اسے اس کی تلاش بھی مگر چونکہ ڈاکٹر کمال قاتلو اوقات میں ادھر ادھر بیٹھنے کے بجائے سیدھا لائبریری کا رخ کرتا اور اضافی وقت وہیں گزارتا تھا۔ جینی بھی کبھی اس کے ہمراہ ہوتی، تو چاہے وغیرہ کی غرض سے..... وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے سینٹرل کینٹین میں آ جاتے۔ ڈی کارلو کے ایک ساتھی نے اسے ٹھوکا دے کر..... سامنے اشارہ کرتے ہوئے قدرے جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا..... ڈاکٹر کمال جن کے ساتھ بیٹھا چائے پینے میں مصروف تھا، درمیان میں دو میزوں کا فاصلہ تھا۔ ڈی کارلو نے سنسنی انگیز نظروں سے گردن ڈرا گھبرا کر ڈاکٹر کمال کی طرف دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر نفرت انگیز تاثرات اظہار کئے۔ چند ہی چند آنکھوں میں شر پھونٹنے لگا۔ وہ یکدم اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور دانستہ بیچتا ہوا سیدھا ڈاکٹر کمال اور جینی کی میز کے قریب جا پہنچا۔ جینی اسے پہچانتی تھی کمال نے بھی اس کے بارے میں سن رکھا تھا۔

باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ واقعی مذہب اسلام کے بارے میں خاصا مطالعہ رکھتی ہے اور ایسے ہی ستار نہیں ہوئی۔

”ایسا سب سازش کے تحت ہوا۔ مسلمانوں کو مسلمان سے لڑانے کے لیے۔“ ڈاکٹر کمال نے کہا تو نہ جانے کیوں اسے اپنی آواز بھنی بھنی ہی محسوس ہوئی۔

”دل کو بھلانے کے لیے خیال اچھا ہے غالب.....“

دفعۃً ہی جینی کے لبوں سے غالب کی شاعری کا یہ مصرع ادا ہوا جس نے ڈاکٹر کمال کو صبح معنوں میں ورط حیرت میں ڈال دیا۔ وہ ایک نکل اس کا چہرہ دیکھا کہ کیا۔

”مسٹر کمال!..... بے شک ہر فساد کے پیچھے ایک بڑی سازش ہی کارفرما ہوتی ہوگی مگر سازش کی ہانڈی بھی بھونکتی ہوئی آگ کے چولہے پر ہی پختی ہے تم لوگوں کے پاس بہترین ضابطہ حیات ہے ایک اللہ، ایک رسول اور ایک کتاب..... پھر اس سے آگے تم کیوں آپس میں بحث و مباحثوں میں پڑتے ہو.....؟“ جینی نے کہا اور کیسپس کی پارکنگ میں کار روک کر نیچے اتر آئی۔ ڈاکٹر کمال بھی اتر آیا۔ جانے کیوں اسے آج محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خود کو جینی کی نگاہوں میں چھوٹا محسوس کرتے لگا ہے۔

اسے جینی کی علی علی علی اور یہ مغز مٹانے والے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ جینی بھی اس کی طرح اپنے فکری شعبے سے بہت کچھ ایسی اضافی تاج بھی رکھتی تھی جس سے انسانی دماغ اور دل کشاوی اور وسیع انظری محسوس کرتا ہے اور روح کی تسکین کا بھی باعث ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ دونوں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے، لیکن آج ڈی کے طالب علم جن کے مطالعے میں دنیا جہاں کی معلومات اور غیر نصیبی اسٹڈی کا موجود ہونا کچھ ایسی الجھنے کی بات نہیں ہوئی۔

پھر جب دونوں ہاسٹل بلاک کے قریب پہنچ کر اپنے اپنے کمروں کی طرف جانے سے پہلے ایک دوسرے کو الوداع کہنے لگے تو ڈاکٹر کمال نے مسکرا کر کہا۔ ”جینی! آج مجھے صبح معنوں میں تمہاری دوستی پر فخر اور خوشی ہے لیکن میرے کہنے کا مقصد اب بھی وہی ہے کہ تم نے انسانیت کے نامے ہی سے ہمارے مسلم غلط فہمی بھائیوں کو ہوتا ہے مگر تم نے کیا۔“

جینی کے نرم گلابی لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی اور وہ ”اے اوکے“ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

بیچینی سنوئیر..... مقامی ہونے کے باوجود ہاسٹل میں ہی رہنا زیادہ پسند کرتی تھی، اس کے مطابق گھر کے مقابلے

”میں نے بالکل ٹھیک سمجھا ہے کمال!“ جینی نے ایک موڑ کاٹتے ہوئے ترنت کہا۔

تمام تر ذہنی اور کسی حد تک نظریاتی ہم آہنگی کے باوصف ان دونوں کے درمیان بھی بحث چھیڑ جایا کرتی تھی، مگر باوجود اس کے دونوں ایک دوسرے کے موقف کو سمجھ لینے تو اچھے دوستوں کی طرح شوق بھی ہوجاتے۔

”تم لوگ یہی سب سے بڑی غلطی کرتے ہو کہ ہر کسی کو سب سے پہلے مذہب اور پھر بعد میں فرقے کی بینک سے دیکھتے ہو۔ کیا ہمارا ایک دوسرے سے محض انسانیت کا ناتانہیں ہو سکتا؟ میں نے بھی اسلام اور اس کی تعلیمات کا مطالعہ کر رکھا ہے اور جس قدر میں نے مذہب اسلام میں کشادگی، روشن خیالی اور وسیع انظری دیکھی ہے وہ مجھے آج تک کسی اور مذہب میں نہیں نظر آسکی۔ تمہارے پیغمبر اسلام نے بھی انسانیت کے درس کے ساتھ ہی ایک خدا اور ایک کتاب (قرآن مجید) کی تبلیغ کی۔ خود ان کی اپنی زندگی انسانیت کی اعلیٰ معراج کا نمونہ نظر آتی ہے۔ ایک واقعہ تو مجھے بھی یاد آتا ہے تمہارے پیغمبر کا کہ کوئی کافر عورت ہر روز ان کے اوپر کچرا پھینکا کرتی تھی، ایک روز ایسا نہ ہوا تو تمہارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ اس کافر عورت کے گھر تھوڑے سے گئے، کافر عورت کو حیرت ہوئی۔ آپ کے اس دور سے فرمایا۔ ”آج تم نے مجھ پر کچرا نہیں پھینکا تو میں سمجھا کہیں تمہاری طبیعت نہ خراب ہو۔ تمہاری خیریت پوچھنے آ گیا ہوں۔“ اس کافر عورت پر اس حسن سلوک کا ایسا اثر ہوا کہ وہ فوراً نکل پڑ کر مسلمان ہو گئی۔ غرضیکہ تمہارے پیغمبر اسلام کی سیرت طیبہ آپ کے حسن اخلاق اور آپ کے کامل انسانی نمونے کو تو غیر مذہب کے لوگوں نے بھی کشادہ دلی سے تسلیم کیا ہے۔ آپ کی ذات پاک تو خود ایک اللہ، اسلام اور آخری کتاب کا تبلیغی پرچار کرنے والی ذات تھی مگر..... میں معذرت چاہوں گی ڈاکٹر کمال کہ میں آپ کی بات تو نہیں کرتی لیکن تم میں کچھ لوگ ایسے بھی موجود ہیں جو مذہبی انتہا پسندی کی طرف گامزن ہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے جب ایک دوسرے کو فرقوں کی بنیاد پر جان سے مار ڈالتے ہیں۔ جبکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کے قتل سے تعبیر کیا گیا ہے۔“ جینی نے اپنی بات ختم کی تب تک یونیورسٹی کیسپس کے گیٹ کے قریب ان کی کار بچھ چکی تھی۔ ڈاکٹر کمال کو ایک عجیب سی چپ کھائی تھی، اس سے پہلے وہ بھی جھٹتا تھا کہ پیغمبر یعنی جینی محض اس کی دوستانہ حمایت میں اس کے ساتھ ہوتی ہے لیکن اسے جینی کی

عابد کا اس روز بہت جی چاہا کہ وہ ایک بار اپنے باپ اور بہن سے فرانس میں اپنی خیر خبر لے سکے آگاہ کر دے۔ مگر طلحہ نے ایسا کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اس میں خطرہ تھا۔ اسرائیلی جنگی جنس کی کال ٹیس بھی کر سکتی تھی اور راہ فرار کا سارا منصوبہ قتل بھی ہو سکتا تھا۔ بہر طور طلحہ نے اور کچھ ٹی وی پر چلنے والی نیوز سے یہ بھی پتا چلا کہ اس وقت اسرائیلی جنگی جنس اور خفیہ پولیس وغیرہ حریت پسندوں کی تازہ کارروائیوں کے باعث اسرائیلی فیشری اس میں بری طرح الجھی ہوئی۔ یہ فرانس آپریشن اور پی ٹی کے صادق الثیری کی اسرائیلی جنگی جنس کے خونخواری سے کے باقوں شہادت کے بعد "المجاهد" اور PLSSO نے اسرائیل کو ناکوں پہنے جیوا دیے ہیں اور ان مٹھی بھر سادہ فلسطینی نکلن یہ دوش جہادوں نے موساد اور ڈیوڈ اسٹار کو جتنی کا ناجی خمار کھا تھا۔

وہن اس مشکل اور جان لیوا صورت حال پر تیزی سے کام کر رہا تھا۔ تب اس نے ام خالدہ کو آگے بڑھ کر دروازہ کھولنے کا کہہ دیا اور خود ایک کمرہ دوسرے کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر اس کے پیچھے چر جائگا۔ کھڑکیاں کشادہ تھیں اور میز پر بھی پاؤں لگا کر کھڑے ہونے کی محاش بھی۔ کھڑکی انہوں نے باہر سے بند کر دی۔ وقت گویا ان پر بھاری سل کی طرح مسلط ہو گیا تھا جو کمرے نہیں گزرتا تھا۔ اندر جانے کیا ہو رہا تھا۔ انہیں کچھ نہیں معلوم تھا۔ عابد شیکری اور ان کے ساتھ ساتھ جڑے اونچے پرانی اپارٹمنٹس کی عمارت کی باہر میں منزل پر تھے۔ جان پر پنی ہوئی تھی، یہ حصہ بلڈنگ کے عقب میں واقع تھا اور دوسرا سلسلہ سمندر کا منظر تھا۔ کافی دیر جد کھڑکی کھلی کسی ممکنہ اور متوقع خطرے کے پیش نظر دونوں کے دل یکساں کی زور سے دھڑکے۔ پھر وہاں ام خالدہ کا چہرہ ظلع ہو تے دیکھ کر دونوں نے طمینان کی سانس لی۔ ام خالدہ انہیں وہاں لگا دیکھ کر ایک لمحے کو متحیر ہوئی، پھر دلی۔ ”اندر آ جاؤ..... وہ طے نہیں ہے۔“

دونوں آہستہ آہستہ ٹھک کر کھڑکی کے قریب آئے، پہلے عابد نے نامہ کو کھڑکی کے اندر داخل کیا پھر خود نہایت احتیاط کے ساتھ اندر دریا۔

”خیر! میں کسی قسم کا جوش نہیں ہوا۔“ عابد نے کہا۔

اگر عابد نے سوالیہ نگاہوں سے ام خالدہ کی طرف دیکھا۔ ”دروازہ دیر سے کھولنے پر وہ اسراہیلی کتے پر دم مڑ رہے تھے۔“ وہ جوابا بولی۔ ”مگر میں نے ہمانہ کر یا کہ میں ہاتھ روم میں تھی اور بچوں کو دروازہ کھولنے کی اجازت نہیں۔“

”ہوں.....“ عابد نے پُرسوجھ ہکاری بھری۔
 ”میرا خیال ہے، بھٹہ مل گیا۔“ تاغم نے کہا۔
 ”ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔“ ام خالدہ بولی۔ ”تھوڑی
 دیر بعد میں دوبارہ باہر نکل کر جائزہ لے کر آؤں گی۔“ پھر
 بوڑی دیر بعد خالدہ دوبارہ عمارت میں نکل گئی۔
 تاغم کے چہرے پر فکر و تشویش کے آثار نمود تھے،
 محسوس کرتے ہوئے عابد نے نفی آمیز لہجے میں اس سے
 کہا۔ ”پریشان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اللہ کے دعا کرو۔
 انشاء اللہ خیر و عافیت جیسے نکل جائیں گے۔“
 ”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ تاغم نے زیر لب کہا۔

مل بوتے پر کرنا پڑتا ہے اور یہی بات انہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور اگے بڑھنے پر بھیڑ کرتی ہے۔ تو بھلا ایک ترقی یافتہ ملک کے نوجوان کو اعلیٰ تعلیم کے لیے سرکھانے کی کیا ضرورت ہے جبکہ اسے ویسے ہی ہر ٹیٹھ ہر قسم کی بنیادی سہولیات حاصل ہیں۔ اب رعایا بات تمہاری ہائیڈ پارک سے متعلق تو ایک معمولی آدمی کو بھی اپنا جائز موقف پیش کرنے کی یہاں قانونی اجازت ہے اور ہم نے بھی اس قانون کی پاسداری میں ہائیڈ پارک میں پرامن احتجاج کیا۔ مگر تم..... مسلم دشمنی کے عصب میں اندھے ہو کر یہاں کیا کھل کھلاتے پھر رہے ہو..... یہ سب جانتے ہیں۔“

ڈاکٹر کمال نے اپنی بات ختم کی۔ ہاتھ میں پکڑی ٹیکک دوبارہ اپنے چہرے سے چڑھائی اور دھواں دھواں مسخ چہرے والے ڈی کارلو کو دیکھ کر ہولے سے اپنے سر کو اٹھائی۔

”جس دی۔ اس وقت ہال میں ڈاکٹر کمال کی اس منٹو ڈھونڈنی تقریر پر میزیں بجنا شروع ہو گئیں اور ”شیخ..... شیخ.....“ کی آوازیں بھی کو بجنے لگیں۔ ڈی کارلو کا سہارہ روچہ احساس تبدیل سے مسخ ہو کر رہ گیا۔ اس سے مزید کچھ بولا ہی نہیں گیا جبکہ ڈاکٹر کمال میز سے اپنی چند کتابیں سمیٹ کر پروقار چال کے ساتھ مینزل کیشین سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ جتنا اس کے پیچھے اس منٹو ڈھونڈنی جواب کے بعد ڈی کارلو کی طرف سے دوبارہ مسلم طالب علم کے ساتھ بدتمیزی یا ہرزہ سرائی دیکھنے میں نہیں آئی، پوری نیورسٹی نے گویا سکون کا سانس لیا تھا۔ نیورسٹی انتقامی تک بھی ”مذاکرے“ کی جھجک پہنچ گئی تھی، ایک طرح سے وہ بھی خوش تھے کہ ڈی کارلو جیسے ”کالے تیل“ کو ٹیکل ڈال دی گئی تھی کیونکہ وہ خود تو ڈی کارلو کے باپ کے اثر و رسوخ کی وجہ سے اس کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہیں کر سکے تھے، اور یہ سب بے چارے چند مسلم طلباء کے ساتھ ہی ہو رہا تھا، بھلا فقار خانے میں طوطی کی کون سا ہنسی..... لہذا انتقامی بھی چشم پوشی اختیار کیے ہوئے تھی۔ تاہم مسلم طلباء بالخصوص جینی کا خیال تھا کہ اس طرح کی کراری جوابی کارروائی سے ڈاکٹر کمال نے..... اس متعصب یہودی ڈی کارلو کو باغیانہ بنالیا ہے مگر ڈاکٹر کمال کو اس کی چنداں پروا نہ تھی۔ وہ حق بات کہنے سے کبھی نہیں چسکا تھا اور لندن بھی قیصر و سرکشی کے دربار سے کیا کم تھا۔

کا جواب میرے پاس بالکل سادہ سا ہے کہ دوسرے پراس
 طرح کی تنہا رہی لغو الزام تراشی درحقیقت تمہارے خود کے
 متعصب ہونے پر دلیل کرتی ہے اور ہاں تمہارے اس طرح
 کے اشتغال انگیز کرتوتوں سے کون واقف نہیں ہے کہ تم خود
 اس معزز اور مہذب تعلیمی ادارے کا امن یا مال کرنے کی
 نیت سے آئے روز امن پسند مسلم طلباء کو تشکیک کا نشانہ بناتے
 رہتے ہو..... مگر وہ اس ادارے کے تعلیمی تقدس کو یا مال نہیں
 ہونے دیتے اور نہ ہی تمہارے جیسے کے ساتھ منہ لگتے ہیں،
 اب رہی بات ایک بڑولے کی..... جو بانی پارک میں.....
 اسرائیلیوں کے خلاف کیچڑا اچھا لٹا ہے تو اس بڑولے کے منہ
 سے تم بھی سن لو..... یہ کیچڑ..... بلکہ کالک..... اسرائیل نے
 خود اپنے منہ پر لی ہے۔ خود کو دنیا کی عظیم قوم ثابت کرنے
 کے جنون نے تم غاصب یہودیوں نے اپنے ہی کرتوتوں
 سے خود کو دنیا کی نظروں میں ملوٹن اور پست ذہنیت قوم
 ثابت کر دیا ہے۔ فلسطین کے ننھے، بے گناہ اور مظلوم
 انسانوں پر اس طرح کی جنگی جارحیت کہاں کا انصاف ہے۔
 آبادیوں والے علاقوں میں بمباریوں سے وحشیانہ کولہ
 باری کرنا کدھر کا دستور ہے؟ مسلمانوں کے قبیلہ اول بیت
 المقدس اور فلسطین پر غاصبانہ قبضہ کرنا کہاں کا شیوہ ہے؟ رہی
 بات اعلان میں آکر ہم اپنی ساری ساری طاقتوں کو استعمال
 کرنے کے لیے آئے..... تو..... یہ صرف برٹش حکومت کی
 خارجہ پالیسی ہی نہیں ہے..... دیگر ترقی یافتہ ممالک میں بھی
 یہی سب کچھ ہے..... اس طرح یہ ممالک..... درحقیقت اپنا
 ایک ظلم کر سکتے ہیں، بہترین دماغوں کا خلا..... اعلیٰ تعلیم
 یافتہ اور Skill Persons اور ذہین لوگوں کا خلا.....
 کیونکہ ان افراد کی شرح ترقی یافتہ ممالک میں وہ نہیں ہے جو
 اب ہونی چاہیے۔ لہذا ایسے ترقی یافتہ ممالک ان تیسری دنیا
 کے ملکوں سے ہائر اسٹڈی کے لیے آئے ہوئے ان لوگوں کو
 بڑی بڑی آفرز دے کر ہائر کر لیتے ہیں۔ انہیں قابل بنا کر
 واپس اپنے وطن جانے سے روک لیتے ہیں اور ایسا ہوتا آیا
 ہے۔ اس کی ایک وجہ ہے..... مذکورہ ممالک میں اس خلا کی
 وجہ بڑی ٹھوس ہے کہ ان ترقی یافتہ ممالک میں ہر عام اور
 چھوٹے سے چھوٹے شہری کو ہر قسم کی بنیادی سہولیات حاصل
 ہیں۔ ہیر وز گاری والاؤس سے لے کر کسی کو معمولی کھانسی بھی
 ہو جائے تو اسپتالوں سے لینے رات کے دو بجے بھی گھر
 آ جاتی ہے۔ ان کا معمولی سے معمولی درد سر بھی حکومت نے
 اپنے ذمے لیا ہوتا ہے جبکہ تیسری دنیا کے لوگوں کو یہ سب
 آسائشیں حاصل نہیں یہ سب کچھ ان بے چاروں کو خود اپنے

جدال انتظام ظاہر حباید معصل

دل کا سارا انتظام اللہ نے جانے کیوں پردے میں رکھا ہے۔ چاہے جسمانی ہو یا احساسات کا معاملہ... اس کا دل بھی بہت اچھا تھا لیکن سرخ آنکھوں میں ایک دکھ کا احساس جھلکتا تھا۔ یہ انسان بھی کیا چیز ہے۔ کئی پردوں میں چھپا ہوا... دل میں درد کی لہریں اور ہونٹوں پر مسکراہٹوں کے پہرے... عجب تماشا ہے زندگی بھی...

گم شدہ محبت کے لال میں مبتلا
ایک حینہ کا ماجرا



میں شروع سے ہی بہت نازک مزاج تھی، اس کے علاوہ جسمانی طور پر بھی بہت زیادہ حساس تھی، ذرا سردی یا گرمی کی اور بیماری نے آن دو جو چاہے۔ نزلہ زکام اور بخار جیسی وہابی لٹفیں بھی مجھے بڑی جلدی آ پکڑ لیتی تھیں۔ ایسے دنوں میں اکثر ای چندوں کے لیے مجھے اسکول سے چھٹی کر لیتی تھیں۔ میں چار بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے لاڈلی بھی زیادہ تھی۔ سارے کہتے تھے کہ میں بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ پیاری ہوں۔ شاید اس وجہ

بہر طور عابد یہاں اتنی سخت چیکنگ دیکھ کر یہ بھی سوچنے پر ضرور مجبور ہو گیا تھا کہ وہ اسرائیلی سیکرٹ سروسز کی نظروں میں کس قدر ”اہمیت“ اختیار کر گیا تھا۔ یقیناً اس کی وجہ یہی رہی ہوگی کہ وہ نہ صرف ساڑھے سات سو غریب الدیار اور جلاوطن فلسطینیوں کو ان کے وطن میں واپس پہنچانے کا سبب بنا تھا بلکہ اس نے آئندہ بھی اس نیک مقصد کو اپنا مشن بنانے کا پختہ عزیمت کر رکھا تھا کہ وہ اسی طرح گاہے... لگا ہے دیگر جلاوطن اور بے گھر فلسطینیوں کو ان کے وطن ضرور واپس لائے گا۔

بہر طور وہ نازک مرحلہ آن پہنچا۔ انیس قطار میں کھڑا کیا گیا تھا۔ نامہ کا نمبر عابد کے بعد تھا۔ عابد نے اسے آخر میں تاکید کر دی تھی کہ اگر وہ یعنی نامہ چیکنگ کے مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گزر جائے لیکن بد قسمتی سے عابد دھریا جائے تو نامہ خاموش رہے گی اور قبریں روانہ ہو جائے گی اس پر نامہ نے بھوری نگاہوں کے ساتھ عابد کی طرف دیکھتے ہوئے بلاتل کہہ دیا تھا۔

”اور اگر میں پکڑی جاؤں تو پھر... تم خاموشی سے شپ میں سوار ہو کر سائیکس روانہ ہو جانا۔“

نامہ کی اس بات پر عابد نے اختیار ایک گہری سانس لے کر دیکھا تھا۔ وہ جلاوطن تھا۔ اس کا نامہ... یہ ہے لیکن نہ ہوگا۔“

”تو پھر میرے لیے یہ کیسے ممکن ہوگا عابد کہ میں جنہیں خطرے میں چھوڑ کر خود...“

”پلیز! نامہ... سمجھنے کی کوشش کرو۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر محبت بھری رسائیت سے بولا۔ ”تمہاری بات اور ہے... اب بحث کا وقت نہیں رہا۔ تم نے وہی کرنا ہے جو میں کہہ رہا ہوں، ویش اٹ...“

چیکنگ ہوتی رہی... عابد کا نمبر لگا سائفر مشین میں اس کا مختصر بیگ چیک کیا گیا اور پھر اسے آگے جانے کی اجازت مل گئی، آگے انگلور تھا۔ باقی عمل وہاں سے گزرنے لگا۔ نامہ کی باری ابھی تک نہیں آئی تھی۔ عابد اسے دیکھنے کے لیے دروازے کے ایک طرف ساڑھیں کھڑا ہو گیا اور وہاں سے باقی ماندہ عمل کی چیکنگ کا روانہ دیکھتا رہا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ رگ و پے میں عجیب سی سنسنی دوڑ رہی تھی۔ سو قسم کے اندیشاںک وسوسے سر اٹھا رہے تھے، بالآخر عابد کی دھڑکنی نظروں نے نامہ کو چیکنگ کاؤنٹر پر آتے دیکھا۔

(جاری ہے)

پہنچائے گا جس وقت کو سڑک کورہ کارگو شپ کے عملے کو لے کر بندرگاہ کی طرف روانہ ہو رہی ہوگی۔

رات ساڑھے بارہ اور ایک بجنے کے درمیان عابد شیکری ایک شینہ ٹرک میں سوار ہو کے کپنی کے دفتر روانہ ہو گیا۔ طلحہ نے اپنی آج کی دوڑ میں عابد اور نامہ کی جیس بدلی ہوئی تصویروں کے ایسٹلائی کارڈز بھی تیار کروا لیے تھے... عابد خلاصوں (ملاح) کے شے سے متعلق تھا جبکہ نامہ ”ڈائمنڈ کار“ کے شے میں تھی۔

مقررہ وقت میں یہ دونوں عملے کی کوٹس میں الگ الگ سیٹوں پر سوار ہو کر بندرگاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

بندرگاہ پہنچنے کے بعد... متعلقہ کپنی کے آفس روم میں جا کر ان دونوں نے دیگر متعلقہ عملے کے لوگوں کی طرح Muster roll پر اپنے اپنے سائن کیے۔ مخصوص

وردیاں چڑھائیں اور کسٹم چیکنگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ عابد کی عقلی نظریں تیزی سے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ساتھ ہی گاہے بے گاہے وہ نامہ کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ طلحہ نے سختی سے اس بات کی تاکید دونوں کو کر رکھی تھی کہ ان کے بشروں سے گھبراہٹ یا ڈر و خوف کا شائبہ تک نہیں بھلنا چاہیے... ورنہ وہ چیکنگ کرنے والوں کی نظروں میں ٹھیک نہیں آئے گی۔

نظروں میں ٹھیک جائیں گے اور انکو اڑی ہو جائے گی۔ یہ اسرائیلی ایجنٹ بہ ظاہر عام لوگوں کی طرح چیکنگ کے مرحلے سے بہ تیرو عافیت گزر چکے کے بعد بھی ان کے شپ میں سوار ہونے تک ان پر خفیہ نظریں رکھیں گے لہذا شپ روانہ ہونے تک کسی قسم کی جلد بازی نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ حقیقت تو عابد شیکری کو بھی معلوم تھی کہ عام حالات میں مسافر دراز شپ کے مقابلے میں کارگو شپ کے عملے کی اتنی سخت چیکنگ نہیں ہوتی مگر اب حالات اور تھے، بندرگاہ پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ اس بار کارگو شپ کی بھی سختی سے چیکنگ ہو رہی تھی مگر اس وقت عابد کے اور... طلحہ کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ جن پر اسرائیلی کسٹم یا انٹیلی جنس کوڈرا بھی شبہ ہو رہا تھا وہ ان کے چہروں پر امنو یا سپرے بھی کر کے چانچ رہے تھے کہ کسی نے اپنا اسل چہرہ ریڈی میڈ میک اپ کے پیچھے چھپا رکھا ہو تو وہ ظاہر ہو جائے۔

اس وقت چیکنگ کے دوران یہی ہو رہا تھا تاہم عابد کو طلحہ کی ایک عقل مند پر اطمینان بھی تھا کہ اس پر یا نامہ پر کسی کوشش نہیں ہوگا کیونکہ عملے کا ریکارڈ فوٹو سمیت دو گھنٹے پہلے کسٹم کاؤنٹر پر پہنچا دیا جاتا تھا۔

سے سب مجھ پر توجہ اور دھیان بھی دیتے تھے جس کی وجہ سے میں اکثر بیمار ہو جاتی تھی۔ ادھر کسی کو چھینک آئی ادھر میں نے بھی چھینکا شروع کر دیا۔ موی بخار کے دن آئے تو سب سے پہلے میرے منہ میں تھر یا میڑ آیا۔ آشوب چشم شروع ہوا تو سب سے پہلے میری آنکھوں میں لالی اتری۔ بڑی چالچی میرے لیے پختیابی کا ایک محاورہ استعمال کرتی تھیں..... جس کے معنی کچھ یوں تھے..... جس گڑ کی بہت ضرورت ہوتی ہے وہ عموماً ذرا خراب ہی ہوتا ہے۔

میرے ابو ایک ملٹی پٹیشنل کمپنی میں آفیسر تھے۔ معقول تنخواہ تھی۔ اچھی گزربھر ہو رہی تھی۔ میرے دو چچا بھی تھے جو ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے۔ لاہور کی ایک جانب کشادہ رہائشی آبادی میں یہ دو منزلہ مکان تھا۔ یہ تیس چالیس سال پہلے ہمارے دادا نے بنوایا تھا۔ دادا تو اب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، وادی حیات تھیں اور ہم سب کے درمیان تھیں۔ بڑے چچا کی شادی ہو چکی تھی اور ان کے ماشا اللہ تین بچے تھے۔ چھوٹے چچا جو بڑے چچا سے آٹھ دس سال چھوٹے تھے، حال ہی میں شادی شدہ ہوئے تھے۔ چھوٹی چچی کا نام سارہ تھا۔ وہ ایک انگلش اسکول میں ٹیچر رہی تھیں۔ کافی اسمارٹ اور دلکش تھیں۔ مجھے ان کے لیے گھنے بال سب سے زیادہ اچھے لگتے تھے۔ ان دنوں میری عمر سات آٹھ سال رہی ہوگی۔

چھوٹی چچی سارہ بڑے اچھے طور اطوار کی مالک تھیں۔ ہر ایک کے لیے دل میں ہمدردی اور محبت رکھتی تھیں۔ مجھے ان کے پاس بیٹھنا اور ان کی باتیں سننا اچھا لگتا تھا لیکن چھوٹی چچی کے ساتھ ایک چھوٹا مسئلہ بھی تھا۔ میں نے اسے ”چھوٹا“ کہا ہے لیکن میرے لیے شاید یہ چھوٹا نہیں تھا۔ چھوٹی چچی کو اکثر الرجی رہتی تھی۔ ناک سرخ رہتی، کبھی کبھی آنکھوں سے پانی بھی نکلتا اور وہ ہاتھ میں رومال یا ٹشو پیپر پکڑے نظر آتیں۔ سردی شروع ہوتی تو انہیں کئی دفعہ چھینکیں مارتے بھی دیکھا۔

امی، ابو اور خاص طور سے امی کو وہم کی حد تک میری صحت کی فکر لاحق رہتی تھی۔ امی نے ایک دن بڑی خاشوخی سے مجھے کہہ دیا کہ میں چچی سارہ کے ساتھ زیادہ میل جول نہ رکھوں۔ ایسے معاملوں میں، میں خود بھی بہت حساس ہو چکی تھی۔ نہ چاہنے کے باوجود میں چچی سارہ سے قدرے دور رہنے لگی۔ خاص طور سے جن دنوں ان کی ناک سرخ نظر آتی یا آنکھیں سوجی سوجی ہوتیں..... یا وہ ویسے ہی پڑھرہ دکھائی دے رہی ہوتیں۔ چچی سارہ دادا کے ایک دوست کی

پوتی تھیں۔ یہ لوگ اسلام آباد میں رہتے تھے۔ چچی سارہ کی الرجی کو بھی اسلام آباد کے موسم سے ہی تھکی کیا جاتا تھا۔ وہاں ہوا میں غالباً کسی طرح کا ”پولن“ تھا جو شہر کے اکثر مکینوں کو اس مصیبت میں مبتلا کر رکھتا تھا۔

جو کچھ مجھے تھا لیکن چچی سارہ مجھے اچھی لگتی تھیں۔ کسی وقت میں اسکول سے ملنے والا ہوم ورک لے کر ان کے پاس بیٹھ جاتی۔ وہ اتنے اچھے طریقے سے ہوم ورک کراتیں کہ میں حیران رہ جاتی۔ بھران کی دلچسپ باتیں، ان کا پیار بھر انداز اور ان کے گزربھر لے رہی بال جو حرکت کرتے ہوئے بار بار ان کے دو دھما چہرے پر آ جاتے تھے اور جنہیں وہ اپنی خوب صورت آنکھوں سے پیچھے ہٹاتی تھیں لیکن اس قسم کے موقع کم ہی آتے تھے۔ خاص طور سے جب امی گھر میں موجود ہوتیں، میں اس طرح کا رسک ہرگز نہیں لیتی تھی۔ امی اور چچی سارہ کے درمیان دھڑرائی، جھجھائی کا رشتہ تھا اور اس رشتے میں اکثر شکایتیں اور تکیاں پیدا ہوتی رہتی تھیں۔ تاہم اس معاملے میں بھی چچی سارہ کا جھکاؤ اکثر مفاہمت اور صلہ کی طرف ہی ہوتا تھا۔ چچا، چچی کے آپس کے تعلقات بھی ٹھیک ہی تھے۔ دونوں مہینے میں ایک بار لاہور سے اسلام آباد جاتے اور وہاں ہی پریم سب بچوں کے لیے کھانا پیونہ چاہتے۔ کھانے کے بعد کچھ دیر وغیرہ لاتے۔ مجھے یقین ہے میرے اور چچی کے درمیان خوب جتنی اگر ہمارے درمیان یہ الرجی والا معاملہ نہ آ جاتا۔

اب اتنے برسوں کے بعد میں سوچتی ہوں۔ ہٹائیں کیوں ہم بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں کو اتنی زیادہ اہمیت دیتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ برائے نام مسائل کو بڑے بڑے دوسروں اور واہموں کا روپ دے دیتے ہیں۔ چچی سارہ کے حوالے سے میرے ذہن میں جو گریز پیدا ہوا تھا وہ دھیرے دھیرے بڑھتا رہا۔ میں ان سے کبھی بھی رہنے لگی۔ دلی خواہش ہونے کے باوجود میں ان کے پاس زیادہ نہ بیٹھتی اور نہ ہی ان کے کمرے میں جاتی۔ بچپن کی ایک بات مجھے آج تک یاد ہے۔ ایک دن چچی سارہ تم آنکھوں اور سرخی مائل ناک کے ساتھ کمرے سے نکلیں اور چھت پر چلی گئیں۔ بڑے چچا نے بڑی چچی نیلے سے کہا۔ ”لگتا ہے، سارہ کو پھر الرجی کا ایک ہوا ہے۔“

بڑی چچی نیلے سے برا سا منہ بنا کر کہا تھا۔ ”کوئی الرجی ورچی نہیں ہے، بس ذرا سے کرتی ہے..... کچن سے دور ہٹا کر کوا چھائیں لگتا۔“ اس بارے میں بڑے چچا اور بڑی چچی میں کچھ اور

باتیں بھی ہوئی ہوں گی لیکن میرے کانوں تک نہیں پہنچیں۔ بس چچی نیلے کا ایک اڑتا اڑتا سا طہر یہ جملہ میری سماعت سے ضرور گزرا۔ ”یہ الرجی سے بھی زیادہ خطرناک چیز ہے۔“ یقیناً یہ جملہ چچی سارہ کے لیے ہی تھا، میں کی دن تک ابھن میں جھلا رہی، پھر یہ بات خود بخود ذہن سے نکل گئی۔

ایک دن چچی سارہ اپنے موڈ میں نظر آئیں۔ ان کا چہرہ بھی نارمل ہی دکھائی دے رہا تھا۔ میرے ساتویں کلاس کے پیپرز تھے۔ سردیوں کے دن تھے۔ چچی چھت پر بیٹھی دھوپ سینک رہی تھیں۔ میں اپنی میتھ کی بک لے کر ان کے پاس جا بیٹھی۔ ان سے دو چار سوالوں کے حل میں مدد لی پھر انگلش گرامر کے دو تین سوال ان سے پوچھے۔ چچی محبت سے میرے بالوں میں انگلیاں چلاتی رہیں اور ساتھ ساتھ مجھے پڑھاتی رہیں پھر ایک دم کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے بولیں۔ ”ناؤو! کیا بات ہے۔ تم دور دور رہتی ہو مجھ سے۔ پچھلے ہفتے میرے سر میں اتنا درد رہا، ہم نے حال تک نہیں پوچھا؟“

میں کوئی بہانہ بنا جاتا تھا مگر پھر پتا نہیں میرے دل میں کیا آئی۔ میں نے چچی کی خوب صورت آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”چچی چچی بتائیں، آپ برا تو نہیں مائیں گی؟“ انہوں نے میرے دونوں ہاتھ پکڑے ہوئے کہا تھا۔

”آپ کو پتا ہی ہے، مجھے بڑی جلدی نزلہ زکام ہو جاتا ہے۔ امی میرے لیے ہر وقت ڈری ہوئی رہتی ہیں۔ آپ کو اکثر الرجی رہتی ہے۔ اس لیے میں ذرا دور رہنے کی کوشش کرتی ہوں لیکن یقین کر س ائی کے بعد پورے گھر میں مجھے سب سے زیادہ آپ اچھی لگتی ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کے پاس بیٹھی رہوں، آپ سے باتیں کرتی رہوں۔“

انہوں نے ایک گہری سانس لی اور میرے بال سنوارتے ہوئے بولیں۔ ”تو پھر بیٹھی رہا کرو، باتیں کرتی رہا کرو۔ تمہیں گارنٹی دیتی ہوں کہ میری الرجی تمہیں نہیں لگے گی۔ بیماری کے جراثیموں سے چارے کے جراثیم زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ وہ دوسرے جراثیموں کو مار دیتے ہیں۔“

میں مسکرا دی۔ وہ خود بھی ہنسنے لگیں۔ انہوں نے مجھے گلے لگا یا شفقت سے میرا ہاتھ چومنا اور میری ناک سے اپنی ناک رگڑتے ہوئے بولیں۔ ”مجھے الرجی نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو تمہیں اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“ اسی دوران میں امی اوپر آگئی تھیں۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ چھوٹی چچی نے مجھے گلے سے لگا رکھا ہے۔ ان کے

کٹرنیں

☆ روپے کی قیمت کتنی بھی گر جائے لیکن اتنی کبھی نہیں گر سکتی جتنا روپے کے لیے انسان گر جاتا ہے۔

☆ شیشے کو توڑنے کے لیے ایک پتھر کافی ہوتا ہے۔

☆ دل کو توڑنے کے لیے ایک لفظ کافی ہوتا ہے۔

☆ محبت میں گزارنے کے لیے ایک لمحہ کافی ہوتا ہے۔

☆ زندگی گزارنے کے لیے ایک اچھا دوست کافی ہوتا ہے۔

☆ زندگی کا المیہ یہ نہیں کہ یہ بہت جلد ختم ہو جاتی ہے بلکہ زندگی کا اصل المیہ یہ ہے کہ ہم جتنا بہت دیر بعد دیکھتے ہیں۔

☆ ہمیشہ اپنی چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے بچنے کی کوشش کرو کیونکہ انسان بڑا زور سے نہیں پھروں سے ٹوکر کھاتا ہے۔

☆ اگر کسی اچھے انسان سے غلطی ہو جائے تو درگزر کرنا چاہیے کیونکہ موتی اگر کچھڑ میں بھی گر جائے تو بھی قیمتی ہی رہتا ہے۔

☆ برا وقت وہ شفاف آئینہ ہے جو بہت سارے چہرے واضح کر دیتا ہے اور اچھا وقت بادلوں کی طرح ہے جو سورج کی پیش کو بھی روک لیتا ہے۔

☆ خالی پیٹ، خالی جیب اور جھوٹا دوست انسان کو وہ سبق سکھاتا ہے جو بڑے سے بڑا استاد بھی نہیں سکھا سکتا۔

☆ اپنا فائدہ سوچنے مناسب کے ساتھ اچھا کرو کیونکہ جو لوگ پھول تقسیم کرتے ہیں ان کے ہاتھوں میں خوشبو ضرور رہ جاتی ہے۔

☆ حرم لہ۔ رضوان خونی کی بیوی اور گی ٹاؤن، کراچی

کہیں آپ کو اعصابی کمزوری تو نہیں؟

آجکل تو ہر انسان ذہنی تفکرات، ناقص غذاؤں بے صبری، بے احتیاطی اور بد پرہیزی کی وجہ سے اعصابی کمزوری کا شکار ہو چکا ہے۔ اعصابی طور پر کمزور لوگ تو ہمیشہ ندامت کی زندگی گزارتے ہیں۔ آپ کی اعصابی کمزوری ختم کرنے، بے پناہ اعصابی قوت دینے کیلئے دیسی طبی یونانی قدرتی دواؤں اور کورسز کا ہر بلز اعصابی کورس مقوی اعصاب کورس کے نام سے تیار کیا ہے۔ اپنے ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کر کے لطف کو دو بالا کرنے کیلئے اور اپنے خاص لحاظ کو خوشگوار بنانے کے لئے آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP مقوی اعصاب کورس منگوا لیں۔

المسلم دارالحکمت (جڑڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

کتنا پیار کرتی تھی۔ میں کئی دن سکتے کی سی کیفیت میں رہی۔ میرے اندر جیسے ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا تھا۔ میں اپنے آپ کو کوئی بھی تھی کہ ایک عرصے تک ایک بے نام خوف کی وجہ سے میں کیوں ان سے دور دور رہی۔ پھر کبھی بھی ایک بھولا بھرا فقرہ میرے کانوں میں گونجنے لگا۔ یہ فقرہ ایک مرتبہ بڑی چچی نیلہ نے ایک زہریلی سرکشی کی صورت میں بڑے چچا سے کہا تھا۔ وہ بولی تھیں۔ ”اے الرجی ورجی نہیں ہے۔ بس ڈرا سے کرتی ہے۔“ پھر شاید بڑی چچی نے یہ بھی کہا تھا۔ ”الرجی سے زیادہ خطرناک بیماری ہے اسے۔“

الرجی سے زیادہ خطرناک؟ کیا چچی سارہ کسی اور خطرناک بیماری میں بھی مبتلا تھیں؟ کوئی ایسی تکلیف جسے ان کے میکے والوں نے چھپایا تھا اور پھر وہ بھی چھپاتی رہی تھیں۔ وہ کیا تکلیف ہو سکتی تھی۔ یہ سوال میرے لیے ایک پہلی بن کر رہ گیا تھا۔

چچی سارہ کی موت کے غم نے کم و بیش تین ماہ تک مجھے گھیرے رکھا۔ پھر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ بڑے بڑے سنگین صدمے دھیرے دھیرے اپنی شدت کھونے لگتے ہیں۔ گردش روز و شب..... ہر وقت رستے دغلوں کو خشک کرنے لگتی ہے۔ میں بھی بڑھائی کی مصروفیت میں اس قدر گم ہوئی کہ کوئی مسئلہ نہ پہنچتا۔ ایک ایسی ہی حالت میں امتیازی باہروں سے پاس لیا اور پھر بی بی اے میں داخلہ لے لیا۔ یاسر کے ساتھ بھی تعلقات معمول پر تھے۔ ہم اکثر ایک دوسرے سے ملتے تھے اور جب نہیں ملتے تھے، تب بھی ایک دوسرے کے خیالوں میں گم رہتے تھے۔ سردیوں کی طویل راتیں، گرمیوں کی حسین شاہیں، ساون کی خوب صورت چڑیاں اور بہار کی چمکیلی خوشبودار تھیں، ہماری محبت کی گواہ تھیں۔ گراں پانچواں موسم غم کا بھی تو ہوتا ہے اور ضروری نہیں کہ یہ موسم خزاں میں ہی آئے۔ یہ موسم کسی بھی موسم میں انسان کو دبوچ سکتا ہے۔ مجھے اور یاسر کو اس موسم نے سردیوں کی نہایت خشک شاہوں میں دبوچا۔ یاسر کی والدہ پر فاق کا حملہ ہوا اور ان کا ایک بازو اور ناک بے کار ہو گئی۔ انہیں اسپتال میں داخل کر دیا گیا اور علاج پر اندھا دھند خرچ ہونے لگا۔ یاسر کا سائنڈ لاسٹ میسر بھی بی بی اے میں رہ گیا۔ پانچ چھ ہفتوں کے اندر اندر ان لوگوں کو اپنی ایک دکان اونٹے پونے پینچ پڑی۔ یاسر کی بڑی بہن کی شادی کی تیاری تھی، وہ تیاری بھی درمیان میں ہی ایک گئی۔ لڑکے والوں کو تاریخ دی جا چکی تھی۔ یاسر نے جیسے جیسے بہن کی ڈولی تو رخصت کر دی لیکن اس کے لیے اسے اپنی دوسری دکان بھی فروخت کرنا

ایسی باتیں ہم ہمیں مذاق میں کیا کرتے تھے، میں اب اتنی نازک مزاج بھی نہیں رہی تھی۔ چچن میں تھی۔ نزلہ زکام بھی اب کافی وقت کے بعد اثر انداز ہوتا تھا بلکہ اس حوالے سے میں تقریباً نارمل ہی ہو چکی تھی۔ عمومی صحت بھی اب پہلے سے کافی اچھی رہتی تھی۔

دھیرے دھیرے ہم دونوں کا تعلق ”محبت“ میں بدل گیا۔ امی کی اجازت سے میں بھی بھاری یاسر کی بانیگ پر بھی کالج سے واپس آ جاتی۔ یاسر کا ہمارے گھر آنا جانا رہتا تھا۔ وہ بہت خیال رکھنے والا اور ہر درد انسان تھا۔ امی، میری اور اس کی انیسیت سے آگاہ ہو چکی تھیں اور شاید ذہنی طور پر اس رشتے کے لیے تیار بھی تھیں لیکن وہ چاہتی تھیں کہ یاسر پہلے اپنے بیروں پر کھڑا ہو۔ یاسر کے والد فوت ہو چکے تھے اور یہ لوگ ابھی تک اندرون شہر سات آٹھ مرلے کے گھر میں رہتے تھے۔ یاسر سے بڑی دو بہنیں تھیں جن کی ابھی شادیاں ہونا باقی تھیں۔ یاسر اور اس کے گھر والوں کی گزربہشتیں دکاؤں کے کراہے وغیرہ سے دور رہی تھیں۔ میرے ابو اس رشتے پر زیادہ خوش نہیں تھے لیکن اتنی لپک انہوں نے اپنے اندر ضرور رکھی تھی کہ اگر یاسر کو کچھ جاب ملے گی اور اس نے اپنی مالی حالت بہتر کر لی تو وہ اس بارے میں خود کریں گے۔

انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک روز اس کالج سے گھر لوٹی تو مجھے ایک روح فرسا خبر ملی۔ یہ خبر ایک ایسی خوب تھی کہ بارے میں تھی جس کو میں نے کچھ عرصے سے تقریباً فراموش کر رکھا تھا۔ مجھے گھر والوں کی زبانی پتا چلا کہ چچی سارہ اپنے گھر کے پاس ہی ایک ٹریفک حادثے میں شدید زخمی ہو گئی ہیں اور انہیں بے ہوشی کی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا ہے۔ ان کی حالت نازک ہے۔ ہم لوگ بھاگ بھاگ شہر کے دوسرے کنارے پر واقع اس اسپتال میں پہنچے۔ وہ اس وقت آپریشن ٹیبل پر لیٹی تھیں۔ ان کے سر پر اور پڑھ کی ہڈی میں شدید چوٹیں آئی تھیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ وہ امید سے بھی نہیں۔ دو ڈھائی ماہ بعد بچہ کی پیدائش متوقع تھی۔ وہ گھر کی قریبی مارکیٹ سے سبزی لینے کے لیے پیدل ہی نکلی تھیں۔ ایک بھلی سڑک سے آنے والی تیز رفتار اسکوٹر دین نے انہیں ٹکرایا اور وہ دیوار سے ٹکرا کر بے ہوش ہو گئیں۔ وہ بڑی دلخراش شام تھی۔ سورج کے ساتھ ہی چچی سارہ کی زندگی کا سورج بھی ڈوب گیا۔ وہ آپریشن ٹیبل سے زندہ نہیں نکل پا گئیں۔ دو معصوم بچوں اور غمزدہ خاندان کو چھوڑ کر وہ قبرستان کی گہری تاریکیوں میں جا گئیں۔

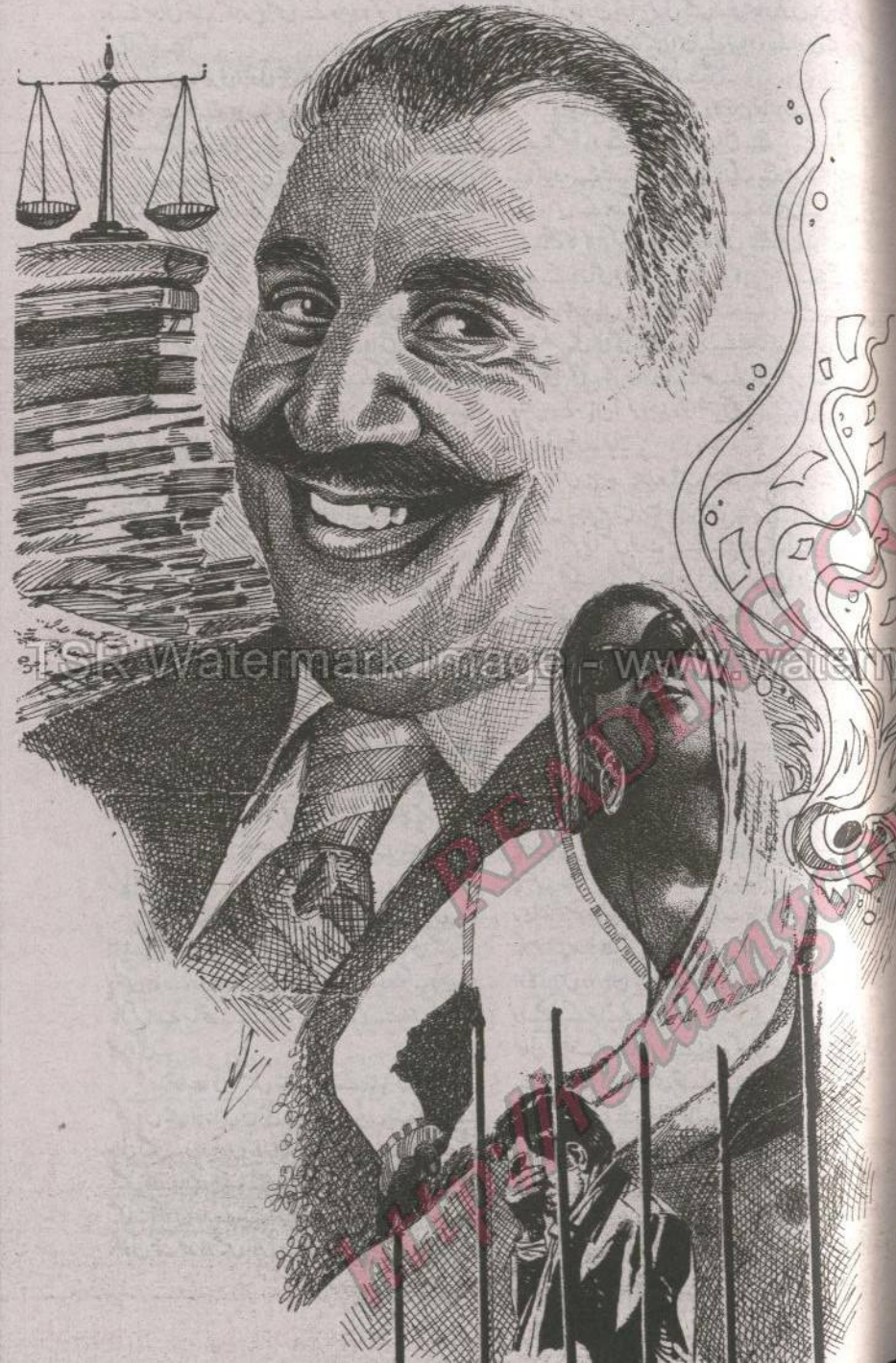
ان کی موت کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میں ان سے

چہرے پر شدید ناگواری کا رنگ بکھر گیا۔ پہلے تو اپنے غصے کو ضبط کرنے کی کوشش کرتی رہیں، پھر ان سے رہا نہیں گیا۔ مجھے ڈانٹنے ہوئے یوں۔ ”دو چار دن ہو گئے ہیں نا ڈاکٹر کے پاس گئے ہوئے۔ اب پھر بتا رہے ہو کہ بیٹھ جانا۔ اوپر سے امتحان سر پر لیں۔ ٹل بھی ہو جاؤ گی انشا اللہ۔“ وہ پاؤں پٹختی ہوئی پیچھے اتر گئیں۔ چچی کا رنگ فق ہو گیا۔ میں بھی امی اور چچی کی لڑائی کے خیال سے سہم گئی اور جلدی سے کتا میں سمیٹ کر پیچھا اڑائی۔

اس واقعے کے بعد چچی سارہ سے میرا ملنا جلنا مزید کم ہو گیا۔ پھر یوں ہوا کہ میرے ابو اور دونوں بچاؤں میں اختلافات بڑھ گئے۔ ایک ساتھ رہنا مشکل ہو گیا۔ چھوٹے چچا نے لاہور ہی میں ایک علیحدہ گھر لے لیا۔ ان کے چلے جانے کے بعد چچی سارہ سے میرا ملنا جلنا نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ بس بھی کھارون پر بات ہو جاتی یا پھر فنی کے کسی فٹنشن میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ ویسے بھی مجھ پر بڑھائی کا بوجھ بتدریج بڑھ گیا تھا۔ میٹرک کے امتحان قریب آتے جا رہے تھے اور ابودن رات مجھے محنت کرا رہے تھے۔ ابوند ہوتے تو بڑے بھائی جان مجھے لے کر بیٹھ جاتے اور میں رات گئے تک کتابوں میں غرق رہتی۔ گھر والے مجھے ڈاکٹر بتانا بہت پسندتے تھے۔ میری بھی خواہش تھی کہ ڈاکٹر ہوں۔ ابوند بن جاؤں تو پھر الرجی و دماغ وغیرہ کی فیلڈ میں اسپیشلائزیشن کروں لیکن انسان کی ہر خواہش تو پوری نہیں ہوتی۔ بس تین چار نمبروں کے فرق سے مجھے پری میڈیکل میں داخلہ نڈل سکا۔ دوسرا آپشن بی بی اے کا تھا۔ مجھے لاہور کے ایک بہترین کالج میں اسکالرشپ پر داخلہ مل گیا۔ میں نے بڑی جانفشانی سے اسٹیڈی شروع کر دی۔ میرا ہر نتیجہ بہترین رہا۔ کلاس میں اول پوزیشن جیسے میرے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔ اسی کالج میں میرا ایک فرسٹ کزن یا سر بھی پڑھ رہا تھا۔ وہ ”بی بی اے“ کے ففٹھ سمسٹر میں تھا۔ ہم دونوں خالہ زاد تھے۔ میں تو عمری ہی میں یاسر سے وابستگی محسوس کرتی تھی۔ جب کالج میں داخلے کے بعد یاسر سے زیادہ ملنا جلنا ہوا تو یہ وابستگی، انیسیت اور پھر کلاؤ میں بدلنا شروع ہو گئی۔ یاسر میرے مجھے ”جی جی“ نام تھا۔ ”چھپڑا تھا۔ وہ کہتا تھا۔“ تم چھوٹی موٹی کا پھول ہو۔ یہ پھول تازگی چھیننے والی ہر چیز کا اثر فوراً قبول کر لیتا ہے۔“

میں مسکرا کر کہتی۔ ”تو تم تازگی چھیننے والی چیز نہ بننا۔“

”دل پر کسی کا بس تو نہیں ہوتا۔ کیا پتا، جو وعدہ میں آج کروں، کل اس پر قائم نہ رہ سکوں۔“



کنہ مشق

سرز امجد بیگ

”م سے مثبت اور ”م سے منفی... عجب منطق ہے انسان کی ہمیشہ ملال میں مبتلا رہتا ہے اور مانتا نہیں کہ اس نے کچھ غلط بھی کر دیا ہے۔ یہی حال اس کا بھی تھا جس نے عقل مندی کا مظاہرہ کچھ مندی عقل سے کر ڈالا... مثبت رویہ چھوڑا اور منافقت کا رستہ اختیار کیا پھر نتیجہ تو یہی نکلتا تھا جو نکلا... لیکن بیگ صاحب کی تدبیروں نے بالآخر مجرم کو گھیرے میں لے ہی لیا۔

اور پہناوے سے وہ غریب نظر آتی تھی۔ میرا یہ اندازہ بعد ازاں درست ثابت ہوا۔

میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ جب وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ چکی تو میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”جی فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”وکیل صاحب! میں بہت پریشان ہوں.....“ وہ اضطرابی لہجے میں بولی۔

”وہ تو آپ کی حالت ہی سے نظر آ رہا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”آپ اپنی پریشانی کی وضاحت کریں تاکہ میں یہ اندازہ لگا سکوں کہ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

”وحیدہ کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔“ اس نے دہکی لہجے میں بتایا۔

”یہ وحیدہ کون ہے؟“ میں نے کاغذ قلم سنبھالنے

موسم سرما کی ایک خشک اور اداس شام میں اپنے آفس میں بیٹھا حسب معمول کلائنٹس کو ڈیل کر رہا تھا کہ ایک پریشان حال عورت اپنا دکھڑا روئے میرے پاس آگئی۔ میں نے سلی ٹائی اس عورت کو اپنے چیمبر میں بلا لیا۔

اس روز میرے آفس میں کلائنٹس کی زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ ایک جاتا تو دوسرا آ جاتا تھا۔ وزینگ لابی میں بھی وہ رونق نہیں تھی جو وہاں کا خاصہ تھی۔ نصف درجن سے زیادہ افراد ہمہ وقت اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔ اس مندی میں کچھ تو موسم کا اثر تھا اور کچھ ویسے بھی بعض دن ایسے ہوتے ہیں کہ کلائنٹس کی عدم موجودگی کے باعث اچھی خاصی یوریت کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا جیسی سلی کو انتظار کی کوفت نہیں اٹھاتا پڑی تھی اور فوراً سے چوشر وہ میرے چیمبر میں پہنچ گئی تھی۔

سلی کی عمر پچاس سے تھوڑی تھی۔ وہ متناسب بدن کی مالک ایک عام سی شکل و صورت والی عورت تھی۔ اپنے طبعی

ہوئے سوال کیا۔ ”اور پولیس نے وحیدہ کو کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟“

باقی کا آدھا دن آرام کرتی تھیں۔ مزا جاؤںوں ماں بیٹیاں
سادہ اور قناعت پسند تھیں اس لیے زیادہ کے لالچ میں نہیں

”ہاں..... یہ قانونی مجبوری ہے۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”جب پولیس کسی ملزم کو عدالت میں

جواب دینا۔“

”جی اچھا.....!“ اس کے چہرے پر اطمینان کی

اس کے چہرے اور آنکھوں میں تذبذب نمودار ہوا،
 ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ”وسیل صاحب! آپ کی فیس
 بہت زیادہ نہیں ہے۔۔۔۔۔؟“
 ”بعض لوگوں کو میری فیس بہت زیادہ محسوس ہوتی
 ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن
 بہت سے کیلون کی تو مجھ سے دگنی تکتی نہیں ہیں۔۔۔۔۔“
 ”مجھے دوسرے کیلون کا تو پتا نہیں جناب!“ وہ
 سادگی سے بولی۔ ”میں تو آپ کے پاس آئی ہوں۔ آپ
 بھلے آدمی ہیں۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ ہم بہت غریب
 لوگ ہیں۔“
 ”آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟“ میں نے اسی سے
 پوچھ لیا۔
 ”آپ یا تو اپنی فیس میں کچھ رعایت کریں
 اور یا۔۔۔۔۔!“

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر تذبذب انداز میں مجھے نکتے
 لگی تو میں نے پوچھ لیا۔ ”اور یا۔۔۔۔۔ کیا؟“
 ”یا یہ کہ۔۔۔۔۔!“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔
 ”آدمی فیس ابھی لے لیں، آدمی وحیدہ کی رہائی کے بعد۔“
 ”میں اس قسم کے معاملات نہیں کیا کرتا۔“ میں نے
 صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”البتہ، میں میں
 رعایت والی بات قابل عمل ہے۔“
 ”ٹھیک ہے جناب! یہ بھی آپ کی مہربانی ہے۔“ وہ
 احسان بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”جو بھی زیادہ
 سے زیادہ کم کر سکتے ہیں، وہ کر دیں۔“

میں سال میں ایک آدھ چربی بھی بچا لیا کرتا
 تھا جس میں، میں ایک پیسا بھی نہیں کماتا تھا۔ اس عمل سے
 میں اپنے پیسے کا صدقہ نکال رہا تھا لیکن یہ سال کا آغاز تھا
 لہذا میں سالی کے پہلے ہی مہینے میں اس قسم کا کوئی کام نہیں
 کرنا چاہتا تھا اور سلی کو بالکل مایوس کر دینا بھی مجھے اچھا نہیں
 لگ رہا تھا چنانچہ میں نے درمیانی راہ کا انتخاب اور استعمال
 کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس راستے کے استعمال سے مجھے کوئی
 نقصان نہیں تھا البتہ سلی کو اس سے حسب مشافکہ ضرورت پہنچ
 سکتا تھا۔

”آپ کی خاطر میں اپنی فیس میں پچاس فیصد کی کر سکتا
 ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مگر میں فیس
 ایڈوانس ہی میں لوں گا۔ ادھار کی کوئی گنجائش نہیں۔“
 وہ قدرے الجھن زدہ انداز میں بولی۔ ”وسیل
 صاحب! یہ فیصد، وعدہ کا حساب میری سمجھ میں نہیں آتا۔“

آپ سیدھی سیدھی رعایتی فیس بتائیں۔۔۔۔۔؟“
 ”پچاس فیصد کا مطلب ہے، آدمی!“ میں نے
 وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے آپ کو اپنی جو فیس
 بتائی ہے اس کو آدھا کر سکتا ہوں۔ بس، اس سے زیادہ
 رعایت ممکن نہیں۔“
 ”جناب۔۔۔۔۔!“ وہ خوشی اور حیرت کے ملے جلے
 تاثرات کے ساتھ بولی۔ ”آدمی فیس کا مطلب تو اتنی رقم
 ہے جو میں آپ کو ایڈوانس ادا کر سکتی ہوں۔ جیسا کہ میں کہ
 چکی ہوں، آدمی فیس آپ ابھی لے لیں۔۔۔۔۔ ہیں؟“
 ”جی ہاں، اس کا بالکل سہی مطلب ہے۔“ میں نے
 زبردستی مسکراتے ہوئے سران بھرے لہجے میں کہا۔ اس کی
 آنکھوں میں مسرت کے چمک چمک اٹھے۔ اس نے مجھے
 ڈھیروں دعاہیں دیں اور میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد
 رخصت ہو گئی۔

”دعا“ بڑی عجیب و غریب چیز ہے۔ اس کی
 خرید و فروخت ممکن نہیں۔ اسے ایک مقام سے دوسرے
 مقام تک پہنچانے کے لیے تو کرایہ خرچ ہوتا ہے اور نہ ہی
 اس پر مختلف ٹیکس چسپان کرنے کی صورت پیش آتی ہے۔ یہ
 ایک ”تیر“ کا جذبہ ہے جو ایک انسان، دوسرے انسان کے
 لیے اسے دل میں رکھتا ہے۔ دوسروں کی دعاہیں بڑے ہمت
 چاہیے۔ چاہے، کب تک اس کی دعا آپ کو لوگ باندھے
 دعاؤں کی قبولیت کا اختیار جس ذات پاک کے پاس ہے وہ
 ہماری شرگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور بے شک آدھ ہر
 شے پر قادر ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ کو ملزمہ وحیدہ اور
 متقول اشتیاق بیگ کے بارے میں مختصر آہٹا چلوں جس
 سے کیس کے پس منظر پر بھی روشنی پڑے گی اور آگے چل کر
 اس کیس کی ساعت کے دوران میں آپ کا ذہن کی الجھن کا
 شکار بھی نہیں ہوگا۔ ایک بات کی وضاحت بھی کرتا چلوں کہ
 ان میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں پتا چلی تھیں لیکن
 واقعات کی ترتیب کا خیال رکھتے ہوئے یہاں بیان کر رہا
 ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بعض باتیں آپ سے چھپا
 بھی لی ہیں جن کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں
 مناسب سنسنی خیز مقامات پر کیا جائے گا تاکہ آپ کی تعریف
 کے لطف کو دو بالا کیا جاسکے۔

☆☆☆

جیسا کہ پیچھے بتایا جا چکا ہے، ملزمہ وحیدہ اور اس کی
 ماں سلی کا تعلق معاشرے کے نچلے طبقے سے تھا۔ وہ لوگوں

کچھ نہ مسکن

کے گھروں میں صفائی ستھرائی کا کام کر کے اپنا گزارہ کرتی
 تھیں۔ وحیدہ کے باپ عبدالغفور کا بہت پہلے انتقال ہو گیا
 تھا۔ وہ ایک فیکٹری میں مزدوری۔۔۔ کرتا تھا۔ ان ماں بیٹی کی
 رہائش بفرزوں کے عقی علاقے میں واقع ایک گھوٹ نہایت
 میں تھی۔
 سلی کے پاس تین گھروں کا کام تھا جبکہ ملزمہ وحیدہ
 صرف دو گھروں میں جھاڑو برتن اور صفائی دھلائی کیا کرتی
 تھی جن میں ایک گھر تو متقول اشتیاق بیگ کا تھا اور دوسرا
 فیاض بیگ کا۔ پہلے وہ متقول کے گھر کا کام نہاتی تھی۔ اس
 کے بعد فیاض بیگ کے بیٹے کا رخ کرتی تھی۔ وقوعہ کے روز بھی
 اس نے اپنا معمول جاری رکھتے ہوئے یہی کیا تھا لیکن جب
 وہ کام نہانے کے بعد اپنے گھر پہنچی تو تھوڑی ہی دیر کے بعد
 پولیس نے اسے اشتیاق بیگ کے قتل کے الزام میں گرفتار
 کر لیا تھا۔

متقول کی فیملی نہایت ہی مختصر تھی۔ یعنی صرف دو افراد
 متقول اشتیاق بیگ اور اس کی بیوی نرس۔ یہ لوگ نارنج
 باغ آباد میں واقع دو سو گز کے ایک پتھلے میں رہتے تھے۔
 متقول ایک صنعت کار تھا۔ شہر کے انڈسٹریل ایریا میں اس
 کی لیڈر ٹیکنیکس کی ایک چھوٹی سی فیکٹری تھی جہاں سے
 وہ دن ملک اور رات ملک مال بٹاتا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا
 بہت اچھے انداز میں چل رہا تھا کہ اچانک دل نے اس کے
 ساتھ دھوکا کر دیا۔ ایک رات اسے ہارٹ ایک ہوا اور وہ
 بڑا ہو کر رہ گیا۔ دل کے دورے سے اس کی جان تو بچ گئی
 مگر ڈاکٹر نے کم از کم چھ ماہ تک بیدار بست بتایا تھا اور
 اس کی ”بیدار بست“ کے چار ماہ ہی گزرے تھے کہ اسے
 کئی شقی القاب شخص نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ وہ
 بے چارہ بے بسی کی موت مارا گیا تھا۔

نرس، متقول کی دوسری بیوی تھی۔ متقول کی پہلی
 بیوی رخسانہ بیگم کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ پہلی
 بیوی۔۔۔۔۔ سے متقول کی ایک اولاد عادل نامی ایک پینا تھا جو
 اپنے ماموں کے پاس رہتا تھا۔ متقول کی دوسری شادی نے
 اس کے بیٹے کے درمیان خاصی شدید اور سنگین اختلافی فضا قائم
 کر دی کی لہذا وہ باپ کو چھوڑ کر اپنے ماموں کے گھر میں
 جا رہا تھا۔ ویسے بھی متقول کا ساری زندگی اپنی سسرال یعنی
 عادل کی تحیال کے ساتھ جھگڑا رہا تھا اور رخسانہ کے انتقال
 کے بعد تو یہ کشیدگی اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ عادل کا رخسانہ
 شادی سے پہلے ہی متقول کی جانب تھا لہذا متقول کی دوسری
 شادی کے بعد گھر میں کچھ اس قسم کے تنازعات اٹھے کہ

عادل اپنا سامان سمیٹ کر ماموں عثمان کے گھر میں آ گیا۔
 جب تک وہ متقول کے گھر میں تھا (متقول کی دوسری شادی
 کے بعد) اس کا صبح شام کسی نہ کسی بات پر اپنی سوچتی ماں
 نرس کے ساتھ جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ
 ان اختلافات کے سلسلے میں متقول اس کے بجائے اپنی بیوی
 نرس کا ساتھ دیتا ہے تو اس کا دل بچھ کر رہ گیا۔ رفتہ رفتہ یہ
 رجس بڑھتی گئی اور بالآخر سال بھر پہلے وہ اپنے ماموں کے
 پاس آ گیا تھا۔ اس کا ماموں عثمان ٹیکنیکل انڈسٹری میں
 انجینئر تھا۔ اس کی رہائش گلشن اقبال میں تھی۔ عثمان کی اپنے
 بہنوئی متقول اشتیاق بیگ سے کبھی نہیں بنی تھی۔

متقول کا بھگلا دو بیڈروم، ایک ٹی وی لاؤنج، ایک
 ڈرائنگ روم اور سرسبز لان پر مشتمل تھا۔ یہ ایک ہوادار اور
 سکون بخش رہائش گاہ تھی۔ ملزمہ وحیدہ روزانہ نو بجے صبح کام
 کے لیے وہاں پہنچتی اور گیارہ بجے تک وہاں رہتی تھی۔ اس
 دوران میں متقول کی بیوی نرس بھی گھر میں موجود ہوتی
 تھی۔ اگر اسے کسی ضروری کام سے باہر جانا ہوتا تو وہ انہی
 اوقات میں نکلا کرتی تھی اور وحیدہ کا کام ختم ہونے سے پہلے
 واپس آ جایا کرتی تھی کیونکہ اسے اپنے بیمار شوہر متقول
 اشتیاق بیگ کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی۔

ملزمہ وحیدہ کے علاوہ متقول کے دو اور صاحبہ متقول
 کام کرنے متقول کے بیٹے پر تھیں تھی۔ لگ بھگ ساڑھے نو
 بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ٹیلی فون سیٹ ٹی وی لاؤنج میں
 ایک اسٹینڈ پر رکھا تھا۔ نرس نے فون اٹینڈ کیا اور پھر مرہمہ
 کے پاس کچن میں چلی آئی۔ وحیدہ اس وقت کچن میں برتن
 دھو رہی تھی۔

”ملزمہ وحیدہ!“ اس نے ملزمہ کو مخاطب کرتے ہوئے
 کہا۔ ”میں تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہی ہوں۔ تم بیگ
 صاحب کا خیال رکھنا۔“

”ٹھیک ہے باجی۔“ ملزمہ نے تائیدی انداز میں کہا
 پھر پوچھا۔ ”آپ کب تک واپس آ جائیں گی؟“

”تمہاری چھٹی کے ٹائم سے پہلے ہی آ جاؤں گی۔“
 وہ سرسری انداز میں بولی۔ ”تمہارے صاحب کی ایک دوا
 لانا ہے۔ ڈاکٹر نے ایک ایسی گولی لکھی ہے جو بہت کم
 اسٹورز پر ملتی ہے۔ ابھی ایک میڈیکل اسٹور والے ہی کا
 فون تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ ابھی وہ فیملش موجود ہیں۔ میں
 نے سوچا، ابھی لے آؤں۔ کیا پتا، پھر ملیں نہ ملیں۔“ لگائی
 توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے
 ہوئے کہا۔

”تمہارے صاحب نے ناشا کر لیا ہے اور میں نے انہیں صبح والی دوا بھی کھلا دی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں آرام سے سو رہے ہیں۔ ان کی دواؤں میں ایک سکون کی گولی بھی ہے۔ وہ تمہیں کسی کام کے لیے نہیں کہیں گے۔ مجھے یقین ہے، میری دوا پس تک وہ یونہی بے خبر سوتے رہیں گے۔“

”ٹھیک ہے باجی! آپ نے فکر ہو کر جا میں۔“

وحیدہ نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ”اگر صاحب جی جاگ بھی گئے تو میں سنبھال لوں گی۔“

اس کے بعد نرس پنکے سے روانہ ہو گئی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کہ نرس، وحیدہ کو گھر میں چھوڑ کر باہر نکلے۔ اکثر و بیشتر وہ ایسا کرتی رہتی تھی لہذا وقوع کے روز وحیدہ نے نرس کے باہر جانے کو کوئی خاص اہمیت نہ دی اور حسب معمول اپنے کام میں جھی رہی۔

وحیدہ کا خیال تھا کہ اس کی باجی نرس دس بجے تک واپس آجائے گی لیکن جب وقت دس سے آگے بڑھنے لگا اور نرس کی شکل نظر نہ آئی تو وحیدہ کو تشویش ہونے لگی۔ جوں جوں اس کی چھٹی کا وقت قریب آ رہا تھا، اس کی فکر مندی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے دو تین بار مقتول کے پتھر میں دس بجے تک گھبراہٹ کر دیکھ لیا۔ مقتول اشتیاق بیگ گہری غیور سو رہا تھا۔

دس کے بعد، سوا دس اور پھر ساڑھے دس بج گئے۔ وحیدہ سوچنے لگی، پتا نہیں باجی کہاں رہ گئی ہیں؟ کون سے میڈیکل اسٹور سے وہ صاحب کی دوائی لے چلی گئی ہیں؟

وحیدہ مقتول کے گھر کا کام ختم کرنے کے بعد فیاض شیخ کے پتھر پر جاتی تھی جہاں اسے گیارہ سے ایک بجے تک کام کرنا ہوتا تھا۔ فیاض شیخ کا بنگلا، مقتول کے پتھر سے پانچ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ اگر اسے وہاں پہنچنے میں بھی دیر ہو جاتی تو... شیخ صاحب کی بیوی بہت شور مچاتی تھی۔ وہ اسکی غصہ و عورت تھی کہ شیخ صاحب بھی عالم طیش میں اس کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ وحیدہ، امینہ کے غصے کا سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی اور دل میں یہ دعا بھی کر رہی تھی کہ گیارہ سے پہلے پیلز نرس واپس لوٹ آئے تاکہ اسے امینہ کے غیظ و غضب کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ سز امینہ بڑی دھانسو شرم کی عورت تھی۔

کم و بیش پونے گیارہ بجے فون کی گھنٹی بجی تو وحیدہ نے ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف اس کی باجی نرس تھی۔ ”ہاں وحیدہ!“ اس نے پوچھا۔ ”سب ٹھیک ہے نا...؟“

”جی، سب ٹھیک ہے۔“ اس نے جلدی سے بتایا۔

”میں نے سارا کام ختم کر لیا ہے اور صاحب جی ابھی تک نہ رہے ہیں۔“ لچائی توقف کر کے اس نے پوچھ لیا۔ ”باجی! آپ کب تک آئیں گی؟“

”نرس، میں دس پندرہ منٹ میں پہنچنے ہی والی ہوں۔“ نرس نے جواب دیا۔ اور اگر مجھے ایک دو منٹ اور نیچے ہو جائیں تو تم چلی جانا۔“

”بیگ صاحب کو اکیلے چھوڑ کر...؟“ وحیدہ نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”میں گھر سے زیادہ دور نہیں ہوں۔“ نرس نے غصہ بھرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”اور تمہارے صاحب تو ایسے بھی آرام سے سو رہے ہیں۔ تم جن گیت کو بخیر کرنا پسند کرتے ہو چلی جانا۔ تم تھوڑی دیر میں پہنچ رہی ہو۔ یہ میں اس لیے بھی کہہ رہی ہوں کہ جب تمہیں دوسرے گھر پہنچنے میں ہو جاتی ہے تو شیخ صاحب کی بیوی تم پر جتنی چلاتی ہے۔“

وحیدہ نے نرس کو مسز شیخ کے غصے کے بہت سے نئے سنار رکھے تھے۔ نرس نے جب اس کی دھتی ہوئی رنگ بگنی دیکھی تو وہ غمگینیت بھرے لہجے میں بولی۔

”جی باجی... یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں گیارہ بجے تک آپ کے آنے کا انتظار کروں گی۔ اس کے بعد پھر ایک گیت بگنی دیکھ کر شیخ صاحب کے گھر چلی جاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے...!“ یہ کہتے ہوئے نرس نے نکلے فونک رابطہ منقطع کر دیا۔

وحیدہ نے مجھے بتایا کہ اس نے احتیاطاً گیارہ بجے تک نرس کی واپسی کا انتظار کیا تھا اور پھر باجی کی حسب ہدایت دس بجے کے بیرونی گیت کو بند کر کے دوسرے پتھر پر کام کرنے چلی گئی تھی۔ گیت کو اس نے باہر سے کٹدی لگا دی تھی تاکہ وہ وغیرہ کے دباؤ کی وجہ سے وہ خود بخود کھل نہ جائے۔

وحیدہ نے وقوع کے روز حسب معمول شیخ صاحب کے گھر کا کام ختم کیا پھر وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔ اس کی ماں سبکی اس سے پہلے گھر پہنچ چکی تھی اور کھانا وغیرہ تیار کر رہی تھی۔ وہ دونوں جب دوپہر کا کھانا کھانے میں مصروف تھیں تو ایک سب ان پینچر دوکانیکیل کے ساتھ ان کے گھر پہنچ گیا پھر وحیدہ کو اشتیاق بیگ کے قتل کے انزال میں گرفتار کر لیا گیا۔

وحیدہ نے جب مقتول کے گھر کو چھوڑا تو اشتیاق بیگ زندہ سلامت، گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ اس کے قتل کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ وحیدہ کو جو کچھ بھی معلوم

اس نے بڑی تفصیل کے ساتھ مجھے بتا دیا تھا۔ باقی کی معلومات مجھے خود حاصل کرنا تھیں اور اس مقصد کے حصول کے لیے میں نے اپنے تمام گھوڑے میدان میں ڈال دیے تھے اور مجھے اپنی محنت سے اور خدا کے شکر سے قوی امید تھی کہ کامیابی میرے قدم چومے گی۔

☆☆☆

ریمائڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے عدالت میں چالان پیش کر دیا۔ میں نے جب تھانے جا کر حالات میں بند وحیدہ سے ملاقات کی تھی تو اسے بعض ایسے گرمجہی بتائے تھے جن کا بروقت استعمال کر کے وہ خود کو پولیس کی معروف تفتیشی ”مہربانیوں“ سے محفوظ رکھ سکتی تھی اور اس نے یہ بین میری ہدایت پر عمل کیا تھا۔ اس معاملے میں وہ خاصی عقل مند ثابت ہوئی تھی۔

عدالتی کارروائی شروع ہونے سے پہلے میں نے وحیدہ کے وکیل کی حیثیت سے اپنا وکالت نامہ اور طرہ کی درخواست ضمانت دائر کر دی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد جج اپنی کرسی پر آکر بیٹھا تو عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنی موٹل کے حق میں بولنا شروع کیا۔ ”جناب عالی! طرہ وحیدہ ایک معصوم اور بے گناہ لڑکی ہے۔ اس کی گہری سانسوں کے تحت اس پر جاری قتل کی واردات کے ساتھ ہی کیا جا رہا ہے۔ میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ میری موٹل کی درخواست ضمانت کو منظور کر تے ہوئے اس کی رہائی کے احکامات صادر کیے جائیں۔“

”پور آرزو!“ وکیل اشتیاق نے ضمانت کے خلاف دلائل دیتے ہوئے کہا۔ ”طرہ ایسی معصوم، بے گناہ اور بے گناہ تھی جسے جیسا میرے فاضل دوست بیان کرنے کی خوش کر رہے ہیں۔ اس لڑکی نے ایک سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے لہذا اس کی ضمانت منظور کرنا انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگا۔“

”سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے...“ میں نے وکیل اشتیاق کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے آبی کے الفاظ دہرائے پھر کڑے لہجے میں پوچھا۔ ”وکیل صاحب! آپ کس سنگین جرم کی بات کر رہے ہیں؟“

”کیا مطلب؟“ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”آپ کوئیں پتا، کون سا سنگین جرم...“

”چند لمحات کے لیے فرض کریں، مجھے کچھ بھی معلوم نہیں...“ میں نے اپنے لہجے کی تنیدگی کو برقرار رکھتے

ہوئے کہا۔ ”آپ بتا دیں گے تو بڑی مہربانی ہوگی۔“

”میں ایسی کوئی مہربانی کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ وہ رکھائی سے بولا۔ ”اور دوسری بات یہ کہ عدالتی معاملات میں ”فرض کرنے“ سے کام نہیں چلتا۔ جب آپ کو یہی نہیں پتا کہ عدالت میں کس کیس کی ساعت ہو رہی ہے تو پھر آپ اپنی موٹل کی وکالت کیسے کریں گے؟“

”آپ میرا کام مجھ پر چھوڑ دیں میرے محترم!“ میں سلگنے والے انداز میں کہا۔ ”صرف اتنا بتا دیں کہ میری موٹل نے کون سے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔“

میرے سوالات نے ابتدائی میں وکیل اشتیاق کو ذہنی طور پر الجھا کر رکھ دیا تھا۔ وہ برہمی سے بولا۔ ”میں ”اشتیاق بیگ مرڈر کیس“ کا ذکر کر رہا ہوں جس کی اس وقت عدالت میں کارروائی ہو رہی ہے۔“

”اوہ...!“ میں نے چونکے کی اداکاری کی پھر گہری تنیدگی سے پوچھا۔ ”تو آپ کا خیال ہے، اشتیاق بیگ کو میری موٹل وحیدہ نے قتل کیا ہے؟“

”تو اور کیا...!“ وہ بے ساختہ بولا۔ ”اسی لیے تو وہ عدالت میں حاضر ہے۔“

”عدالت میں تو آپ اور میں بھی حاضر ہیں میرے فاضل دوست...“ میں نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔ ”تو کیا یہ سچ ہے کہ ہم نے بھی اشتیاق بیگ کے قتل میں حصہ لیا ہے؟“

”آپ خواہنا وہ بات کو ابھانے کی کوشش کر رہے ہیں!“ وہ اکتاہٹ آمیز انداز میں بولا۔

”بالکل نہیں...!“ میں نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں تو اچھے ہوئے معاملے کو سدھار کرنے کی تگ و دو میں لگا ہوا ہوں اور اس سلسلے میں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔“

”میرے تعاون کی ضرورت ہے... کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”آپ نے میری موٹل کے حوالے سے کہا ہے کہ... اس لڑکی نے جو سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔“ میں نے نہایت ہی تنیدگی سے کہا۔ ”اور ابھی آپ نے اضافہ کیا ہے کہ اسی لیے وہ اشتیاق بیگ کے قاتل کی حیثیت سے اس وقت عدالت میں حاضر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ میری موٹل کے جرم کے بارے میں بہت پر یقین ہیں؟“

”جی ہاں...“ وہ خاصی کراری آواز میں بولا۔

”میں پر یقین ہوں۔“

اس نے میرے بچھائے ہوئے جال میں پہلا قدم

MEDICAM

Bleach Cream

Whiteness in 14 days

*No Side Effects



زکے ہر نظر.... آپ پر!

ضمانت نامہ کی حد تک مشکل ہوتی ہے۔ مجھے عدالت کے اس فیصلے پر کوئی اچھا ہوا تھا اور نہ ہی مایوسی۔ میں مطمئن تھا کہ میں نے اپنے حصے کا کام نہایت ہی خوبی سے کر دیا تھا۔ کیس کی باقاعدہ سماعت پر مجھے اپنے جوہر دکھانا تھے۔ آگے بڑھنے سے قبل میں آپ کو پوسٹ مارٹم رپورٹ اور پولیس کے چالان، یعنی استغاثہ کے بارے میں مختصر آہٹا چلوں۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول اشتیاق بیگ کی موت میں جنوری کی دوپہر دس اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ آلٹرنل ایک تیز دھار گوشت کاٹنے والی چھری تھی جس کی مدد سے مقتول کی شہرہ گ کاٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ مذکورہ خطرناک چھری سے مقتول کی گردن پر اتنا بڑا کٹ لگا گیا تھا کہ اس کے زندہ رہنے کے امکانات صفر کے برابر ہو کر رہ گئے تھے۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ ہی میڈیکل ایجنس کی رپورٹ بھی فائل میں لگی ہوئی تھی۔ اس رپورٹ میں بڑے واضح الفاظ میں لکھا تھا کہ یہ وقت قتل مقتول کی خواب آور دوا کے زیر اثر تھا اور حالت بے ہوشی یا حالت نیند میں اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ لیبارٹری ٹیسٹ سے یہ بھی ثابت ہوا تھا کہ مقتول کے جسم میں تو بارہوا اور دوا موجود تھے۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ یہ دوا اور جو ٹرس نے ناشتے کے بعد اپنے شوہر مقتول اشتیاق بیگ کو کھلائی تھی۔

استغاثہ نے میری موکل کے خلاف خاصا مشروط کیس تیار کیا تھا۔ اشتیاق بیگ کے قتل کے علاوہ بھی اس پر مزید الزامات ڈالے گئے تھے۔ نمبر ایک دس ہزار نقدی نمبر دو لک بجھ جالیں ہزار کے طلائی زیورات کی چوری۔ یہ دونوں چیزیں مقتول کی بیوی ٹرس کی الماری سے غائب ہوئی تھیں۔ ٹرس کا دعویٰ تھا کہ جب وہ وقوعہ کے روز گھر سے نکلی تو یہ نقدی اور زیورات اس کی الماری میں موجود تھیں لیکن جب دن میں وہ واپس آئی تو اس کی الماری کے پٹ کھلے ہوئے تھے اور یہ دونوں اشیاء اپنی جگہ موجود نہیں تھیں۔ اس نے اپنی الماری کا کونا کونا چھان مارا مگر اسے کہیں بھی نقدی یا زیورات دکھائی نہ دیے۔ الماری کے کھلے ہوئے پٹ دیکھ کر اسے جس گریز کا احساس ہوا تھا، وہ ایک ٹھوس حقیقت تھی۔

قصہ مختصر، میری موکل وحیدہ کو نقدی و طلائی زیورات چرانے اور اپنے صاحب اشتیاق بیگ کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کر کے حوالہ عدالت کر دیا گیا تھا۔

رکھ دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”آپ کے یقین سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے میری موکل کو خود اپنی آنکھوں سے یہ جرم کرتے ہوئے دیکھا ہے.....؟“

”نہیں.....“ وہ بڑبڑایا۔ ”میں تو کوئی بات نہیں۔“

”پھر کسی بات ہے میرے فاضل دوست؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں وہی تو جانتا چاہتا ہوں۔“

”م..... میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ..... میں نے مزید وحیدہ کو یہ قتل کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں بھلا اس واقعے کو کیسے دیکھ سکتا تھا۔“

”کوئی اور یعنی شاہد ہے اس واردات کا؟“

”کوئی نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”تو پھر.....“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو میری موکل کے بارے میں زبان کو زحمت دیتے وقت محتاط الفاظ کا استعمال کرنا چاہیے۔ جب تک عدالت میں، اس پر عائد جرم ثابت نہیں ہو جاتا، اس کی حیثیت ایک طرز میں ہی ہے لہذا یہ کہہ دینا کہ..... وہ ایک مجرم ہے، اس نے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے..... سراسر میری وضاحت نے ویل استغاثہ کو قدرے شرمندہ سا کر دیا تھا۔ وہ کھسپا ہٹ آمیز انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں نے روئے سخن بیچ کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! میری موکل گھروں میں کام کرنے والی ایک بے چاری لڑکی ہے۔ میں آگے چل کر ثابت کر دوں گا کہ قتل کی اس واردات سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں لہذا معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ اس کی ضمانت کو منظور کیا جائے۔“

ویل استغاثہ ایک بار پھر ضمانت رکوانے کے لیے بڑھ چڑھ کر بولنے لگا۔ ”جناب عالی! واقعاتی شہادتیں سراسر طرز کے خلاف جاتی ہیں۔ خاص طور پر آلٹرنل پر طرز کے جو فکٹر پرنس لے ہیں، انہیں کسی بھی قیمت پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“

مزید پندرہ بیس منٹ تک وحیدہ کی ضمانت کے حق میں اور ضمانت کے خلاف دلائل کا سلسلہ جاری رہا پھر عدالت نے میری موکل کی درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے وحیدہ کو جیوڈیشل ریہائڈ..... پرنسٹن بھیج دیا۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا گیا ہے کہ قتل کے طرز کی

اس پیشی پر کیس کی باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا۔ جج کرسی انصاف پر ابراجان ہوا تو عدالت میں سنا سنا چھا گیا۔ جج نے کارروائی شروع کرتے ہوئے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے سخت جرم سے انکار کر دیا۔ یہ بات پہلے بھی کئی بار بتائی جا چکی ہے کہ پولیس کسٹڈی میں دے دیے گئے ملزم کے بیان یعنی اقبال جرم کو عدالت میں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ پولیس والوں کے تفتیشی ہتھکنڈوں سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے بعض اوقات ملزم اقرار جرم کر لیتا ہے اور عدالت میں جا کر اس سے منحرف ہو جاتا ہے۔ یہ نکتہ چونکہ عدالت کے علم میں بھی ہوتا ہے اسی لیے وہ پولیس کی جھوٹ میں ملزم کے کسی بھی بیان کو تنبیہ کی سے نہیں لیتی۔

اس کے بعد ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔ ملزم وحیدہ نے میری ہدایت کے عین مطابق نہایت ہی نپے تلے الفاظ میں مختصر سا بیان ریکارڈ کرا دیا۔ یہ وہی بیان تھا جو وہ اس سے پہلے پولیس کو دے چکی تھی۔

استغاثہ کی جانب سے کل پانچ گواہوں کی فہرست دائر کی گئی تھی لیکن میں یہاں صرف انہی گواہوں کا ذکر کروں گا جن کے بیانات میں کوئی خاص بات ہوگی۔ اس سے پہلے کہ استغاثہ کے گواہوں کے بیانات کا خلاصہ شروع ہوتا ہے میں نے جج سے درخواست کی۔ ”جناب عالی! میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے چندا ہم سوال کرنا چاہتا ہوں۔“

جج نے فوراً مجھے اجازت دے دی۔ ”پریشن گرانٹ!“

تفتیشی افسر یا انکوائری آفیسر کی حیثیت کسی بھی کیس میں استغاثہ کے گواہ کی سی ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ موجودہ کیس کے آئی او (انکوائری آفیسر) کا نام صفدر علی تھا۔ رینک کے اعتبار سے وہ ایک سب انسپٹر تھا۔ صفدر علی پست قامت اور بھرے بھرے جسم کا مالک تھا۔ اس کے گال بھوے ہوئے تھے، آنکھوں سے شرارت چمکتی تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر ذہن میں پہلا تاثر یہی جاگتا تھا کہ وہ بڑے سارے کا کوئی شریر بچہ ہے۔

جج کے حکم پر آئی او صفدر علی ونیس باکس میں آکر کھڑا ہو گیا۔ میں جرح کے لیے اس کے قریب چلا گیا اور سر تاپا اس کا جائزہ لیتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

”آئی او صاحب!..... آپ خاصے صاف سترے نظر آ رہے ہیں۔“

وہ میرے ریمارکس پر چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ قدرے ناگوار لہجے میں متستر ہوا۔ ”کیا مطلب ہے آپ وکیل صاحب؟“

”مطلب یہ کہ.....“ میں نے چھیڑ چھاڑ کے سلسلے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا یونیفارم خاصا اچھا نظر آ رہا ہے، آپ کا شیدہ بنا ہوا ہے، بال بڑے سلیقے سے سنورے ہوئے ہیں اور جو تہ بھی چمک رہے ہیں۔ آپ خاصے خوش ذوق معلوم ہوتے ہیں۔“

وہ اپنی تعریف اور وہ بھی ایک وکیل مخالف کی زبان سے سن کر خوش ہو گیا تاہم اپنی خوشی کو دباتے ہوئے اس نے قدرے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”آپ نے بجا فرمایا کہ میں ایک خوش ذوق پولیس آفیسر ہوں لیکن ان باتوں کا زیر نظر پولیس سے کیا تعلق ہے؟“

”کوئی تعلق نہیں آئی او صاحب!“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”بس، میں نے ایسے ہی ذکر کرنا ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ عموماً صبح وشام جن پولیس والوں سے واسطہ پڑتا ہے انہیں اپنے حلیے یا یونیفارم سے کوئی دلچسپی دکھائی نہیں دیتی۔ کم از کم تھانہ انچارج کے رینک سے نیچے تو اس بات کی اہمیت کو سمجھا ہی نہیں جاتا کہ انسان کا لباس اور اس کے اندر کے صلاحتیں کیا ہیں۔“

”بس جناب!.....“ وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

”اپنی اپنی جھکی بات ہے۔“

”کیا خوب صورت بات کی ہے آپ نے؟“ میں نے تو سنی نظر سے اسے دیکھا۔ اس نے کچھ نہیں کہا خاموش نگاہ سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ”صفدر صاحب! آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب اور کس نے دی تھی؟“ ”ایک لمحے کے توقف سے میں نے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ”واقعے سے میری مراد اشتیاق بیگ مرڈر کیس“ ہے۔“

”آپ وضاحت نہ بھی کرتے تو میں سمجھ گیا تھا۔“ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اس واقعے کی اطلاع مقتول کی بیوی یعنی مقتول کی بیوہ نرگس نے تین جنوری کی دوپہر تھانہ فون کرنے دی تھی۔“

”دوپہر..... کتنے بجے؟“ میں نے سوال کیا۔ ”پولیس کے روزنامے کے مطابق یہ اطلاع دوپہر پانچ بجے کر پینتالیس منٹ پر دی گئی تھی یعنی پونے ایک بجے اور آپ جانے وقوع پر کتنے بجے پہنچے تھے؟“

”ایک..... سو ایک بجے کے درمیان۔“ اس نے جواب دیا۔

”میری معلومات کے مطابق ملزم وحیدہ کو لگ بھگ دو بجے اس کے گھر سے گرفتار کیا گیا تھا۔“ میں نے آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سب انسپٹر صاحب! میری معلومات غلط تو نہیں ہیں؟“

”جی نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔ ملزم کی گرفتاری کا وقت وہی ہے جو آپ نے بتایا ہے۔“

”ملزم کی گرفتاری یقیناً مقتول کی بیوہ نرگس کی نشاندہی پر کی گئی ہوگی؟“ میں نے استفسار کیا۔

”جی ہاں۔“ اس نے سر کو مثبتی جنبش دی۔ ”نرگس صاحبہ نے میری پوچھ گچھ کے نتیجے میں مجھے بتایا تھا کہ وہ ملزم کو گھر میں چھوڑ کر کسی ضروری کام سے باہر گئی تھی۔

واپسی میں اسے دیر ہو گئی۔ جب وہ گھر آئی تو ملزم وحیدہ یعنی ملزم گھر میں موجود نہیں تھی اور نرگس کے شوہر کو بڑی..... بدردی سے گلا کاٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور دوسرے کمرے کی الماری بھی کھلی پڑی تھی۔ مذکورہ الماری میں سے نقدی اور طلائی زیورات بھی غائب تھے۔ نرگس کو شک تھا کہ اس کا ملزم اس کے شوہر کی کانٹیں دھو رہا تھا۔

اس نے نرگس کے ایمپر ملزم کو اس کے گھر سے گرفتار کر کے شامل تفتیش کر لیا۔“

”بہت خوب!“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ”آپ کی کارکردگی واقعی لا جواب تھی۔“

وہ ایسی نظر سے مجھے ننگے گالے جیسے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ میں اس کی تعریف میں سنجیدہ ہوں یا مذاق کر رہا ہوں۔ میں نے اسے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دیا اور سوالات کے سلسلے کو دہرا کر دیتے ہوئے کہا۔

”آپ نے بتایا ہے کہ جب نرگس واپس آئی تو ملزم وحیدہ گھر میں موجود نہیں تھی۔ کیا ملزم کو اس وقت گھر میں موجود ہونا چاہیے تھا؟“

”جی ہاں!.....“ وہ اصرار کی انداز میں بولا۔ ”مقتول کی بیوی نرگس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا شوہر دل کا مریض تھا اور اس نے ملزم کو خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ جب تک وہ واپس نہیں آ جاتی، وہ گھر میں موجود رہے۔“

”مقتول کی بیوہ نرگس نے شاید آپ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس نے وقوع کے روز دس پینتالیس پر اپنے گھر فون کر کے ملزم سے کیا کہا تھا؟“ میں نے تھکے لہجے میں کہا۔

کہنہ شوق

”جی ہاں!..... سب بتایا تھا۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”نرگس نے ٹھیک پونے گیارہ بجے اپنے گھر فون کیا تھا۔ فون ملزم نے اٹھینا کیا تھا۔ نرگس نے ملزم کو تاکید کی تھی کہ جب تک وہ واپس نہ آئے، ملزم گھر سے نہیں جائے گی چاہے اسے دوسرے گھر سے کام کی چھٹی ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔“

”لیکن ملزم کا بیان اس کے برعکس ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”پونے گیارہ بجے جب مقتول کی بیوہ نرگس نے ملزم کو فون کیا تو ملزم نے پوچھا تھا، باجی! آپ کب تک واپس آئیں گی۔ مجھے گیارہ بجے شیخ صاحب کے گھر کام کرنے جانا ہے؟“ اس پر نرگس نے جواب دیا تھا، میں گھر سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ دس پندرہ منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔ تم میری واپسی کا انتظار نہیں کرنا اور گیارہ بجے بیرونی گیٹ بند کر کے شیخ صاحب کے گھر چلی جانا ورنہ تمہارے دیر سے جانے پر شیخ کی بد مزاج بیوی تم پر خواتواہ چیخے چلائے گی۔ ان دونوں بیانات میں اتنا زیادہ تضاد ہے کہ.....“

میں نے لحاظ کی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”کہ..... دونوں میں سے کوئی ایک بیان ہی درست ہو سکتا ہے۔“

”ملزم وحیدہ غلط بیانی سے کام لے رہی ہے۔“ آئی او جلدی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ”یہی فتویٰ میں اس کیس کی مدعی اور مقتول کی بیوہ نرگس کے لیے بھی جاری کر سکتا ہوں۔“

”آپ کا فتویٰ درنت نہیں مانا جائے گا وکیل صاحب!“ انکوائری آفیسر بڑے اعتماد سے بولا۔ ”کیونکہ مقتول دل کا مریض تھا۔ نرگس اس کی طرف سے ایسا غیر محتاط اقدام اٹھائی نہیں سکتی۔ وہ ملزم کو اس وقت تک گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی جب تک وہ خود مقتول کے پاس واپس نہ جاتی۔ یہ تو ایک سانس کی حقیقت ہے جو معمولی سی عقل رکھنے والا انسان بھی بڑی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔“

آئی او نے آخری جملے میں مجھ پر چوٹ کی تھی۔ میں نے اس کی بات کا برا نہیں منایا اور مقتول انداز میں پوچھا۔

”آپ کی معلومات کے مطابق وقوع کے روز مقتول کی بیوہ نرگس کتنے بجے گھر واپس آئی تھی؟“

”ساڑھے بارہ بجے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور بارہ پینتالیس پر اس نے تھانہ فون کر کے،

کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔ ”کون سی اہم بات؟“
میں نے آئی او کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے بیچ
کی جانب دیکھا۔ اس کی دلچسپی ہرگز رتے لئے کے ساتھ
بڑھ رہی تھی۔ میں نے اٹھ کھڑا کر گلا صاف کیا اور آئی او کے
سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”میری مڑول اور اس کیس کی مڑمہ کا دعویٰ ہے کہ
واقعہ سے چند روز قبل وہ چھری چکن سے غائب ہو گئی تھی۔
جب اس نے مذکورہ چھری کے بارے میں اپنی باجی یعنی
مقتول کی بیوہ نرگس سے استفسار کیا تو اس نے چھری کے
حوالے سے اپنی لائمی ظاہر کر دی تھی۔“

”مجھے آلودہ قتل کے ماضی کے بارے میں کچھ پتا
نہیں۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”نہ ہی مجھے یہ ہسٹری
جاننے سے کوئی دلچسپی ہے۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ آلودہ
قتل پر مڑمہ کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے اور وہ
اپنی مالکن کی حکم عدویٰ کر کے اس کے گھر آنے سے پہلے ہی
مقتول کے گھر سے نکل گئی تھی۔“

”آئی او صاحب!“ میں نے اس کی آنکھوں میں
جھانکتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں دریافت کیا۔ ”کیا آپ
پوری دیانت داری کے ساتھ مجھے ایک بات بتائیں گے؟“
”مڑول صاحب! میں نے ابھی تک معاذ اللہ
کے روبرو جو کچھ میں کہا ہے اس میں دیانت داری کو ایک
لمحے کے لیے بھی نظر انداز نہیں کیا۔“ وہ قدرے ناراضی سے
بولا۔ ”پوچھیں، آپ کو مجھ سے کون سی بات پوچھنا ہے۔ جو
میری نظر میں سچ ہوگا، میں ضرور بتاؤں گا۔“

”یہ جو معاشرے کے نیچے طبقے سے تعلق رکھنے
والے لوگ ہوتے ہیں مثلاً مزدور، بستی، جھانکس اور سخت کام
کرنے والے یا گھروں میں کام کرنے والی نوکرانیاں
وغیرہ.....“ میں نے گہری تنہید کی کہ۔ ”آپ کے خیال
میں ان کی کھوپڑی میں دماغ نہیں ہوتا؟“

”میں سمجھتا ہوں، آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں.....“ وہ
انھیں زدہ نظر سے مجھے تنکے لگا۔ ”اپنی بات کی وضاحت
کریں گے؟“

”میرا مطلب ہے، کیا یہ لوگ آپ کی نظر میں عقل
سے پیدا ہوتے ہیں۔“ میں نے اپنے لہجے کی تنہید کی کہ
برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ”ان میں اور ایک گدے میں کوئی
فرق نظر نہیں آتا آپ کو؟“

بیچ نے اپنے ہاتھ میں موجود قلم سے سامنے پھیلے
ہوئے کاغذات پر چند سطریں تھیشیں اور دوبارہ ہماری

مقتول کی لاش کو دیکھ کر کیا اندازہ قائم کیا تھا؟“
”جیسا آپ فرما رہے ہیں، میں نے بالکل ویسا ہی
دیکھا تھا۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔
”مقتول کی لاش اور بستر کی حالت سے یہی اندازہ ہوتا تھا
کہ موت کے منہ میں جاتے وقت مقتول نے زیادہ اچھل کود
نہیں بچائی ہوگی۔“

”مجھے پتا چلا ہے، آپ نے جانے واقعہ سے بڑی
آسانی کے ساتھ آلودہ لاش بھی برآمد کر لیا تھا؟“ میں نے
قدرے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں.....“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔
”آلودہ قتل کی تلاش میں مجھے زیادہ تنگ و دوغوب کرنا پڑی تھی۔
وہ خطرناک گوشت کاٹنے والی چھری مقتول کے بیڈ کے نیچے
ہی پڑی مل گئی تھی۔“

”آپ نے آلودہ قتل پر سے فکر پریش بھی اٹھائے
تھے۔“ میں نے سادہ سے لہجے میں پوچھا۔ ”اور وہ پریش
مڑمہ کے فکر پریش سے بیچ بھی کر گئے تھے۔ میں غلط تو نہیں
کہہ رہا آئی او صاحب؟“

”نہیں جناب! آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔“
وہ بہ آواز بلند بولا۔ ”بجی تو یہ بات اور بھی یقینی ہو گئی کہ
مڑمہ ہی نے وہاں مقتول کی جان لی تھی۔ اگر وہ اس
معاذ اللہ موت نہ ہوتی تو آلودہ قتل پر اس کی انگلیوں کے
نشانات کیوں پائے جاتے۔ یہ ایک غور طلب بات ہے۔“

”ایک نہیں، اس کیس میں تو بہت سی باتیں غور طلب
ہیں آئی او صاحب!“ میں نے منہ پر ہونے انداز میں
کہا۔ ”جن پر ہم باری باری غور بھی کریں گے لیکن آلودہ قتل پر
مڑمہ کے فکر پریش کی موجودگی ہرگز یہ ثابت نہیں کرتی کہ
اس نے مقتول اشتیاق بیگ کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔“
”جی کیا مطلب؟“ وہ چونک کر مجھے تنکے لگا۔ ”یہ
آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”میں بالکل خشک کہہ رہا ہوں۔“ میں نے مضبوط لہجے
میں کہا۔ ”میری مڑول کے مطابق وہ خطرناک چھری جو اس
کیس میں آلودہ قتل کی حیثیت کی حامل ہے اس کا تعلق مقتول
کے گھر کے چکن سے ہے۔ مڑمہ اکثر و بیشتر اسے استعمال کرتی
تھی لہذا اس چھری کے دستے پر مڑمہ کی انگلیوں کے نشانات کا
پایا جانا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ اس چھری کے حوالے سے
مڑمہ نے مجھے ایک نہایت ہی اہم بات بھی بتائی ہے۔“
میں نے جملہ ادھر اچھوڑ کر مڑمہ کی خبر انداز میں آئی او

”مضمر صاحب! واقعہ کے روز جب آپ دوپہر ایک اور سوا
ایک کے درمیان جانے واردات پر پہنچے تو وہاں مقتول کی
بیوہ نرگس کے علاوہ اور کون موجود تھا؟“

”مقتول کی فیملی کی کئی شخصیات فریدخوری بھی جانے واقعہ
پر موجود تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا فریدخوری کو بھی مقتول کی بیوہ نے فون کر کے
وہاں بلایا تھا؟“

”یہ مجھے نہیں معلوم۔“ وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔
”آپ نے اس سلسلے میں مقتول کی بیوہ نرگس سے
پوچھا نہیں تھا؟“ میں نے سوال کیا۔ ”ایک انکوائری آفیسر
کی حیثیت سے آپ کو فریدخوری کی جانے واقعہ پر موجودگی
کا سبب پتا ہونا چاہیے تھا؟“

”میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔“ وہ
رکھائی سے بولا۔ ”آپ نرگس سے خود پوچھ لیجئے گا۔“

”میں مقتول کی بیوہ سے ضرور یہ سوال کروں گا۔“
میں نے گہری تنہید کی کہ۔ ”کیونکہ میں اس معاملے کو
بہت اہم سمجھتا ہوں۔“

”جیسی آپ کی مرضی!“ اس نے بے پروائی سے
کندھے اچکا دیے۔

”میں نے جن کے سلسلے کو آپ نے اشارہ کیا ہے وہ
پوچھا۔ ”آئی او صاحب! جب آپ جانے واقعہ پر پہنچے تو
آپ نے وہاں کیا دیکھا تھا؟“

”مقتول بیگ اپنے کمرے میں بیڈ پر سرورہ پڑا تھا۔“
اس نے سرسری لہجے میں جواب دیا۔ ”اس کی گردن کی ہوئی
تھی۔ خون کے بہاؤ نے اس کا لباس اور بیڈ کا ایک بڑا حصہ
سرخ کر دیا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ اب اسے
زندوں میں ٹھہرائیں کیا جاسکتا۔ اس کی موت واقع ہو چکی تھی۔“

”پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق جب مقتول کو
موت کے گھاٹ اتارا گیا تو وہ کی خواب آور دوا کے زیر اثر
تھا۔ اس کے معدے کے کیسادی تجزیے سے بھی یہی ثابت
ہوا ہے۔ اغلب امکان اس بات کا ہے کہ مقتول کی بیوہ نے
ناشے کے وقت اسے جو سکون بخش دوا کھلائی تھی یہ اس کے
اثرات ہوں۔ ان اثرات کی روشنی میں دراصل میں یہ کہنا
چاہتا ہوں کہ.....“ میں سانس ہموار کرنے کے لیے لمبے سہر
گور کا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”جب کسی نشہ آور شے کے زیر اثر کسی شخص کی شہ
رگ کاٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے تو مرنے
والے کو زیادہ تر پٹے پھرنے کا موقع نہیں ملتا۔ آپ نے

اپنے شوہر کو پیش آنے والے واقعے کی اطلاع دی تھی۔“
میں نے آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یعنی گھر
پہنچنے کے خشک پندرہ منٹ بعد.....؟“

”جی ہاں.....!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ نرگس صاحبہ بڑے
مضبوط اعصاب کی مالک ہیں۔“ میں نے حیرت سے
آنکھیں پھیلانے ہوئے کہا۔ ”ورنہ ان کی جگہ اگر کوئی اور
خاتون ہوتی تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ وہ سب
سے پہلے ارد گرد کے لوگوں کو اکٹھا کرتی۔ پولیس کو اطلاع
دینے کا خیال تو بہت بعد میں آتا۔“

میری مڑول نے مجھے بتایا تھا کہ وہ نرگس کی اجازت
پر ہی گیارہ بج کر پانچ منٹ پر پہنچنے سے نکل گئی کیونکہ نرگس
پہنچنے کے قریب ہی نہیں موجودگی لیکن آئی او سے ہونے
والے سوال وجواب سے جو صورت حال سامنے آ رہی تھی
اس سے ظاہر ہوتا تھا، نرگس کے ذہن میں کچھ اور بھی پک رہا
تھا۔ جب وہ گواہی دینے و سننے یا کسی میں پہنچتی تو میں اسے
اپنے انداز میں محسوس کر سکتا تھا۔ فی الحال تو آئی او سے نمٹنا تھا جو
استفسار کا سب سے اہم گواہ ہونے کے ساتھ ہی استفسار کا
وارث بھی تھا۔ میں نے مختصری جرح کے لیے اسے بیچ سے

کاٹا تھا۔ میں نے کچھ اور باتیں اس کے جواب کا سبب بن گئیں
زیادہ ہی دراز ہوتا چلا جا رہا تھا لیکن چونکہ میری کرید کے
نتیجے میں نئے نئے انکشافات ہو رہے تھے لہذا بیچ بڑی توجہ
اور دلچسپی سے یہ کارروائی دیکھ اور سن رہا تھا۔ اسی دوران
میں وقفے وقفے سے اس کا قلم بھی حرکت میں آ جاتا تھا اور وہ
اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ کرنے لگتا تھا۔

”یہ تو جناب..... اپنی اپنی ہمت اور حوصلے کی بات
ہے۔“ انکوائری آفیسر نے میرے اعتراض کے جواب میں
کہا۔ ”بعض لوگ کسی مصیبت کا سن کر ہی ہاتھ پاؤں ڈال
دیتے ہیں اور بعض پر قیامت بھی نوٹ پڑے تو وہ کسی چٹان
کے مانند اتادہ رہتے ہیں۔“

”پھر تو مقتول کی بیوہ کو ”آئرن لیڈی“ کی شیلڈ ملنا
چاہیے۔“ میں نے نیم طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”ایسے فولادی
اعصاب کی مالک ہونا کوئی معمولی بات نہیں۔“

اس نے میرے طنز کا جواب طنزیہ سے دیا۔ ”اگر
آپ کا کوئی بورڈ اس قسم کے انعامات کا انعقاد کرتا ہے تو
آپ بہ خوش مزاج کو یہ شیلڈ پیش کر سکتے ہیں۔“
میں نے زیر لب مسکرائے پر انکشاف کیا اور سوالات
کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے انکوائری آفیسر سے پوچھا۔

جانب متوجہ ہو گیا۔

آئی او نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔ ”میں تو ایسا نہیں سمجھتا جناب! جب اللہ نے ان کے سر کے اوپر کھوپڑی بنائی ہے تو یقیناً اس کے اندر دماغ بھی رکھا ہے اور یہ بھی معاشرے کے دوسرے یعنی بالائی طبقوں کے مانند سوچتے اور سمجھتے ہیں بلکہ بعض معاملات میں تو ان کا دماغ کچھ زیادہ ہی چلتا ہے۔“

”دماغ کے استعمال اور سمجھ بوجھ کے حوالے سے ملزم وحیدہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“ میں نے چہیتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

”وہی خیال ہے جس کا میں آپ کے پہلے سوال کے جواب میں اظہار کر چکا ہوں۔“ وہ خامے اطمینان کے ساتھ بولا۔ ”یعنی ملزم بھی ایک سمجھ دار اور باشعور انسان ہے۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”اسے“ ”الوکی پتھی“ کہنا درست نہیں ہوگا؟“

”ایسے الفاظ کا استعمال تو کسی بھی شخص کے لیے مناسب نہیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”لیکن اس سے ملزم کے جرم کی سنگینی کم کیا تم نہیں ہو جاتی۔“

”ٹھیک ہے، ہم جرم اور اس کی سنگینی کی طرف آجائے ہیں۔“ میں نے سمجھاؤ انداز میں کہا۔ ”میرا مٹوئل پر اشتیاق بیگ کوئل کرنے کا الزام ہے اور آپ یہ بھی مانتے ہیں کہ وہ کوئی ذفر یا الوکی پتھی نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ.....“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”پھر کیا وجہ ہے کہ اس نے (استفادہ کے مطابق) اشتیاق بیگ کوئل کرنے کے بعد آڈیو کو اسی کے بیڈ کے نیچے چھپک دیا۔ آپ کو وہ خطرناک تیز دھار چھری مقتول کے بیڈ کے نیچے سے کیسی ملی؟“

”جی ہاں..... وہیں سے ملی تھی۔“ آئی او نے پریشان لہجے میں جواب دیا۔

”وہ اگر چاہتی تو اس چھری کو کسی جگہ بھی چھپا سکتی تھی جہاں سے آسانی سے ڈھونڈ لی نہ جاسکتی۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”وہ آڈیو کو گھر سے باہر کسی کچرا دان میں بھی چھپک سکتی تھی۔ اس نے اپنے سنگین جرم کے سب سے بڑے ثبوت کو مقتول کے بیڈ کے نیچے کیوں ڈال دیا تھا یہ تو وہی بات ہوئی کہ..... آہیل، مجھے مارا۔“

”آپ کا سوال یقیناً بہت اہم ہے۔“ وہ تائیدی

انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں سمجھتا ہوں، ملزم نے بولکا ہٹ اور پریشان بین آڈیو کو بیڈ کے نیچے چھپک دیا ہوگا۔ اشتیاق بیگ کے قتل کے بعد اس پر وحشت اور دہشت سی طاری ہوئی ہوگی اور وہ چھری کو وہیں چھوڑ کر جلد از جلد ہنگامے سے فرار ہو گئی ہوگی۔“

”وحشت زدہ یا دہشت زدہ یا بولکا یا ہوا پریشان شخص پہلی فرصت میں کسی پُر سکون جگہ پر بیٹھ کر اپنے حواس کو مجتمع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔“ میں نے آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خامے زہر لیے انداز میں کہا۔ ”جبکہ ملزم کا ریکارڈ اس کے برعکس گواہی دیتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ حذب و بذب انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ ”آپ کے مطابق.....“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ ”ملزم اشتیاق بیگ کے قتل کے بعد اس قدر بولکا گئی تھی اور دہشت زدہ ہو گئی تھی کہ پریشان اور وحشت میں آڈیو کو مقتول کے بیڈ کے نیچے ہی چھپک کر گھر سے فرار ہو گئی تھی جبکہ واقعات کے مطابق وہ اپنے مقررہ وقت پر فیاض شیخ کے گھر پہنچی تھی اور پورے دو گھنٹے اس نے شیخ صاحب کے گھر میں معمول کے مطابق پُر سکون انداز میں کام کیا تھا۔ اس امر کی گواہی فیاض شیخ کی بیوی

ایبہ دے کے گھر سے ملے گی۔“ میں نے اپنے انداز میں آواز سے کہا۔ ”اگر چہ میں اس کے معزز عدالت کا حکم ہوگا تو میں اپنی مٹوئل کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے مسز فیاض شیخ ایبہ دے کو عدالت تک لانے کا فرض پورا کر سکتا ہوں۔“

ایبہ دے نے ایک لمحہ کے لیے غصہ سے کہا۔ ”میں اس کا کام نہیں کر سکتی۔“ میں نے ایک عورت جس نے پانچ منٹ پہلے کسی شخص کا گلا کاٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا وہ وہ مہر و سکون کے ساتھ پورے دو گھنٹے کسی گھر میں اپنے معمول کے کام کو کس طرح انجام دے سکتی ہے۔ یہ تو انسانی فطرت اور

نفیات ہی کے خلاف ہے آئی او صاحب.....“

تفتیشی افسر صدر علی میرے اس بھرپور مطلق ایک پر بغلیں جھانکنے لگا۔ اسے دیکھ کر مجھے وکیل استفادہ کی یاد آ گئی۔ میں اس قسم کے دعوں و دھار جملے وکیل استفادہ پر کرتا تھا لیکن ابھی تک اس کیس میں وکیل استفادہ کی باری نہیں آئی تھی۔ جس طرح آئی او اسے جرح کے جواب میں یہ

کیس اور اس کیس کے معاملات پرت در پرت تھلتے چلے جا رہے تھے اور کیس تیزی سے اپنے اختتام کی طرف بڑھ

کھلتے مشق

رہا تھا اسے دیکھ کر مجھے تو یہی محسوس ہوا تھا کہ وکیل استفادہ کو بہت کم ”وجہت“ اٹھانا پڑے گی۔

”آئی او صاحب!“ میں نے سوالات کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ”میری مٹوئل پر اشتیاق بیگ کوئل کرنے کے علاوہ بھی دو الزامات ہیں۔ نمبر ایک، دس ہزار نقدی کی چوری۔ نمبر دو، چالیس ہزار کے طلائی زیورات کی چوری..... میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”نہیں جناب! آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”آپ نے جب ملزم کو اس کے گھر سے گرفتار کیا تو خانہ اور جامہ تلاشی بھی لی ہوگی۔“ میں نے کہا۔ ”کیا آپ یہ رقم اور طلائی زیورات برآمد کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے؟“ ”نہیں جناب۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”ہم نے ملزم کے گھر کا کوئی اچھا مارا تھا لیکن مال مسروقہ اور نقدی نہیں سے برآمد نہیں ہو سکی۔“

”ریمائنڈ کی مدت کے دوران میں آپ نے ملزم کی زبان کھلوانے کے لیے کئی تفتیش بھی کی تھی۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”دس ہزار نقدی اور طلائی زیورات کے بارے میں کچھ بتا چلا آپ کو؟“

”جی ہاں، ایک بار تفتیشی میں گردن ہلائی۔“ میں نے کہا۔ ”چربیے پر وہ پہلے والی تازہ اور بشت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ خاصا تھکا ہوا نظر آنے لگا تھا۔ میں وقفے وقفے سے جج کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ جب بھی میں آئی او کے سامنے کوئی خاص نکتہ اٹھاتا تو آئی او اس کا جواب دیتا تو جج اپنے پاس کچھ نوٹ کر لیتا تھا یعنی وہ اہم پوائنٹس اپنے پاس جمع کر رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میری جرح خاصی سودمند ثابت ہو رہی تھی۔“

”آئی او صاحب!“ میں دوبارہ تفتیشی افسر کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ”آپ کے خیال میں، دس ہزار نقدی اور چالیس ہزار کے طلائی زیورات مقتول اشتیاق بیگ کے نیچے کے نیچے رکھے ہوئے تھے؟“

”یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں وکیل صاحب!“ وہ برہمی سے بولا۔ ”نقدی اور زیورات جھلاکون نیچے کے نیچے رکھا ہے.....؟“

”آپ کی تفتیش اور استفادہ کی رپورٹ سے تو یہی لگتا ہے۔“ میں نے چوٹ کی۔

”کیا مطلب.....؟“

”مجھے..... میری مٹوئل نے استفادہ کے مطابق

اشتیاق بیگ کی گردن پر چھری پھیری، نیچے کے نیچے سے دس ہزار نقدی اور چالیس ہزار کے طلائی زیورات نکالے اور چلتی بنی.....“ میں نے طنز کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”آپ بھی کمال کرتے ہیں وکیل صاحب۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”استفادہ کی رپورٹ میں یہ کہاں لکھا ہے کہ دس ہزار کی نقدی اور طلائی زیورات مقتول کے نیچے کے نیچے رکھے تھے؟“

”آپ سمجھیں پور.....!“ وکیل استفادہ نے اپنی موجودگی کا اظہار کے لیے نعرہ مستانہ بلند کیا۔ ”وکیل صفائی حد سے بڑھتے جا رہے ہیں۔“

جج نے گہری سنجیدگی سے وکیل استفادہ کی جانب دیکھا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”وکیل صاحب! آپ کو کس بات پر اعتراض ہے؟“

”جناب عالی! آج اس کیس کی پہلی باقاعدہ سماعت ہے۔“ وہ بڑے مضبوط لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اور وکیل صفائی آدھے پون گھنٹے سے آئی او صاحب کو پکڑے کھڑے ہیں۔ کام کی کوئی بات نہیں ہو رہی اور محض..... عدالت کا تفتیشی وقت برباد کیا جا رہا ہے اور اب تو انہوں نے حد ہی کر دی ہے.....“ وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اٹھ کر وکیل صفائی کے رخ سے جج کو دیکھنے لگا۔

جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ مطلب یہی تھا کہ میں وکیل استفادہ کے اعتراض کا جواب دوں۔

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور روئے سخن جج کی سمت پھیرتے ہوئے نہایت ہی ادب و احترام کے ساتھ بولنا شروع کیا۔

”جناب عالی! میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اب تک انکواری افسر صدر پر جرح کے دوران میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا لہذا عدالت کے فیصلے وقت کے برابر ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر وکیل استفادہ کے اعتراض کو ایک سیکنڈ کے لیے درست بھی مان لیا جائے تو پھر سر! آپ نے اس جرح کے دوران میں زیر سماعت کیس کے حوالے سے اپنے پاس جو اہم پوائنٹس نوٹ کیے ہیں انہیں بھی بیکار اور فضول سمجھتے ہوئے کاٹ دینا ہی مناسب ہوگا اور..... مجھے یقین ہے سر، آپ ایسا نہیں کریں گے۔“

میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے وکیل استفادہ اور تفتیشی افسر سمیت حاضرین عدالت پر ایک سرسری نظر ڈالی پھر دوبارہ جج کی طرف دیکھتے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ اب میرے انداز میں ایک خاص قسم کا

”ضرور جناب.....“ میں نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے

کے نشانات نہیں مل سکے تھے۔“ میں نے بہ دستور اس کے

مرغوثوں کے بیڈروم یعنی جائے وقوعہ پر نہیں جا رہے بلکہ

سرف اتنا بتائیں کہ میں نے مقتول کے لینے کے حوالے

سے جو تفصیلات بتائی ہیں، وہ کہاں تک درست ہیں؟
 ”آپ نے بالکل درست نقشہ کھینچا ہے۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مقتول اسی پوزیشن میں اپنے بیڈ پر مردہ پایا گیا تھا۔“
 ”پھر تو آپ اس بات سے بھی اتفاق کریں گے کہ قاتل نے جنوبی اور مشرقی سمت سے مقتول پر حملہ نہیں کیا تھا؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔
 ”بالکل اتفاق کروں گا۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”جن دوستوں کا آپ نے ذکر کیا ہے، اوسر سے تو بیڈ دیواروں کے ساتھ چپکا ہوا ہے۔“
 ”اور مغربی جانب سے بھی اس نوعیت کا قاتلانہ حملہ ممکن نظر نہیں آتا۔۔۔۔۔؟“

مقتول کی گردن چھری کے مہلک وار سے، کہاں سے کہاں تک متاثر ہوئی تھی؟
 ”دیکھیں جناب۔۔۔۔۔“ وہ دونوں ہاتھوں کو اپنی گردن کے ساتھ مصروف کرتے ہوئے بتانے لگا۔ ”وہ خوف ناک کٹ۔۔۔۔۔ اس نے انکشت شہادت کو اپنے دائیں کان کی لو کے نیچے، چہرے کی ہڈی کے پاس رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہاں سے شروع ہوا تھا اور۔۔۔۔۔ پھر وہ اسی انگلی کو بائیں کندھے پر، گردن کی جڑ کے قریب لے گیا اور ایک جگہ ٹھہراتے ہوئے بولا۔ ”یہاں تک گیا تھا۔۔۔۔۔“
 ”اوہ۔۔۔۔۔!“ میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلا لیں۔ ”یہ تو خاصا لمبا چوڑا اور خطرناک کٹ تھا اور۔۔۔۔۔ شہرہ بے چاری اس کٹ کے سینٹر میں آئی ہے۔ اسے تو کٹنا ہی تھا۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ وہاں سے مقتول کی گردن اتنی دور پڑتی کہ اس پر چھری چلانا ناممکن تھا۔“ اس نے کہا۔ ”پھر قاتل کو اتنی مشکل میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے سیدھا سیدھا شمالی جانب سے حملہ کیا ہوگا جودھر سے مقتول اپنے بیڈ پر چڑھتا اور اترتا تھا۔“
 ”الٹا آپ کا بھلا کرے آئی اوصاحب!“ میں نے بڑی رسائی سے کہا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے۔۔۔۔۔“
 ”وہ ایسی نظر سے مجھے دیکھنے لگا جیسے یہ سارا معاملہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ میں اس قسم کے اوٹ پٹانگ سوالات پوچھ کر کیا حاصل کرنے کی سعی میں لگا ہوں۔ میں نے اسے مزاحیہ دیر تک سوچوں میں گم نہیں رہنے دیا۔“
 ”آئی اوصاحب!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ نے مقتول کی کئی ہوئی گردن کا تو بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہوگا؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ یہ تو بہت ضروری تھا۔“
 ”کٹ کا اینٹیل تو آپ کو یاد ہوگا؟“
 ”جی بالکل یاد ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔
 ”میں اس حوالے سے اپنے مختلف ذرائع استعمال کر کے بڑی تفصیلی اور مصدقہ معلومات حاصل کر چکا تھا گویا مقتول کی کئی ہوئی گردن کا ہر زاویہ اور ہر منظر میرے تصور کی نگاہ میں محفوظ تھا اور یہی اس کیس کا وہ اہم رخ تھا جس سے ماہرانہ انداز میں کھیلنے ہوئے مجھے اپنی مٹوکل اور اس کیس کی طرز مکرر بے گناہ ثابت کرنا تھا۔“
 ”بالکل یاد ہے۔۔۔۔۔“ میں نے پُر سوچ انداز میں آئی او کے الفاظ دہرائے اور قدرے بلند آواز میں کہا۔ ”آپ ذرا اس کٹ کی وضاحت کر دیں جس سے واضح ہو جائے کہ

”آئی اینٹیل پورائز“ کا نعرہ لگانے کی بھی پوزیشن میں نہیں تھا۔ عدالت کے کمرے میں موجود افراد کو یا سناٹا نے سوکھ گیا تھا۔ سب کی نظریں تقیثی افسر اور مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔
 آئی او نے ڈیمو دینے سے پہلے ایک مرتبہ پھر متذبذب نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اشارہ کیا کہ۔ ”چڑھ جا بیٹا سوئی پر، رام بھلی کرے گا۔“
 آئی او نے اس سوئی ہوئی عورت کی گردن کا کٹ ڈالی۔ چھری کا ایک لمبا کٹ پوسٹر پر نمایاں ہو گیا جو مذکورہ ”عورت“ کے بائیں کان سے دائیں کندھے کی سمت تھا یعنی کندھے سے شروع ہو کر کان کی طرف گیا تھا۔
 ”یہ آپ نے کیا کر دیا آئی اوصاحب۔۔۔۔۔؟“ میں نے جلدی سے کہا۔
 ”کیوں۔۔۔۔۔ کیا ہو گیا؟“ وہ ہولکا کر میری جانب دیکھنے لگا۔
 ”میں نے کہا۔“ مقتول اشتیاق بیگ کی کئی ہوئی گردن پر کٹ کا اینٹیل یہ تو نہیں تھا۔“
 ”وہ ابھی زردہ انداز میں پوسٹر کو دیکھنے لگا۔“
 ”آئی اوصاحب! میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالنے سے کہہ دیا۔“ اشتیاق بیگ کی گردن کا کٹ دائیں کندھے سے شروع ہو کر بائیں کان کے نیچے تک چلا گیا تھا جبکہ آپ کا لگایا ہوا کٹ بائیں کندھے سے شروع ہو کر دائیں کان تک گیا ہے۔ یہ تو بالکل الٹا معاملہ ہو گیا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”آپ کچھ تو ٹھیک ہی رہے ہیں۔۔۔۔۔“ وہ متذبذب بھرے انداز میں بھی عورت کی تصویر کو اور بھی اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔
 ”پھر۔۔۔۔۔؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اسے گھورا۔
 ”شاید میرا ہاتھ صحیح نہیں پڑ رہا۔۔۔۔۔“ وہ بڑبڑاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ”اسی لیے کٹ کا زاویہ بدل گیا ہے۔“
 ”ہاتھ صحیح نہیں پڑ رہا تو ہاتھ کو بدل کر دیکھیں۔“ میں نے اسے پٹ دی۔
 اس نے میکا کی انداز میں چھری کو دائیں ہاتھ سے بائیں میں منتقل کیا۔ میری بات اس کی سمجھ میں بیٹھ گئی تھی۔ پھر اس نے بائیں ہاتھ کی مدد سے عورت کی گردن کا کٹ ڈالا۔ عمل دہرایا تو ہو بہو ویسا کٹ لگا جیسے مقتول کی گردن پر پایا گیا تھا۔
 آئی او سنسنی خیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔

”کچھ آیا کچھ میں جناب کی۔۔۔۔۔؟“
 ”یہی سمجھ میں آیا کہ۔۔۔۔۔“ وہ عینان آمیز سرسراہٹ ہوئی آواز میں بولا۔ ”قاتل نے اگلے ہاتھ سے چھری کا استعمال کرتے ہوئے اشتیاق بیگ کی گردن کا کٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔“
 ”یعنی قاتل لیفٹ ہینڈ ہے۔“ میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”ہر کام بائیں ہاتھ سے کرنے کا عادی۔۔۔۔۔؟“
 ”جی۔۔۔۔۔ جی بالکل!“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔
 ”آپ تھوڑی دیر پہلے اس امر کی بھی تصدیق کر چکے ہیں کہ اس کیس کی طرز اور میری مٹوکل وحیدہ دائیں ہاتھ سے کام کرنے کی عادی ہے یعنی وہ رائٹ ہینڈ ہے۔۔۔۔۔ میں نا؟“
 ”جی ہاں۔۔۔۔۔“ اس نے کمزوری آواز میں جواب دیا۔
 اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔

☆ ☆ ☆
 گزشتہ پیشی پر میں نے اس کیس کے انکوائری آفیسر سب انسپٹر صفدر علی پر خاصی طویل اور معنی خیز جرح کی تھی جس سے کافی مثبت اور مفید نتائج برآمد ہوئے تھے۔ میں اپنی کارکردگی پر کافی مطمئن تھا۔ لیکن ابھی تک اس کیس کی نہایت ہی اہم نکتہ عدالت کے علم میں لانے میں کامیاب رہا تھا کہ اشتیاق بیگ کو جس بھی شخص نے قتل کیا وہ بائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی تھا یعنی وہ لیفٹ ہینڈ تھا جبکہ آئی او نے اس امر کی تصدیق کی تھی کہ میری مٹوکل اور اس کیس کی طرز وحیدہ رائٹ ہینڈ تھی۔
 اس پیشی پر استقلاش کی جانب سے تین گواہ پیش کیے گئے جن میں صرف ایک کا بیان قابل ذکر اور اہمیت کا حامل ہے۔ میں یہاں پر اسی گواہ کا احوال بیان کر دیاں گا۔
 مقتول کے بچنے کے عین سامنے جو بنگلا واقع تھا اس کے چوکیدار نے وقوعہ کے روز طرز کو اپنے بچنے سے نکلنے دیکھا تھا یعنی مقتول کے بچنے سے۔ مذکورہ چوکیدار نما لازم کا نام افضل خان تھا۔ افضل خان کی عمر چونتیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد کا مالک اور عام شکل و صورت والا شخص تھا۔ افضل خان نے بچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرایا۔ اس کے بعد وکیل استقلاش نے اس سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔
 ”افضل خان! تم نے وقوعہ کے روز جس عورت کو مقتول کے بچنے سے نکلنے دیکھا تھا کیا وہ یہی ہے؟“ بات

کے اختتام پر وکیل استغاثہ نے انگلی سے اکیوڈ باکس میں کھڑی میری ٹوئٹ کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔
 ”جی جی..... بالکل سچی تھی۔“ گواہ نے جواب دیا۔
 ”ڈراما سوچ کر بتاؤ، یہ کتنے بیچے کا واقعہ ہے؟“ وکیل استغاثہ نے استفسار کیا۔
 ”سازمے دس بجے گا۔“ گواہ نے بڑے اعتماد سے بتایا۔
 مجھے یہ سمجھ لینے میں کوئی وقت..... محسوس نہیں ہوئی کہ گواہ ایک رٹا ہوا بیان دے رہا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول اشتیاق بیگ کی موت دس اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی گواہ کے سازمے دس بجے والے بیان سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ملزم اپنے مالک کو قتل کرنے کے بعد جھگڑے سے لگی تھی۔
 ”تم نے ملزم کے انداز میں کوئی خاص بات نوٹ کی؟“ وکیل استغاثہ نے پوچھا۔
 ”جی.....“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا۔ ”اس نے باہر آ کر گیٹ کو بند کیا اور کئی بھی لگا دی۔“
 ”یعنی گیٹ کو باہر سے کئی لگا دی؟“ وکیل استغاثہ نے تصدیق طلب نظر سے افضل خان کی طرف دیکھا۔
 ”جی بالکل..... باہر سے کئی لگا دی۔“ گواہ نے بڑے وقوف سے جواب دیا۔ ”مجھے اس کی اسرار سے حیرت ہوئی تھی۔“
 ”کیا تم نے اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ گیٹ کو باہر سے کئی کیوں لگا کر جا رہی ہے؟“ وکیل استغاثہ نے پوچھا۔
 ”میرے دل میں تو آیا تھا کہ اس سے پوچھوں لیکن اس نے اتنا سوچ ہی نہیں دیا.....“
 ”سنتی خیر انداز میں استفسار کیا۔
 ”جناب! اس اللہ کی بندی نے جلدی سے گیٹ بند کر کے باہر سے کئی لگا لی اور اس سے پہلے کہ میں اسے آواز دے کر روکتا اور کوئی سوال کرتا، یہ آفتابا میری نگاہ سے غائب ہو گئی۔“
 ”نگاہ سے غائب ہو گئی.....“ وکیل استغاثہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ملزم نے کوئی جادوئی عمل کیا تھا؟“
 ”نہن..... نہیں جناب۔“ وہ جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میرا مطلب یہ تھا کہ یہ تقریباً بھاگنے والے انداز میں تیز تیز چلتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئی۔“

تھی جیسے..... جیسے.....“
 ”کیا جیسے؟“ وکیل استغاثہ نے لقمہ دیا۔ ”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“
 ”جیسے اسے ڈر ہو کہ اگر یہ ایک لمحہ بھی وہاں ٹھہری تو کوئی اسے پکڑے گا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔“
 ”مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!“ وکیل استغاثہ نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر قاتحانہ انداز میں میری جانب نکلے لگا۔
 میں وکیل استغاثہ کے اس انداز کی تہ میں جیسے ہوئے قاتحانہ جذبات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ گواہ کی زبان سے یہ کہو کہ بہت خوش تھا کہ وقوعہ کے روز جب ملزم مقتول کے بیٹکے سے رخصت ہوئی تو بے حد گھبراہٹ ہوئی تھی جیسے اسے ڈر ہو کہ کوئی اسے پکڑنے لے یعنی..... وہ کوئی ایسا کارنامہ انجام دے کہ بیٹکے سے لگی تھی جس کے نتیجے میں گرفتاری کا اندیشہ ہو۔
 میں اپنی باری پر وٹس باکس کے قریب آ گیا پھر استغاثہ کے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی جرح کا آغاز کیا۔
 ”افضل خان! تم نے جھوٹی کہانی کہہ کر اپنے لیے سبکی رقم وصول کی ہے؟“
 ”یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں.....“ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔
 ”آپ کی جیشن پورا آئے؟“ وکیل استغاثہ نے فوراً ٹانگ اڑا دی۔ ”میرے فاضل دوست، استغاثہ کے معزز گواہ پر الزام لگا رہے ہیں۔ دس الزامات فیئر۔“
 جج نے مجھے ہدایت کی کہ میں متعلقہ امور کو مد نظر رکھتے ہوئے گواہ سے سوال کروں۔ میں نے نہایت ہی فرماں برداری سے سرکوشا ثباتی جنیش دی اور گواہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔
 ”افضل خان! تمھاری دیر پہلے تم نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز جب تم نے گھبرائے ہوئے انداز میں ملزم کو مقتول کے بیٹکے سے نکلے دیکھا اس وقت دوپہر کے بارہ بجے تھے۔“
 یہ بات میں نے گواہ کو چکر دینے کے لیے کہی تھی۔ میں نے افضل خان کے حوالے سے کافی ہوم ورک کر رکھا تھا اور اسے جکڑنے کے لیے ایک نادیہ جال بھی اس کے اوپر پھینک چکا تھا۔

میرے سوال کے جواب میں وہ تارت بولا۔ ”میں نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کہا.....“
 ”پھر تم نے کیا بتایا تھا؟“ میں نے بہت مصحوبیت سے پوچھا۔
 ”میں نے تو کہا تھا کہ اس وقت ساڑھے دس بجے تھے۔“
 ”نفس ساڑھے دس؟“ میں نے نفوس لہجے میں پوچھا۔
 ”جی بالکل۔“ اس نے جواب دیا۔
 ”کیا تم وقت کا درست اندازہ لگانے کے ماہر ہو یا تم نے گھڑی میں وقت دیکھا تھا جو اتنے وقوف سے بتا رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
 ”میں نے گھڑی میں وقت دیکھا تھا۔“ اس نے بتایا۔
 ”اوکے..... تمھاری گھڑی کا وقت تو درست ہے نا؟“
 ”اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔
 میں نے اپنی فائلوں میں سے چند کاغذات نکال کر جج کی جانب بڑھا دیے۔ جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے کہا۔
 ”جناب عالی! یہ وقوعہ کے روز یعنی بیس جنوری کا مقتول کے ٹیلی فون کا کال ریکارڈ ہے۔ اس ریکارڈ کے مطابق مذکورہ نمبر پر دن کے پہلے مجھے میں، پہلے ساڑھے نو بجے اور پھر پونے گیارہ بجے کال آئی تھی۔ ان دونوں کالز کی تاریخ بیس جنوری بروز صحت کی جا چکی ہے لیکن میں ایک مرتبہ پھر مختصر ذکر کروں گا.....“
 ”محالی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر سلسلہ بیان کو آگے بڑھا تو ہوئے کہا۔
 ”ساڑھے نو بجے کسی کا فون آتا ہے۔ مقتول کی بیوہ نرس فون اینڈ کرتی ہے اور ملزم کو بتاتی ہے کہ کسی میڈیکل انسور والے کا فون ہے۔ اس کے بعد نرس بیٹکے سے رخصت ہو جاتی ہے۔ پھر دس بیسٹائیس یعنی پونے گیارہ بجے ای نرس پر ملزم، نرس کی کال ریسپونڈ کرتی ہے اور نرس اسے بتاتی ہے کہ وہ دس پندرہ منٹ میں واپس آ جائے گی۔ اگر وہ مزید چند منٹ لیٹ ہو جائے تو ملزم اپنے وقت پر یعنی ٹھیک گیارہ بجے چلی جائے۔ ملزم نے اپنی ماکن کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے گیارہ بج کر پانچ منٹ پر بنگلا چھوڑا اور گیٹ کو باہر سے کئی لگا کر فیاض شیخ کے گھر کی جانب روانہ ہو گئی لیکن.....“ میں نے ایک مرتبہ پھر ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر استغاثہ کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
 ”لیکن..... افضل خان کا دعویٰ ہے کہ اس نے ملزم کو ٹھیک ساڑھے دس بجے بیٹکے سے گھبرائے ہوئے انداز میں نکلے، گیٹ کو باہر سے کئی لگا تے اور وہاں سے فرار ہوتے

انچارج

میاں، بیوی چوری کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔
 خاوند۔ ”جو شخص چوری کرتا ہے وہ بعد میں ضرور پچھتا تا ہے۔“
 بیوی رومانگ موڈ میں بولی۔ ”اور آپ نے جو شادی سے پہلے میری نیندیں چرائی تھیں، ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟“
 خاوند۔ ”کواس کر تو رہا ہوں، وہ بعد میں ضرور پچھتا تا ہے۔“
 مرسلہ۔ قاضی عرفان احمد عاجز، چو آسیدن شاہ

دیکھا تھا جبکہ حالات و واقعات اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ افضل خان کے بتائے ہوئے وقت پر ملزم مقتول کے بیٹکے کے اندر موجود تھی اور کم از کم پونے گیارہ بجے تک وہ بیٹکے ہی میں موجود تھی۔ کیونکہ ٹھیک پانے گیارہ بجے نرس اور ملزم کی فون پر بات ہوئی تھی۔
 جج نے گھور کر افضل خان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”تم نے غلط بیانی سے کیوں کام لیا۔ کیا تمہیں پتا ہے، اس دروغ گوئی پر تمہارے خلاف تعزیری کارروائی بھی ہو سکتی ہے؟“
 ”مجھے معاف کر دیں جناب۔“ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔ ”ہوسکتا ہے، اس دن میری گھڑی میں کوئی خرابی ہو گئی ہو۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ ساڑھے دس بجے ملزم بیٹکے کے اندر موجود تھی اور پونے گیارہ بجے اس کی نرس سے فون پر بات ہوئی تھی تو میں ایسا بیان نہ دیتا۔“
 ”بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔“ جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”افضل خان!“ میں اپنے کام سے لگ گیا۔ ”تم نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ ملزم نے تمہیں بات کرنے کا موقع فراہم نہیں کیا تھا ورنہ تم اس سے بہت کچھ کہنے والے تھے۔“
 ”جی، میں نے یہی کہا ہے۔“ وہ قدرے سنہیلے ہوئے بولا۔ ”میں اس کی گھبراہٹ اور پریشانی کا سبب جانتا چاہتا تھا۔“

”تم جسے میری غلط فہمی کہہ رہے ہو، وہ ایک سفاک حقیقت ہے اور اس حقیقت کے نصف درجن گواہ بھی ہیں جن میں تمہاری گلی کے کونے پر واقع جنرل اسٹور کا مالک ظہیر الدین اور اس کے برابر میں موجود پان فروش شاکر بھی شامل ہے۔“ آئی جی..... یا پہلی ہی جلی جی؟“

وہ پریشان ہو کر ادھر ادھر کھٹکتے لگا۔ ”جج نے مجھ سے پوچھا۔ ”بیگ صاحب! یہ غلط فہمی والا کیا معاملہ ہے؟“

”جناب عالی!“ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر بڑی کراری آواز میں بولنا شروع کیا۔ ”استغاثہ کا محزر گواہ افضل خان کافی عرصے سے ملزم پر ”گاہ“ رکھے ہوئے تھا اور میری معلومات کے مطابق یہ کوئی اچھی گاہ نہیں تھی۔ میری معلومات کی تصدیق کے لیے جنرل اسٹور کے مالک ظہیر الدین اور پان فروش شاکر کو عدالت میں بلایا جاسکتا ہے۔ یہ دونوں افراد اس شرمناک واقعے کے معنی شاید ہیں جب نصف درجن افراد نے افضل خان کی درگت بنائی تھی اور وہ بھی بیچ چوراپے پر.....“ میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے وقف کیا پھر اپنی بات گوراز کرتے ہوئے مزید کہا۔

”جیسا کہ میں نے بتایا، گواہ ملزم پر کافی عرصے سے بری نظر رکھے ہوئے تھا۔ جب بھی اسے موقع ملتا، یہ ملزم سے بات کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کی ایک دو تین کوششیں گواہ کو بہت مشکلی پر دیتی۔ جب گلی کے کونے پر گواہ نے ملزم کو زبردستی روکنے کی کوشش کی۔ ملزم نے اس کے منہ پر زنائے دار طمانچہ رسید کیا تو اس پاس موجود افراد ان کی جانب متوجہ ہو گئے پھر اس سرعام بدتمیزی پر ”عوام“ نے افضل خان کی خوب خاطر تواضع کر ڈالی تھی اور اب.....“ میں نے لچائی توقف کر کے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر جج کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کر دی۔

”اور اب..... یعنی وقوعہ کے روز جب افضل خان نے دیکھا کہ ملزم کو اشتیاق بیگ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے تو یہ اپنی اس دن والی بے عزتی کا ملزم سے بدلہ لینے کے لیے اس نوعیت کا بیان دینے کے لیے تیار ہو گیا جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ وقوعہ کے روز ملزم کچھ اس قدر گھبرائے ہوئے انداز میں مقتول کے پینکے سے رخصت ہوئی تھی جیسے وہ اشتیاق بیگ کو قتل کر کے فرار ہو رہی ہو۔“

میں خاموش ہوا تو عدالت کے کمرے میں موجود افراد کی سرگوشیاں ایک مخصوص نوعیت کی سمجھناہٹ کی صورت میں ابھرنے لگیں۔ لوگوں کی اکثریت ناپسندیدہ

نظروں سے استغاثہ کے گواہ افضل خان کو دیکھ رہی تھی چہ میگوئیاں بھی کر رہی تھی۔

جج نے ”آرڈر..... آرڈر“ کی صدا بلند کر کے عدالت کے کمرے کے مخصوص سکون کو قائم کیا اور خاصے سخت الفاظ میں گواہ افضل خان کو سرزنش کی۔ اس کے بعد وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”بیگ صاحب! آپ کو گواہ سے اور تو کچھ نہیں پوچھنا؟“

”نہیں جناب عالی!“ میں نے نہایت ہی مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”استغاثہ کے محزر گواہ کی بدتمیزی اور دروغ گوئی عدالت کے ریکارڈ پر آچکی ہے۔ مجھے افضل خان سے مزید کچھ نہیں پوچھنا البتہ..... عدالت سے میری ایک چھوٹی سی درخواست ہے۔“

”یہی درخواست؟“ جج نے مجھ سے استفسار کیا۔ ”فیاض شیخ کی بیوی امینہ اس وقت عدالت کے کمرے کے باہر موجود ہے۔ میں نے بڑی رمان سے جواب دیا۔ ”میں نے امینہ کو صفائی کے گواہ کی حیثیت سے بلایا ہے۔ اس کی گواہی ہو جائے تو میری مشکلی کے بے گناہی مزید ثابت ہو جائے گی۔ میں محزر عدالت کی اجازت سے امینہ کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ جج نے اجابت میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

امینہ فیاض شیخ کی بیوی بہت موٹی اور غصہ ور عورت تھی۔ فیاض شیخ بھی اس کے سامنے بھیجا ہوا ہی نظر آتا تھا۔ ملزم نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ڈرا ڈرا سی بات پر آپ سے باہر ہو جاتی تھی اور اسے ڈانٹ ڈپٹ کیا کرتی تھی۔ میرے شاریات کے مطابق امینہ کی گواہی میری مؤکل کے لیے کافی سودمند ثابت ہونے والی تھی۔

امینہ نے جج بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کر دیا تو میں مختصری جرح کے لیے وٹس باکس کے قریب چلا گیا۔

”امینہ جی.....!“ میں نے انگلی سے اکیوڈ باکس میں موجود اس کیس کی ملزمہ وحیدہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا آپ اس عورت کو جانتی ہیں؟“

”جی بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کچھ عرصہ پہلے یہ میرے گھر میں کام کر چکی ہے۔“

”پھر اس نے آپ کے گھر کا کام کیوں چھوڑ دیا؟“ میں نے پوچھا۔

کہنہ مشتاق

”اس نے کام چھوڑا نہیں بلکہ یہ قتل کے کیس میں گرفتار ہو گئی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”اس لیے یہ میرے گھر میں کام کرنے نہیں آسکی۔“

”کیا آپ کو لگتا ہے کہ اس بے چاری نے اپنے مالک اشتیاق بیگ کو قتل کیا ہوگا؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”یہ تو اللہ کو پتا ہوگا یا پھر آپ جیسے قانون دانوں کو۔“ وہ قدرے بیزار سی بولی۔ ”میں کیا جانوں!“

”اوکے۔“ میں نے مصحلت آمیز انداز میں گردن ہلائی۔ ”آپ اتنا تو جانتی ہوں گی کہ ملزم کس کردار کی مالک ہے؟“

”میں آپ کا سوال سمجھ نہیں پاتی۔“ اس نے ابھین زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

”میرا مطلب ہے، یہ اپنے اخلاق اور برتاؤ میں کسی ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اس میں چوری چکاری کی عادت تو نہیں ہے؟“

”جی بالکل نہیں۔“ وہ قطعیت سے بولی۔ ”مجھے مرمر اپنی قبر میں جانا ہے اور خدا کو حساب دینا ہے اس لیے میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ اس عورت نے میرے گھر سے بھی کوئی معمولی سی چیز بھی نہیں چرائی۔ یہ اپنے کام سے کام لے کر، اپنی باسی کے اور اپنا کام جان لاکر بڑی سخت سے کرتی ہے۔“

”اس کے باوجود بھی اسے آپ کی ڈانٹ ڈپٹ سنتا پڑتی ہے۔“ میں نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں..... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”ڈانٹ ڈپٹ بہت ضروری ہے۔ اس سے انسان کا دماغ درست رہتا ہے۔“

”میرے معلومات کے مطابق، ملزمہ روزانہ دوپہر گیارہ بجے بسے ایک بجے تک آپ کے گھر کام کرنے آیا کرتی تھی۔“ میں نے اصل نکتے کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ”کیا وقوعہ کے روز بھی یہ اپنے وقت پر ہی آئی تھی؟“

”جی نہیں۔“ اس نے غمی میں گردن ہلائی۔ ”یہ عموماً گیارہ بج کر پانچ منٹ پر آ جاتا کرتی تھی لیکن اس روز یہ تقریباً پانچ منٹ لیٹ آئی تھی لہذا میں نے اسے چھٹی بھی لیٹ ہی دی تھی۔“

”اوہ.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”تو وقوعہ کے روز آپ نے اسے دیر سے چھوڑا تھا؟“

”زیادہ دیر سے نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”یہ

پانچ منٹ لیٹ آئی تھی۔ میں نے اسے دس منٹ لیٹ چھوڑا۔ یہ ایک بج کر دس منٹ پر میرے گھر سے نکلی تھی۔“

”امینہ جی! ایک نہایت ہی اہم سوال کر رہا ہوں۔ ذرا سوچ کر جواب دیجیے گا۔“ میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے لہجے میں کہا۔

”وہ بہت تن گوش ہو گئی۔ میں نے اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”وقوعہ کے روز یعنی میں جنوری کو ملزمہ نے دوپہر گیارہ دس سے ایک دس تک آپ کے گھر میں کام کیا۔ کیا آپ نے اس کے انداز میں کوئی خاص تبدیلی محسوس کی؟“

”کس قسم کی تبدیلی؟“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ”مثلاً کسی نوعیت کی بے چینی، اضطراب، پریشانی، بوکھلاہٹ یا گھبراہٹ.....؟“

”نہیں، میں نے اس میں ایسی کوئی بات نوٹ نہیں کی۔“ اس نے پُر وثوق انداز میں کہا۔ ”اس نے معمول کے مطابق کام کیا اور پہلی گئی۔“

”محزر عدالت کے سامنے حقیقت بیانی کا بہت شکر ہے۔“ میں نے امینہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر جج کی جانب رخ پھیر کر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

”مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!“ اس نے اسے ساتھ ہی عدالت کا محزر روک کر قلم بٹوئی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں لے کر عدالت کی درخواست کرنے کا اعلان کر دیا۔

”دی کورٹ از اڈجٹ چارنڈ.....!“

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور وٹس باکس میں اس کیس کی سب سے اہم گواہ یعنی مدعی نمبرس کھڑی تھی۔ گزشتہ تین جنوری کو نمبرس کے شوہر اشتیاق بیگ کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا لیکن نمبرس کے بناؤ سنگار اور پہناؤ سے لگتا نہیں تھا کہ وہ بیوہ ہو۔

وکیل استغاثہ اپنا ”کام“ مکمل کر چکا تو میں جرح کے لیے نمبرس والے کٹہرے کے نزدیک چلا گیا پھر اس کے چہرے پر نگاہ بھا کر ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

”نمبرس صاحب! مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ کچھ عرصہ قبل آپ کے شوہر کو قتل کر دیا گیا۔ میں آپ کے دکھ درد میں برابر کا شریک ہوں مگر یہ کارروائی بھی ضروری ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ وہ سپاٹ آواز میں بولی۔ ”جب یہ کیس عدالت میں لگا ہوا ہے تو پھر یہ سب تو ہونا ہے۔ آپ اپنا کام شروع کریں۔“

”زمکس صاحب! کیا یہ درست ہے کہ وقوعہ کے روز یعنی بیس جنوری کی صبح آپ کو اچانک گھر سے باہر جانا پڑ گیا تھا۔ ایک فون آیا تھا اور.....“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”جی، یہ درست ہے۔ وہ ایک میڈیکل اسٹور والے کا فون تھا۔ ڈاکٹر نے میرے نوٹ پر کو جو ادویات لکھ کر دی تھیں ان میں ایک گولی اکثر مارکیٹ سے شارٹ رہتی تھی اور اسے تلاش کرنے میں مجھے کافی دشواری ہوا کرتی تھی۔ میں نے اس میڈیکل اسٹور والے سے کہہ رکھا تھا کہ جب بھی اس کے اسٹور پر یہ گولی آئے تو وہ فوراً مجھے اطلاع دے۔“

”تو یہ ٹیلی فونک اطلاع اسی سلسلے میں تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”جی..... جی ہاں۔“ اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

میں نے اپنی فائلوں کے پاس رکھی ایک کتاب کو اٹھا کر زمکس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ فیض احمد فیض صاحب کی شاعری کا مجموعہ ہے۔ کیا آپ نے یہ کتاب پڑھ رکھی ہے؟“

اس نے گہری سانس لی اور مجھے دیکھ کر لہجائی تذبذب کے بعد وہ کتاب میرے ہاتھ سے لے کر سرسری انداز میں اس کا جائزہ لینے کے بعد مجھے واپس کر کے ہوئے کہا۔

”نہیں..... میں نے یہ کتاب نہیں پڑھی۔“

”کوئی بات نہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر انسان نے ہر کتاب پڑھ رکھی ہو۔“ میں نے مذکورہ کتاب اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا پھر سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”اگر میری معلومات غلط نہیں ہیں تو آپ کی رہائش تارکھ ناظم آباد کے علاقے میں ہے۔ آپ دو سو گز کے ایک عالی شان بنگلے میں رہتی ہیں جو دو بیڈروم ایک ڈرائنگ روم، ایک ٹی وی لائونج اور خوب صورت لائن پر مشتمل ہے۔“

”آپ کی معلومات بالکل درست ہیں۔“ وہ میرے پھیلے ہوئے جال میں قدم رکھتے ہوئے بولی۔ ”یوں محسوس ہوتا ہے آپ نے میرے بنگلے کا وز کر رکھا ہو۔“

”ابھی تک تو نہیں کیا.....“ میں نے سختی خیز انداز میں کہا۔ ”لیکن اگر ضرورت محسوس ہوئی تو آئندہ پیشی سے پہلے یہ نیک کام بھی کرنا پڑے گا۔ اپنی ہاؤس.....“ میں نے لہجائی

توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر سلسلہ سوالات کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”جس شخص نے وقوعہ کے روز آپ کو کسی مخصوص ٹیلیٹ کے بارے میں فون کیا تھا، اس کا اسٹور بھی تارکھ ناظم آباد میں ہے۔“

”جی!“ اس نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

”تارکھ ناظم آباد کو اپنی کافی خاص وسیع و عریض علاقہ ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”کیا مذکورہ میڈیکل اسٹور آپ کے گھر کے نزدیک ہی ہے یا کچھ فاصلے پر؟“

”نہ زیادہ دور نہ زیادہ نزدیک۔“ اس نے جواب دیا۔ ”دس سے پندرہ منٹ کا فاصلہ ہو گا۔“

”دس سے پندرہ منٹ۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”پیدل یا کار میں؟“

”جی پیدل..... مطلب واکنگ ڈسٹینس ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اُدھے..... مگر آپ تو وقوعہ کے روز اپنی گاڑی لے کر گھر سے نکلی تھیں؟“

”جی، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے ایک دو کام اور بھی تھے اور گاڑی ضروری تھی۔“

”وقوعہ کے روز آپ نے پہلے وہ دو کام حاصل کی تھے یا پہلے وہ دوسرے ایک دو کام نمٹائے تھے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”ظاہر ہے، میں نے پہلے وہ دو کام حاصل کی تھے۔“ اس نے بڑی رसान سے جواب دیا۔ ”دوسرے کام تو کسی وقت بھی کیے جاسکتے تھے۔“

”زمکس صاحب! کیا آپ معزز عدالت کو اس میڈیکل اسٹور والے شخص کا نام بتانا پسند کریں گی جس نے وقوعہ کے روز فون کر کے آپ کو اس دوا کی دستیابی کی اطلاع دی تھی۔“

”کیوں.....“ وہ بد کے ہوئے انداز میں بولی۔

”اس کے نام کی کیا ضرورت ہے؟“

”آئیٹیمشن یور آئر۔“ وکیل استقانی نے احتیاجی لہجے میں کہا۔ ”ڈیفینس استقانی کی معزز گواہ کو خواہ مخواہ ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”اٹ اٹناٹ فیر۔“ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! میری صورت ایسی خوف ناک ہے، نہ میں نے ہاتھ میں آتشیں اسلحہ اٹھا رکھا ہے اور نہ ہی میں نے ابھی تک کوئی جارحانہ

دھمکی آمیز الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ پھر معزز گواہ کس چیز سے ہراساں ہو رہی ہیں۔ معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ مجھے اپنی جرح مکمل کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔“

جج نے زمکس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بی بی! آپ کو اس میڈیکل اسٹور والے شخص کا نام بتانا ہو گا جس نے وقوعہ کے روز آپ کو فون کیا تھا۔ ہو سکتا ہے تمہارے بیان کی تصدیق کے لیے اسے عدالت میں طلب کرنے کی ضرورت پیش آجائے۔“

”جی..... فرحان! وہ جلدی سے بولی۔ ”اس کا نام فرحان ہے۔“

”بیک صاحب! پلیز پروسیڈ۔“ جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”زمکس صاحب! میری معلومات اور ٹھیکہ ٹیلی فون کے ریکارڈ کے مطابق جج ساڑھے نو بجے آپ کے گھر کے فون پر کسی کی کال آئی تھی۔ آپ نے بتایا کہ اس میڈیکل اسٹور والے فرحان نے بیس جنوری یعنی وقوعہ کے روز ٹھیک ساڑھے نو بجے آپ کو اس مخصوص ٹیلیٹ کے بارے میں فون کر کے اطلاع دی تھی۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں۔“

”میں آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔“ وہ تانیذی لہجے میں بولی۔

”آپ اپنی گاڑی لے کر بنگلے سے نکلیں۔ سب سے پہلے آپ نے وہ ٹیلیٹ حاصل کیا پھر اپنے دوسرے کام نمٹانے چلی گئیں۔ ایسا ہی ہوا تھا؟“

”جی..... جی۔“ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”مذکورہ میڈیکل اسٹور آپ کے بنگلے سے واکنگ ڈسٹینس پر ہے۔“ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے بقول دس سے پندرہ منٹ کا فاصلہ..... گاڑی میں تو اور بھی کم وقت لگا ہو گا.....؟“

”جی۔ میں پانچ چھ منٹ میں وہاں پہنچ گئی تھی۔“

”یعنی زیادہ سے زیادہ نو بج کر چالیس منٹ پر آپ نے وہ میڈیسن حاصل کر لی تھی؟“ میں نے ٹھونکنے والے انداز میں سوال کیا۔

”جی، بالکل.....“ اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”زمکس صاحب! ذرا سوچ کر بتائیں.....“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر ڈرامائی انداز میں پوچھا۔

”بیس جنوری کو کراچی میں سن رائزر (طلوع آفتاب) صبح سات بج کر سترہ منٹ پر تھا اور سن سیٹ (غروب آفتاب) شام چھ بج کر چھ منٹ پر تھا۔“

”مگر..... میں کیا کروں.....“ وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی۔ ”آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں.....؟“

”اس لیے بتا رہا ہوں کہ مجھے آپ سے ایک نہایت ہی اہم سوال کرنا ہے۔“ میں نے ٹھونس لہجے میں کہا۔

”کون سا اہم سوال؟“ اس کے چہرے پر گھبراہٹ نمودار ہوئی۔

”بیس جنوری کی صبح کراچی کے مشرقی افق پر صبح سات بج کر سترہ منٹ پر سورج طلوع ہوتا ہے اور ٹھیک دو گھنٹے تیرہ منٹ بعد یعنی ساڑھے نو بجے فرحان صاحب آپ کو فون کر کے ٹیلیٹ لے جانے کے لیے کہتے ہیں اور آپ نے ابھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ آپ نے نو بج کر چالیس منٹ پر وہ دوا حاصل کر لی تھی یعنی نو بجے سے بھی پہلے.....“ میں نے تھوڑا توقف کر کے حاضریں عدالت پر ایک نگاہ ڈالی پھر استقانی کی گواہ سے استفسار کیا۔

”زمکس صاحب! آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ کراچی کی ہسٹری میں یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ میڈیکل اسٹور گیارہ بجے یا اس سے بھی پہلے کھلے ہوئے ہوں گے۔ کیا فرحان صاحب کا میڈیکل اسٹور کراچی کی حدود سے باہر ہے یا وہ بیس جنوری کو علی الصبح اپنا اسٹور کھول کر کراچی کی ہسٹری میں اپنا نام ذرا مختلف انداز میں لکھوانے کے متنبی تھے.....؟“

”وہ..... وہ جی.....“ وہ بری طرح پریشان ہو گئی۔

”وہ جی اور یہ جی سے کام نہیں چلے گا۔“ میں نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔ ”آپ جو بھی جواب دیں گی اس کی تصدیق کے لیے فرحان صاحب کو عدالت میں بلایا جائے گا۔“

وہ بے حد گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”وہ دراصل فرحان کا اسٹور اس وقت بند تھا۔ اس نے اپنے گھر سے مجھے فون کیا تھا۔“

اس کی آنکھیں اور چہرہ زبان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ دروغ گوئی سے کام لے رہی تھی۔ میں نے اس پر چڑھائی کر دی۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے وہ میڈیسن فرحان کے میڈیکل اسٹور سے نہیں بلکہ اس کے گھر سے جا کر حاصل کی تھی؟“

”جج..... جی.....“ وہ بس اتنا ہی کہہ پائی۔

”یہ امیر جنسی عقل سے باور ہے۔“ میں نے سخت الفاظ میں کہا۔ ”خیر..... فرحان کو تو عدالت میں طلب کرنا تاگزیر ہوئی چکا ہے کیونکہ ٹھوڑی دیر پہلے آپ بتا چکی ہیں کہ وقوعہ کے روز آپ نے وہ میڈیکل فرحان کے میڈیکل اسٹور سے حاصل کی تھی۔ اب تو مجھے آپ کی اس بات پر بھی یقین نہیں رہا کہ یہ کتاب.....“

میں دانستہ اپنی بات نامکمل چھوڑ کر فیض صاحب کے شعری مجموعے کی جانب بڑھا اور ایک مرتبہ پھر وہ کتاب ”زنگس“ کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے پوچھا۔

”اچھی طرح سوچ کر بتائیں، یہ کتاب آپ نے پڑھ رکھی ہے یا نہیں؟“

”نہیں..... بالکل نہیں۔“ وہ پوری قطعیت سے بولی۔

”اوکے“ میں نے ایک بار پھر وہ کتاب اس سے واپس لے کر چوٹی میز پر رکھ دی پھر استفسار کی سب سے اہم گواہ کے قریب پہنچ کر کہا۔ ”زنگس صاحب! وقوعہ کے روز آپ نے دس بیج کر پینتالیس منٹ پر یعنی پونے گیارہ بجے..... اپنے بیٹکے پرفون کر کے مزمہ سے کہا تھا کہ آپ گھر کے قریب ہی کہیں موجود ہیں اور دس پندرہ منٹ بعد آپ پہنچ رہی ہیں؟“

”جی نہیں۔“ میں نے یہی کہا تھا۔ ”میں نے ذرا سنبھل کر جواب دیا۔

”اور مزمہ سے آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے وقت پر یعنی شیک گیارہ بجے چھٹی کر کے چلے جائے اور.....“

”نہیں!“ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ”میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ میری واپسی تک بیٹکے پر ہی رکے۔ میں دس پندرہ منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ مزمہ نے غلط بیانی سے کام لیا ہے؟“ میں نے کہا۔

”جی ظاہر ہے۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

”پونے گیارہ بجے آپ اپنے بیٹکے سے دس پندرہ منٹ کے فاصلے پر تھیں۔“ میں نے جیسے ہوئے انداز میں سوال کیا۔ ”لیکن آپ کی واپسی ساڑھے بارہ بجے ہوتی ہے۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گی کہ آپ نے یہ پونے دو گھنٹے کہاں گزارے تھے؟“

”جب میں نے مزمہ کو فون کیا اس وقت میں واقعی گھر سے دس پندرہ منٹ کے فاصلے پر ایک جگہ پر تھی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”لیکن پھر اچانک مجھے ایک کام یاد آ گیا۔ میں مطمئن تھی کہ میں نے مزمہ کو گھر پر رکھنے کے

لے کہہ دیا ہے۔“

”اوہ..... اگر ضروری سمجھا گیا تو آپ کے اس اچانک یاد آ جانے والے ضروری کام کی تفصیلات بھی طلب کرنی چاہئیں گی۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”میری مٹوکل اور اس کیس کی مزمہ وحیدہ کے بیان کے مطابق آلٹول یعنی گوشت کاٹنے والی وہ تیز و ہار چھری جس سے آپ کے شوہر کو زخم کیا گیا، چند روز پہلے وہ چھری چکن میں سے غائب ہو گئی تھی۔ آپ اس بارے میں کیا کہتی ہیں؟“

”ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔“ وہ ناپسندیدہ نظر سے مزمہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ جھوٹ بول رہی ہے۔“

”اوکے..... جھوٹ اور جھگڑا کا فیصلہ کرنے کے لیے یہ عدالت لگی ہوئی ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”اس عدالت میں مزمہ پر دو کیس چل رہے ہیں۔ نمبر ون، اس نے آپ کے شوہر اشتیاق بیگ کو قتل کیا ہے۔ نمبر ٹو، اس نے آپ کی الماری میں سے دس ہزار نقدی اور لگ بھگ چالیس ہزار کے زیورات چرائے ہیں۔ کیا میں سچ کہہ رہا ہوں؟“

”جی..... اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

”میں آپ کے بیٹکے کے دو بیڈرومز کی دھج پڑی بیان کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اگر میں نہیں غلطی پر ہوا تو نوک دیکھیں گے گا وہ ہاں ہیں۔“ میں نے ایک مزمہ چھوٹی میز پر سے نیش احمد قریب کا شعری مجموعہ اٹھا لیا پھر اسے ”زنگس“ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جب تک میں اپنی بات مکمل کرتا ہوں اس کتاب کو آپ پکڑے رکھیں اور یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ اب آپ سے وہ سوال نہیں کروں گا جو پہلے دوبار کر چکا ہوں۔“

”لحاحی تذبذب کے بعد اس نے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے بولنا شروع کیا۔

”دونوں بیڈرومز بیٹکے کے پچھلے حصے میں بنے ہوئے ہیں۔ دونوں کا سائز بھی ایک جیسا ہی ہے یعنی بارہ فٹ اور دو فٹ کے داخلی دروازے مغربی سمت میں ہیں۔“

”بالکل درست۔“ اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

”میں نے اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”مقتول کا بیڈ اور وہ الماری جس میں سے نقدی اور زیورات چرائے گئے، یہ دونوں چیزیں دو مختلف بیڈرومز میں ہیں۔ مقتول کا بیڈ اپنے کمرے کی جنوبی دیوار کے ساتھ اور آپ کی الماری آپ کے بیڈروم کی شمالی دیوار کے ساتھ۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں جناب، آپ بالکل شیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ

حیرت سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے کیوں محسوس ہو رہا ہے جیسے آپ نے میرے گھر کا سروے کر رکھا ہو۔“

”مٹوکل کو اس نوعیت کی سازی معلومات رکھنا پڑتی ہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اور میرے خیال کے مطابق، مقتول اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹ کر آپ کے بیڈروم کی الماری کو نہیں دیکھ سکتا تھا؟“

”سوال ہی پائیدار نہیں ہوتا۔“ وہ دو ٹوک انداز میں بولی۔

”استفسار کے مطابق مزمہ نے پہلے آپ کی الماری میں سے نقدی اور زیورات چرائے۔ اس کے بعد آپ کے شوہر کو قتل کر کے بیٹکے سے روانہ ہو گئی۔“ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کیا کہتی ہیں؟“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ یہ دونوں کام مزمہ نے میرے سامنے ٹھوڑی کیے ہیں۔“ وہ ناگواری سے بولی۔

رپورٹ میں جو کچھ لکھا ہے، وہی درست ہے۔“

”استفسار کی رپورٹ کے مطابق پہلے مزمہ نے نقدی اور زیورات چرائے پھر خود کو دیکھ لے جانے کے خوف سے اس نے آپ کے شوہر کو قتل کر دیا لیکن آپ اس امر کی تصدیق کر چکی ہیں کہ آپ کا شوہر اپنے بیڈ پر لیٹے لیٹے دوسرے بیڈروم میں رہی آپ کی الماری کو نہیں دیکھ سکتا لہذا باغض خیال، اگر مزمہ نے آپ کی الماری میں سے نقدی اور زیورات چرائے تھے تو وہ آپ کے شوہر کے کمرے میں آئی نہیں سکتا اور پھر.....“

”لحاحی توقف کر کے میں نے ”زنگس“ کے چہرے پر ابھرنے والے پریشانی کے تاثرات کا جائزہ لیا اور کہا۔

”اور پھر پوسٹ مارٹم رپورٹ کہتی ہے کہ آپ کے شوہر کی موت نیند کے دوران میں ہوئی ہے یعنی اگر مزمہ نے چوری کی بھی تھی تو آپ کا شوہر کسی بھی قیمت پر اسے دیکھ نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ ناشتے والی دوا کے قتل بے ہوشی کی حالت میں تھا۔“

”یہ تو آپ بالکل شیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”اشتیاق کی ایک دوا ایسی ہے جس سے نیند آتی ہے۔“

”گو یا استفسار کا بیان درست نہیں۔“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”اگر مزمہ نے نقدی اور زیورات چرائے لیے تھے تو اسے آپ کے شوہر کو قتل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی؟“

”مگر اس چھری پر مزمہ کی انگلیوں کے نشانات ملے۔“ وہ ایک اہم نکتے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”آپ اتنی بڑی حقیقت کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں؟“

”جیسے دوسری اتنی بڑی حقیقت کو استفسار نے نظر انداز کر دیا ہے۔“ میں نے سناٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا..... مہ..... میرا مطلب ہے..... آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟“ وہ جلدی سے سنبھلتے ہوئے بولی۔

”میرا مطلب صرف اتنا ہے کہ آپ کی الماری پر مزمہ کے فنگر پرنٹس نہیں پائے گئے لیکن استفسار کو یقین ہے کہ نقدی اور زیورات اسی نے چرائے ہیں۔ دوسری جانب چھری پر مزمہ کے فنگر پرنٹس پائے گئے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ یہ قتل میری مٹوکل نے نہیں کیا۔“

”پتا نہیں آپ کس قسم کی الجھی ہوئی باتیں کر رہے ہیں۔“ وہ بیزاری سے بولی۔ ”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”سب سمجھ میں آجائے گا جب میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ آج عدالت میری مٹوکل کو بے گناہ مان کر رہا کر دے گی۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا اور زیر لب مسکراتے ہوئے یوں اضافہ کیا۔ ”لاکین، یہ کتاب مجھے دے دیں۔ اس کا کام ختم ہو چکا۔“

”اس کے چہرے پر الجھنوں کا حال جا بھل گیا۔

”شعری مجموعے کو میری جانب بڑھاتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ”اس کتاب کا کیا کام تھا جو پورا ہو گیا اور عدالت کس بنا پر مزمہ کو بری کر دے گی؟“

”زنگس صاحب! میں آپ کے دونوں سوالوں کا جواب دوں گا۔“ میں نے یہ دستور مسکراتے ہوئے کہا۔

”لیکن دوسرے سوال کا جواب پہلے اور پہلے سوال کا جواب بعد میں۔ آپ کو میری اس بے ترتیبی پر کوئی اعتراض تو نہیں؟“

”جی نہیں۔“ وہ ساٹ آواز میں بولی۔

”میں نے کھٹکھٹا کر گلا صاف کیا پھر کہا۔ ”عدالت آج میری مٹوکل کو اس لیے بری کرے گی کہ وہ دوا ایسی ہاتھ سے کام کرنے کی عادی یعنی راسٹ بینڈز ہے جبکہ آپ کے شوہر کا قاتل بائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی یعنی لیفٹ بینڈز ہے اور..... اس امر کی تصدیق ایک پچھلی پیشی پر اس کیس کے انکوائری آفیسر نے بھی کی ہے۔“

”اوہ.....“ وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئی پھر مضطرب نظر سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”میں اس کے کہہ سکیں استفسار ہمارے بیچ کو پڑتا،

”جناب عالی! جیسا کہ گزشتہ پیشی پر میں نے
انکوائری آفیسر صدر علی کی تصدیق سے یہ بات پایہ ثبوت کو
پہنچادی تھی کہ اشتیاق بیگ کو کسی لیفٹ اینڈر شخص نے موت
کے گھات اتارا ہے۔ اس پیشی پر میں نے کوشش کر کے اس
کیس سے متعلق افراد میں سے ایک لیفٹ اینڈر شخصیت
یعنی مقتول کی بیوہ نرگس صاحبہ کو ایک پوز کر دیا ہے۔ انہی کی
زمانی پتا چلا ہے کہ مقتول کا میجر فرید غوری بھی لیفٹ اینڈر

فرید غوری بلاشبہ اپنے کام کا باہر ایک کہنہ مشق کھلاڑی تھا
مگر وہی بات کہ شاطر سے شاطر شخص کو بھی ایک روز اس کی
عیاری لے ڈالتی ہے۔ فرید غوری کو بھی منہ کی کھانا پڑی تھی
(تحریر: حسام بٹ)

155



محبت کا بھرم رکھنے والے ایک دلبر کی بہادری کا دلچسپ کارنامہ

سیمیپنس ڈائجسٹ ————— 153 ————— جنوری 2015ء

نہیں ہیں جو یہ ظاہر نظر آرہے ہیں بلکہ ملزم کو پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں اسی شک کی بنیاد پر جیوری کے باقی گیارہ ارکان سے دس روز تک الجھتا ہوا اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن نہ تو وہ قائل ہو رہے تھے اور نہ ہی مجھے قائل کر سکے تھے۔ وہ اپنی سر توڑ کوشش کے باوجود مجھے میرے موقف سے ہٹانے میں ناکام رہے تھے۔ بعد ازاں یہ بات میرے علم میں آئی کہ میرا شک اپنی جگہ درست ہے۔ قتل کے پس پردہ وہی واقعات تھے جن کا میں نے اندازہ لگا لیا تھا۔ ملزم جارج نہیں جانتا تھا کہ اس کے ہاتھوں کو قتل بھی ہوا ہے۔

یہ درست ہے کہ مقدمے کے دوران یہ بات سامنے نہیں آئی تھی حالانکہ وہ احمق عدالت کو یہی بیان دینا چاہتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک سادہ لوح شخص تھا اور زندہ رہنا چاہتا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کا وکیل ہورس، بے حد محتاط اور زیرک واقع ہوا تھا۔ وکیل استیقا کا نام ریٹ تھا۔ وہ ایک تجربہ کار وکیل تھا اور اس کیس کے پرچے اڑانے پر تلا ہوا تھا۔ شکا کو جیسے ہنگامہ خیز شہر میں ہر سال ایک دو بڑے اور سستی خیز مقدمات پیش ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ مقدمہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اتنا دلچسپ اور سستی خیز تھا کہ عرصے تک اس کی بارگاہیت سنا لی جاتی رہی۔

میں شروع ہی سے اس مقدمے میں دلچسپی لیتا رہا اور حتیٰ کہ میرے دل میں یہ خواہش جاگ اٹھی کہ کاش مجھے اس مقدمے میں جیوری کا ایک رکن بنالیا جائے اور..... ایک روز خلاف توقع عدالت سے میرا بلاوا آ گیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں اس وقت تک اپنی بات منوانے کی کوشش کرتا رہوں گا جب تک باقی ارکان مجھ سے نجات نہیں حاصل کر لیتے۔ بہر حال یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ ساہا سال کے بعد مجھے ایک ایسے کیس میں جیوری کے رکن کی حیثیت سے طلب کیا گیا تھا جس نے مجھے سحر کر دیا تھا۔

اخبارات میں کیس کی تفصیل پڑھنے کے دوران ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان لوگوں کو جیوری کے ایک رکن کی شدید ضرورت ہے اور اب عدالت کے کمرے میں بیٹھنے کے بعد میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ اس سے قبل عدالت فیصلہ سنانے والے ممبران کی دو عدد فہرستیں خارج کر چکی تھیں کیونکہ ہر رکن اخبارات پڑھ کر اپنی رائے قائم کر چکا تھا۔ یہ ملزم جارج کے حق میں کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ وہاں پہلے سے دس اراکین جیوری

جلوہ افروز تھے۔ یہ لوگ اس جھوٹے مقدمے کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ اس موقع پر مجھے بھی جھوٹ کا سہارا لینا پڑا کیونکہ میں بھی دوسروں کی طرح شدت سے جیوری کے رکن کے فرائض انجام دینے کا خواہش مند تھا۔ مجھ سے کئی سوالات کیے گئے جن کا میں نے تسلی بخش جواب دیا۔ تب مجھے اس فرض کی اداسگی کی اجازت دے دی گئی۔ میں نے ان کے سوالوں کے جواب میں کہا تھا کہ میں نے اس مقدمے کی بابت بہت تھوڑا پڑھا ہے اور کوئی ذاتی رائے نہیں رکھتا اور یہ کہ میں سزائے موت کے خلاف نہیں ہوں۔ میں نے ساری عمر لگا کر تین جھوٹ نہیں بولے تھے۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد لوگ ایک ایک اور بڑے جھوٹے کو پکڑ لائے اور اس طرح ہم بارہ ہو گئے۔ بارہ معصوم جھوٹے۔

اگلے روز سے اس کیس کی جزیات سامنے آنے لگیں۔ میں نے نگاہیں گھما کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور مجھ پر یہ عقیدہ کھلا کہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی گیارہ مضحکہ خیز اعلیٰ درجے کی گواہیوں کو دیکھے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ سرکاری وکیل اور شاہد وکیل صفائی بھی یہی چاہتا تھا۔

خدا خدا کر کے مقدمے کی کارروائی کا آغاز ہوا لیکن میں پہلے ہی اس کیس کی تفصیل سے واقف تھا اور سب کچھ جانتا تھا۔ مقدمے کا سب سے اہم سرکاری گواہ کی پولیس مین وینی تھا۔ وہ ایک فربہ اندام اور خوش طبع شخص تھا۔ اس نے اپنے بیان میں کہا کہ ایک رات تقریباً دو بجے اس نے ملزم جارج کو ریو اور بدست کھڑا پایا تھا۔ اس سے کچھ قائلے پر ایک شخص کی لاش پڑی تھی اور ملزم ہکا بکا اپنے ریو اور کو گھور رہا تھا۔ جب اس نے ملزم سے پوچھا کہ اس نے اس شخص کو کیوں قتل کیا تو ملزم نے اعتراف جرم کرنے سے انکار کر دیا لیکن اپنے ہاتھ میں موجود ریو اور کا کوئی جواز پیش کرنے سے قاصر رہا۔

وینی کے بیان کے مطابق ملزم جارج نشے میں دھت تھا۔ اس نے موقع واردات سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کی تھی اور جب وینی نے اس سے کہا کہ وہ زیر حراست ہے تو وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا تھا۔ مقتول کی جلد ہی شناخت ہو گئی تھی۔ اس کا نام ہووارڈ تھا۔ وہ ایک رنڈا تھا۔ اسے دو گولیاں لگی تھیں۔ ایک گردن میں اور دوسری سینے میں۔ اس کی لاش اسی وقت مجسمہ وٹھین کے ادارے کو بھیج دی گئی اور ملزم جارج کو پولیس اسٹیشن کی ایک کھڑی میں بند کر دیا گیا جہاں وہ ساری رات گھوڑے سے بچ کر سوتا

رہا اور دن چڑھے بیدار ہونے کے بعد اس نے جرم کی صحت سے انکار کر دیا تھا لیکن بعد ازاں اس پر قتل کا الزام عائد کر دیا گیا تھا۔

ملزم جارج کا کہنا تھا کہ مقتول ہووارڈ اس کے لیے قتل کی اجنبی تھا۔ وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ چنانچہ نشے میں دھت ہونے کے باوجود اس کے پاس ہووارڈ کو قتل کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس نے اس بات سے بھی انکار کر دیا کہ اس کے پاس اس وقت یا زندگی میں کبھی ریو اور تھا۔ اس کی تصدیق اس کے دوستوں نے بھی کی جو سب کے سب معزز شہری تھے۔ جارج بذات خود ایک معزز شہری تھا اور سچ پوچھے تو بہت سی حقیقتوں میں ایک یہ حقیقت بھی اس کے خلاف جانی تھی۔ وہ خوش حال تھا، اچھے لباس زیب تن کرتا تھا اور اچھی شہرت رکھتا تھا۔ اس قسم کا کوئی آدمی اگر کسی سنگین جرم میں ملوث ہو جاتا ہے تو اس کے کارنامے کو بری طرح اچھالا جاتا ہے اور عام شہری تو درگناہ، بچ اور جیوری بھی اس سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ جب اس نے عدالت کو اس رات کا واقعہ سنایا تو اس کا وکیل ہورس تک یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی کہانی بالکل سچی اور بے جاں ہے۔

ملزم نے اس بات کا بھی اقرار کیا کہ جب اس نے قاتل کی آواز سنی تو اس کا رنڈا اپنے گھر کی جانب نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نشے میں دھت تھا اور خود اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ ولیم اسٹریٹ پر کیا کر رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ریو اور کیوں موجود تھا۔ یقیناً کسی نے اسے ریو اور تھا دیا ہوگا۔ بہر حال وہ صرف ایک ہی بات جانتا تھا کہ اس نے ہووارڈ کو قتل نہیں کیا تھا۔

وہ ایک خوب رو آدمی تھا۔ اس کی بیوی ایک نوجوان اور دلکش خاتون تھی لیکن اس واقعے نے اس کی ساری دلکشی چھین لی تھی اور اس کی حالت کسی زندہ لاش سے مختلف نظر نہیں آتی تھی۔ مقدمے کی کارروائی کے دوران وہ اپنے وکیل ہورس کے ساتھ عدالت کے کمرے میں بیٹھی رہتی تھی۔ سرکاری وکیل ریٹ بھی ناک اور چوہے جیسی آنکھوں کا مالک دیکھتا تھا۔ اس نے ملزم جارج کے بیان کی دھجیاں اڑانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن جارج اپنے بیان پر کئی سے ڈٹا رہا۔ حتیٰ کہ ایک بے حد اہم گواہ کو توڑنے کے باوجود اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔

وہ گواہ ایک عورت تھی۔ اس کا نام مسز بیٹرن تھا۔ وہ مدعا علیہ کی جانب سے پیش کی گئی تھی لیکن ریٹ جیسے شاطر

وکیل کی جرح کے آگے ٹھہر نہ سکی اور تھوڑی ہی دیر کے بعد کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کسی کی گواہ ہے۔ اس کا بیان خاصا واضح تھا تاہم اس گواہ پر محنت کی جانی چاہیے تھی۔ اس کے بیان کے مطابق وہ اپنی کھڑکی کے قریب بیٹھی، اپنے شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔

”کیا تمہارا شوہر ملزم کا دوست ہے؟“ ریٹ نے سوال کیا۔

”ہرگز نہیں۔“ اس نے تیز لہجے میں جواب دیا پھر دوبارہ بیان دیتے ہوئے کہا کہ اس نے دو آدمیوں کو اپنی کھڑکی کے قریب سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ گولیوں کے چلنے سے ڈرا پہلے کا ذکر ہے۔ اس نے ان دونوں کو آپس میں لڑتے جھگڑتے سنا تھا۔ ان میں سے ایک خوب زور زور سے اپنا بازو لہرا رہا تھا۔ اس نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کی تھی اور ان دونوں میں کوئی بھی ملزم جارج نہیں تھا۔ دونوں اس کے مقابلے میں خوب خچم خچم تھے اور اسے اس بات کا یقین تھا کہ ان میں سے ایک شخص مقتول ہووارڈ تھا۔ اس نے تسلیم کیا کہ رات اندھیری تھی لیکن چونکہ اسٹریٹ اس کے گھر کے قریب ہی واقع ہے اس لیے اس نے انہیں واضح طور پر دیکھا تھا اور ان کی آوازیں بھی سنی تھیں۔ ان میں سے کسی کی بھی آواز نہ جارج کے قتل کی تھی تھی اور سب ریت کے لیے بعد از پھر کے دو دھکے کیے اور مسز بیٹرن کے بیان کے پرچے اڑا دیے۔ اس نے سب سے پہلے یہ ثابت کیا کہ مسز بیٹرن اونچا سنی ہیں حالانکہ وکیل صفائی ہورس کے سوال کے جواب کے دوران وہ شیک تھی۔ دراصل وہ بلند آواز میں سوال و جواب کرتا رہا تھا لہذا کسی کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ مسز بیٹرن اونچا سنی ہیں اور پھر وہ جاتی تھی کہ ہورس کون سا سوال کرنے والا ہے لیکن ریٹ نے اتنی سفاکی سے جرح کی کہ اس کی سٹی کم ہو گئی۔ ریٹ نے قعداً اپنا پلو دم رکھا تھا لہذا مسز بیٹرن کو اس کے ہر سوال پر اپنا ہاتھ کان تک لے جا کر پوچھنا پڑتا۔ ”کیا..... کیسے؟“

ریٹ نے سب سے پہلے اسے یہ اقرار کرنے پر مجبور کر دیا کہ اس نے کچھ نہیں سنا تھا۔ وکیل صفائی ہورس نے اس سے قبل بڑی صفائی سے اس سے یہ سوال کرنے سے خود کو رکھا تھا لیکن ریٹ اس کمزور پہلو کو تڑپا گیا تھا لہذا اس نے وہیں ضرب لگائی اور بالآخر مسز بیٹرن کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ ممکن ہے وہ سب اس کا وہم ہو۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ اس نے جن دو افراد کی آوازیں سنی

تھیں، ان میں سے ایک کی آواز ملزم جارج کی تھی یا نہیں اور یہ کہ اس نے جس شخص کو ہووارڈ سمجھا تھا ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی اور ہو۔ ریکٹ جو کچھ ثابت کرنا چاہ رہا تھا، اس کا۔ یہ آسانی تصور کیا جاسکتا تھا۔ مزید پیش کرنے کو چاہیے کہ آواز نہیں سنی تھی حالانکہ اس کا مکان جانے واردات سے چوتھائی بلاک کے فاصلے پر تھا۔ ریکٹ اس کے ہر جواب پر فالتانہ انداز سے ہماری طرف دیکھنے لگتا اور مزید پیش کرنے کی کیفیت یہ تھی کہ وہ روہاٹی ہوئی تھی۔

وکیل صفائی ہوریس تیزی سے اس کے قریب پہنچا اور اس نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس نے اس کے اونچا سنے کا یہ جواز پیش کیا کہ اس وقت بڑے کا شکار ہے جس سے اس کی سماعت متاثر ہوئی ہے لیکن واردات کی رات وہ بالکل واضح طور پر سننے کے قابل تھی۔ اس کی اس دلیل پر جج بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ دوسرا اہم ترین گواہ ایک دربان تھا۔ اس نے ایک شخص کو بھاگتے ہوئے دیکھا تھا اور بس۔ وہ شخص اسے فائرنگ کے چند ہی لمحوں کے بعد جانے واردات سے کچھ فاصلے پر بھاگتا ہوا نظر آیا تھا لہذا یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہی قاتل ہے۔ یہاں تک تو یہ بات درست تھی لیکن پھر جانے واردات پر ریوا لور بدست جارج کی موجودگی کا کیا جواز تھا جس کے گواہوں کے جملہ میں تین گواہوں کی آم تھیں۔

☆☆☆

ان تمام کمزور پہلوؤں کے باوجود وکیل صفائی کے پاس حکم کا کا تھا جسے مات و نیاز ریکٹ کے بس کی بات نہیں تھی۔ دوران تفتیش یہ بات سامنے آئی کہ مقتول کے پاس اپنی بیوی کی ایک تنگی سی تصویر ہوا کرتی تھی جسے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ لیے پھرتا تھا۔ اس کے کچھ دوستوں نے اس کی تصدیق کی تھی اور ایک نے عدالت کو حلیفہ بیان دیتے ہوئے یہاں تک کہا تھا کہ وہ تصویر تو عدالت کی شب بھی اس کے پاس تھی اور اس نے اپنے دوست کے ہاں سے اپنے گھر روانہ ہوتے وقت وہ تصویر اسے دکھائی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ گھر پہنچنے کے بجائے عالم بالا پہنچ گیا تھا۔ وہ تصویر غائب تھی اور جارج کے پاس سے برآمد نہیں ہوئی تھی۔ نہ جانے واردات کے آس پاس نہیں پڑی ہوئی پائی کی تھی۔ یہ ایک خوب صورت نکتہ تھا اور کئی سمت اشارے کرتا تھا۔ جج تو یہ ہے کہ اس پورے کیس میں یہی واحد روحانی نکتہ تھا اور اخبارات اسے لے اڑے تھے۔ انہوں نے شروع ہی سے اس نکتے کو اچھا لٹا شروع کر دیا تھا اور ہر

اخبار اسے ہر ایڈیشن میں اس تصویر کو شائع کرنے لگا تھا۔ جیوری کے ہر رکن نے وہ تصویر دیکھی تھی اور جان گئے کہ مقتول کی بیوی کیسے نقش و نگار کی عورت تھی۔ وکیل صفائی ہوریس نے اپنا زور بیان اس گم شدہ تصویر پر صرف کر دیا تھا لیکن سرکاری وکیل ریکٹ نے اس نکتے کو یوں مسترد کر دیا گویا اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔

میرے خیال میں ہر شخص کو یقین تھا کہ ملزم جارج قاتل ہے اور شاید ہر شخص اپنی جگہ یہ سوچ رہا تھا کہ اس کی قتل کے پیچھے کوئی ایسا راز پوشیدہ ہے جس کی کڑی ملزم جارج اور مقتول کی بیوی سے یا مقتول اور ملزم جارج کی بیوی سے جاملے گی۔

وکیل صفائی شروع ہی سے ایک راگ الاپ چلا رہا تھا اور اس کی یہ راگنی جیوری کو قطعی متاثر نہیں کر رہی تھی لیکن اس کے پاس کہنے کو بھلا اور تھا ہی کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اپنا سارا زور لگا دیا تھا۔ آخر میں اس کے پاس ایک ہی چیز رہ گئی تھی اور وہ تھی بیان۔ وہ جانتا تھا کہ جارج کو بری کروانے کے لیے اب صرف ایک بہت ہی دھانوسم کے بیان کی ضرورت تھی اور وقت آنے پر اس نے وہ بیان دیا بھی۔

شکل و صورت اور علی سے وہ کوئی فلم ایکنے لگتا تھا۔ عدالت کے کمرے میں موجود قاضی کی نظر اس کی طرف پڑی رہتی تھیں۔ وہ بے شک ایک اچھا مقرر تھا۔ اس نے بے شمار کیس جیتے تھے اور اگر اس نے جارج کا کیس ہاتھ میں لے لیا ہوتا تو نوبت یہاں تک بھی نہ پہنچتی۔ میں چونکہ شروع ہی سے اس کیس کی تفصیلات سے آگاہ تھا اور اس کے بارے میں اپنی ایک رائے قائم کر چکا تھا لہذا اس کے بیان کے صرف وہ حصے جو سننے کے قابل تھے۔ دونوں دھلا کی نوک جھونک خاصی دلچسپ تھی۔ اس کے بعض فقروں پر عدالت کا کمر اقبہتوں سے گونج اٹھا۔ پستہ قامت ریکٹ ایک جیٹا جگمگا تفتہ تھا۔ اس کے چہرے پر ہر وقت طنز آمیز تاثرات بکھرے رہتے تھے اور وہ طنز کے تیر چلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ ایک موقع پر ہوریس عسکی پولیس مین دینی کے بیان کی دھجیاں بکسیرتے ہوئے، جانے واردات کی منظر کشی کر رہا تھا اور عدالت کو بتا رہا تھا کہ جب گولی چلی تو جرم جارج لاش سے کتنے فاصلے پر کھڑا تھا اور اس وقت چاند کی کیا پوزیشن تھی وغیرہ وغیرہ۔ اپنے میں ریکٹ نے اپنے ہونٹوں پر ایک طنز آمیز مسکراہٹ بکسیر کر تبصرہ کیا۔

”مسٹر ہوریس کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ ہم نے چاند کو بطور گواہ طلب نہ کر کے فاش غلطی کی ہے۔“ اس کے اس تبصرے پر عدالت کا کمر ازعفران زار بن گیا۔ اس کے جواب میں ہوریس نے کہا۔ ”اگر چاند کو بطور گواہ طلب کیا جاسکتا تو دینی کو طلب کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔“

اس کی اس بات پر کوئی نہیں ہنسا۔ اس کے بعد ہوریس نے ریکٹ کو آڑے ہاتھوں لیا اور مدعا علیہ کے حمایتی چیلنے اور قہقہہ لگانے لگے۔ ریکٹ ہم میں سے کسی کی بھی نگاہ میں پسندیدہ نہیں تھا لیکن اسے ملزم کو مزائے موت دلوانے کا قانونی حق حاصل تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ ہوریس جیوری روم میں مقبول تھا۔ لیکن وہ ریکٹ کے مقابلے میں پسندیدہ تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ وہ ایک کیس ہار رہا تھا لیکن اس کے باوجود جرم کر رہا تھا۔ ابھی بھی دونوں دکھلا رہے تھے اور جج کو انہیں تنبیہ کرنی پڑتی۔

☆☆☆

سارے گواہان کے بیانات مکمل ہونے کے بعد دھلا کے دلائل کا آغاز ہو گیا۔ ریکٹ کا بیان ہمیشہ کی طرح طنزیہ تھا۔ اخبارات نے اس کا نام جلاور کھا تھا کیونکہ وہ اس کیس میں صرف باہمی کا طلب گار تھا۔ اس نے بہت سے دلائل کو یہاں تک میں چھوڑ دیے اور کچھ بیانات سب سے غور طلب نکتہ یہ تھا کہ اب تک قتل کے محرک کا پتا نہیں چل سکا تھا۔ گواہان کے بیانات سے بھی اس پر کوئی روشنی نہیں پڑتی تھی لیکن قتل کا محرک تلاش کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ دینی کی گواہی کے بعد کیس مکمل ہو گیا تھا۔ ملزم جارج کسی بھی وجہ سے ہووارڈ کو قتل کرنا چاہتا تھا اور رگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اور یہی بات سب سے اہم تھی۔ اس نے ایک انسانی جان لی تھی لہذا قانون اس کے بدلے اس کی جان لینی چاہیے تھی۔

ہوریس نے اپنے بیان میں پہلے تو اس کیس کے دوران ریکٹ کے رویے کی شکایت کی اور پھر ملزم جارج کو حالات کا شکار قرار دیتے ہوئے اس کی شرافت، تنک نامی اور سادہ لوحی کا ذکر کیا۔ ساتھ ہی کہا کہ اس شخص نے اپنی حماقت سے ضرورت سے زیادہ نی کر خود کو ایک سنگین معاملے میں ملوث کر لیا ہے۔ اس کی تقریر خاصی متاثر کن تھی اور اس نے جس طرح وہ واقعہ بیان کیا، اس سے اس منظر کی تصویر سی نگاہوں کے سامنے چمک اٹھی۔ ملزم جارج نشست میں دھت تھا۔ اسے یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ کس سمت جا رہا

مہلت

لڑکا۔ ”آپ اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کر دیں۔ میں اسے سوئے میں بول دوں گا۔“ باپ۔ ”مجھے کدھن کی مہلت دے دو۔“ لڑکا۔ ”شادی کی تیاری کرنی ہے کیا؟ ویسے مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“

باپ۔ ”دراصل میں نے بیٹی کو ڈانٹنگ سے منع کرنا ہے تاکہ اس کا کچھ وزن بڑھ جائے۔“

ایک گھنٹا

ایک اسٹیشن سے ایک بڑی مونچھوں والے خان صاحب گاڑی میں سوار ہوئے اور سیٹ پر براجمان ہونے کے بعد مکمل اپنی دائیں مونچھ کو مروڑتے رہے۔ جب وہ اپنی منزل پر اترنے لگے تو ایک مسافر نے اپنی کھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”خان صاحب آپ کی بائیں مونچھ ایک گھنٹا پیچھے ہے۔“

جرمانہ

چلی گاڑی میں بھیجی ایک خاتون نے زنجیر کھینچ دی۔ ٹی ٹی کچھ دیر بعد ڈبے میں آدھما کر اوروں۔ ”زنجیر کس نے اور کیوں کھینچی؟“ خاتون بول اٹھیں۔ ”میں گاڑی کے کمرے کے اندر بیٹھ ہے؟“ ”کیوں؟“

”دراصل میں انڈے لے جا رہی ہوں۔“ خاتون بولی۔

ٹی ٹی نے غصے سے کہا۔ ”گاڑی کے کمرے کا کوئی امکان نہیں انشا اللہ۔ آپ زنجیر کھینچنے کا سہو دہیا جرم ادا کریں۔“

مرسلہ۔ ریاض بیٹ، حسن ابدال

عجیب وغریب مہارتی!

اٹھارویں صدی کے وسط میں جوہور راج کھرانے کی سابقہ ملکہ، مہارانی کور بائی اپنے زمانے کی ایک عجیب و غریب خاتون تھیں۔ ہر روز ان کے غسل کے لیے 150 سیر تازے گلاب کا عرق نکال کر رکھا جاتا تھا۔ پھر کینڑیں ان کو اس عرق گلاب سے تقریباً دو گھنٹے تک نہلاتی تھیں۔ پھر ایک دن کسی نے کہا کہ اگر آپ پھر کے خون سے نہا لیں تو اور نکھار پیدا ہوگا۔ بس پھر ایک محل میں روز بھر کھنٹے لگے اور وہ پھر کے خون سے نہا کر سکون پاتی رہی۔

مرسلہ۔ دلہا، جیتن، حیدر آباد

ہے۔ ایسے میں گولیاں چلیں اور وہ مقتول کے پاس جا کھڑا ہوا۔ قاتل کا ریو اور لاش کے پاس پڑا ہوا تھا۔ اس نے اسے اٹھالیا اور وہیں نے موقع واردات پر پہنچ کر اسے گرفتار کر لیا جبکہ اصل قاتل اپنی جان بچا کر بھاگ چکا تھا۔ ایک دربان نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھا بھی لیکن اس اندھے کو اس کی شکل نظر نہیں آئی۔

ہورس کے بیان کی روشنی میں ہم نے بے شک اس دربان کی گواہی اور مسز ہورس کے بیان کو مد نظر رکھا تھا، جس کا بیشتر حصہ تھپوں کی ہڈر ہو گیا تھا لیکن ذاتی طور پر مجھے یقین تھا کہ مسز ہورس نے حقیقت آواز سن لی تھی۔ دو پر اسرار افراد آپس میں لڑتے ہوئے گزر رہے تھے اور ان کی آوازیں خاصی بلند تھیں پھر ہورس نے اس تصویر کا حوالہ دیا جو بے حد اہم تھی اور جس کا اب تک کوئی سراغ نہیں لگ سکا تھا۔ وہ تصویر ملزم جارج کو بے گناہ قرار دیتی تھی۔ تصویر مقتول کے پاس سے یا پھر جارج کے پاس سے برآمد ہوئی جا چکی تھی کیونکہ جارج کو اسے پھینکنے یا چھپانے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ ہورس کا بیان بلاشبہ ایک عمدہ بیان تھا۔ اس نے جارج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، اس کی بے داغ زندگی اور اس کے معزز دوستوں کا حوالہ دیا۔ ساتھ میں یہ کہہ کر کہ ایک ایسا شخص جس نے کبھی ریو اور لوگ کو ہاتھ نہ لگا ہوا، ہمیں اسے کسی کارپورادور تک کرنا پڑے گا۔ ایسے شخص کو قتل کر سکتا ہے جسے اس نے زندگی میں نہ بھی دیکھا تھا اور نہ ہی جس کے بارے میں سنا تھا۔ ہورس کے دلائل سن کر ہر شخص اش اش کراٹھا لیکن ریکٹ نے اپنے آخری بیان میں اس کے دلائل کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”یہ سب محض قیاس آرائیاں ہیں۔ آپ لاکھ قیاس آرائیاں کریں، یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ ملزم جارج ریو اور بدست لاش کے قریب کھڑا تھا اور ریو اور سے گولیاں چلی تھیں اور جہاں تک نشے میں ہونے کا تعلق ہے تو یہ کوئی جواز نہیں ہے۔ وہ جسمانی طور پر ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ رہے ہوں، دونوں ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔“

انتا کہہ کر اس نے ہونٹوں کے ایک گوشے کو مخصوص انداز میں خم دیتے ہوئے مزید کہا۔ ”اگر جیوری یہ سمجھتی ہے کہ مدہوش سفاکانہ قتل کا جواز بن سکتی ہے تو ملزم کو بری کر دے تاکہ دوسروں کی حوصلہ افزائی ہو اور لوگ شراب پی کر بے گناہ ہوں تو قتل کرنے نکل کھڑے ہوں لیکن اگر ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انسانی جانوں کو شرابی و درندوں

نے، خواہ وہ کتنے ہی نیک نام اور معزز کیوں نہ ہوں محفوظ رکھنا ہی ہمارا فرض ہے تو خصوصی طور پر ملزم جارج کو سزا دے موت دے کر ایک اچھی مثال قائم کر سکتے ہیں۔“

ریکٹ کا بیان اگرچہ ہورس کے بیان سے زیادہ متاثر کن نہیں تھا لیکن اس سے بہت زیادہ مدلل اور قائل کرنے والا تھا اور جہاں تک جیوری کا تعلق تھا، تو وہ بہت پہلے ہی جارج کے لیے سزائے موت تجویز کر چکی تھی۔ سب سے آخر میں جج نے۔۔۔ دونوں وکلاء کے دلائل کی روشنی میں جو کچھ اخذ کیا تھا، پڑھ کر سنا شروع کیا۔ اس کا بیان۔۔۔ بحیثیت مجموعی سرکاری وکیل کی جانب داری کر رہا تھا جو غیر متوقع نہیں تھا لیکن اس نے آخر میں ہمیں متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہمیں ملزم جارج کے جرم پر شک ہے تو ہم پر منحصر ہے کہ اسے سزائے موت دیں یا بری کر دیں۔ اس کے اس بیان کے بعد ہم سب اٹھ کر جیوری روم میں چلے گئے اور مقدمے کی اس کارروائی کی روشنی میں فیصلے پر بحث مباحثے کا آغاز ہو گیا۔

☆☆☆

ڈین نامی ایک انتہائی تنگ نظر آدم بیزا شخص جیوری کا سربراہ تھا۔ وہ شروع ہی سے خود کو اتنی اہمیت دیتا آ رہا تھا گویا اسے ڈین کی وزارت مل گئی ہو۔ وہ اس سے پہلے بھی جیوری کی طرف سے انجام دینے چکے تھے لیکن اس کا یہ اس کا پہلا موقع تھا۔ وہ سارے اسرار اور موزے سے بخوبی واقف تھا۔ سارے کے سارے کیارہ ارکان جیوری متفقہ طور پر جارج کو سزائے موت دینے کے حامی تھے اور صرف ایک رکن ایسا تھا جو اسے بری کروانے کے حق میں تھا۔ یہ انکشاف قریب اندازے کے ذریعے ہوا تھا۔ میں اس واحد رکن کو جانتا تھا لہذا باقی کیارہ ارکان کو شش و پنج میں مبتلا رکھنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

”دوستو! وہ رکن میں ہوں۔“ میں نے انہیں مخاطب کر کے کہا۔ ”مجھے قائل کر دو۔“

میرا یہ جملہ کسی ہم کے گولے کی طرح ان کے سروں پر پھٹا۔ انہیں اس گولے کی توقع نہیں تھی۔ خاص طور سے ہمارا سربراہ ڈین تو ایسا بولکھلایا کہ مجھ سے اس طرح لڑنے لگا گویا یہ اس کا ذاتی معاملہ ہو۔ اس کا ذہن یہ تسلیم کرنے سے قاصر تھا کہ میں ان کے متفقہ فیصلے کی مخالفت بھی کر سکتا ہوں۔ وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ ہم فوراً اس کے فیصلے کی تائید کر دیں گے اور وہ اسی وقت جج کو اس فیصلے سے آگاہ کرے گا اس کا سر اپنے سر باندھ لے گا لیکن جب ایسا نہیں ہوا تو وہ

ہلکا اٹھا۔ پہلے پہل بقیہ ارکان کو میری یہ مخالفت مضحکہ خیز لگی۔ وہ یہ جانتا چاہتے تھے کہ میں ملزم جارج کو بے گناہ کیوں تصور کر رہا ہوں؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ جبکہ ساری شہادتیں اس کے خلاف ہیں اور اسے مجرم ثابت کرتی ہیں۔ انہیں اس سے ہمدردی ضرور تھی لیکن جہاں تک بے گناہی کا تعلق تھا تو۔۔۔

”مسٹر رسل۔“ ان میں سے ایک مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”یہ ایک بالکل عام سائیکس ہے۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ وکیل صفائی ہورس نے مقدمے کی بہت اچھی پیروی کی لیکن وہ اپنے موقف کی حمایت میں ایک بھی ٹھوس دلیل نہ دے سکا۔ میں غلبت میں کوئی فیصلہ کرنے کے خلاف ہوں۔ اگر مجھے اس کے جرم پر ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو میں دوسروں کے فیصلے کو مسترد کر دیتا لیکن مجھے اس کیس میں شک کی ہلکی سی پرتھالی بھی نظر نہیں آ رہی ہے۔ ملزم جارج بے شک مجرم ہے، اسے اپنے کیے کی سزا ملنی چاہیے۔“

”اسے پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔“ میں نے نجری سے کہا۔ ”اس نے پی رگھی تھی اور شوخی قسمت کے موقع واردات پر پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ قاتل اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی گردن پھنسا کر فرار ہو گیا۔ میرا اندازہ تو یہی ہے اور ہورس کا بھی یہی خیال ہے کہ ملزم میں بہت پرچائے واردات پر پہنچ گیا اور اسے میں ہونے سے باعث اس نے لاش کے قریب پڑا ہوا ہسپتال غیر ارادی طور پر اٹھالیا۔ عین اسی لمحے کشتی سپاہی وہی موقع واردات پر پہنچ گیا اور اس نے اسے ریو اور سمیت گرفتار کر لیا۔ میرے خیال میں قاتل نے فرار ہوتے وقت ہسپتال اس کے ہاتھ میں تھام لیا تھا اور چونکہ وہ مدہوش تھا، اس نے وہ ہسپتال لے لیا۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔“

”جو اس۔“ دوسرے نے کہا۔ ”اس نے یہ جرم ایک منصوبے کے تحت کیا تھا اور شراب اس لیے پی رگھی تھی کہ اپنے اعصاب پر قابو پا سکے۔“

”تمہارے خیال میں وہ مقتول ہووارڈ سے واقف تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”بے شک۔“ ان سب نے بیک زبان ہو کر جواب دیا۔

”لیکن اس کی کوئی شہادت نہیں ہے۔ ریکٹ نے بھی کہا تھا لیکن وہ کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکا۔“

”اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔“ ڈین نے لب کوئلے۔ ”میں کے مطالعے سے یہ بات از خود عیاں

ہو رہی ہے، اگر وہ مقتول سے واقف نہ ہوتا تو اسے کوئی کیوں مارتا؟“

”وکیل صفائی بھی یہی جانتا چاہتا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اور چونکہ وہ اس سے واقف نہیں تھا لہذا اس نے اسے قتل نہیں کیا۔ اس کا جواب یہی ہے۔ اور اس کم شدہ تصویر کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”ایسی کوئی تصویر مقتول کے پاس نہیں تھی۔“ ڈین سرے سے منحرف ہو گیا۔ ”ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ جس شخص نے یہ گواہی دی تھی، وہ جھوٹ بول رہا تھا۔“

”تمہاری ثانی اماں کا سر۔“ میں نے پھر کر کہا۔ ”اس شخص نے ہووارڈ کے قتل ہونے سے صرف ایک گھنٹا قبل وہ تصویر اس کے پاس دیکھی تھی۔ اگر اس تصویر کا سراغ لگ جاتا تو ہمیں ایسی بہت سی باتوں کا علم ہو جاتا جن کا ہمیں علم نہیں ہے اور جارج کے سر پر نگار نہ لگ رہی ہوتی۔ آپ حضرات محض اس وجہ سے ملزم کے خلاف ہیں کیونکہ اس نے شراب پی رگھی تھی۔ میں اس کے لیے آپ لوگوں کو مورد الزام نہیں ٹھہراتا لیکن یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ چونکہ اس نے شراب پی رگھی تھی لہذا قاتل بھی اسی نے کیا ہے۔“

”اس امر جھوٹ ہے کہ ہم کسی خاص وجہ سے تمہارے خلاف ہیں۔“ ڈین نے جواب دیا۔ ”میں نے یہ فرض کرنے کی ایک اچھی وجہ ہے۔“

یہ بحث پونہ پچاس رقبی اور دن روز گزر گئے لیکن ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکے۔ اس دوران ہم نے ایک دو شہادتیں کھنکھائیں لیکن گھوم پھر کر وہیں پہنچ گئے جہاں سے چلے گئے۔ جرم میرے ہر شخص جارج کو مجرم تصور کر رہا تھا اور ان میں سے بعض اسے بھانسی پر لٹکانا چاہتے تھے۔ بحث جوں جوں بڑھ رہی تھی، لوگوں کی جھجھلاہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ شدت سے جارج اور میرے خلاف ہوتے جا رہے تھے۔ میں انہیں زہر لگنے لگا تھا۔ میری باتیں انہیں زہر لگتی تھیں۔ بہت ممکن ہے وہ یہ سوچتے ہوں کہ مجھے رشوت دی گئی ہے جی میں نے معاملے کو اب تک لٹکا رکھا ہے۔ ان کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ وہ لوگ گھر سے دور تھے اور ان کے اہل خانہ ان کی واپسی کے منتظر تھے جبکہ میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں کنوارا تھا اور میرا میرا انتظار کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ میں صرف ایک بات جانتا تھا کہ مجھے جارج کی گردن بچانی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بے گناہ ہے۔ اس دوران جج کا گہ بگاہے اپنے

”بہت خوب۔“ اس کے منہ سے نکلا۔ میں تمہارے خیال کی داد دیتا ہوں۔ تم اس پر ایک اچھی کہانی لکھ سکتے ہو لیکن جارج کا اس کہانی سے کیا تعلق؟“

”مجھے اپنی بات مکمل کرنے دو۔“ میں نے کہا۔

”ممکن ہے، یہ ایک فرضی داستان ہو لیکن تم دیکھو گے کہ یہ حقیقت کی کتنی عجیب عکاسی کرتی ہے۔۔۔۔۔۔ پھر وقت گزرتا رہتا ہے۔ کئی سال بیت جاتے ہیں۔ ایک روز اسٹھ کو لڑکی کی ماں کا ایک خط موصول ہوتا ہے۔ وہ اسٹھ کو شروع ہی سے پسند کرتی آئی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ اس کی بیٹی یعنی سوز ہووارڈ مر گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے شروع سے آخریک ہووارڈ کا سارا کچا چٹھیا بن کر دیا تھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ شادی کے بعد ہووارڈ نے اس کی بیٹی کو ایک لمحے کا بھی سکھ نہیں دیا تھا۔ وہ دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگتا رہا تھا۔ اس کی انہی حرکتوں نے اس کی بیٹی کی جان لے لی تھی۔ وہ اس سے طلاق لینے کے بجائے اس نے خود شادی کر لی تھی۔ آپ سوچ سکتے ہیں وہ کتنی شدید ذہنی اذیت میں مبتلا رہی ہوگی۔ آپ لوگوں نے اس کی تصویر دیکھی ہے۔ ممکن ہے، آپ کو تصویر دیکھ کر اس کی فطرت کا اندازہ ہو گیا ہو۔“

”بہر حال اسٹھ اس کے خط کا جواب دیتا ہے اور تعزیت کرنے کے ساتھ ہی لکھتا ہے کہ اگر ہووارڈ کبھی اسے مل گیا تو وہ اس کا بہت برا شر کرے گا کیونکہ وہی لڑکی کی خود شادی کا ڈر تھا۔ ایسے ہی جیسے اس نے اس معصوم سستی کا قتل کیا ہو۔ ہم اسے قتل نہیں کہہ سکتے لیکن کیا واقعی قتل نہیں تھا؟“

ان میں سے نصف درجن ارکان جیوری نے میری تائید میں سر ہلایا۔ وہ سب کے سب شادی شدہ تھے۔ ممکن ہے ان کی بیٹیاں بھی ہوں۔ میں نے سلسلہ کلام اس زمرہ جوڑتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

”لڑکی کی ماں نے اس کے سارے کروتات اسٹھ کے گوش گزار کر دیے تھے اور اب وہ جان گیا تھا کہ ہووارڈ نے کس طرح اسے اپنی راہ سے ہٹا دیا تھا۔“

”پھر ایک رات ان دونوں کی مدد بھیم ولیم اسٹریٹ کے کتھر پر ہو گئی۔ یہ وہی رات تھی جب سوز پیٹرکس اپنی کھڑکی کے پاس بیٹھی اپنے شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے نزلے کی شکایت نہیں تھی۔ یہ لڑکی کی خود شادی کے بہت عرصے بعد کا واقعہ ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ دونوں رقیبوں کی سر رداہ ملاقات ہوئی تھی اور ہووارڈ،

اسٹھ کو دیکھتے ہی بھاگ کھڑا ہوا تھا جیسی اسٹھ کو معلوم ہوا تھا کہ وہ اسی شہر میں ہے۔“

وہ سب بہترین گوش تھے کیونکہ اب ان پر حقیقت واضح ہوتی جا رہی تھی کہ میں اسٹھ سے اور اس کی داستان حیات سے واقف ہوں اور میں بے شک واقف تھا۔ تاہم ان میں سے ایک نے فقرہ جست کیا۔ ”معلوم ہوتا ہے، تم اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو؟“

”ہاں، میں جانتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا اور دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ”اس رات ایک بار پھر ان دونوں کا آمنہ سامنا ہو گیا تھا۔ ہووارڈ اس ناگہانی مدد بھیم کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ اس کے پاس ریو اور موجود تھا۔ وہ اس کی ملاقات کے بعد سے ہر وقت اپنے پاس ریو اور لیے پھرتا تھا۔ دراصل وہ کوئی خطر موصول نہیں لکھا جاتا تھا جب اسٹھ قطعی غیر متوجہ تھا۔ وہ ہووارڈ کو ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ ملاقات اتفاقاً تھی۔ دونوں میں تلخ کلامی ہونے لگی۔ ہووارڈ خود کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سوز پیٹرکس نے انہیں اپنی کھڑکی کے قریب سے گزرتے ہوئے ان کی بحث و تکرار سنی تھی۔ اسٹھ نسبتاً خاموش تھا۔ وہ ایک فیصلہ کر چکا تھا اور اب اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔ لہذا اس نے ہووارڈ کو اپنی انتہائی غصے سے لے کر اپنے گھر کے مخرج دیا۔ بالآخر ہووارڈ نے اپنی بیوی سے اپنی محبت کے اظہار کے طور پر اپنے پرس میں سے اس کی تھکی تصویر نکال لی اور مگر چھ کے آسواہانے لگا۔ اس کی اس ریاکاری پر اسٹھ کا خون ٹھول اٹھا۔ اس نے وہ تصویر بچھٹ لی اور دوسرے ہاتھ کا مٹکا پوری قوت سے اس کے منہ پر مارنا چاہا مگر ہووارڈ نے پھرتی سے غوطہ لگایا، ساتھ ہی اپنا ریو اور بھی نکال لیا۔ اسٹھ نے اس کے ریو اور پر ہاتھ ڈال دیا اور اسی کشش میں ریو اور چل گیا لیکن پہلا فائر ہوا تھا۔ اس کے بعد مزید دو فائر ہوئے۔ میں سچ اسٹھ کی طرف داری نہیں کر رہا۔ ممکن ہے اس وقت اس سے غیر ارادی طور پر وہ حرکت سرزد ہو گئی ہو اور وہ اس حرکت کا ڈر سے دار نہ ہو یا ممکن ہے، ڈر سے دار ہو۔ ہووارڈ نے اس پر چھلانگ لگائی اور اسٹھ نے اس پر دو فائر جھونک دیے۔ ایک ہی سیکنڈ میں معاملہ ختم ہو گیا اور اسٹھ ایک قاتل بن گیا۔ زندگی میں کسی بھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم وہ حرکت کر گزرتے ہیں جس کے کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے کوئی منصوبہ نہیں بناتے۔ ممکن ہے، اس کی وجہ یہ ہو کہ ہمارے اندر ایک جانور چھپا بیٹھا ہے، جو کبھی کبھی ہم پر غالب آجاتا ہے۔ آپ اسے

اشتعال کہہ لیں۔“

ڈن غور سے میری باتیں سن رہا تھا اور اب مجھ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا تھا۔ ”یہ اسٹھ کون ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ”کیا جارج ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اسٹھ وہ شخص ہے جسے دربان نے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ جارج کو پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ عین وقت پر جانے واردات کے پاس سے نشے میں چور ڈگمگاتا ہوا گزرا تو یہ دیکھنے کے لیے رک گیا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ اسٹھ جو اپنی اس حد درجہ سنگین غلطی پر انتہائی دہشت زدہ تھا اور موقع واردات سے فرار ہونا چاہتا تھا، اپنی مجبوری کی وہ بھی سی تصویر اٹھا کر اور متولی کا ریو اور جارج کو تھما کر بھاگ گیا۔ اس نے اتنی چڑھا رکھی تھی کہ اسے کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے جرم کی محنت سے انکار کر دیا لیکن اس وقت تک اس کے پیروں کے نیچے سے زمین ٹپک چکی تھی۔“

میں نے اکتان بیان کرنے کے بعد ایک لمحہ توقف کیا اور ایک گہری سانس خارج کر کے دوبارہ لب کھولے۔ ”یہ ہے اس قاتل کا پس منظر۔ اور اب ہمارے کرنے کے لیے ایک ہی کام رہ گیا ہے۔ وہ کہ جارج کو باعزت بری کر دیں۔“

ان دنوں اسٹھ کے ہاتھ میں ایک ہتھیار تھا۔ وہ ایک تک یک تک مجھے غور سے رہے پھر ڈن کے سنے میں جان پڑی۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے مخاطب ہوا۔ ”زلزلہ بلاشبہ ایک اچھی کہانی ہے اور اگر یہ سب کچھ سچ ہے تو ہم فیصلہ اس شخص کو جانتے ہو گے۔ میری مراد اسٹھ سے ہے۔ سوز پیٹرکس اپنی کہانی سچ ثابت کرنا پڑے گی اور جو نیکی یہ سچ ثابت ہوئی، ہم جارج کو باعزت بری کر دیں گے۔ یہ میرا وعدہ ہے لیکن اگر تم جارج کو بے گناہ ظاہر کر کے رہا کر دینے کے لیے پریوں والی کہانی سنارے ہو تو۔۔۔۔۔۔“

”بہتر ہے۔“ میں درمیان میں ہی بول پڑا۔ ”تمہیں بطور ثبوت کیا چاہیے؟“

اس نے ایک لمحہ غور کیا اور پھر لب کھولے۔ ”اگر تم اسٹھ کو پیش کر دو تو بات بن جائے گی۔ کیوں دوستو! لیکن اسٹھ کو وہ تصویر پیش کرنی پڑے گی تاکہ ہمیں یقین آجائے کہ وہی اسٹھ ہے اور اس کی کہانی سچی ہے۔ میرے خیال میں، وہ تصویر ایک ناقابل تردید ثبوت ہے، کیوں دوستو؟“ باقی ارکان جیوری نے اس سے

اتفاق کیا۔ وہ سب ایک دوسرے کی باتوں سے اتفاق کرتے تھے سوائے میرے۔۔۔۔۔۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اسٹھ کا کیا ہے گا؟ کیا وہ جارج کی جگہ لے لے گا؟ تم لوگوں کو اس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے کیا تم لوگ اسے ہووارڈ کے قتل کے الزام میں تختہ دار پر لٹکا دو گے؟ واضح رہے کہ میں نے جو کچھ کہا، سچ ہے اور سچ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس وقت تم لوگ اسٹھ کی قسمت کا فیصلہ کرنے بیٹھے ہو۔ تم اسے سزائے موت دو گے یا رہا کر دو گے؟ اگر تم نے عدالت کو اسٹھ کے بارے میں بتا دیا تو دوسری جیوری اس معاملے کو اس طرح نہیں دیکھے گی جس طرح تم لوگوں نے سمجھا ہے۔ تم لوگوں پر حقیقت متکشف ہو گئی ہے۔ کہو، کیا کہتے ہو؟“

”ہم اسے رہا کر دیں گے۔“ ایک نے کہا۔

دوسروں نے بھی اس پر غور کیا لیکن ان کا جواب ان کے چہرے پر تحریر تھا۔ وہ اسٹھ کو رہا کرنے کے حق میں تھے۔ اس سے جو غیر شعوری فعل سرزد ہوا تھا، وہ کسی سے بھی سرزد ہو سکتا تھا۔

”یہ رہی وہ تصویر۔۔۔۔۔۔!“ میں نے تصویر اپنی جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔ ”اسے خوب غور سے دیکھو۔ یہ قاتل کی اس رات سے اب تک میری جیب میں پڑی ہوئی ہے اور اب مجھے غور سے دیکھو۔“

کمرے کے ایک سرے سے دوسرے تک زبردست سستی پھیل گئی۔ ان کے چہرے زرد پڑ گئے اور وہ بچتی بچتی بے یقین نظروں سے یک تک مجھے غور سے چلے گئے۔ بہت دیر بعد انہیں ہوش آیا۔ تصویر وہی تھی۔ انہوں نے وہ تصویر درجنوں بار اخبارات میں دیکھی تھی۔ یہی وہ تصویر کو، کبھی مجھے دیکھتے اور کبھی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتے۔ ان سستی خیز لحظات میں مجھے چھائی کا پسینا اپنی گردن پر پھینسا ہوا محسوس ہو رہا تھا لیکن میں ان کا ذہن پڑھ چکا تھا۔ ان کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا تھا لیکن انہیں میری بات پر یقین آ گیا تھا پھر ان میں سے ایک پست قامت رکن نے جو جارج کو سزائے موت دینے کا زبردست حامی تھا، خوش طبعی سے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا۔

”ڈورمٹ، ہم میں سے کوئی بھی تم پر فرد جرم عائد نہیں کرے گا۔ آؤ دوستو! یہ آخری قرعہ اندازی ہے۔ جارج بے گناہ ہے اور اسٹھ بھی بے گناہ ہے۔ یہی ہمارا فیصلہ ہے۔“

محفل شہر و سخن

✽ جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی
کسی نے پھر ہمیں تسخیر کر لیا آخر
کوئی مثال تو آئی تری مثال کے بعد
✽ زاہد چودھری..... چھوڑ کینٹ
موسم جبر میں یہ بارش کا برستا کیسا؟
اک صحرا سے سندھ کا گزرتا کیسا؟
اے میرے دل نہ پریشان ہو تھا ہو کر
وہ تیرے ساتھ چلا کب تھا چھڑنا کیسا؟
✽ کمال انور..... کراچی
اس کے بعد اور بھی سخت مقام آئے گا
حوصلہ یوں نہ گنوا یہ ترے کام آئے گا

✽ زخمی کرشن..... عمر کوٹ

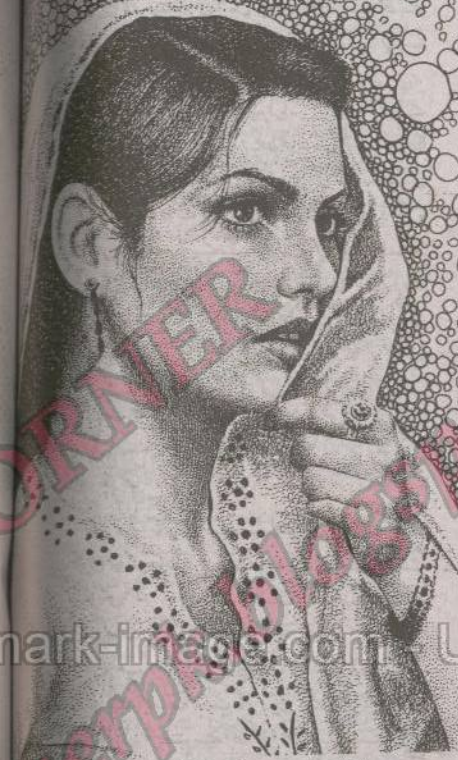
پوست کشوں کا طمانہ ہے شاہِ غم کے سہارے
جس کی رو پڑا تعلیم بھی زخمِ مسکراے
✽ احسان عمر..... میانوالی

تنگ آنکھ ہیں اب تو فریبِ نظر سے ہم
گھبرا گئے ہیں اپنے ہی دیوار و در سے ہم

✽ قیصر اعوان..... ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا
نہ میرے قلم سے لکھی گئی نہ میری زبان سے ادا ہوئی
جو آنکھ سے کہنے کی بات تھی وہ حروف میں نہ سائے گی
کوئی پھول چتا ہے کس طرح کوئی دھول ہوتا ہے کس طرح
یہ وقتِ وقت کی بات ہے ہمیں زندگی ہی بتائے گی

✽ عبدالجبار رومی انصاری..... لاہور
لاکھ خاموش رہیں ضبط کے خوگر ہو کر
آنسوؤں سے بھی تو کچھ راز عیاں ہوتا ہے

✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
جانے کیا مجھ سے زمانہ چاہتا ہے
میرا دل توڑ کر بھی مجھے ہسانا چاہتا ہے
جانے کیا بات جھلکتی ہے میرے چہرے پر
ہر شخص مجھے ہی آزماتا چاہتا ہے



✽ تفسیر عباس باہر..... اوکاڑہ
مثل خیال و خواب چین وصل کی وہ راتیں
مقدم میں پھر بھر کا زندان اس نے لکھ دیا
پس و پیش سا درپیش تھا بوقتِ رخصت یوں ہوا
قرع اس کذب و دریا پہ اک بیان اس نے لکھ دیا

✽ سعدیہ بخاری..... ضلع انک
اب کسی بات پہ کیا اس سے خفا ہوتا ہے
زندگی بھر کے لیے جس سے جدا ہوتا ہے
تم سے چھڑے ہیں تو اب سینے کی محرابوں میں
کون دیکھے گا جو اک حشر پچا ہوتا ہے

✽ مہرین ناز..... حیدرآباد
جو ہم سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھنا چاہتا
اس شخص کے لوٹ آنے کا امکان سائیکوں ہے
مٹی کا بنا ہے تو کھل کیوں نہیں جاتا
پتھر کا اگر ہے تو پھر انسان سائیکوں ہے

✽ راجہ افتخار علی..... چوآسدن شاہ (موہڑہ)
کبھی مجھے بھی آنسو ہزاروں کوششیں لگیں
جو قسمت میں نہیں لکھا وہ رونے سے نہیں ملتا
✽ عمران علی..... سرگودھا
کیا خوب ہی ہوتا اگر دکھ ریت کے ہوتے
سچی سے گرا دیتے پاؤں سے اڑا دیتے

✽ شبانہ حسن..... لاہور

خیر زیت میں چلتے چلتے
کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے
بے تحاشا محبت کرنے والے
بے حجب چھوڑ جاتے ہیں

✽ محمد آصف شہزادہ..... ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا
اب تیرے شہر میں آؤں گا مسافر کی طرح
سایہ ابر کی مانند گزر جاؤں گا

✽ محمد قدرت اللہ نیازی..... حکیم ناؤں، خانہ خاں
بلا کا تضاد ہے تیرے حسن و ظہن میں
نرم ہونٹوں سے بہت سخت بولتے ہو

✽ ایم رشید سیال..... روپڑی، سکھر
لہجہ ایسا کہ مطمئن کروے!
نکتے سچے ہیں اس کے جھوٹ!

✽ طالب حسین طلحہ..... نیو سنٹرل جیل ملتان
شامِ غم انکی بلا خیر نہ دیکھی تھی کبھی
آسمان پر نہ رہا کوئی بھی تارا باقی
اب کہیں جتنی نہیں محفلِ اربابِ چین
میں ہی رہ گیا اس بزم میں تنہا باقی

✽ احمد علی صدیقی..... نیو سنٹرل جیل ملتان
ہم اپنے رزم دکھاتے کے زمانے میں
کسی نے قصہ غم شوق سے سنا ہی نہیں
لے جو اشک تو ہم نے ہی گئے خاموشی سے
ہمارا درد نمایاں ہو ہی نہیں

✽ سید اکبر شاہ..... منسہرہ
خاک نکلی آرزو اگر نکلی
ہر سعی اپنی بے اثر نکلی
بر کوئی باخبر ہے دوراں سے
عقل اپنی ہی بے خبر نکلی

✽ ناصر علی صدیقی..... رحیم یار خان
بہت سکون سے ہو میرے بن
جیسے ابھرن کوئی سلیم گئی ہو
✽ عبدالغفور خان ساگر، نکل..... سبیل، ملتان
بہت پختہ مزاج ہے وہ شخص
اسے یاد ہے کہ مجھے یاد نہیں کرتا

✽ زوہب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
اس طرح کیے پھرتے ہیں تیری محبت کو ہم
ٹوٹا ہوا بازو جیسے سینے سے لگا ہو

✽ عرفان احمد عاجز..... چوآسدن شاہ
بنا کے گردشِ دوراں کو زندگی ہم نے
یہ بارِ زیت اٹھایا ہنسِ خوشی ہم نے
اٹھا کے تاز ترے صبح و شام جانِ کلیم
بڑھا دیا ترا اندازِ دلبری ہم نے

✽ ریاض بٹ..... حسن ایدال
تم مکانوں میں ہو مقید تمہیں کیا معلوم
دل میں اخلاص و محبت ہو تو گھر بنتے ہیں

✽ امجد ہرل..... ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا
چھڑے تجھ سے نہ دیکھے گئے وصال کے موسم
کسی کو ملتے ہوئے دیکھا تو ڈھانپ لیں آنکھیں



شکنبہ

سیم انور

کھا کھا کر گوشت کا پہاڑ بننا اور پھر فاقے کر کر کے رفتہ رفتہ اس پہاڑ کو گھٹانا پر زمانہ کافیشن رہا ہے شاید... وہ بھی اس اذیت کا شکار تھا کہ ایک روز اس کے ہاتھ ایسا گر لگا کہ بڑے سے بڑا پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل کر رہ گیا... کیونکہ یہ سب تو زندگی کے جھمیلے ہیں مگر وہ کیوں دھیرے دھیرے موت کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔

فاتح کی فکر میں گئے والوں کی عجیب منتقوں کا اظہار

جس روز میری ملاقات ویڈی ہائیکو سے ہوئی،
میری زندگی ہمیشہ کے لیے بدل گئی۔
رٹکارٹن ہوں کے بار کا بھول نہایت پرسکون تھا
اور ہر شے سے نفاست چک رہی تھی۔ میری پوری زندگی
بلوٹن شہر میں گزری تھی لیکن مجھے بھی رٹکارٹن میں جانے کی
تمنا نہیں ہوئی تھی۔ باہر سڑک پر لوگ جولائی کی گرم آلود فضا
سے بچنے کے لیے تیز تیز قدموں سے ادھر سے ادھر جا رہے
تھے اور پبلک گارڈنز کی جانب رواں ٹریفک دھیرے
دھیرے بڑھ رہا تھا۔
لیکن رٹکارٹن کے بار کی فضا میں مدھم مدھم سرگوشیوں
اور برف کے ڈالوں کی شن شن کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں
دے رہی تھی۔ میں نے اپنی نگاہیں کھڑکی کی جانب سے

سید محی الدین اشفاق..... فتح پور، لہ
یہ علم کا سودا، یہ رسالے یہ کتابیں
ایک شخص کی یادوں کو بھلانے کے لیے ہے
* کائنات مریم، عائشہ ثانی..... حیدر آباد
ہم تو مٹی سے اکائیں گے محبت کے گلاب
تم اگر توڑنے جاتے ہو، ستارے جاؤ
* احمد حسن عرضی خان..... قبولہ شریف بائی پاس
ہار جاتا میں خوشی سے کہ وفا کا تھا سوال
جیت جاتی وہ اگر شرط لگاتی مجھ سے
* ہارون بھروس..... مردان
ذرا سی بھول پر جنت سے نکلا
میں بھکا کب تھا بھکایا گیا ہوں
* رائے..... کورنگی
کس منہ سے جاؤ گے خدا کے رو بہ محشر میں تم
عمر ساری عشق بیتاں میں اب گزر جانے کے بعد
* نعیم الحسن شاہ..... اسلام آباد
رہتے بھی دل میں ہو، دکھاتے بھی دل ہی ہو
اپنا مقام دیکھو اور اپنے کام دیکھو
* رمضان پاشا..... محسن اقبال، کراچی
اس وطن کے واسطے دی جتنی قربانی نہ پوچھ
چشم گردوں کی فکر یہ فتنہ سامانی نہ پوچھ
* ڈاکٹر محمد عصفیر عباس..... خوشاب
دل کے دروازے پہ پھر سے شہناز دستک
پھر وہی شخص نیا روپ لیے آیا ہے
* شازیہ کمال..... ناتھ کراچی، کراچی
سفر کا بوجھ ہے سر پر، لدے ہوئے زر سے
تھکے ہوئے مسافر، چلے تھے جو گھر سے
* نورین عباس..... پشاور
اک ایسے عالم وارفتگی سے گزرا ہوں
جہاں سمیتا خود کو تو میں نکھر جاتا

محفل شعر و سخن

کوین

برائے

شمارہ

فروری

2015

لجے لہراتے حسین بال ہمیشہ کے لئے۔

MEDICAM SHAMPOO

مہینے بھر کا شیمپو



وہ فولڈر میں موجود کاغذات کو پڑھنے میں یوں مگن رہی جیسے میں نے کچھ پوچھا ہی نہ ہو۔ پھر اپنی ٹینک دوبارہ ناک پر جماتے ہوئے مجھے گھورنے لگی۔ ”میں یہاں تمہارا مسئلہ حل کرنے کے لیے موجود ہوں۔ ہماری ملاقات کہاں ہو رہی ہے، یہ بات اہمیت کی حامل نہیں ہے۔“ اس نے سر دھچکے میں کہا۔

میں بوکھلا سا گیا۔ اس لیے کہ میں توقع کر رہا تھا جو فرد میری اس پریشانی کا حل نکالے گا، وہ ہمدردی کے جذبے سے معمور اور حساس طبیعت کا مالک ہوگا۔ شاید اکھڑا اکھڑا لہجہ میرے مسئلے کے حل کے لیے ضروری تھا، یہ سوچ کر میں چپ رہا۔

ساتھ ساتھ اپنا فولڈر بند کر دیا اور ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ پھر بولی۔ ”میرے خیال سے تمہارے لیے ایک سو پچاس پونڈ تک کا وزن کافی رہے گا۔“ میں مسکرا دیا۔ ”ایک سو پچاس پونڈ وزن زبردست رہے گا۔ لیکن میں آپ کو ایک بات بتا دوں۔ میں کھانا دیکھ کر خود پر قابو نہیں رکھ سکتا۔“

وہ اپنے فولڈر پر انگلیاں بجاتے ہوئے بولی۔ ”تم نے راجز اینڈ ڈکٹن کے یہاں بیٹوراکاؤنٹنٹ چار سال تک کام کیا ہے۔ تمہاری آمدنی میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ تمہاری بیوی سینڈرا یہ بیٹوراکاؤنٹنٹ ملازمت کر رہی ہے اور گزشتہ برس اس کی آمدنی بارہ ہزار ڈالر تھی۔ تم دونوں کو بچوں کی خواہش ہے لیکن سینڈرا تمہارے منہ پر اور وزن کے بارے میں فکر مند رہتی ہے اور اسے امید ہے کہ عارضی علیحدگی تمہیں اپنا وزن گھٹانے اور دبلا پتلا بننے پر مجبور کر دے گی۔“

یہ سن کر میرا منہ لٹک گیا۔ ”آپ کو یہ سب کیسے پتا چلا؟“ ”میری بیٹی ہمارے تمام کلائنٹس پر مکمل ریسرچ کرتی ہے مسٹر جیم۔ میں برسیٹن کی فیس تین سو ڈالر لیتی ہوں اور نتائج کی ضمانت دیتی ہوں۔“

میں نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔ ”آپ میرے معاملے میں کچھ زیادہ تیز جا رہی ہیں۔“ میں نے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ”میں خود کو کسی بھی چیز کا پابند بنانے سے قبل یہ جاننا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کا طریقہ کار کیا ہے؟“

ساتھ ساتھ اسٹیشن نے اپنا رخ میز کی طرف کیا، ایک دروازہ کھولا اور کاغذ کی ایک شیٹ نکالی۔ ”میرا کوئی طریقہ کار نہیں ہے۔ تمہارا جوجی چاہے کھاپی سکتے ہو۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے وہ کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ ”پلیز اس پر دستخط کرو۔“

کے لیے اس قسم کی جگہ کا انتخاب کر سکتی ہے۔ اگر معاملہ ویبڈی کی سفارش اور میرے عزم و مصمم کا نہ ہوتا تو میں وہیں سے گھر واپس چلا جاتا۔

جو سیزھیاں اوپر جا رہی تھیں ان پر تاگو اور پورچی ہوئی تھی۔ ہر طرف خالی بوٹیں اور کھانے پینے کی اشیاء کے ریمپر بکھرے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ دوسری منزل کے پشتر دفاتر کے دروازے بند تھے اور ہر شے کی سطح گرد کی تھیں جی ہوئی تھیں۔

مجھے آگے کی جانب ایک دروازے پر پینٹل کی پلیٹ دکھائی دی جس پر ساتھ اسٹیشن کا نام لکھا ہوا تھا۔ میں نے دروازے کے شیشے پر دستک دی۔ جب کسی نے جواب نہیں دیا تو میں نے دروازے کو دھکیل کر کھول دیا۔

کمرے کی دروازے پر پینٹل کی پلیٹیں اور ان پر کی بھی تصویر نظر نہیں آ رہی تھی۔ کھڑکی کے پاس ایک مویشی ماڈرن میرا دروازہ آلود فولڈنگ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔

”ہیلو!“ میں نے آواز دی۔

کوئی جواب نہیں آیا۔

اسے میں نے پتہ قدموں کی چاپ سنائی دی اور چند سیکنڈ بعد ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے دفتر میں قدم رکھا۔ اس نے اپنے خاکستری بالوں کی شکل میں ہاتھ دھوئے تھے اور پھر سے پر مول شیشوں کی ٹینک نمایاں تھی۔ وہ عورت دینی تیلی اور اس کا قد لانا تھا۔ اس کا لباس ڈارک بیوکٹر کے اسکرٹ اور پھول دار بلاؤز پر مشتمل تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک نیلا فولڈر دیا ہوا تھا۔

”میں ساتھ ساتھ اسٹیشن ہوں۔“ اس عورت نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”اور تم یقیناً جیم ہیبرس ہو اور شٹیک وقت پر آئے ہو۔ یہ ایک اچھی علامت ہے۔“

پھر وہ فولڈنگ کرسیوں میں سے ایک پر براہمان ہو گئی اور اپنا اسکرٹ درست کرنے کے بعد مجھے دوسری کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔ اس نے فولڈر اپنی گود میں رکھا اور اسے کھول دیا۔

”آپ کا حوالہ ویبڈی ہائیکٹر نے دیا تھا۔“ میں نے بتایا۔ ”اس نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کی کامیابی کا ریٹ اٹھانوے فیصد ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنا ہوگا کہ جب میں نے یہ بلڈنگ دیکھی تو قدرے بے زار ہو گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ واپس چلا جاؤں لیکن پھر اپنے مقصد کی خاطر میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ کیا آپ اپنے تمام کلائنٹس سے اسی جگہ پر ملاقات کرتی ہیں؟“

”میں اس وقت تک کوئی دستخط نہیں کروں گا جب تک اس بارے میں مزید نہ جان لوں کہ آپ کرتی کیا ہیں۔ مجھے تین سو ڈالرز کے عوض کیا ملے گا؟“ میں نے اصرار کیا۔ ”ترغیب مسٹر جیم۔ اگر تم دستخط نہیں کرنا چاہتے تو پھر تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔“ اس نے سر دھچکے میں کہا۔ میں نے کاغذ کی سمت اشارہ کیا۔ ”مجھے حقیقت میں کس بات کے لیے دستخط کرنا ہیں؟“

”یہ ایک معاہدہ ہے جس کی رو سے تم اس بات کے پابند ہو گے کہ میری ہدایات کے مطابق یقینی عمل کرو گے اور اس بارے میں کوئی سوال نہیں کرو گے۔ مزید یہ کہ تمہیں اقرار کرنا ہوگا کہ میرے طریقہ کار کو کسی پر آشکار نہیں کرو گے۔ کسی بھی قسم کے اخلاف کا مطلب خاتمہ ہے۔“ یہ کہہ کر سانٹھا اسٹیشن نے اپنی آنکھیں نیم وا کر لیں۔ ”تم یہاں سے رخصت ہونے کے لیے آزاد ہو لیکن میرے احساسات یہ ہیں کہ تم یہاں سے نہیں جاؤ گے۔ تمہیں اپنی مدد کے لیے میری ضرورت ہے۔ کوئی بھی تمہیں وہ نتائج نہیں دے سکتا جو میں دوں گی۔“

میں نے معاہدے پر ایک سرسری نگاہ دوڑائی۔ اس پر درج دونوں پیرا گراف من و عن وہی تھے جو ابھی سانٹھا نے زبانی بتائے تھے۔ لیکن میں اب بھی دستخط کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔ سانٹھا اسٹیشن کی سردمہری مجھے کھل رہی تھی اور اس کی رازداری کی شرط کی وجہ میری کچھ نہیں آ رہی تھی۔ پھر ونڈی ہانچ کر چہرہ میری نظروں میں گھوم گیا۔ اس نے اسی تھراپسٹ کی ہدایات پر عمل کیا تھا اور وزن گھٹانے میں کامیاب رہی تھی۔

اس لحاظ سے سانٹھا اسٹیشن میری آخری امید ہو سکتی تھی۔ میں نے میز پر سے ایک پین اٹھایا اور معاہدے کے کاغذ پر دستخط کر دیے۔

سانٹھا اسٹیشن نے معاہدے کا دستخط شدہ کاغذ اٹھا کر اپنے فولدر میں لگا دیا اور فولدر اپنی میز کی دراز میں بند کر دیا۔

”پروگرام میں خوش آمدید۔ تمہیں ہفتے میں ایک بار اپنا وزن چیک کرانے کے لیے مجھے رپورٹ کرنا ہوگی اور اس وقت تک آتے رہنا ہوگا جب تک تم اپنا وزن ایک سو پچاس پونڈ تک گھٹانے میں کامیاب نہیں ہو جاتے۔ اس وزن کے حصول کے بعد تمہیں وزن چیک کرانے کے لیے سال میں صرف ایک بار آنا پڑا کرے گا۔ تم اپنے حصول

کردہ وزن ایک سو پچاس پونڈ سے زیادہ وزن نہیں ہونے دو گے۔ یہ لازمی ہوگا۔ ہماری کوئی اسپتال ڈائنٹ یا گولیاں نہیں ہیں جو تمہیں کھانا پڑیں گی۔ صرف ایک سادہ اصول ہے جس پر تمہیں عمل کرنا پڑے گا اور تم اس سے کبھی انحراف نہیں کرو گے۔“

”وہ سادہ اصول کیا ہے؟“ میں نے جانتا جاہا۔ ”ہر ہفتے جب تم اپنا وزن کرانے آؤ گے تو تمہارا وزن لازمی طور پر کم از کم تین پونڈ گھٹا ہوا ہونا چاہیے۔“

سانٹھا اسٹیشن نے جواب دیا۔ ”کیا یہ کسی قسم کا لطیفہ ہے؟“ ”یہ مذاق یا لطیفہ نہیں ہے۔ مسٹر جیم! میں تمہیں اس بات کا یقین دلارہی ہوں۔“ سانٹھا اسٹیشن کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ ”ہر ہفتے تین پونڈ وزن گھٹانا ناممکن ہے۔ یقیناً ابتدائی چند ہفتوں تک تو ایسا ہو سکتا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ چند ہفتے میں کوئی وزن گھٹانہ سکوں۔“

”کیا تم اپنی بیوی سے محبت کرتے ہو؟“ ”یقیناً کرتا ہوں لیکن کیا وہی ترغیب کافی نہیں ہے۔“ ”وہ کافی ہے لیکن یہ بھی ضروری ہے۔ اس وقت تمہاری بیوی اپنی بہن کے ساتھ ایک شاپنگ مال میں ہے۔ وہ اس وقت تک یہاں بیٹھنے والی ہے۔ اگر تم اپنی بیوی کے ساتھ ایک سو پچاس پونڈ تک بٹھ نہیں جاتا۔ اگر کوئی ہفتہ ایسا رہا کہ تم اپنا وزن کم از کم تین پونڈ تک گھٹانے میں کامیاب نہ ہوئے تو تمہاری بیوی کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔“ سانٹھا اسٹیشن نے کہا۔

ایک لمحے کے لیے میں سمجھ نہ پایا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ ”خاتمہ؟ خاتمے سے آپ کی مراد کیا ہے؟“ میں اپنی بے چینی کو چھپانے کے لیے مسکرانے لگا۔ ”کیا آپ اسے قتل کر دیں گی؟“

”نہیں ایک گندی اصطلاح ہے۔ میں خاتمے کے لفظ کے استعمال کو ترجیح دیتی ہوں۔“ سانٹھا اسٹیشن نے کہا۔ میں نے میز کی دراز کی جانب اشارہ کیا۔ ”وہ معاہدہ جس پر میں نے دستخط کیے ہیں، اس میں کہا گیا ہے کہ آپ کی ہدایات سے کسی بھی قسم کے اخلاف کا مطلب خاتمہ ہوگا۔ کیا آپ مجھے قتل کروں گی؟“ میں نے پوچھا۔

”اگر نوبت یہاں تک آئی تو!“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا دل دگنی رفتار سے دھڑکنے لگا اور ہاتھ کانپنے لگے۔ میں نے اپنی انگلی سے کھونٹے کے انداز میں اس کی جانب اشارہ کیا اور قدرے بلند آواز سے

بولاً۔ ”تم پاگل ہو۔ میں پولیس کے پاس جا رہا ہوں۔“ اب میں اسے آپ کے بجائے تم سے مخاطب کر رہا تھا۔ ”اگر تم نے ایسا کیا تو تمہاری بیوی کا فوری طور پر خاتمہ کر دیا جائے گا اور اس کا الزام تمہارے سر دھریا جائے گا۔ ہم نے تمہارے گھر سے ایسی بہت سی چیزیں ہٹا دی ہیں جن کی وجہ سے تم اس جرم میں بے آسانی ملوث ہو جاؤ گے۔ اب ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ... تمہاری بیوی چوبیس گھنٹے کڑی نگرانی شروع کر دی جائے۔ تمہاری تھراپسٹ کی حیثیت سے میں سینڈرا کو قتل کرنے کے تمہارے ذہن پر سوار خیال اور اس سے متعلق ہماری خفیہ گفتگو کو پولیس پر آشکار کرنے پر مجبور ہو سکتی ہوں۔ پولیس تم پر کبھی یقین نہیں کرے گی کیونکہ تمہارے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ جبکہ ایک تھراپسٹ کی حیثیت سے میری بات پولیس کی نگاہ میں زیادہ وزن دار اور اہمیت کی حامل ہوگی۔ سو تم دیکھ سکتے ہو کہ جب تک تم اپنا وزن ایک سو پچاس پونڈ تک گھٹانے لیتے، تم میرے کنٹرول میں ہو۔ اب تمہارے حق تلفی کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں۔“

”ادھ شٹ۔“ مجھے اپنی آواز کا بھتی محسوس ہوئی۔ ”تم جو چاہ رہی ہو وہ ناممکن ہے۔ کوئی بھی ہر ہفتے اپنا وزن تین پونڈ نہیں گھٹا سکتا۔ مجھے اس کا کوئی حوصلہ نہیں ہے۔“ میں ایک کاروباری گورت ہوں مسٹر جیم۔ اگر میں چاہوں تب بھی تمہیں اس پروگرام سے باہر نہیں نکال سکتی۔ میرے سامنے میرے لیے نامعلوم ہیں۔ میں ان کے رابطے کے طور پر کام کرتی ہوں۔ تمہاری ادا کردہ رقم کو میں الحاق کپنی کے پوسٹ آفس بکس کے پتے پر روانہ کر دیتی ہوں۔ پھر وہ مجھے میری تنخواہ بھیج دیتے ہیں۔ وزن کنٹرول کرنا ایک بڑا بزنس ہے اور میرے جو باس ہیں انہوں نے اسے اپنے لیے انتہائی منافع بخش بنانے کا ایک طریقہ وضع کیا ہوا ہے۔ وہ بے حد خطرناک لوگ ہیں جو تمہارے عہد کو نہایت سنجیدگی سے لیتے ہیں۔“

”میں اس بات پر یقین کر رہا ہوں۔ دیکھو، تم اپنے ہاتھوں کو بتا دو کہ اگر وہ اس معاملے کو نہیں ختم کر دیں تو میں انہیں جوہر چاہوں گے، ادا کر دوں گا۔“ میں نے کہا۔ سانٹھا اسٹیشن نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”یہ بات ہمارے کاروبار کے لیے نقصان دہ ہوگی۔ ہماری ایک شہرت ہے جس کی بدولت ہم جی رہے ہیں۔ اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہے۔ ہم اپنی کامیابی کے تناسب پر بے حد فخر ہے۔ ایک بار جب آپ معاہدے پر دستخط کر دیتے ہیں

تو پھر آپ ہمارے کلائنٹس میں سے ایک بن جاتے ہیں۔ میں اس بارے میں اب کچھ نہیں کر سکتی۔“ سانٹھا نے ٹکاسا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”فرض کرو کہ میں اپنا وزن کرانے کے لیے حاضر نہیں ہوتا تو پھر کیا ہوگا؟“ میں نے جانتا جاہا۔ ”ہم جانور نہیں ہیں۔ ہم لپک دکھاتے ہیں۔ لیکن ہم منطقی طور پر قابل قبول جواز کے بغیر غیر حاضری تسلیم نہیں کرتے۔ میرے سامنے ہر وقت تم پر نگاہ رکھے رہیں گے اور میں متنبہ کر دوں گا کہ اگر انہوں نے محسوس کیا کہ تمہاری غیر حاضری کا جواز اطمینان بخش نہیں تو پھر میں ان کے رد عمل کی ذمہ دار نہیں ہوں گی۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ ہر ہفتے باقاعدگی سے رپورٹ کرنا تمہارے حق میں بہتر رہے گا۔“

سانٹھا اسٹیشن نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ☆☆☆ جب میں اپنی کارڈرائیو کرنا ہوا اپنے گھر کی جانب جا رہا تھا تو میرے ذہن میں ایک طوفان سا رہا تھا۔ سانٹھا اسٹیشن کے دفتر سے نکلنے پر سیاہ رنگ کی ایک لنکن کار نے میرا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے میرے تعاقب اور نگرانی کو ختم رکھنے کی قطعاً کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے اپنی کار کا ٹرنک کھولا تھا اور اس میں سے ہتھیار نکالے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ میری انگلیوں کے نیچے سپرڈ پڑ گئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ لوگ یقیناً سینڈرا کو قتل کرنے کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہو سکتے۔

یہ میں نے اپنے آپ کو کس جہال میں پھنسا لیا ہے؟ یہ میں نے سینڈرا کو کس جہال میں پھنسا دیا؟ اس پاگل پن سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ تو ہوگا۔

جب میں اپنے اپارٹمنٹ پہنچا تو سینڈرا گھر پر موجود نہیں تھی۔ میں لپک کر اندر پہنچا اور کھڑکی سے جھانک کر باہر کی طرف دیکھا۔ سیاہ رنگ کی لنکن کار سڑک پر موجود تھی۔ اگر میں پولیس کو فون کرتا ہوں تو وہ لوگ سینڈرا کو قتل کر دیں گے۔ مجھے اس بارے میں منصوبہ تیار کرنے کے لیے وقت درکار تھا۔

میں نے سبک کے نیچے سے کوڑے کا ایک خالی تھیلا نکالا اور پچن کے کینٹ کھول کر ان میں رکھی ہوئی اشیاء جیسے بسکٹ، کیک، بیٹر کے جاز، آلو کے چپس، کینڈی بارز نکال کر تھیلے میں بھرنا شروع کر دیں۔ جو بھی شے مجھے کھانے پر درملالت تھی، وہ اس تھیلے میں منتقل ہو رہی تھی۔

جب میں ان اشیاء سے دوسرا تھیلا بھر رہا تھا تو سینڈرا

”تم کیا کر رہے ہو، ہنی؟“ اس نے پوچھا۔

جس معاہدے پر میں نے دستخط کیے تھے، اس کی رو سے میں نے یہ راز آشکار نہ کرنے کا عہد کیا تھا۔

”اس مرتبہ میں یہ کر کے رہوں گا۔“ میں نے اپنی آواز کو کنٹرول میں کرنے کی کوشش کی۔ ”میں اپنا وزن گھٹانے جا رہا ہوں۔“

”کچھ زیادہ بتانے کو نہیں ہے۔ اس کا راز ترغیب ہے۔ میں نے ایک فارم پر دستخط کیے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ میں اس کے طریق کار کا راز کسی پر ظاہر نہیں کروں گا..... حتیٰ کہ تم پر بھی نہیں۔ لہذا تم خود ہی نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا۔“

سیٹرڈراکو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے الفاظ کس حد تک حقیقت اور سچائی پر مبنی تھے۔

☆☆☆

دفتر میں میرا کام متاثر ہو رہا تھا۔ میں اپنی توجہ مرکوز نہیں کر سکتا تھا اور مجھے غلطیاں سرزد ہونے لگی تھیں۔ جسے تک میں ذہنی اور جسمانی طور پر تباہ ہو چکا تھا۔ دفتر میں لوگوں نے میرے بارے میں باتیں بنانا شروع کر دی تھیں۔ اس نے بھی کہہ دیا کہ اگر میں نے اپنے آپ کو درست نہیں کیا تو وہ مجھے نوکری سے رخصت کر دے گا۔

میں نے ہر مرتبہ سائنٹسٹوں سے منت سماجت کی کہ وہ مجھے اس پروگرام سے نکال دے اور اس نے ہر بار یہی جواب دیا کہ یہ ناممکن ہے۔ یہ چوتھا ہفتہ تھا جب مسئلہ کھڑا ہو گیا۔

اس سہ پہر میں سوچوں میں گم یوسن کی سڑکوں پر
یونی گھومتا رہا۔ میں سینڈرا سے مدد طلب نہیں کر سکتا تھا
کیونکہ مجھے یونی تھا کہ ہمارے گھر میں آواز سننے کا خفیہ آلہ
نہ نصب ہو۔ اگر ہم اس بارے میں گفتگو کرنے کی خاطر باہر
چہل قدمی کے لیے جاتے تب بھی شاید ان کے پاس کوئی ایسا
طریقہ کار ہو سکتا ہے کہ وہ ہماری گفتگو سن لیں۔

اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ تب میں نے ایک نوٹ
 لکھا کہ اس کے ہاتھوں میں تھمادی۔ میں نے تمام باتیں اس نوٹ
 کے تحت تحریر کر دی تھیں اور وہ منسوبہ بھی بیان کر دیا تھا جس

پھر سینڈرا نے اپنی بہن کو فون کیا اور وہ دونوں
 شایگ مال چلی گئیں۔

البتہ اصل بات یہ تھی کہ سینٹر کی کار اس کی بہن
واٹس چلا رہی تھی جس نے اپنے طیلے اور لباس سے سینٹر کا
بہرہ روپ اختیار کر لیا ہوا تھا۔
سینٹر ان کے جانے کے چند منٹ بعد گھر سے نکلی۔

ہمارے درمیان یہ بات طے ہو چکی تھی کہ جب معاملات ٹھیک ہو جائیں گے اور ہماری زندگیاں محفوظ ہوں گی تو وہ مجھ سے خود ہی رابطہ کرے گی۔

میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ سینڈرا کی عمرانی کرنے والوں کو پیغام دے رہا تھا کہ وہ سینڈرا کو قابو کر لیں۔ لیکن اس وقت تک سینڈرا کی بہن وائلٹ پلانٹ کے قریبی دروازے سے نکلنے کے بعد اپنی کار میں سوار ہو کر۔

سینہ ذائقہ حسن

”میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟“

☆☆☆

ایک نچے حکم دیا کہ مجھے رنج وے ایک روز نامی میٹل
ہسپتال میں اس وقت تک لاک اپ میں رکھا جائے جب
تک کہ ڈاکٹر اس بات کا فیصلہ نہیں کر لیتے کہ میں ایک
ماتل زندگی گزارنے کے لیے فٹ ہو چکا ہوں۔ تب ہی میں
عام زندگی میں لوٹ سکتا تھا۔

اپنی بابت فحی تصور کی بہتری کے لیے انہوں نے مجھے پندرہ سو کیلو فی یوم کی غذا پر رکھ دیا۔ اگر میں نے تھراپی پر حسب ہدایت بہتر عمل کیا تو وہ ایک سال سے کچھ زیادہ عرصے کے بعد مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں گے۔

☆☆☆

جب میں کمرے میں داخل ہوا تو ہراسٹ نے اپنی کرسی کا رخ کھڑکی کی سمت کیا ہوا تھا۔ میں میز کے سامنے بیٹھ کر خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد ہراسٹ نے اپنی گھونسلے والی کرسی کا رخ میری طرف کیا تو بے ساختہ میری آنکھ لگی۔

— جنوری 2015ء —

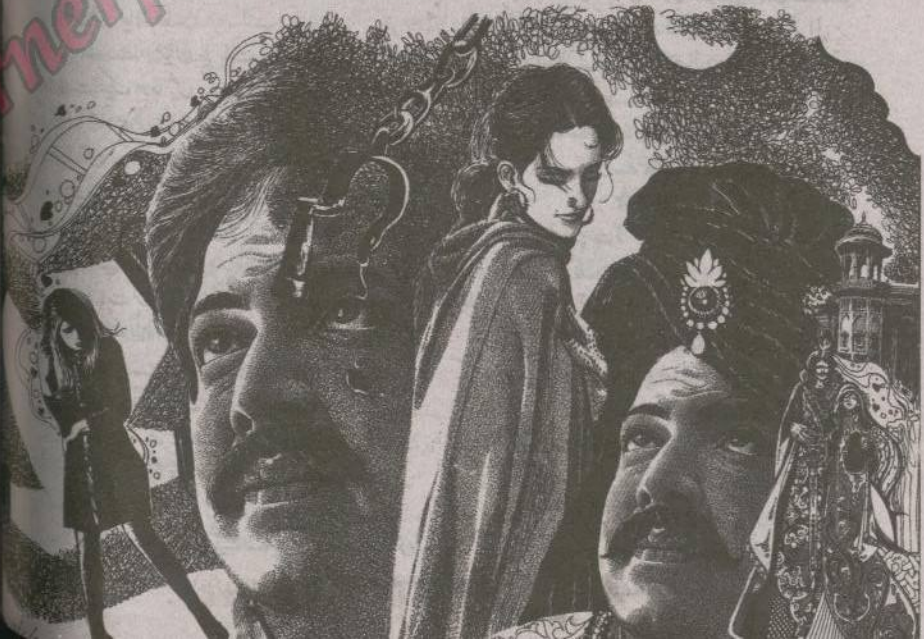


محمد الدین نواب

چودھویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرائی ویرانی ہو یا پرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوس قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پرے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادلوں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کبھی پھولوں کی مہک، کبھی کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو پتہ چلا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پہنچ سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحریر اور لطیف جذبوں میں سموٹی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی جلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ محفلوں، لاکھوں سینے، آنسوؤں کا تخیل دھڑکنے لگا۔

ایک چہرہ کن روپ، کئی چھاؤں کئی وجوہ، محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلا



آزادی سے گھومتا رہا۔ کتنا آسان ٹارگٹ تھا لیکن اسے گولیاں مارنے والے شوٹرز خود ہی موت کے گھاٹ اترتے چلے گئے۔

دوسرے نے کہا۔ ”ہماری معلومات کے مطابق مرینہ اسے اٹھانے لگی تھی اور وہ اب تک وہیں چھپا ہوا ہے۔“

ڈی بلیک نے کہا۔ ”مرینہ کا قہقہہ عجیب ہے، اس نے مراد کے بچے کی ماں بننے کے لیے اسے چھپا رکھا ہے۔ بڑی عجیب عورت ہے۔ ایک بچہ پیٹ میں لینے کے لیے پچاس لاکھ کی بیمنٹ کو ٹال رہی ہے۔ اس کے MET ڈیپارٹمنٹ والے اسے فوراً پیش کرنا چاہتے ہیں۔ پچھلی تمام رات بے پور کے لوگ جاگتے رہے۔ میٹری ہڈن کے اور میرے کارندے وہاں ایک ایک گھر میں کھس کر اسے تلاش کرتے رہے لیکن وہ ہمارے ہاتھ نہیں آیا۔“

”میرا خیال ہے ہڈن کوئی چال چل رہا ہے۔ اس نے مراد کو بے پور سے نکال کر کسی دوسری جگہ پہنچا دیا ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں۔ میرے آڈیو نے دہلی میں ہڈن پر حملہ کیا تھا تا کہ وہ خوفزدہ ہو کر مجھے مراد تک پہنچا دے۔“

میکی براؤن نے کہا۔ ”MET سے ہمارا معاہدہ ہو چکا ہے۔ اگر مراد ہڈن کے پاس ہوتا تو وہ پچاس لاکھ حاصل کر لے گا۔ لیکن فوراً اسے ہمارے ہاتھ لے کر آئے گا۔“

ڈی بلیک نے کہا۔ ”MET والوں کا مراد سے ایسا کوئی سمجھوتا ہے جس کی وجہ سے وہ ابھی پچاس لاکھ بیمنٹ بڑی رقم نہیں لے رہے ہیں۔ ہمارے اہم معاملے کو نظر انداز کر رہے ہیں۔“

”آج صبح میرے دو ماتحتوں نے ہڈن کی بہن لیزا کو اغوا کرنا چاہا تو اچانک ایک شخص نے آکر اسے بچا لیا۔ میرے دونوں ماتحتوں کو اس نے مار ڈالا۔ اس کا چہرہ مامک میں چھپا ہوا تھا۔“

”میں یقین سے کہتا ہوں کہ ہڈن کی بہن لیزا والا وہ مراد علی مکی ہوگا۔ مراد مرینہ ہڈن اور ان کے ڈائریکٹر جنرل جان اتھوئی کے درمیان خفیہ گٹھ جوڑ ہے۔“

میکی براؤن نے کہا۔ ”اسے اپنی نفسانی خواہش کی خاطر چھپا کر رکھنے والی مرینہ ہے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ پہلے مرینہ کو ہی اپنے قابو میں کرنا ہوگا۔“

ڈی بلیک نے کہا۔ ”آج میں نے اسے قابو میں کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ غضب کی فائر ہے۔ اس نے ایک ہی حملے میں میرے چاروں فائٹرز کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔“

اور انڈر ورلڈ کے مجرموں سے رابطے میں رہتا تھا اور اسی مقصد کے لیے اس نے تمام تنظیموں کے سربراہوں کو ایک سینار اسٹار ہوں میں شراب و شباب کی دعوت دی تھی۔ دوسو پچاس کروڑ کے سات منزلہ ہوں میں سربراہ کے لیے کمرے اور سوئٹس ریزرو کرائے گئے تھے۔ ایک خوبصورت سے سوئٹنگ پول میں انتہائی حسین عورتیں بالشت بھر کے لباس میں تیر رہی تھیں۔ وہاں سے نکل کر بڑے ناز و انداز سے مہمانوں کو شراب کے جام پیش کر رہی تھیں۔ پھر وہاں سے پلٹ کر پول کے شفاف پانی میں غوطے لگا رہی تھیں۔

تمام سربراہ پول کے کنارے بیٹھے کھانی رہے تھے۔ شبابی نظاروں سے آنکھیں سینک رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ حسنا میں نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ مہمانوں کے سامنے سے شراب کی بوتلیں اٹھالی گئیں۔ ایک مہمان نے میکی براؤن سے کہا۔ ”مسٹر براؤن..... ایہ کیا؟ ابھی تو پینا شروع کیا تھا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”ابھی حسنا میں مست کرنے والی تھیں ہائے کیا کیا؟ تم نے اچانک ہی سب کو غائب کر دیا۔“

میکی براؤن نے کہا۔ ”ابھی ہم جس بات کے لیے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں صرف دو بات ہوگی۔ پیش و عشرت کے لیے ساری رات پڑی ہے۔“

”میرے دوستو! ہماری جرائم سے بھرپور ایک الگ دنیا ہے۔ ہم اس دنیا میں ایک ہی زندگی گزارتے آ رہے ہیں۔ ہمارے درمیان ایسے خطرناک مجرم آتے جاتے رہے ہیں جو کسی سے زبرد نہیں ہوتے تھے۔ اس کے باوجود وہ کیونکر گولی سے حرام موت مر گئے۔“

”لیکن وہ... وہ مراد علی مکی کسی کے نشانے پر نہیں آ رہا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ وہ ناقابل شکست ہے۔ نہیں، ہم میں سے کوئی بھی اسے ایک چنگی میں مل دے گا لیکن وہ نظر آئے۔“

”وہ اب تک اس لیے سلامت ہے کہ نظر نہیں آتا ہے۔ ہمارے شوٹرز اس کی تصویر لیے پھرتے ہیں لیکن نہ جانے کیا بات ہے، وہ جانا پہنچانا چہرہ نہیں دکھائی نہیں دیتا ہے۔“

ایک تنظیم کے سربراہ نے کہا۔ ”جب وہ دکھائی دیتا تھا تب ہم نے کون سا تیر مار لیا؟“

ایک انڈر ورلڈ کے سربراہ نے کہا۔ ”بڑے شرم کی بات ہے ایک چھپر مار نہیں جا رہا ہے اور ہم کرائیاں پیٹتے جا رہے ہیں۔ وہ جیل سے باہر آنے کے بعد کراچی شہر میں

ہال کی عمارت باہر سے دیکھی ہے۔ اسے اندر سے بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”کیسے دیکھو؟ تمام دشمن تمہاری صورت کو دور سے پہچان لیں گے۔“

”میں اسی مسئلے پر بات کرنے آیا ہوں۔ کیا آپ کسی پلاسٹک سرجری کے ماہر سے رابطہ کر سکتے ہیں؟ میں آج ہی بلکہ ابھی چہرہ بدلتا چاہتا ہوں۔“

وہ سر ہلا کر بولا۔ ”تم بروقت صبح قدم اٹھا رہے ہو۔ ڈاکٹر ٹینیسن بہت ہی ماہر اور تجربہ کار سرجن ہے۔ میں نے سنا ہے، دو چار گھنٹے میں سرجری ہو جاتی ہے۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا۔ تمہیں ڈاکٹر ٹینیسن سے معلومات حاصل ہو جائیں گی۔“

”آپ ان سے اتنا کہہ دیں کہ چہرہ آج ہی بدل جائے۔ کل ہڈن کے معاملے میں مصروف رہوں گا۔“

دھرم داس فون اٹھا کر ڈاکٹر ٹینیسن کے نمبر پر کال کرنے لگا۔

جرائم کی دنیا میں اگلی کی اہمیت اس حوالے سے ہے کہ پہلا گاڈ فادر بیٹیں سے ابھرتا تھا۔ جب سے اب تک اس ملک میں گاڈ فادر کی فکری تسل ورسل تخلیقی پھولتی جا رہی ہے۔ ملکی سیاست میں ان کا براؤن دامن ہے اور قانون والوں کے سامنے گھٹنے ٹیکتا رہتا ہے۔

دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی مجرموں کی تنظیمیں اتنی مضبوط اور طاقتور ہوتی ہیں کہ بلیک لسٹ میں ہونے کے باوجود آزادی سے آگ اور لہو کا کھیل جاری رکھتی ہیں۔ یہ تنظیمیں لاکھوں پاؤنڈز اور کروڑوں ڈالرز کی ڈینگ کرتی رہتی ہیں۔

تمام تنظیمیں ایک دوسرے کی دوست بھی ہوتی ہیں اور دشمن بھی۔ ان خطرناک لوگوں کی ایک الگ دنیا ہے۔ سب سے الگ اپنی سوسائٹی ہے۔ یہ حرام موت بھی مرتے ہیں اور پیش و عشرت سے زندگی بھی گزارتے ہیں۔

سٹڈ کیٹ ریڈارٹ کا ہیڈ کوارٹر سکلی میں تھا۔ مراد نے ان کے سب سے اہم کارندے برنارڈ کو ہلاک کیا تھا۔ برنارڈ ایک بڑے ملک کا سیکرٹ ایجنٹ تھا اور ریڈارٹ کے سربراہ میکی البرٹ کا بیٹھو بھی تھا۔ مراد نے بیٹھو کی برنارڈ کے بعد سالہ میکی البرٹ کو بھی جہنم میں پہنچا دیا تھا۔

اب دوسرا سالہ میکی براؤن ریڈارٹ کا سربراہ بن گیا تھا۔ اس نے مراد کے سر کی قیمت پچاس لاکھ ڈالرز لگائی تھی۔ اس سلسلے میں وہ دن رات تمام خطرناک تنظیموں سے

باتیں بیان نہیں کروں گا۔ تم یقین نہیں کرو گی۔“

”صرف ایک ہی بات سے یقین کروں گی۔ تم کو ڈورڈز... ادا کرو گے۔ یاد ہے نا؟ یو لو کیا پولو گے؟“

”میں پولوں گا، میری ماروی کسی عمر کے کھانے میں کبھی نہیں آئے گی۔“

وہ بولی۔ ”ہاں، تب میں آنکھیں بند کر کے یقین کر لوں گی کہ انجینی بن کر آنے والے تم ہی ہو۔“

”تو پھر یہ چہرہ مٹا دو؟“

”ہاں، میں ہر حال میں نہیں پہچان لوں گی۔ تم اپنی جان بچانے کی فکر کرو جتنی جلدی ہو سکے اپنی شخصیت کو بدل دو۔“

”بس تو پھر ٹھیک ہے۔ میں فون بند کر رہا ہوں۔ چہرہ تبدیل ہونے کے بعد تمہیں کال کروں گا۔“

مراد نے رابطہ ختم کر کے اطمینان کی سانس لی۔ اسے کسی کی پروا نہیں تھی ایک ماروی کی طرف سے فکر بھی کہ وہ اس نئے چہرے کو قبول نہیں کرے گی۔ مگر اب اس نے اسے بھولے ہوئے کو ڈورڈز یاد دلانے تھے۔ اب وہ اطمینان سے پیدا نئی چہرے کو اوداع کہہ سکتا تھا۔

اس نے اپنا فون اٹھا کر ایم این اے دھرم داس سے رابطہ کیا۔ ”آگ آگ آپ مصروف نہیں ہیں تو ضروری باتیں کرنے کے لیے آنا چاہتا ہوں۔“

وہ بولا۔ ”مصروفیات تو ہیں۔ یہ کبھی پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔ مگر تمہارے لیے وقت نکال سکتا ہوں۔ آ جاؤ۔“

وہ آدھے گھنٹے میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے کہا۔ ”مراد... اتم نے دشمن کی بہن کو ہلاک نہیں کیا۔ اس کی جان بچائی ہے۔ یہ تم نے بہت اچھا کیا ہے۔“

مراد نے پوچھا۔ ”ہڈن آپ سے کچھ کہہ رہا تھا؟“

”تم نے اسے الجھا دیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ لیزا کوئی زندگی دینے والا اگر کوئی دیوتا ہے تو وہ اس سے ملاقات کیے بغیر کیوں چلا گیا اور اس نے بائیس کا مامک پہن کر اپنا چہرہ کیوں چھپا رکھا تھا۔ وہ دیوتا بھی ہو سکتا ہے اور دشمن بھی۔“

”وہ ہوشیار ہو گیا ہے۔ کل کرکس ڈے ہے۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ہال میں جشن منایا جائے گا وہاں سکیورٹی کے لیے سپاہیوں کی تعداد بڑھا دی جائے۔ یہ غیر ملکی سفارت خانے والوں کا معاملہ ہے۔ ان کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ میں نے اسے یقین دلایا ہے کہ سکیورٹی سخت کر دی جائے گی۔ تم یو لو کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”میں نے ادھر سے گزرتے ہوئے دانی مکی ہی اسے

اس نے بتایا کہ مرینہ نے کبھی چالبازی سے انہیں ہلاک کیا تھا۔ ان میں سے ایک نے حقارت سے کہا۔ ”عورت کتنی ہی زبردست فائز بن جائے۔ پہاڑ جیسے مرد کے مقابلے پر آئے تو چوڑیاں بھول جاتی ہے۔“

ڈی بلیک نے اس سے پوچھا۔ ”بار برس... اتم واقعی زبردست ہو۔ کیا اسے زیر کر سکو گے؟“

بار برس نے پوچھا۔ ”میمون کتنی ہوگی؟“

”اگر اسے جانے نہیں مارو گے، اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر اسے اپنا جینا کر کے مہرے حوالے کر دو تو میں ہزار ڈالر دوں گا۔“

”بہت کم ہیں۔“

میکسی براؤن نے کہا۔ ”مرینہ کا بومیں آجائے گی تو اس سے اگلیا جاسکے گا کہ مراد کو کہاں چھپا رکھا ہے۔ وہ مراد سے دور ہوجانے کے باوجود اس کی موجودہ پناہ گاہ کے بارے میں اور اس کی مصروفیات کے بارے میں ضرور جانتی ہوگی۔“

”بے شک یہ آسان راستہ ہے۔ ہم مرینہ کی گردن دیوچ کر مراد تک پہنچ جائیں گے۔“

میکسی براؤن نے کہا۔ ”جو بھی مرینہ کو اپنا جینا کر لائے گا، میں اسے ہزار ڈالر دوں گا۔“

بار برس نے کہا۔ ”میرے ہاتھ میں توڑ پھوڑ کے آپ کے سامنے پیش کروں گا۔“

دوسرے فائز ارمنی نے کہا۔ ”یہاں تم سے بھی سوا میر بیٹھے ہیں۔ تم سے پہلے میں اسے اپنا جینا کر لے آؤں گا۔“

ان کے درمیان ایک بوڑھا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تھیں اور انگلیوں کے درمیان دانے پھسلتے جا رہے تھے۔ اس نے کہا۔ ”آپس میں نہ لڑو۔ جب وہ ہاتھ آجائے گی تو ثابت ہو جائے گا کہ کون کس سے برتر ہے۔“

وہ بوڑھا استیبل سے آیا تھا۔ اس کی تنظیم کا نام... ”ترکے بلند“ تھا۔ ترکی زبان میں اس کے معنی تھے، بلندی پر اُڑنے والا پرندہ۔ اس بوڑھے کا نام نظام تھا۔ تھا۔ بڑا پچپنا ہوا تھا۔ سب اسے نظام بابا کہتے تھے۔

میکسی براؤن نے کہا۔ ”نظام بابا! تم ہمیشہ دور کی کوڑی لاتے ہو۔ تم نے سوچا ہوگا کہ مراد کی تک کیسے پہنچو گے؟“

”ہاں تم پچاس لاکھ ڈالر کا معاوضہ دے رہے ہو۔ جرائم کی دنیا میں مراد علی مگنی پہلا دشمن ہے، جس کے سر کی اتنی بڑی قیمت لگائی گئی ہے۔“

اس نے میکسی براؤن کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ ”تم

غصے اور جوش وجون میں ہو۔ مراد نے پہلے تمہارے بہنوئی برنارڈ کو مارا پھر تمہارے بھائی میکسی البرٹ کو ختم کر دیا۔ میں تم سے کہوں گا کہ چھ ماہ تک مہر کر دو اور اسے بھول جاؤ تو نہ مہر کرو گے نہ بھولو گے۔“

میکسی براؤن نے پوچھا۔ ”میرے مہر کرنے سے کیا وہ گرفت میں آجائے گا؟“

نظام بابا نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”ہاں۔ چھ ماہ بعد وہ تمہارے سامنے اپنا جین کر آئے گا۔“

وہاں بیٹھے ہوئے لوگ ہنسنے لگے۔ ایک نے پوچھا۔ ”کیا چادوسے اپنا جین کر آجائے گا؟“

وہ ان پر ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ”یہاں بیٹھ کر بس رہے ہو اور تمہارے جاننا جاسوس اور شوٹرز ہر دوسرے تیسرے دن مراد کے ہاتھوں مارے جا رہے ہیں۔ آپ ذرا حساب لگائیں۔ اگلے چھ ماہ تک ہر تنظیم کے ہزار ڈالر والے کے کتنے وفادار اور جاں نثار مارے جائیں گے۔“

ایک نے فضا میں گھونسا اہراتے ہوئے کہا۔ ”چھ ماہ کی بات نہ کرو۔ ہم چھ دنوں کے اندر اس کی لاش گرا دیں گے۔“

نظام بابا نے کہا۔ ”اپنا گھونسا جیب میں رکھو۔ مجھے معلوم ہے اس نے تمہارے جاں نثار فائزوں کو اپنے ہتھیار چھپا دیا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں اس کے جاننے والے جاں نثار جان سارحان سے جائیں گے۔ تمہارا کیا جائے گا؟“

میکسی براؤن نے کہا۔ ”ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے مزید آدمی مارے جائیں۔ نظام بابا...! آپ بتائیں چھ ماہ تک اسے بھولنے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ہم اسے تلاش کر چھوڑ دیں۔ وہ ہمیں نظر آئے تو اسے گولی نہ ماریں؟“

اس کی انگلی بیچ کے دانوں پر پھسل رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”وہ نظر نہیں آئے گا۔ اسے صرف مرینہ ہی نہیں، سنڈکیٹ دی ماسٹر کے سربراہ ماسٹر کو بوبو بھی زبردست سیکورٹی دے رہا ہے۔“

”آپ معلومات حاصل کریں تو معلوم ہوگا ماسٹر کو بوبو کی اور کتنی دوست تنظیمیں ہیں جن کی مدد سے مراد چھپنے میں کامیاب رہتا ہے۔“

”آپ کیلئے یہ بتائیں چھ ماہ بعد آخرا کیا ہوگا؟ وہ کیسے ہمارے ہاتھ آئے گا؟“

”وہ چھپنے والا ہر روز دن رات اس انتظار میں رہے گا کہ کوئی کہیں سے اس پر حملہ کرنے آئے گا اور حیران ہوتا رہے گا کہ کوئی اسے سینگ مارے نہیں آ رہا ہے۔“

”اسے سیکورٹی دینے والے کو بوبو مرینہ اور دوسرے مددگار ہر روز مرینہ اس کے دشمن کو کہیں نہیں پائیں گے تو یقین کر لیں کہ دشمنوں نے مراد کو بھلا دیا ہے۔ انہوں نے مراد سے خوفزدہ ہو کر ہتھیار ڈال دیے ہیں۔“

”تب بہت محتاط ہو کر اپنی پناہ گاہ سے کبھی نکلتے گے گا۔ مہر عام آنے کے بعد بھی اس پر حملہ نہیں ہوگا تو وہ رفتہ رفتہ سیکورٹی کے معاملے میں بے پروا ہو جائے گا۔ ایسے وقت یعنی کم از کم چھ ماہ بعد ایک اسے چاروں طرف سے گھیر کر حملہ کیا جائے گا تو وہ اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔“

ایک نے کہا۔ ”یہ تو وہی بات ہوئی کہ کب باپ مرے گا اور کب جاندا ملے گی۔ وہ پناہ گاہ سے نکلے یا نہ نکلے، ہم اس لگائے بیٹھے رہیں گے۔“

میکسی براؤن نے کہا۔ ”نظام بابا! آپ کی پلاننگ بہت اچھی ہے لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ مراد چھ مہینوں میں اور زیادہ طاقتور ہو جائے گا۔ آج مرینہ اور کو بوبو وغیرہ کا محتاج ہے۔ کل کسی ملک میں انڈر ورلڈ کا ٹیگ لیڈر بن جائے گا۔ ہم اسے پاؤں پھیلانے کا موقع نہیں دیں گے۔“

”چلو میری اس پلاننگ کو جانے دو۔ ایک دوسری تدبیر ایسی ہے کہ مراد پر کوئی نہیں چلائی پڑے گی۔ وہ خود ہی ہمارے پاس دوبارہ آجائے گا۔“

”نظام بابا! آپ کو ایسی تدبیر پہلے بتانی چاہیے۔“

اس نے کہا۔ ”تدبیر عمل کرنا بہت مشکل ہوگا۔“

”آپ بولیں۔ ہم عمل کر کے دکھائیں گے۔“

پتا نہیں وہ بیچ ہاتھ میں لیے بولنے کے دوران کیسے پڑھ رہا تھا۔ انگلیوں کے درمیان دانے پھسلتے جا رہے تھے۔

اس نے کہا۔ ”مراد علی مگنی کی ایک بہت بڑی کمزوری ہے اور وہ ایک بہت ہی حسین لڑکی ہے۔ اس کے عشق میں حالات نے ایسی کر دت بدلی ہے کہ وہ ایک گدھا گاڑی والے کی غریبی اور شرافت کو بھول کر جرائم کی دنیا میں آ گیا ہے۔“

”محبوب نامی اس کا ایک ہم شکل ہے۔ اسے دیکھتے ہی آپ سمجھیں گے کہ وہ مراد علی مگنی ہے۔ وہ اس ملک میں ایک بہت بڑا ارب بقی صنعت کار ہے۔ مراد کی محبوب کا نام ماروی ہے۔ وہ محبوب کی سخت سیکورٹی میں رہتی ہے۔ وہ بڑے وسیع ذرائع کا مالک ہے۔ وہاں کی ایسی شخص والے اس سے بھرپور تعاون کرتے ہیں۔“

”اگر سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود آپ ماروی کو

وہاں سے اغوا کر کے لانے میں کامیاب ہو جائیں گے تو مراد پاگل ہو کر اس کے پیچھے دوڑا چلا آئے گا۔“

میکسی براؤن نے کہا۔ ”ایسی بات ہے تو ہم ماروی کے متعلق اپنے طور پر معلومات حاصل کریں گے۔ اگر وہ مراد کے لیے متناطیس ثابت ہوگی تو جان جو ہم میں ڈالنے والے ہمارے جاننا ہر حال میں اسے معصومہ کو اٹھا کر لے آئیں گے۔“

”ہم اب تک ان تدابیر سے متفق ہوئے ہیں کہ مرینہ کو اپنا جینا کر اس پر تار چر کر مراد کا پٹھان کا معلوم کریں۔“

”دوسری تدبیر یہ ہے کہ اس کی محبوبہ ماروی کو کوکاپچی شہر سے اٹھا کر یہاں لایا جائے پھر دیکھیں گے کہ وہ دیوانہ عاشق ادھر خود ہی آئے گا یا نہیں؟“

”ہمارے ماتحت کام کرنے والے جان کی بازی لگاتے رہتے ہیں۔ ہم ان کی قدر کرتے ہیں۔ ہم مراد کے مقابلے پر جانے والوں کی میمنہ بڑھائیں گے اور کوشش کریں گے کہ ان کی لاشیں نہ آئیں۔ وہ زندہ آئیں۔ صرف ایک لاش مراد کی لاش جلد سے جلد گادی جائے۔“

میکسی براؤن نے یہ کہہ کر ایک بین کو دیا۔ گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی سینا میں مختصر سے لباس میں نمودار ہونے لگیں۔ پھر وہی جام و بالا دوشوں سے نکلتی۔

”چلو ماروی! آپ کو یہاں لایا گیا ہے۔“

”دربار کی محفلیں پھر سے گرم ہو گئیں۔“

☆☆☆

ڈاکٹر مینی اس پلاسٹک سرجری کا ماہر تھا۔ لوگ اسے مینی کر ریزی کہتے تھے کیونکہ وہ ایک ذرا خفگی یا پینارل سا لگتا تھا جبکہ ایسا نہیں تھا۔ اس نے اگلوتے جوان بیٹے راہن من کو صرف اس لیے گھر سے نکال دیا تھا کہ وہ دین اسلام سے متاثر ہو گیا تھا اور اکثر ایک عالم دین کے گھر جا کر اچھا خاصا وقت گزارتا تھا۔ وہ جوان بیٹا گھر سے نکلنے کے بعد کہیں چلا گیا تھا پھر اس نے پلٹ کر باپ سے فون پر بھی رابطہ نہیں کیا۔

ڈاکٹر اس کے جانے کے بعد اداس رہنے لگا تھا اور کھوئی اولاد نہیں تھی۔ بیوی مرچکی تھی۔ تمہارے جانے کے بعد بیٹے کی طرف دل کھینچا تھا تھا۔ وہ اکثر بیٹے کے بیڈ روم میں آ کر اس کے خالی بستر کو دیکھتا تھا۔ اس جگہ اگر فرش پر بیٹھ جاتا تھا جہاں اس نے بیٹے کو ایک بار نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ پھر اس نے غصے سے پوچھا تھا۔ ”کیا تم نے مسلمانوں کا دین قبول کر لیا ہے؟ اپنے دین سے بھگے ہو؟“

اس نے کہا تھا۔ ”الحمد للہ۔ میں مسلمان ہو گیا ہوں اور میرا نام ایمان علی ہے۔“

یہ سنتے ہی اس نے بیٹے کو گھر سے نکال دیا تھا۔ اب بچہ تار تھا۔ ایمان علی نے فون کی سم بدل دی تھی۔ اس سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے۔ اس واقعے کو پانچ برس گزر چکے تھے۔ وہ کہتا تھا۔ میرا بیٹا اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو ایک بار اپنے باپ سے ملنے ضرور آتا۔ وہ سنگدل نہیں ہے۔ وہ باپ سے بہت محبت کرتا تھا۔ پانچ برس تک اس کی کشمکش اور لاعلمی نے یقین دلا دیا تھا کہ وہ اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔ جب ڈاکٹر عینی نے دل میں یہ عہد کیا تھا کہ پھر سے بیٹے کو زندہ کرے گا۔

یہ سراسر خدائی دعویٰ تھا۔ بیٹے کی جدائی اسے اپنا رمل بنا رہی تھی۔ اسی لیے سب اسے کر بڑی کہتے تھے۔ وہ بھی غلامی نکتا ہوا کہتا تھا۔ ”میرے بیٹے نے مجھے فون کیا تھا۔ کہہ رہا تھا مجھ سے ملنے کے لیے تڑپ رہا ہے۔ ڈیڈی! اور واڑہ ہلار کھو۔ میں جلد ہی آنے والا ہوں۔“ وہ دل میں عہد کر چکا تھا کہ بیٹا اس دنیا میں رہا ہے یا نہیں ہے؟ اگر مر چکا ہے تو اسے پھر سے زندہ کرے گا۔ ضرور کرے گا۔ پھر وہ دن آیا کہ اس نے مجرہ کر دکھایا۔ جو بیٹا کچھ چکا تھا، اسے زندہ اور تھک کر دیا گیا ہوتا نہیں ہے مگر ہو گیا تھا۔

اس وقت سرجری روم میں آئینے کے سامنے ایمان علی سرجری چیئر پر بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر عینی سن کھڑا ہوا اپنے بیٹے کو سانس لیتے دیکھ رہا تھا۔

مراد سید جا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو آئینے میں دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ میں کہاں ہوں؟ یہ تو کمال ہو گیا۔ میں تو اپنے اندر ایسے کم ہو گیا ہوں کہ خود اپنی صورت نہیں دیکھ سکتا۔ اس نے کہا۔ ”ڈاکٹر! آپ نے مجھے کیا سے کیا کر دیا ہے۔ مجھے غائب کر دیا ہے۔ کیا میں بھی خود کو دکھائی نہیں دوں گا؟“

وہ بولا۔ ”جب چاہو گے سرجری کے ذریعے تمہارا چہرہ واپس لے آؤں گا۔ ابھی تو میں نے اپنے بیٹے کو زندہ کیا ہے۔ آج سے تم مجھے ڈاکٹر نہیں ڈیڈی بولو گے۔“

پھر وہ ایک محتجب شیشہ اٹھا کر اس کے چہرے کا معائنہ کرتے ہوئے بولا۔ ”خود کو آئینے میں دیکھ رہے ہو، یہ بتاؤ میرا بیٹا کتنا پیڑم تھا۔“

”بہت ہی خوب رو تھا۔ میں نے کہا تھا کہ مجھے خوبصورت نہ بنائیں۔ معمولی سی صورت ہوتا کہ عورتیں مجھ

سے دور رہیں۔“

”کیا تم ارادے کے کمزور ہو؟ عورتیں تمہاری طرف جھکتی ہیں اور تم ان کی طرف جھک جاتے ہو؟ میرے بیٹے کیا تمہارے اندر ایمانی قوت نہیں ہے؟“

”میں پار سار بنے کے لیے ایمانی قوتوں کا ہی سہارا لے رہا ہوں۔ صنف نازک سے کمزور آ رہا ہوں۔ اس کے باوجود چاہتا ہوں کہ مجھ میں خورونی اور کشش نہ ہو اور آپ نے تو مجھے بہت ہی خوب رو اور پُر کشش بنا دیا ہے۔“

”میرا بیٹا ایسا ہی گفام تھا۔ لڑکیاں اس پر مرقی تھیں اور وہ ان سے دین ایمان کی باتیں کرتا تھا۔ دراصل اپنی نیت کھری اور مستحکم ہو تو قدم نہیں ڈمکاتے۔ شیطان دور کھڑا نکلتا رہ جاتا ہے۔ دھرم جی نے تمہارے حالات بتائے ہیں۔ تم ایک شریف مجرم ہو۔ پہلے انتہائی سیدھے سادے اور شریف تھے لیکن تمہیں مجرم بننے پر مجبور کیا گیا ہے۔ صرف مجرموں کے لیے ہی مجرم نہیں ہوا تو ان کے محافظ کہلاتے والے بھی تمہیں مار ڈالنے کے لیے ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”اب کسی کا باپ بھی تمہیں نہیں پہچانے گا۔ میں یہاں کا ایک معزز ڈاکٹر ہوں۔ بھی ضرورت ہوئی تو میں بیان دوں گا کہ تم میرے بیٹے ہو۔“

”اس حلقہ کے بچے اور بچیاں اس فون تک پھیلے ہوئے میرے رشتے دار کو اپنی دیں گے کہ تم میرے بیٹے راہن بن ہو اور تم نے دین اسلام قبول کیا ہے۔ میرے پاس راہن بن کا شتھی کارڈ اور تعلیمی ڈگریاں ہیں۔ میں ایمان علی ولد ڈاکٹر عینی سن کے نام سے تمہارا شتھی کارڈ اور پاسپورٹ بنوا دوں گا۔“

مراد نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”میں آپ کے یہ احسانات بھی نہیں بھولوں گا۔ آپ میرے راز دار بن کر رہیں گے تو کوئی مجھ پر بھی شبہ نہیں کرے گا۔“

”تمہارا فرض ہے کہ میرے احسانات کا بدلہ مجھے دو اور میری ایک خواہش پوری کرو۔“

”جہاں تک میرے اختیار میں ہوگا، میں آپ کی ہر خواہش پوری کروں گا۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”میں چاہتا ہوں ہمیشہ میرے بیٹے بن کر رہوں۔“

”میں یہاں ہمیشہ نہیں رہ سکوں گا۔ پاکستان میں میری جان حیات ہے۔ آپ کی ہونے والی بیوکا نام ماروی ہے۔ میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔“

”میں تمہیں بہو کے پاس جانے سے نہیں روکوں گا لیکن وہاں کیسے جاؤ گے؟ دھرم داس جی نے کہا ہے کہ

دلکش تحریریں لیے جنوری 2015ء کا سال نو نمبر حاضر ہے

پاکیزہ

کراچی

ماہنامہ

نگہت سیمیا اور رفاقت جاوید کے ماہرانہ قلم کے شاہکار سلسلے وار ناول

جنگل کا پھول زاہدہ پروین نے کھلائے کچھ نئے طرز کے پھول

نایاب جیلانی کی خوب صورت تحریر ترک وفا کا اک نیاموڑ

سال نو کے لیے انجم انصار کے ماہر قلم کا شاہکار ناول

سمیرا یونس ہارون محبت بھرے مکمل ناول کے ساتھ حاضر ہیں

عظمیٰ آفاق سعید کا پُر لطف سفر نامہ مدنی

اس کی جلالہ

نگہت اعظمی، عنیقہ محمد بیگ، شمیم فضل خالق

زناہت جبین ضیا و دیگر کہنہ مشق رائٹرز کی دلنشین کاوشیں

یہ نیا سال کیا پیغام لاتا ہے پڑھیے

شائستہ زریں

کے کیے گئے سروے کا دلچسپ احوال

اسی کے ساتھ ساتھ مستقل متنوع سلسلوں کا دلکش اور دلربا امتزاج صرف آپ کی اعلیٰ ذوقی کی نذر

تمہارے وطن کی زمین تمہارے لیے تلک ہوگئی ہے۔
 ”اب وہاں مجھے کوئی نہیں پہچانے گا۔ میں چھپ کر
 ماروی سے ملوں گا۔ وہاں اس کے ساتھ پوری زندگی
 گزارنے کے لیے اس نئے روپ میں نیک نامی سے۔۔۔
 بلکہ شہری کی طرح رہوں گا۔ ہتھیار چھپک دوں گا۔“
 ”وہاں نہیں رہ سکو گے۔ اگرچہ کوئی تمہیں نہیں
 پہچانے گا۔ لیکن ماروی کی وجہ سے تم پہچان لیے جاؤ گے۔“
 ”ہاں، یہ اندیشہ ہے۔ میں سوچوں گا۔ کوئی تدبیر کام
 نہ آئی تو ماروی کو یہاں لے آؤں گا۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”یہ ہوئی بات۔ اس سے اچھی
 کوئی بات ہوئی نہیں سکتی۔ میرا بیٹا میری بہو میرے پوتی
 پوتے یہاں میرے گھر میں رہیں گے۔“
 ”اگر کسی وجہ سے یہاں نہ آسکا تو؟“
 ”تو لندن میں میرا ایک چھوٹا سا بنگلا ہے۔ میرے
 بعد اور کون میرا ہوگا؟ تم ہی بیٹے کی حیثیت سے میری تمام
 دولت اور جائیداد کے مالک بن جاؤ گے۔“

ڈاکٹر ٹینی سن کے ذریعے اسے بڑی سہولتیں حاصل
 ہو رہی تھیں۔ ایمان علی کے نام سے ایک پاسپورٹ اور
 شناختی کارڈ بن جاتا تو وہ آسانی سے جد ہار اپنی ماروی کے
 پاس جاسکتا تھا۔
 اگر ماروی کے ساتھ پاکستان میں رہنا ممکن نہ ہوتا تو
 وہ اپنی شریک حیات کو لے کر وہی ڈاکٹر ٹینی سن کے پاس
 پھرے پراسن شہری کی طرح شریفانہ زندگی گزارنے لگتا۔
 اس نے ڈاکٹر کا ہاتھ تمام کر کہا۔ ”آپ بیٹے سے
 محروم ہو گئے تھے۔ اب میں اس کی پوری کروں گا۔ ابھی
 جاؤں گا اور اپنا ضروری سامان لے کر یہاں آ جاؤں گا۔“
 وہ خوش ہو رہا تھا۔ خوشی سے اس کی آنکھیں جھجک
 رہی تھیں۔ مراد نے کہا۔ ”میں کوشش کروں گا کہ جلد سے
 جلد دشمنوں سے نجات حاصل کر لوں اور اپنی دلی خواہش
 کے مطابق یہاں ماروی کے ساتھ رہ کر محفوظ اور پرامن
 زندگی گزاروں۔“

اس نے کہا۔ ”تم انگریزی بولتے ہو لیکن لندن کے
 عیسائیوں والا لہجہ اور اسٹائل نہیں ہے۔ اسے سیکھنا تمہارے
 لیے بہت ضروری ہے۔ میرے ساتھ رہو گے تو یہ سیکھ لو گے۔
 ”میرے بیٹے کی حیثیت سے وہاں تمہارے کئی
 عیسائی رشتے دار بھی ہیں۔ وہ مزاج کے کیسے ہیں؟
 کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟ تمہارے لیے یہ سب
 جاننا لازمی ہے۔ میں اہم سے ان کی تصویریں تمہیں دکھاتا

رہوں گا۔ ان سب کے متعلق بہت سی باتیں بتاتا رہوں گا۔“
 ایک ملازم نے آکر کہا۔ ”دھرم داس جی آئے ہیں۔“
 ڈاکٹر نے اس سے کہا تھا کہ وہ چار گھنٹے بعد آئے،
 مراد کی صورت تبدیل ہو جائے گی۔ وہ دونوں کلینک کے
 وزینگ روم میں آئے۔ دھرم داس نے اس کے بیٹے کو دیکھ
 کر حیرانی سے کہا۔ ”رائن بن اقم واپس آ گئے؟ تم کیسے بیٹے
 ہو؟ باپ کو پانچ برسوں سے ترساتے اور پریشان کرتے
 رہے ہو؟“

مراد نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ
 مجھے اچھی طرح دیکھیں، میری یہ انگریزی لیتھوگن سنیں۔ کیا
 میں واقعی رائن بن ہوں؟“
 وہ بولا۔ ”اس میں کیا شبہ ہے؟ تم ڈاکٹر کے بیٹے
 ہو۔ میں برسوں سے تمہیں دیکھتا آیا ہوں۔“

وہ ہنستے ہوئے ہندی بھاشا میں بولا۔ ”دھرم داس جی
 میں آپ کا سبک مراد علی مگنی ہوں۔“
 اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے
 کہا۔ ”میری مہارت دیکھ رہے ہو۔ میں نے مراد کو نیا چہرہ
 دے کر اپنے بیٹے کو زندہ کر دیا ہے۔“

دھرم داس بالکل حیرت میں آکر مراد کے چہرے کو چھو کر
 دیکھ رہا تھا۔ پھر بولا۔ ”یہ کون سا جادو ہے؟ اس کا
 ہو جاتا ہے؟ ڈاکٹر! تم انہی نے چنگار دکھایا ہے۔ مراد علی کی کو
 بالکل ہی غائب کر دیا ہے۔ دشمن تو اسے ڈھونڈتے
 ڈھونڈتے مرجائیں گے۔“

وہ پھر اسے چھو کر بولا۔ ”وہ ہتیارے اس کے سامنے
 آکر بھی اسے پہچان نہیں سکیں گے۔ تم نے کمال کر دیا ہے
 ڈاکٹر!“

پھر اس نے مراد سے پوچھا۔ ”اس نئے چہرے کے
 ساتھ ایک نئی زندگی شروع ہو رہی ہے۔ تم ایک بہت ہی
 مشہور و معروف اور بہت ہی عزت دار ڈاکٹر کے بیٹے بن
 گئے ہو۔ تمہیں قسمت سے یہ موقع مل رہا ہے۔ ڈاکٹر کے
 ساتھ رہنا چاہتے ہو تو اسلحہ چھپک دو۔ اپنے تمام دشمنوں کو
 بھول جاؤ۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”دھرم جی بہت اچھی بات کہہ رہے
 ہیں۔ آج تم نے فیماں لیا ہے۔ آج سے تمہارا کوئی دشمن نہیں
 ہے۔ اس لیے اب نہ اسلحہ اٹھاؤ، نہ نئے دشمن پیدا کرو۔“
 مراد نے کہا۔ ”میری ماروی دل سے چاہتی ہے کہ میں
 پراسن شہری کی طرح شریفانہ زندگی کی طرف لوٹ آؤں۔“
 وہ سر اٹھا کر خلا میں اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اگر

میں چوبیس دن کے اندر نیک نامی حاصل کر کے اس کے
 پاس نہیں جاؤں گا تو وہ پرانی ہو جائے گی۔
 ”میں نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر اس رب کریم
 سے وعدہ کیا تھا کہ گناہوں سے باز آ جاؤں گا اور پانچوں
 وقت کی نمازیں ادا کرتا رہوں گا۔ شکر ہے میرے
 معبود۔۔۔ اب سے میری زندگی میں بہتری آ رہی
 ہے۔ میں گناہوں سے دامن بچاتا آ رہا ہوں اور یہ تو ناممکن
 نظر آتا تھا کہ میں اگلے ماہ کی دو تاریخ سے پہلے پاکستان جا
 کر ٹین دس لاکھوں گا کہ میں اب مجرم نہیں رہا ہوں۔ میں نے
 ہتھیار چھپک دیے ہیں۔“

”صرف وہی ہمارا معبود ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔
 اب میں آزاد ہوں۔ یا اللہ۔۔۔ اب میں ہتھیار چھپک کر
 ماروی کے ساتھ شریفانہ زندگی گزار سکوں گا۔“

”میں بہت خوش نصیب ہوں۔ جیسے ہی ایمان علی کے
 نام سے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنے گا، میں یہاں سے
 پاکستان چلا جاؤں گا۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”دھرم داس جی! یہ آئی ڈی کارڈ اور
 پاسپورٹ وغیرہ حاصل کرنا آپ کے لیے گھر کی بات
 ہے۔ میرے بیٹے کا اسلامی نام ایمان علی ہے۔ کیا دو چار
 روز میں اس کے لیے کوئی کاغذ تیار ہو جائے گا؟“
 اس نے کہا۔ ”آپ ابھی بیٹے کے لیے درخواست
 لکھیں اور اس کی تصاویر دیں۔“

وہ چٹکی بجا کر بولا۔ ”یہ ہمارے باپ کا تھکا کھیل
 ہے۔ کل ہی آئی ڈی کارڈ اور پاسپورٹ تیار ہو جائے گا۔“
 مراد خوشی سے کھل گیا۔ اس نے کہا۔ ”اس کا مطلب
 ہے میں اپنی ماروی کے پاس دو چار روز میں جاسکوں گا۔“
 ”بے شک جاسکو گے لیکن وعدہ کرو۔ وہاں سے بہو کو
 میرے پاس لاؤ گے۔“

”اللہ کو شکر ہو تو اسے اپنی پناہ گاہ میں لاؤں گا لیکن
 کئی پہلوؤں پر غور کرنا ہوگا۔ بات یہاں آکر ختم ہے کہ
 ماروی میرے ساتھ پاکستان یا انڈیا میں یا لندن میں
 رہے۔ اس کی وجہ سے میں اس بہروپ کے باوجود پہچان لیا
 جاؤں گا۔“

دونوں نے ہاں کے اعداد میں سر ہلایا۔ دھرم داس نے
 کہا۔ ”جہاں جاؤ گے ماروی تمہاری پہچان بن جائے گی۔“
 ڈاکٹر نے کہا۔ ”میری بہو مصیبت نہیں بنے گی۔ میں
 اس کی بھی صورت بدل دوں گا۔“
 مراد نے کہا۔ ”نہیں ڈیڈ! میں ایسی پیاری من موہنی

سی صورت کو مٹنے نہیں دوں گا۔ ایسا لا جواب قدرتی حسن نہ
 اس دنیا میں ہے نہ ہوگا اور نہ ہی آپ جیسے ماہر سرجن سرجری
 کے ذریعے ایسا حسن پیدا کر سکیں گے۔ ہم اس پہلو پر بعد
 میں گفتگو کریں گے۔ ابھی رازداری کے سلسلے میں کہنا چاہتا
 ہوں کہ ڈیڈی نے میرا یہ چہرہ بنایا ہے اور دھرم داس جی
 ہمارے رازدار ہیں۔“

”دھرم جی! آپ ماسٹر کولیو کے وفادار ہیں۔ کیا اس
 سے یہ بات چھپائیں گے کہ میں ڈاکٹر ٹینی سن کا بیٹا بن کر نئی
 زندگی گزارنے جا رہا ہوں؟“

اس نے کہا۔ ”ماسٹر کولیو میرے کام آتا ہے۔ میں
 اس کے کام آتا ہوں۔ اس حد تک اس کا وفادار ہوں۔ ورنہ
 وہ انڈیا میں اور بہت سے اہم معاملات مجھ سے چھپاتا ہے
 میں بھی اپنے بہت سے اہم راز کی ہوا اسے نہیں لگنے دیتا۔
 تم مجھ پر شبہ کر سکتے ہو۔ لیکن مجھ پر بہرہ و سار کا ناپی پڑے گا
 کیونکہ ڈاکٹر کے بعد میں دوسرا رازدار ہوں۔“

وہ مراد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔ ”تم رفتہ
 رفتہ یقین کر لو گے کہ میں تمہارا سچا رازدار ہوں۔“

ان کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ رنگ ٹون نے
 مداخلت کی۔ اس نے بھی سی اسکرین کو بڑھ کر کہا۔ ”کوئی
 اجنبی کال کر رہا ہے۔“ اس نے اشارہ کر کے ٹون کو کان
 لگایا۔ پھر پوچھا۔ ”ہیلو۔ کون ہیں آپ؟“

کسی نے کہا۔ ”میں تمہاری موت ہوں۔ اگر پوری
 زندگی جینا چاہتے ہو تو بتاؤ، مراد علی مگنی کہاں ہے؟“
 اس نے مراد کو دیکھا پھر کہا۔ ”میں کسی مراد علی مگنی کو
 نہیں جانتا۔ تم شاید رنگ نمبر پر نول رہے ہو۔“

مراد اپنی جگہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ دھرم داس کا منہ
 تنکے لگا۔ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”پانچ گھنٹے پہلے
 ہمارے ایک تجربے میں مراد کے ساتھ تمہارے گھر سے
 نکلے دیکھا ہے۔ تم اسے چھپا کر نہیں رکھ سکو گے۔ ہم نے
 تمہارے پی اے سے مراد کا پتا پوچھا تھا۔ اس نے بتانے
 سے انکار کیا تو اسے کوئی مار دی۔ تم اس کے گھر جا کر اس کی
 لاش دیکھ سکتے ہو۔ یہ تمہارے لیے وارننگ ہے۔ اگر تم نے
 ایک گھنٹے کے اندر مراد تک نہیں پہنچایا تو اپنی چٹا کا بندھن
 بن جاؤ گے۔“

دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ دھرم داس نے
 فوراً ہی فون کے ذریعے اپنے پی اے کی خیریت معلوم کی تو
 دشمن کی دشمنی درست ثابت ہوئی۔ اس بے چارے کو کسی
 نے کوئی مار دی تھی۔

مراد نے اس سے کہا۔ ”ابھی آپ اور ڈیڈی فیصلت کر رہے تھے کہ مجھے اسٹیشن اٹھانا چاہیے۔ اب بتائیں میں کس دل سے آپ کو دشمنوں کا نشانہ بننے دوں گا۔“

اس نے کہا۔ ”تم فکر نہ کرو۔ ابھی اپنے اطراف سیکورٹی سخت کرلوں گا۔“

”دھرم جی! آپ نے ہیلری ہڈن کے لیے بھی سیکورٹی بڑھادی ہے۔ اس کے باوجود وہ اس کی بہن کو اغوا کر رہے تھے۔ آپ اپنی جوان بیٹیوں اور بیٹوں کو کیسے سیکورٹی دیں گے۔ وہ میری بہنیں ہیں۔ کالج اور شاپنگ کے لیے جاتی ہیں۔ آپ کے بیٹے میرے بھائی ہیں۔ سرکاری عہدوں پر ڈیوٹی کے لیے جاتے رہتے ہیں۔ کسی بھی وقت نہیں سے ایک انڈی گولی آکر انہیں لگ سکتی ہے۔ آپ اچھی طرح سوچیں! آپ کے حفاظتی انتظامات دھرم کے دھرم رہ جائیں گے۔“

وہ اپنے صوفے پر پریشانی سے پہلو بدل رہا تھا۔ ایک باپ خود کو خطرہ مول لے سکتا تھا لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ جوان اولاد کی طرف موت آئے۔ فون کال سے ملنے والی دھمکی کبہر ہی تھی کہ اس کی بیٹیاں اور بیٹے ناویدہ گن پوائنٹ پر ہیں۔

وہ بولا۔ ”تم نے لیز کو بھیجا تھا۔ سیکورٹی گاؤڈز سے زیادہ تیز سراسر اور کاشی احمد ہوئے۔ وہیں دشمنوں کو میری بیٹیوں اور بیٹوں کے قریب آنے سے روک سکو گے۔“

ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”دھرم جی کے بچے میرے بچے ہیں۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ میرے بیٹے ایمان علی! انہیں اسلحہ نہیں چھیننا چاہیے۔ میں بہت مجبور ہو کر کہہ رہا ہوں۔ کچھ روز کے لیے... دھرم جی کے بچوں کی سلامتی کے لیے اسلحہ اٹھاؤ۔“

وہ بولا۔ ”کچھ روز کے لیے نہیں ڈیڈی! اسلحہ میرے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔ آگے جا کر دشمن مجھے نہیں پائیں گے تو ماروی کو اغوا کرنا چاہیں گے۔ مجھے اسلحہ ہاتھوں میں رکھنا ہی ہوگا۔“

دھرم داس اپنے تمام بچوں کو فون پر کہہ رہا تھا کہ وہ آج اور کل گھر سے نہ نکلیں۔ نامعلوم دشمنوں نے بی اے کو ہلاک کیا ہے! انہیں بھی گولی مار سکتے ہیں۔ وہ کہہ کر انہیں تفصیل بتانے کا کہ معاملت کیا ہیں؟

پھر اس نے فون کے ذریعے سیکورٹی گاؤڈز کو بلا دیا۔ مراد نے کہا۔ ”میں باہر جا رہا ہوں۔ موٹر سائیکل پر دور تک جاؤں گا، چاروں طرف دیکھوں گا۔ جو لوگ مشکوک

لگیں گے، انہیں دور سے نشانے پر رکھوں گا۔ جب آپ خیریت سے گھر پہنچ جائیں گے تو میں واپس آ جاؤں گا۔ آپ بچوں کے متعلق بتائیں وہ کہاں ہیں۔“

ایک بیٹی اور تین بیٹے گھر میں ہیں۔ بڑی بیٹی بریمن پریٹیکل کلاس اسٹینڈ کرنے لگی تھی۔ وہیں رکی رہے گی۔ میں دو گاؤڈز کو بھیج رہا ہوں۔“

”آپ پریمنا سے بولیں، وہیں گاؤڈز کے ساتھ رہے۔ جب میں وہاں پہنچوں تو کالج سے نکلے۔“

دھرم داس بیٹی کو کال کرنے لگا۔ مراد نے اپنے ریوالور کو چیک کیا۔ اسے لباس کے اندر چھپایا۔ دو فاضل میگزین جیبوں میں رکھے۔ ہیلیمٹ پہن لیا۔ اس طرح اس کی صورت کسی کو نظر نہ آتی۔ پھر وہ کلینک سے باہر آ گیا۔

وہ موٹر سائیکل کے پاس آ کر دو رنگ نظر میں دروازے لگا۔ سامنے بچوں کا پارک تھا۔ شام کے وقت بچے کھیل رہے تھے۔ اس کے بعد ایک شاہراہ کھڑک کھڑکی۔ وہ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ادھر جانے لگا۔ وہ پارک کے ایک طرف گھوم کر جا رہا تھا پھر میں گزے کا فاصلے پر جا کر رک گیا۔ پارک کے اس حصے میں لڑکیاں اور لڑکے ڈانس کر رہے تھے۔ ان کے ماں باپ تالیاں بجا رہے تھے۔

وہ بے غار نظر تھا۔ دیکھنے کے لیے سامنے پارک میں دو رنگ نظر میں دروازہ تھا۔ شام کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ اب تب میں رات کی تاریکی چھانے والی تھی۔

وہاں ایک جالی دار بیچ رہا تھا۔ بچے اس بیچرے میں گھس کر کھینچے ہوئے دور تک جاتے ہوئے بیچرے کے دوسرے سرے سے باہر نکلتے تھے۔ اب بچوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ تاریکی پھیلنے کے باعث وہ اپنے بزرگوں کے ساتھ واپس جا رہے تھے۔ ایسے وقت مراد نے دو مشکوک افراد کو اس بیچرے میں دیکھا۔

وہ چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتے ہوئے بیچرے کے دوسرے سرے پر پہنچ کر رک گئے تھے۔ اس دوسرے سرے کا رخ ڈاکٹر کے کلینک کی سمت تھا۔

کلینک سے صرف چند گز کا فاصلہ تھا۔ دھرم داس دروازہ کھول کر باہر گاڑی میں بیٹھے آتا تو گاڑی تک پہنچنے سے پہلے بڑی آسانی سے ٹارگٹ بن جاتا۔

تاکوں کے فرار ہونے کے لیے پارک کے احاطے کے باہر ایک گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ احاطے کے باہر جہاں مراد تھا وہاں اسٹریٹ لائٹ نہیں تھی۔ وہ موٹر سائیکل کو دھکیلتا ہوا بیچرے کے دوسرے سرے کے سامنے

آ گیا۔ احاطے کی دیوار نے اور تاریکی نے اسے چھپا لیا تھا۔ وہ دونوں شوئرز صاف نظر آرہے تھے اور بہت ہی ایزی ٹارگٹ بنے ہوئے تھے۔

اس نے فون پر کہا۔ ”دھرم جی! آپ اپنے گاؤڈز کا انتظار نہ کریں۔ آپ دروازہ کھول کر ابھی اسی وقت کلینک سے باہر آئیں۔ میں آپ کے قریب ہی ہوں گا۔“

اس نے فون بند کر کے اسے جیب میں رکھا پھر ریوالور کو نکال کر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس نے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ اگر دھرم داس کے باہر آتے ہی وہ گولی نہ چلاتا تو اس کا نشانہ بچک جاتا تو دشمنوں کی گولوں سے لگی ہوئی گولیاں باہر آنے والے ایم این اے کا کام تمام کر دیتیں۔

ہوسکتا تھا، وہ اسے جان سے نہ مارتے زخمی کرنے کے بعد اس سے مراد کا پتا پوچھتے رہتے۔ اس وقت انہوں نے اپنا اسلحہ ایک تھیلے میں چھپا رکھا تھا پھر جیسے ہی کلینک کا دروازہ کھلا، انہوں نے پھر سے اپنی تین باہر نکال لیں۔ ان دونوں کی گولوں میں ٹیلی اسکوپ لگی ہوئی تھی۔ نشانہ خطا نہیں ہوسکتا تھا۔ ان سے پہلے ہی مراد ان کی تاک میں احاطے کی دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ اس نے بڑی مہارت سے نشانہ لے کر ٹریگر کو دبایا۔ گولی ایک کی کھوپڑی

میں سونامی مچ گئی۔ گولی گولی گئی۔ دھرم داس نے دیکھا کہ دوسرا کھوپڑی کا ٹریگر دھمک گیا۔ چشم زدن میں سمجھ گیا کہ کسی سے

نشانے پر ہے۔ ایسی پوزیشن میں فوراً جگہ بدلی تھی۔ وہ وہاں سے اچھل کر ایک جگہ سے پیچھے جانا چاہتا تھا لیکن اچھلنے کے بعد گولی کھا کر زمین پر واپس آیا اور تکلیف سے ترپنے لگا۔

فون سے رنگ ٹون ابھرے لگی۔ اس نے اسے کان سے لگا لیا۔ دھرم داس نے واپس اندر جا کر دروازے کو بند کر لیا تھا۔ فون پر کہہ رہا تھا۔ ”تم نے مجھے باہر آنے کو کہا تھا۔ وہاں نہیں سے گولیاں چل رہی ہیں۔“

مراد نے کہا۔ ”میں نے گولیاں چلائی ہیں۔ جو آپ کو قتل کرنے آئے تھے۔ ان میں سے ایک مر گیا ہے۔ دوسرا شاید زندہ ہے، زخمی پڑا ہے۔ سیاہیوں سے بولیں فوراً اسے اسپتال لے جا کر اگلوں میں کہ وہ کس خطرناک گروہ سے تعلق رکھتا ہے؟“

اس نے جیسے ہی فون بند کیا، اس کی شامت آگئی۔ ایک گولی اس کے ہیلیمٹ سے ٹھن کی آواز کے ساتھ ٹکرائی ہوئی خطرے کی گھنٹی بجاتی ہوئی گز گئی۔ وہ دھپ سے زمین پر گر کر لڑکھٹا ہوا احاطے کی دیوار سے لگ گیا۔ آدھا لیٹ کر آدھا بیٹھ کر دور تک ہم تاریکی میں

دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک ہی دور تار کی جیسے شعلہ سا رپاک، ایک گولی چلی۔ اس کے سامنے کسی کی موٹر سائیکل تھی۔ وہ فائرنگ کی زد میں آئی۔ اس گاڑی نے آنے والی گولی کو روک لیا تھا۔

اسی لمحے میں مراد کے ریوالور سے لگی ہوئی گولی نے کسی کو آخری بار چیتنے پر مجبور کیا۔ دوسرا بھاگ رہا تھا۔ وہ بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز کی سمت متواتر گولیاں چلانے لگا۔ ایک فائر دوسرا فائر پھر تیسرا... آخر چوتھے فائر پر بھاگنے والا گر پڑا۔

ایسے وقت پولیس کی دو گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی کلینک کے سامنے آ کر رک گئی تھیں۔ مراد فوراً ہی اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر وہاں سے بھاگنے لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کے نئے روپ میں ایمان علی کو گن فائر کے طور پر دیکھے۔ اس نے دور جا کر فون پر دھرم داس سے کہا۔ ”یہ یاد رکھیں۔ کسی سے یہ نہ بولیں کہ ڈاکٹر ٹینیسن کے بیٹے نے ان قاتلوں سے مقابلہ کیا ہے۔ آپ انجان بن جائیں۔ یہ کہہ دیں کہ آپ کلینک کے اندر تھے باہر نہ جانے کن لوگوں کے درمیان کاؤنٹر فائرنگ ہوتی رہی تھی۔“

دھرم داس نے کہا۔ ”بہت خوب مراد...! میں تمہیں دل کی گراہیوں سے بے خبر کر دوں گا۔ ابھی پولیس سے نمٹ کر تم سے بات کروں گا۔“

وہ فون کو جیب میں رکھ کر تیزی سے بائیک دوڑاتا ہوا ایک ریسٹورنٹ میں آ گیا۔ صبح ناشتے کے بعد کھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے ایک میز پر آ کر کھانے کا آرڈر دیا۔ پھر اپنے فون پر نمبر بچھ کرنے لگا۔

☆☆☆

ماروی نئے شہر اسے کھیل رہی تھی۔ محبوب ایک گھنٹے بعد ڈنر کے لیے آنے والا تھا۔ اس کے نصیب میں مہادی کے ساتھ کھانا پینا نہیں تھا۔ وہ دن رات اس کے بچے سے بھلتی رہتی تھی۔ اس نے سرگھما کر اپنے فون کو دیکھا۔ رنگ ٹون اسے بلارہی تھی۔ اس نے بڑے اعتماد سے فون کو اٹھایا۔ دل کہہ رہا تھا مراد آدیا ہے اور واقعی وہ اسے پکار رہا تھا۔

اس نے مثن دبا کر کان سے لگایا۔ گویا دل سے لگایا۔ دل والے نے پوچھا۔ ”میری جان! کیسی ہو؟“ اس نے جواب دیا۔ ”تمہارے بغیر کیسی ہو سکتی ہوں یہ خود سوچو۔“

”انشاء اللہ جدائی کے دن ختم ہو جائیں گے۔ ایک اچھی بات سن رہا ہوں۔ تم سے مشورہ کرنے اور تم سے

اجازت لینے کے بعد چہرہ تبدیل کر چکا ہوں۔ آج سے کوئی دوست اور دشمن مجھے نہیں پہچان سکے گا۔ تمہارے سامنے آؤں گا تو تم بھی مجھے اپنی سمجھو گی۔“

”میرے سامنے آؤ اور آواز میں کوڈ ورڈز کے ذریعے تمہیں پہچان لوں گی۔ یہ تم چہرہ بدل کر بہت اچھا کیا ہے۔ اب تو دشمن تمہارے پیچھے آئیں گے تم بدھو گے۔“

”بدھو تو میرے مقدر میں لکھ دی گئی ہے۔ چہرہ بدلنے کے بعد میں محفوظ ہو گیا ہوں لیکن تم غیر محفوظ ہوئی ہو۔ دشمن جانتے ہیں کہ تم میری جان ہو۔ میری بہت بڑی کمزوری ہو۔ وہ تمہیں کن پوائنٹ پر انوکھ کر کے نہیں لے جائیں گے۔ پھر تم سمجھ سکتی ہو۔ وہ درندہ تمہاری زندگی کا سودا مجھ سے کریں گے اور مجھے کن پوائنٹ پر آنے کے لیے مجبور کر دیں گے۔“

”یا اللہ! یہ نئی بات کیا کہہ رہے ہو؟ عقل کبھی ہے دشمن ایسا ضرور کریں گے۔ پھر کیا ہوگا مراد؟“

”یہی تو کہہ رہا ہوں کہ بدھو کو چھینک نہیں سکتا۔ آئندہ تمہارے لیے ایک طویل جنگ لڑنی ہے۔ اللہ نے چاہا تو میں تم پر آج نہیں آنے دوں گا۔ یاد رکھو، سب سے زیادہ خطرہ میرے لیے ہے۔ جب وہ مجھے پہچان پائے گی تو نہیں انصاف پہنچائے یا انوکھ کر لے آئے گی تاکہ میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دوں اور اس کے ساتھ بھی ازدواجی زندگی گزاروں۔“

ماروی نے ناگوار سی کہا۔ ”وہ کیسی بے شرم عورت ہے۔ کیا شرم اور شرافت اسے چھو کر نہیں گزری ہے؟“

”وہ مغربی ماحول کی پروردہ ہے۔ تم اطمینان رکھو اب وہ نہ مجھے پہچان سکے گی، نہ آئندہ میری مجبور یوں سے کھیل سکے گی۔ میں تمہیں اس کے ہاتھ لگنے نہیں دوں گا۔“

”کیا تم اگلے ماہ کی دو تاریخ سے پہلے یہاں آ سکو گے؟“

”انشاء اللہ! آج نہیں تو کل یا پھر چوتیس دنوں کے اندر ضرور آؤں گا۔“

”آؤ جاؤ گے لیکن یہ ثابت کرنا مشکل ہوگا کہ جرائم کی دنیا سے نکل آئے ہو؟“

”تمہاری تو صورت بدل گئی ہے۔ کیا انہیں بتاؤ گے کہ تم نے نئے چہرے کے پیچھے اپنا چہرہ چھپایا ہے؟“

”ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا ہے کہ محبوب وغیرہ کو میرے چہرے کی تبدیلی کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے یا نہیں؟ وہاں آنے کے بعد فیصلہ کروں گا۔“

ویراس کے سامنے کھانا لاکر رکھ رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک چپ رہا۔ ماروی بول رہی تھی۔ ”خود کو یہاں آکر ظاہر کرنا ہوگا کہ تم مراد ہو اور جرائم کی دنیا سے نکلنے کے لیے چہرہ بدل چکے ہو۔“

”محبوب کو بتانے کا مطلب یہ ہوگا کہ معروف صاحب کو، سمیرا کو اور حماد صدیقی کو معلوم ہوگا۔ میرا چہرہ تبدیل ہونے کا راز کھلتا جائے گا۔ دشمنوں کو چھینک لے لی تو پھر وہی دشمنی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ وہی بھاگ دوڑ وہی پریشانیان مرینہ تو جان کو آجائے گی۔ فی الحال اسی میں بہتری ہے کہ میں نے بہرہ میں جب تک چھپ سکا ہوں چھپا رہوں۔“

”پھر محبوب پوچھیں گے کہ تم کہاں ہو؟ اور ایک ماہ گزرنے کے بعد بھی نہیں آئے ہو؟ پھر تو وہ دو تاریخ کو مجھے دہن بنانے کے حق دار ہو جائیں گے۔“

”ہاں۔ یہ بہت ہی پیچیدہ مسئلہ ہے۔ حل نہ ہوا تو تمہیں پرانا ہونا پڑے گا اور ایسا میں ہونے نہیں دوں گا۔“

”تمہیں مراد! حقائق کو تسلیم کرو۔ تمہاری پارسی کا یقین صرف میں کر رہی ہوں۔ تم نے چہرہ بدلتے ہی مرید سے پیچھا چھڑا لیا ہے۔ اب تم مجرم کہلانے والے مراد علی گئی نہیں ہو۔“

”لیکن یہ حقائق محبوب کو اور معروف صاحب وغیرہ کو معلوم ہونے چاہئیں۔ معلوم نہیں ہوگا اور تم گناہ گار اور مجرم کہلاتے رہو گے تو میں زبان ہار جاؤں گی۔ پھر تمہیں سمجھنا چاہیے کہ مجھے محبوب سے نکاح قبول کرنا ہوگا۔“

”ایسی باتیں نہ کرو۔ مجھے غصہ آتا ہے، میرا فیصلہ کن لو۔ میں اگلے ماہ کی دو تاریخ تک کوئی تدبیر سوچتا رہوں گا۔ جب دوسرے دن دو تاریخ کو دیکھوں گا کہ تم پرانی ہونے والی ہو تو مجبوراً خود کو ظاہر کر دوں گا۔ یہ ثابت کر دوں گا کہ چہرہ بدل کر میں نے مجرمانہ زندگی بدل دی ہے اور اب میں گناہ گار بھی نہیں رہا ہوں۔“

”اس کے بعد تمہارے پرانے دشمن پھر سے پیدا ہو جائیں گے اور تمہاری زندگی عذاب بنا دیں گے۔“

”مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔ مجھ پر جو بھی قیامت گزرے میں تمہیں پرانا نہیں ہونے دوں گا۔“

”مراد! کچھ ایسا کرو کہ جتنی جلدی ہو سکے چپ چاپ یہاں آکر مجھے لے جاؤ اور انہیں چھپا کر رکھو۔ میں تمہارے ساتھ کسی بند کوٹھری میں زندگی گزار لوں گی۔“

”میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ تمہیں رازداری سے

یہاں لے آؤں یا لندن لے جاؤں۔ ابھی بہت کچھ سوچنا اور سمجھنا ہے۔ ابھی فون بند کر رہا ہوں پھر کسی وقت کال کروں گا۔“

وہ کھارہا تھا اور باتیں کر رہا تھا۔ ماروی نے کہا۔ ”یہ اچھی طرح جانتی ہوں دنیا چاہے ادھر کی ادھر ہو جائے تم مجھے پرانی نہیں ہونے دو گے۔ ہائے مراد! میں تم سے جتنا پیار کروں گی اتنا ہی کم ہوگا۔ میں دل ہی دل میں تم پر قربان ہو رہی ہوں۔“

”ایسی پیار بھری باتیں کرو گی تو ابھی بھاگ کر چلا آؤں گا۔ بانی داوے، یہ یاد رکھو اب میرا فون نمبر بدل جائے گا۔ یہ تم نکال کر چھینک دوں گا۔ اگلی کال میں نمبر سے آئے گی۔ خدا حافظ۔“

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ کھاتے ہوئے سوچنے لگا کہ ماروی کو دشمنوں سے محفوظ رکھنا ایک سنگین مسئلہ ہے۔ اس کی حفاظت کے لیے اگر وہ جلد پاکستان نہ جاسکا تو ماسٹر کو بوبوکو اس کی سلامتی اور مضبوط سیکورٹی کے لیے بولنا ہوگا۔

وہ آخری لقمہ چھاتے ہوئے دل ہی دل میں بولا۔ ”اللہ نے چاہا تو کل ج ہونے تک ماروی کے چاروں طرف سیکورٹی کی آہنی دیواریں کھڑی کر دوں گا۔“

وہ کھانے کے بعد باہر نکلے گا۔ اب اسے وقت دھرم داس کے کال کی۔ وہ فون کو کان سے لگا کر بولا۔ ”جی دھرم جی! وہاں کیا ہو رہا ہے؟ کچھ پتا چلا کہ وہ دشمن کون تھے؟“

اس نے کہا۔ ”تم نے تمہارا شوٹرز کو مارا یا ہے۔ ان میں سے ایک زندہ ہے۔ بری طرح زخمی ہے۔ وہ مقامی باشندہ ہے۔ سنڈ کیٹ ریڈارٹ کے لیے کام کر رہا ہے۔“

”مراد! پتا نہیں تمہارے کتنے دشمن ہیں۔ آج صبح نیٹری ہڈن پر ڈیجیٹل ریکٹ کے شوٹرز نے حملہ کیا تھا۔ اس کی بہن لیڈا کو انوکھا کرنا چاہتے تھے۔ وہ بھی تمہارا پتا پوچھ رہے تھے۔ یہ ریڈارٹ والے بھی پوچھ رہے ہیں۔ بہر حال تم کالج جاؤ۔ وہاں میرے دو دشمن مین گاڑی لے کر گئے ہیں۔ تم جاؤ گے تو پریمینا کالج سے باہر آئے گی۔“

”میں ابھی جا رہا ہوں۔ آپ ماسٹر کو بوبوکو میرے اور اپنے حالات بتائیں۔ میں پریمینا کو سیکورٹی دینے کے بعد ماسٹر سے بات کروں گا۔“

دھرم داس نے اسے پریمینا کا فون نمبر بتایا۔ وہ رابطہ ختم کر کے کھانے کا بل ادا کرنے کے بعد ریستورنٹ سے باہر آیا اور کالج کی طرف جانے لگا۔

برسر اقتدار پارٹی کے ایک ایم این اے پر قاتلانہ

حملہ ہوا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ تمام پولیس اور سی آئی اے والوں نے ریڈارٹ اور ڈیجیٹل ریکٹ کے زرخیز شوٹروں کو ڈھونڈنا شروع کر دیا تھا۔ دھرم داس۔ پریس والوں کو بیان دے رہا تھا کہ خطرناک تنظیموں اور انڈر ورلڈ والے کسی مراد علی گئی کو تلاش کر رہے ہیں۔ انہوں نے بوبو کے ایسیسی کے تنظیم بھری ہڈن پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے مراد علی گئی کو نہیں چھپایا ہے۔ کیا میرا دماغ خراب ہوا ہے کہ میں پاکستان سے آنے والے کسی جاسوس کو چھپا کر رکھوں گا۔ ان خطرناک تنظیموں کے سربراہوں سے بات کی جائے۔ انہیں حکم دیا جائے کہ ہمارے دیس سے نکل جائیں ورنہ کسی کو زندہ نہیں چھوڑا جائے گا اور وہ جو مراد علی گئی پاکستانی جاسوس ہے اسے بھی جلد از جلد گرفتار کیا جائے۔ ہم دیس بھگت ہیں۔ دیس کے دشمنوں کو یہاں سانس بھی لینے نہیں دیں گے۔

مراد اس دیس بھگت کی بیٹی کو سیکورٹی دینے کے لیے کالج کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ قریب ہی ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ عشا کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ موٹر سائیکل سے اتر کر مسجد میں جانا چاہتا تھا۔ اسی وقت فون نے اس کی توجہ کو پکارا۔ اس نے فون کو دیکھا۔ ایک نامیبر تھا۔ اس نے اسے کان سے لگا کر پوچھا۔ ”جی! کون؟“

دوسری طرف سے بہت ہی محترم آواز سنائی دی۔ ”راہین! یہ تم بول رہے ہو نا؟ ڈیڈی نے تمہارا نمبر دیا ہے۔“

اس نے کہا۔ ”میں کبھی راہین بن تھا، اب ایمان علی ہوں۔“

وہ بولی۔ ”تم ایسے والی زید کوئی سا بھی نام رکھ لو، میرے ساتھ گزارے ہوئے پیار بھرے لمحات تو یاد ہوں گے؟“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو؟ دیکھو نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ تمہارے کالج کے سامنے والی مسجد میں جا رہا ہوں۔ آدھے گھنٹے بعد فون کروں گا تو تم کالج سے باہر آ کر اپنی گاڑی میں بیٹھو گی۔“

”تم بھی میرے ساتھ بیٹھو گے نا؟“

”میں اپنی موٹر سائیکل پر دروازے سے نکل کر تار ہوں گا۔ آدھے گھنٹے تک یہ فون بند رہے گا۔“ اس نے فون کا سوچ آف کر کے اسے جیب میں رکھا پھر زبردست کلمہ پڑھتا ہوا مسجد کے اندر چلا گیا۔

پریمینا کالج کے برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھی، اس نے اپنے فون کو دیکھا۔ اس کے یار راہین سن کی آواز بند

TSR Watermark Image.com

نئے سال کا پہلا شمارہ اہمیت کا حامل شمارہ

سرگزشت

ماہنامہ

شکوہ سخن

اس شاعر کا زندگی نامہ جسے کالا پانی کی سزا ہوئی تھی

کیسے کیسے لوگ

انوکھی شخصیات کا مختصر مختصر سا تعارف

سمندر کے بھید

سمندر کی انوکھی دنیا کے رنگ عجیب ہیں

ہم ہمارے

اس فنکار کی سرگزشت جس نے فن میں نام پیدا کیا

مایا

اندرون سندھ سے ایک انتہائی

دلچسپ و سبق آموز سچ بیانی

ادب کا عالم

”سرب“ جیسی اہو کو گرم کر دینے والی طویل کہانی
”فلکی الف لیلا“ جو خود میں تاریخ ہے
”الوداع“ ایک ایسی سفر کہانی جو معلومات کا خزانہ ہے

اور

ایک سے بڑھ کر ایک دلچسپ سچے واقعات
انوکھے قصے، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں
آج ہی نئی کی ایک اسٹال پر پرچہ شخص کرائیں

”یہاں جان کے لالے پڑے ہیں اور تم میرے ساتھ بیٹھنے کی ضد کر رہی ہو۔ تمہارے ڈیڑی پر قاتلانہ حملہ ہو چکے ہیں۔ میں دور رہ کر سیکورٹی دوں گا۔ چلو باہر نکلو۔“
”پلیز رابن سن! میری بات مان لو۔ تم نے میری کھلی شلا کے گھر میں میرے ساتھ رات گزار لی تھی۔ ابھی ہم اسی گھر میں جا رہے ہیں۔ وہاں تنہائی میں دو چار گھنٹے گزاریں گے۔ میں ڈیڑی سے کہہ دوں گی کہ شیلانے مجھے روک لیا ہے۔“

”تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں اب رابن سن نہیں رہا۔ میرا مذہب ’میرا سن‘ مزاج سب بدل چکا ہے۔ میں عورتوں کے سامنے سے دور رہتا ہوں۔“
”تم نے مجھے لڑکی سے عورت بنایا ہے۔ اب مذہب بدل کر مجھ سے نہ بھاگو۔ اپنی موٹر سائیکل دوڑاؤ گاڑو۔ دو۔ میرے ساتھ گاڑی میں چلو۔“

اس نے فون بند کیا پھر دھرم داس سے رابطہ کر کے بولا۔ ”دھرم جی! میں آپ کو پریمنے کے بارے میں ایک حقیقت بتا رہا ہوں۔ پانچ برس پہلے رابن سن سے اس کا رومانس چل رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ تنہائی میں وقت گزار چکا ہے۔“

”خفت بھے میں بولا۔ ”مراد! کیا کو اس کو روک رہے ہو؟“
”آپ دراصل میرے میں۔۔۔ میں نے آپ کو جانے دیا ہے کہ وہ جانے لگا۔ وہ مجھے رابن سن سمجھ کر خد کر رہی ہے۔ کراچی ایک نیکی کے گھر جا کر میرے ساتھ تنہائی میں وقت گزارے گی۔ میں نے انکار کیا ہے تو وہ کالج سے باہر آنے سے انکار کر رہی ہے۔ کہتی ہے میں اس کی بات مانوں گا تو گاڑی میں آکر بیٹھنے کی۔ ورنہ میری سیکورٹی میں نہیں جانے گی۔ آپ اسے سمجھائیں۔“

دھرم داس نے فوراً ہی مراد سے رابطہ ختم کر کے بیٹا کو مخاطب کیا۔ پھر پوچھا۔ ”رابن سن کے ساتھ تمہارا کیا چکر تھا؟“
”وہ بولی۔ ”ڈیڈ! میں اسے جانتی ہوں۔ وہ بھی مجھ سے ٹوٹ کر پیار کرتا تھا۔ گھر آکر آپ کو یہ بتانے والی تھی کہ وہ تو پہنچ ہو گیا ہے۔ پتا نہیں کیا ہوا کہ مسلمان ہو گیا ہے۔ مجھے غصہ آ رہا ہے۔ وہ مسلمان ہوتے ہی بدل گیا ہے۔ میرا دل توڑ رہا ہے۔“

وہ اقرار کر رہی تھی کہ رابن سن کے ساتھ اس کا پتہ چلا رہا تھا۔ باپ نے پریشان ہو کر کچھ سوچا پھر کہا۔ ”تم گھر آؤ تو میں تمہاری خبر لوں گا۔“
”پلیز دھمکی نہ دیں ڈیڈ!۔۔۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ

ہو گئی تھی۔ اس نے پھر اس کا نمبر ری ڈائل کیا۔ پتا چلا فون بند ہے۔ وہ کہہ چکا تھا کہ آدھے گھنٹے بعد کال کرے گا۔

وہ اسے تصویر کی اسکرین پر دیکھنے لگی۔ رابن سن چھ فٹ سے بھی اونچا ایک محنت مند نوجوان تھا۔ لڑکیاں اس کی خوب روٹی پر مری تھیں۔ وہ دین اسلام قبول کرنے سے پہلے ایک کلنڈر راپے ہوا ہے تھا۔ حسین لڑکیوں کو خوش کرتا رہتا تھا۔ اس نے پریمنے سے بھی خوش کرنے والی دو چار ملاقاتیں کی تھیں۔ وہ اس کی دیوانی ہوئی تھی لیکن پھر اچانک ہی رابن سن بدل گیا۔ لڑکیوں سے کترانے لگا۔ اس نے پریمنے سے کہا۔ ”مجھے بھول جاؤ۔ میں نے گناہوں سے توبہ کی ہے۔ میں اپنا مذہب چھوڑ کر مسلمان ہونے والا ہوں۔ اس سے پہلے میں تمام غلطیوں سے پاک ہو جانا چاہتا ہوں۔“

اگر وہ تنہائی میں یہ بات کہتا تو پریمنے بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑتی۔ بیاس بھگا رہتی لیکن اس نے ایک ریسٹورنٹ میں یہ کہا تھا اور اس سے جدا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ اس نے دین اسلام قبول کیا ہے اور باپ نے طیش میں آکر اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ ان دنوں وہ انیس برس کی تھی۔ اب چوبیس کی ہو گئی تھی۔ اس نے پانچ برس بعد آکر اسے پھر بھڑکا دیا تھا۔

وہ مسجد میں تھا نماز پڑھنے کے بعد دعا مانگ رہا تھا۔ ”یا میرے پاک پروردگار! میں گناہوں سے بچنے کی کوششیں کر رہا ہوں اور تو مجھے میری نیک نیتی کا بھرپور صلہ دے رہا ہے۔ تیرا شکر ہے کہ مجھے گناہوں سے دور کر رہا ہے۔ میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ ایک وقت کی بھی نماز نہیں چھوڑتا ہوں۔ آج پھر آزمائش سے گزرنے والا ہوں۔ پتا نہیں پریمنے کسی لڑکی ہے اور کس حد تک جائے گی۔ تو مجھے اس کے شر سے بچالے۔ تو ہی غلطیوں سے اور گناہوں سے بچانے والا ہے۔“

وہ دعا مانگ کر زربل آتیتیں پڑھتا ہوا مسجد سے باہر آیا۔ اس نے فون نکال کر اس کا سوچ آن کیا پھر پریمنے سے رابطہ کر کے بولا۔ ”اپنے گاڑو کے ساتھ باہر آکر گاڑی میں بیٹھ جاؤ اور اپنے گھر کی طرف جاؤ۔“
اس نے خلاف توقع کہا۔ ”میں نہیں جاؤں گی۔“

وہ حیرانی سے بولا۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟“
”تم میرے ساتھ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھو گے تو میں یہاں سے نکلوں گی۔ تم نہیں جانتے میں تم سے کتنی ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“

جارے تھے۔“

مراد نے بالکل ساکت ہو کر کہا۔ ”اگر تم میری طرح پیشور شوہر ہو تو سن لو۔ میں ڈیجیٹل ریکٹ کا ایک شوہر ہوں۔ وہ دیکھو دھرم داس کی بیٹی گاڑی میں بیٹھ کر جارتی ہے۔ میں اسے زخمی کرنے یا ہوس کا تو اسے اغوا کرنے آیا ہوں۔“

”جھوٹ بولتے ہو۔ کیا تمہارا اسے اغوا کر سکو گے؟“

”نہ کر سکا تو زخمی ضرور کروں گا۔ وہ جا رہی ہے۔ تمہارا بھی یہی مقصد ہے تو دیر نہ کرو۔ وہ ہاتھ سے نکل جائے گی۔“

اس نے کہا۔ ”میں ریڈ الارٹ کے لیے کام کر رہا ہوں۔ چلو ایک سے دو بھلے ہم دونوں میں سے کوئی بھی اسے زخمی کرنے میں کامیاب ہوگا تو ریڈ الارٹ کا مقصد پورا ہو جائے گا۔“

وہ دھرم داس کو صرف دھمکی دینے کے لیے اس کی بیٹی کو زخمی کرنا چاہتا تھا۔ مراد نے کہا۔ ”تو پھر چلو۔ دیر نہ کرو۔“

وہ شوہر دوڑتا ہوا کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی موٹر سائیکل پر جا کر بیٹھ گیا۔ دونوں نے اپنی اپنی بانکس کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھایا۔ پھر رفتار بڑھا کر آگے جانے والی گاڑی کے پیچھے ہو گئے۔

مراد نے بڑی چال بازی سے دشمن کا ہتھیار حاصل کر لیا تھا۔ یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ تمنا ہے۔ ایک لڑکی کو زخمی کر کے بھاگنے کے لیے ایک ہی شوہر کافی ہوتا ہے۔

وہ اپنی موٹر سائیکل کو دوڑاتے ہوئے مراد کے برابر چلتے ہوئے بولا۔ ”اس گاڑی میں دو گن مین ہیں۔ اگر ہم کسی طرح انہیں ختم کر دیں تو لڑکی کو لے جا سکیں گے۔ اسے اغوا کرنے سے مجھے ڈبل ہیمنٹ ملے گی۔“

مراد نے کہا۔ ”مجھے بھی ڈبل ہیمنٹ ملے گی۔ چلو آج ہم ڈبل کمائی کریں گے۔“

وہ بولا۔ ”اگر ہم گاڑی کے پتھروں پر فائر کریں تو یہ آگے نہیں جا سکیں گے۔ گاڑی سے نکل کر ہم پر فائر کریں گے ہم جوابی فائرنگ سے انہیں ہلاک کر سکیں گے۔ کیا ان سے مقابلہ کرو گے؟“

وہ بولا۔ ”نہیں، مقابلے میں ہم بھی مارے جاسکتے ہیں۔ چلو گاڑی کو تارکنا بنا دیتے ہیں۔ پھر ہم ان سے دور جا کر دیکھیں گے کہ اس کے گاڑی کیا کرتے ہیں؟“

”تو پھر اسپید بڑھاؤ، اس کا رے قریب ہو کر پتھروں پر گولیاں چلائی ہوں گی۔“

اس مقصد کے لیے دونوں نے رفتار بڑھائی۔ پھر

مراد نے اچانک رفتار کم کر دی۔ اس طرح وہ آگے نکل گیا۔ مراد نے فوراً یو اور نکال کر اس کا نشانہ لیا۔ وہ پتھروں کا نشانہ لے رہا تھا۔ بیک وقت دونوں نے گولیاں چلائیں۔ آگے جانے والا گولی کھا کر موٹر سائیکل سے اچلا۔ پھر نیچے سڑک پر آ کر دو رنگ لڑھکا چلا گیا۔

فائرنگ کی آواز کے ساتھ ہی گاڑی کی رفتار اور بڑھ گئی۔ ادھر ایک گاڑی نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کئی فائر کیے۔ لیکن وہ دور ہوتے جا رہے تھے۔ گولیاں یوں ہی ہوا میں چلتی رہیں۔

مراد موٹر سائیکل روک کر اتر گیا۔ دور جانے والی گاڑی نظروں سے اوجھل ہوئی تھی۔ وہ سڑک کے کنارے بڑے ہوئے شوہر کے پاس آیا۔ گولی اس کے شانے میں لگی تھی لیکن پتھر ملی سڑک پر اچھل کر گرنے اور لوٹنے رہنے کے باعث پتھریاں بچ رہی تھیں۔ وہ اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

مراد نے اس کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ”فون نکالو اور اپنے پاس کو کال کرو۔ کم آن دیر نہ کرو۔“

اس نے ٹیکسٹ سے کراہتے ہوئے فون نکال کر فیرینچ کے پھر رابطہ بہتے ہی بولا۔ ”بابو بھائی! میں نارائن بول رہا ہوں۔ تباہیوں سے کون سے اس نے مجھے دھوکے دیے۔“

مراد نے اس کے فون پر زنگ لگائی۔ کون سے فون پر زنگ لگا کر کہا۔ ”اچھا تو تم انڈیا میں ریڈ الارٹ کے ایجنٹ ہو۔ میں نے تمہارے پہلے آقا میکی البرٹ کو اسی شہر میں کوئی مادی تھی۔“

”اب تمہارے دوسرے آقا میکی براؤن کو معلوم ہو گا کہ اس کے درجنوں جاں نثار اسی طرح حرام موت مرتے رہیں گے۔ چنانچہ وہ اور کتنوں کو قربانی کا کبرا بناتا رہے گا۔ اپنے اس آقا سے بولو یہاں آئے اور اپنے بھائی کا اور بہنوئی بناؤ گا انعام مجھ سے لے۔“

”اور بابو بھائی! اغیر ملکوں کے غلام...! آج کے بعد تو بھی گیا۔ اپنی سانسیں نکلتے رہتا۔“

یہ کہہ کر اس نے فون کو ایک طرف پھینک دیا پھر شوہر سے بولا۔ ”یہ بابو بھائی کہاں رہتا ہے؟“

وہ بولا۔ ”چاندنی چوک پر رہتا ہے۔ بہت مشہور ہے۔ سب ہی اسے جانتے ہیں۔ مجھے کسی طرح اسپتال پہنچا دو۔ میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔“

مراد نے پوچھا۔ ”میں کیوں احسان کروں؟ کبھی زندگی میں کوئی اچھا کام کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو ایک بے قصور لڑکی کو زخمی کرنے اور اغوا کرنے کیوں آئے تھے؟“

اس نے جواب سے بغیر اسے گولی مادی۔ پھر اپنی

موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اپنے ڈاکٹر ڈیڈی کے بیچلے میں آگیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں دعا میں مانگ رہا تھا کہ خیریت سے واپس آ جاؤ۔“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”خدا نے آپ کی دعا قبول کر لی۔ میں خیریت سے آ گیا ہوں۔“

”مجھ سے اسی طرح انگریزی میں بولا کرو۔ میرے لیے اور اسٹائل تو جو دیتے ہو۔ لوگوں کو یقین ہونا چاہیے کہ تم برطانوی انگریز ہو اور واقعی ڈاکٹر عینی کے مسلمان بیٹے ایمان علی ہو۔“

وہ ہنسنے ہوئے انداز میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ عینی سن نے کہا۔ ”میں تمہارا بیڈروم دکھاتا ہوں۔ وہاں چل کر آرام سے لیٹ جاؤ۔ نیند آئے تو سو جاؤ۔“

وہ ڈاکٹر کے ساتھ اس کے بیٹے رابن سن کے بیڈروم میں آ گیا۔ آرام دہ بیڈ پر لیٹتے ہوئے بولا۔ ”آپ اپنی ہونے والی بیوی کو فکر کریں ڈیڈی...! میں اسے وہاں سے نکال دیتا ہوں اسے خرد و نقصان پہنچا سکیں گے۔“

”تم اسے کسی طرح پاکستان سے... یہاں لے آؤ۔ پھر میں جاہوں گا کہ تم دونوں لندن جا کر رہو اور دشمنوں سے دور سکون سے زندگی گزارتے رہو۔“

”بہت مشکل ہے ڈیڈی! ماروی جن ملک میں بھی میرے ساتھ رہے گی میری واضح پہچان بنی رہے گی۔ دوست اور دشمن سب ہی ہمیں گے کہ اس کے ساتھ رہنے والا ماروی ملٹی ہی ہے۔“

اسی وقت ماروی نے کال کی۔ مراد نے فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ”بولو مراد کی جان! کیسی ہو؟ دیکھو تمہارا جواب معلوم ہے کہ میرے بغیر اور کیسے رہو گی۔ آہٹ ہے کان لگے رہتے ہیں۔ درپے نظر رہتی ہے اور آنے والا نہیں آ رہا ہے۔“

”میں نے یہ کہنے کے لیے فون کیا ہے کہ یہاں آنے کی جلدی نہ کرو۔ لیکن دو تاریخ سے پہلے ایسی ٹھوس پلاننگ کے ساتھ آؤ کہ مجھے یہاں سے لے جا سکو۔“

”میری جان...! مجھے میری طرف سے زیادہ اندیشہ ہے اس لیے جلدی آنا چاہتا ہوں۔“

”اس کی فکر نہ کرو۔ میری فرمائش پر مجبور یہاں جدید ایکنز و فکل حفاظتی انتظامات کر رہے ہیں۔ کوئی بھی کوئی کے احاطے کی دیوار پر چڑھے گا تو یہاں اندر چارنی دی اکیرین پر نظر آ جائے گا۔ کوئی دروازے اور کھڑکیوں کے قریب آئے گا تو خطرے کا الارم بجنے لگے گا۔ میں ایسے

ماروی انتظامات سے بہت مطمئن ہوں۔

”محبوب نے سیکورٹی گاڑی کی تعداد بڑھا دی ہے۔ تین گاڑیوں دن رات چھت پر الارٹ رہتے ہیں۔ چھ گاڑیوں احاطے کے اندر کوشی کے چاروں طرف بکھیر لگاتے رہتے ہیں۔ مراد...! یہاں تو اب کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکے گا۔ مزید کا پاب بھی یہاں نہیں آ سکے گا۔ تم فکر نہ کرو۔“

”جب ایسے ٹھوس انتظامات ہو رہے ہیں تو میں بھی پوری طرح مطمئن رہوں گا۔“

”لیکن یاد رکھو تمہیں دو تاریخ سے پہلے یہاں آنا ہوگا۔ تم مجھے پرانی نہیں ہونے دو گے۔“

”بے شک تم میری ہو۔ صرف میری ہی رہو گی، میں دو تاریخ سے پہلے آؤں گا۔“

اسے فون پر اپنے بیٹے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ ماروی اسے گود میں اٹھا کر پچکارتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”میرا بچہ نیند میں چوک کر اٹھا ہے۔ پتا نہیں اتنے سے بچے ایسا کیا خواب دیکھ لیتے ہیں کہ ڈر جاتے ہیں۔ میں پھر کسی وقت فون کروں گی۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ مراد نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”ڈیڈی! ماروی کی طرف سے فی الحال اطمینان ہو گیا ہے۔ وہ بہت مضبوط سیکورٹی میں رہے گی۔ اب جلدی نہیں ہے۔ میں دس بارہ دن بعد بھی وہاں جا سکتا ہوں۔“

”یہ تمہارے لیے اچھا ہے۔ کل تمہارا پاسپورٹ تیار ہو جائے گا۔ تم میرے ساتھ لندن چلو۔ میرے بیٹے کی حیثیت سے اپنے تمام رشتے داروں سے ملو۔ میں تمہیں الہم سے ان سب کی تصویریں دکھاؤں گا۔ ویڈیو حرکت فلم کے ذریعے تم شادی بیاہ اور کرسمس ڈے کی تقریبات میں تمام رشتے داروں کو ہنستے بولتے دیکھو گے اور انہیں یاد رکھو گے۔“

وہ بولنے بولتے رک گیا۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور کھلے ہوئے دروازے پر ایک یونا کھڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”عبداللہ! تم...؟“

عبداللہ نے مراد کو دیکھ کر خوشی سے چیخ ماری۔ ”میرے دوست رابن سن...! نہیں، ایمان علی تم آ گئے؟“

وہ خوشی سے دونوں بازو پھیلائے دوڑتا ہوا آیا۔ وہ یونا اتنا چھوٹا تھا کہ مراد کو اس سے گلے ملنے کے لیے اٹھنا نہیں پڑا۔ وہ بیٹھا رہا۔ عبداللہ! اس کے گلے لگ گیا۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ”یہ تمہارے بچپن کا یار عبداللہ ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم دونوں کی دوستی مثالی تھی۔ کوئی سات برس پہلے بد معاشرت سے الگ ہو رہے

تھے۔ عبداللہ نے ان کی خوب پٹائی کی تھی۔ یہ بہت زبردست فائز ہے۔ یہ جوڈو کرانے اور جمناسٹک کے کرب بھی جانتا ہے۔

عبداللہ نے حیرانی سے کہا۔ ”انکل! آپ اسے میرے بارے میں کیوں بتا رہے ہیں؟ کیا یہ مجھے بھول گیا ہے؟“
”ہاں بھئی! اسکی ہی بات ہے۔ یہ پچھلی بہت سی باتیں بھول گیا ہے۔ بتائیں اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا؟“
عبداللہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
”ڈونٹ وری مائی فرینڈ! تم اپنے ڈیڈی کے پاس اور اس دوپانے دوست کے پاس آئے ہو۔ ہم تمہیں تمام بھولی ہوئی باتیں یاد دلادیں گے۔“

ڈاکٹر نے اس سے پوچھا۔ ”تم یہ بتاؤ اسنے دونوں تک کہاں رہے؟ تقریباً ایک برس بعد آئے ہو؟“
”کیا بتاؤں انکل! اول ٹوٹ گیا ہے۔ پہلے تو میرا یہ یار آپ کو چھوڑ کر چلا گیا۔ مجھ سے بھی مل کر نہیں گیا۔ اس کے بعد میری جان میری محبوبہ کینسر کے مرض میں اللہ کو پیاری ہو گئی۔“

وہ سر جھکا کر قریبی صوفے کے پاس گیا۔ وہ صوفہ اس کے قد سے اونچا تھا۔ وہ اچھل کر اس پر بیٹھنے ہوئے بولا۔ ”تم بڑی دنیا میں اکیلے رہا ہو۔ سوچ رہا تھا مجھے جا کر کافقوں میں کام کروں گا لیکن میرا یار واپس آ گیا ہے۔ اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔“

ڈاکٹر اس کی باتیں سن رہا تھا اور دور تک سوچ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”عبداللہ! تم غضب کے فائز ہو۔ اکیلے دو چار پر بھاری پڑتے ہو۔ یہ بتاؤ کبھی تم نے گن چلائی ہے؟“
”انکل! میں اڑنی چڑیا کو مار کر مارتا ہوں۔ بچپن سے میرے دماغ میں یہ بات تھی کہ میرا قد چھوٹا ہے۔ کیوں نہ میں ایسے ہنر اور ایسے کمالات سیکھ لوں جن کے ذریعے دوسروں سے برتر ہو جاؤں۔ قد آدھ لوگوں کو مات دے کر ان سے اونچا ہوتا رہوں۔“

ڈاکٹر نے مراد سے کہا۔ ”بیٹے! تم اسے آزما کر دیکھ لو۔ یہ واقعی تیز طرار اور بے باک فائز ہے۔ تمہارا بہترین ساتھی اور محافظ بن کر رہا کرے گا۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”انکل! اس سے کیا پوچھتے ہو؟ میں خود اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ اب اسے کہیں جانے نہیں دوں گا۔ ابھی جاؤں گا اور اپنا ضروری سامان لے کر آ جاؤں گا۔“

”یہ لندن جانے گا پھر پاکستان جائے گا۔ کیا تم اس

کے ساتھ جاؤ گے؟“

اس نے کہا۔ ”میں اپنے یار کے ساتھ صرف جڑ میں ہی نہیں جہنم میں بھی جاسکتا ہوں۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”مراد! میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔ یہ زبان کا دھنی ہے اور میرے بیٹے کا سچا یار تھا۔“
عبداللہ نے چونک کر پوچھا۔ ”آپ ”تھا“ کیوں کہہ رہے ہیں جبکہ بیٹا آپ کے سامنے موجود ہے؟“
مراد نے کہا۔ ”میں موجود ہوں لیکن ان کا بیٹا اور تمہارا یار موجود نہیں ہے۔“

وہ منکراتے ہوئے بولا۔ ”موجود ہو اور موجود نہیں ہو۔ یہ کیسی مشکلفیز باتیں کر رہے ہو؟“
ڈاکٹر نے کہا۔ ”عبداللہ! یہ درست کہہ رہا ہے۔ میرا بیٹا تمہارا یار واپس نہیں آیا ہے۔ گاڈ جانتا ہے کہ وہ زندہ ہے یا نہیں؟ میں نے سرجری کے ذریعے گمشدہ بیٹے کو زندہ کیا ہے۔“

وہ بڑی حیرانی سے اور بے یقینی سے مراد کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میرا نام مراد علی منگی ہے۔ پچھلے کئی مہینوں سے خطرناک تنظیموں کے شوٹرز اور انڈر ورلڈ والے ہی نہیں یہاں کی پولیس اور سی آئی اے والے بھی مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ میں نے اب تک درجنوں دشمنوں کو گولی مار دی ہے اور درجنوں کو زخمی کیا ہے۔ پھر بھی دشمن ہیں کہ برساتی مینڈکوں کی طرح پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ میں نے ان سب سے چھپنے کے لیے تمہارے یار کے اس چہرے کے پیچھے پناہ لی ہے۔“

وہ اسے ابتدا سے اب تک کی اہم باتیں بتاتے لگا کہ ایک سیکرٹ ایجنٹ بنارڈو کو ہلاک کرنے کے بعد دنیا کے بدترین اور خطرناک مجرم اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ایک خطرناک عورت مرینڈن ان کی MET آفیسر ہے۔ وہ بھی بدظاہر اس کی دوست اور باطن میں جانی دشمن ہے۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ”یہ پیدا کئی مجرم نہیں ہے۔ افسوس! یہ جتنا شریف ہے دشمن اتنی ہی نیکی سے اسے بددوق پکڑتے رہنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ عبداللہ! اس کی صورت دیکھو۔ اب یہ میرا بیٹا ہے۔ تم بولو اسے یار تسلیم کرو گے؟“

وہ صوفے سے اچھل کر فرش پر کھڑا ہو گیا۔ پھر مراد کے پاس آ کر اس کے ہاتھ کو تھام کر بولا۔ ”تم سر سے پاؤں تک انکل کے بیٹے رابن سن ہو۔ میرے یار ایمان علی ہو۔ خدا کرے کہ ہم تمہارے کام آتے رہیں اور ہمیں انعام کے طور پر ایمان علی زندہ سلامت مل جائے۔ اللہ چاہے گا تو وہ کہیں سے ضرور واپس آئے گا۔“

ماروی

”میری محبوبہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی ہے۔ وہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔ میں تمہاری محبوبہ کو تم سے ملانے کے لیے نیکی کروں گا۔ تمہارے کام آتا رہوں گا۔ میرا یار جانتا تھا کہ میں کیسے کمالات دکھاتا ہوں۔ تم نہیں جانتے۔ اٹھو لاؤنچ میں آؤ۔ میں تمہیں کچھ دکھاؤں گا۔“

وہ تینوں بیڈ روم سے نکل کر لاؤنچ میں آ گئے۔ وہاں اس نے کہا۔ ”جمناسٹک کے کمالات دیکھو۔“
وہ بچوں کے بل جو کنگ کرتا ہوا چانک بنی ہندی کی طرف اچھلا پھر فضا میں قلابازی کھاتا ہوا مراد کے سر کے اوپر سے گزرتا ہوا گیا۔ مراد نے فوراً پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ وہ فرش پر پہنچ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اگر ذرا بھی ڈگمگا تا تو کھڑا نہ ہوتا فرش پر اوندھے منہ گرنا۔ یہ اس کی مہارت تھی کہ دونوں پیروں پر جم کر کھڑا ہو گیا تھا۔

مراد اور ڈاکٹر نے داد دینے کے لیے تالیاں بجائیں۔ وہ بولا۔ ”میرا کمال دیکھنے والے کہتے ہیں کہ میں کمبڈی کا کھلاڑی لگتا ہوں۔ سب مجھے عبداللہ کمبڈی کہتے ہیں۔“

مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔ تمہارے کرب اور چھوٹے قد کے حوالے سے یہ نام اچھا لگتا ہے۔ میں بھی چھوٹا تھا۔“

اس نے کہا۔ ”ایمان علی! میرا چھوٹا سا گلڈان ہے۔ اسے ایک ہاتھ سے اٹھاؤ۔ مجھ کو تم نے رپو اور پکڑا ہے۔“
مراد نے گلڈان کو نہیں اٹھایا۔ اس نے مسکرا کر لباس کے اندر ہاتھ ڈال کر رپو اور نکال لیا۔ کمبڈی نے کہا۔ ”یہ ٹھیک ہے۔ میرا نشانہ لو جیسے کوئی مارنے والے ہو۔“
مراد نے نشانہ لیا۔ وہ بولا۔ ”یاد رکھو میں اسے کراؤں گا اور تم نے نہیں دو گے تو جیج زخمی ہو جاؤ گے۔ بولو منظور ہے؟“

اس نے کہا۔ ”منظور ہے۔ میں نے بڑے زخم کھائے ہیں۔ ایک معمولی چوٹ کھانے سے نہ ڈراؤ۔“

اس نے پھر جو کنگ کی۔ بچوں کے بل اچھلنے لگا۔ وہ فضا میں اچھلتا ہوا قلابازی کھاتا ہوا ایک جگہ سے دوسری جگہ گیا۔ رپو اور کے نشانے سے مت گریا۔ مراد نے فوراً ہی گن کا رخ اس کی طرف کیا۔

ہاؤ ہو ہاؤ ہو... وہ فضا میں اچھل کر مراد کے بائیں طرف آ گیا۔ وہ اتنی تیزی سے چلا گیا کہ رپو اور فضا میں قلابازی کھاتے ہوئے فٹ بال کی طرح محوم رہا تھا کہ مراد کی آنکھیں ایک جگہ نہیں ٹھہر رہی تھیں۔ وہ نشانہ لینے کے لیے رپو اور کا رخ ادھر سے ادھر کر رہا تھا۔

وہ واقعی چھوٹے قد کی وجہ سے فضا میں قلابازیاں کھاتے وقت فٹ بال کی طرح دکھائی دیتا تھا پھر اچانک ہی مراد کی آنکھوں کو اور توجہ کو ادھر سے ادھر نکالتے ہوئے فضا میں اڑتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو ٹھوکر مار کر گزر گیا۔ وہ ٹھوکر پتھر کی طرح لگی تھی۔ مراد کے حلق سے ہلکی سے کراہ نکلی۔ کمبڈی نے درست کہا تھا کہ وہ زخمی ہوگا۔

رپو اور اس کے ہاتھوں سے نکل کر دور فرش پر جا گرا پھر اس سے پہلے کہ مراد اسے اٹھاتا، وہ ایک قلابازی کھاکر اسے اٹھاتا ہوا دور جا کر فرش پر جم کر کھڑا ہو گیا پھر اس نے مراد کو نشانے پر رکھا لیا۔

مراد ایسے کمالات دیکھ کر اس کا گرویدہ ہو گیا۔ اسے گلے لگانے کے لیے اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ اپنے دونوں بازو پھیلا دیے۔ وہ دوڑتا ہوا آ کر اس سے لپٹ گیا۔ مراد نے اس کی پیٹھ کو چھوتے ہوئے کہا۔ ”بھدا میں نے پہلی بار ایک فائز کی ایسی پھرتی اور مہارت دیکھی ہے۔ اب تو میں چاہوں گا کہ ہمیشہ میرے ساتھ رہا کرو۔“
وہ بولا۔ ”اور میں جی جان سے رہوں گا۔“

”تمہارے ہاتھ پاؤں پتھر کی طرح سخت ہیں۔ میرے ہاتھ ڈھک رہے ہیں۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”میں بھولا ہوں۔ میں عام بولو کی طرح نرم و نازک نہیں ہوں۔“
ڈاکٹر نے کمبڈی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”خدا تم دونوں کی دوستی کو سلامت رکھے۔ میں نے دل کی گہرائیوں سے مراد کو اپنے بیٹے کی صورت دی ہے۔ اب میں دیکھوں گا کہ تم اس کے ساتھ باڈی گاؤڈ بن کر رہتے ہو۔“

مراد نے کہا۔ ”میں تمہاریوں کے بغیر لڑتے وقت کی محسوس کرتا تھا۔ اپنی طاقت سے دشمنوں کو زیر کرتا تھا لیکن لڑنے کی تکنیک یا داؤ پیچ نہیں جانتا تھا۔ جوڈو کرانے بھی نہیں جانتا۔“

وہ بولا۔ ”میں ہوں نا۔ تمہیں سکھاتا رہوں گا۔ دشمنوں نے تمہیں خطرناک شوٹر بنا دیا ہے۔ میں تمہیں خطرناک فائز بنا دوں گا۔ اب ذرا گھڑی دیکھو۔ آدھی رات ہو رہی ہے اور میں نے کچھ کھایا نہیں ہے۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں نے بھی نہیں کھایا ہے، ابھی ملازم کھانا لگے گا۔“

وہ چلا گیا۔ مراد نے کہا۔ ”میں نے شام کو سات بجے کھانا کھا تھا پھر بھی ساتھ دوں گا۔ میرے دوست! تمہارے ساتھ ایک نئی توانائی محسوس کر رہا ہوں۔“

اس کے ذہن میں جو سب سے اہم غلط خیال پرورش پا رہا تھا، وہ یہ تھا کہ ماروی کو مراد کی دنیا سے غائب کر دے۔ وہ اسے ڈھونڈتا پھرے اور جب اسے معلوم ہو کہ اس کی ماروی مرینہ کی قید میں پڑی ہے تو وہ اس کے سامنے آکر گھٹنے ٹیک دے۔

سب ہی ذہن کھل رہے تھے کہ مراد لاپتا ہو گیا ہے۔ کہیں نظر نہیں آ رہا ہے۔ وہ شاید ہمیں بدل کر رہنے لگا ہے۔ مرینہ نے اسے کال کی تو رابطہ نہیں ہوا۔ پتا چلا کہ اس کا فون بند ہے۔

ڈائریکٹر جنرل جان انٹونی نے کہا۔ ”دیکھو۔ اس نے تم سے بھی رابطہ ختم کر دیا ہے۔ اسی دن کے لیے سمجھا رہا تھا کہ اسے یہاں لے آؤ۔ ہم اس کی گمرانی کرتے رہیں گے تو وہ فرار نہیں ہو سکے گا۔ نہ کہیں چھپ سکے گا۔“

وہ بولی۔ ”وہ مجھ سے نہیں چھپ رہا ہے۔ اس نے مجبوراً فون کو بند رکھا ہے یا فون اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ وہ ضرور بدترین حالات سے گزر رہا ہے۔“

مرینہ کو یقین تھا کہ اس نے مراد کو اچھی طرح ٹریپ کر لیا ہے۔ وہ اس پر اتنا اعتماد کرنے لگا ہے۔ وہ حالات پر قابو پاتے ہی ضرور اسے کال کرے گا لیکن وہ اندر سے پریشان بھی تھا۔ اس کی طبیعت اس کے سامنے بڑی ہی کمزور اور اعتماد نہیں کر رہا ہے۔ ڈائریکٹر جنرل اور ہڈن کے آدمی اسے تلاش کرنے بے پور گئے تھے۔ تب سے وہ مرینہ پر بھی شبہ کرنے لگا ہے۔

وہ زیر لب بڑبڑاتی۔ ”وہ مجھے بڑے جذبے سے میری جان مرینہ کہتا تھا۔ اب شاید نہیں کہے گا۔ میرے اپنے ہی ڈیپارٹمنٹ والوں نے کام لگا ڈیا ہے۔“

اس نے اپنی رہائش گاہ میں آکر ماسٹر کو یو کو کال کی اور کہا۔ ”ماسٹر! تمہیں خوش خبری سنارہی ہوں۔ میں نے آج MET آفیسر کے عہدے کا چارج سنبھال لیا ہے۔“

ماسٹر نے خوش ہو کر کہا۔ ”مارک! ہومرینہ! میرے لیے اس سے بڑی خوش خبری اور کیا ہو سکتی ہے؟“

”ویل مرینہ! جب اس ڈیپارٹمنٹ والوں نے تمہیں چھوڑ دیا تھا اور ریڈ الرٹ والوں نے بھی تمہارا ہاتھ نہیں تھا تھا تب میں نے تمہیں سر پر بٹھا دیا تھا۔ اب کیا خیال ہے؟ میری دوستی کا جواب دوستی سے دوٹی؟ ضرورت کے وقت میرے کام آؤ گی؟“

”ضرور کام آؤ گی۔ مراد آپ کا خاص آدمی ہے۔ آپ اسے دل و جان سے چاہتے ہیں۔ میں اس کی خاطر

ڈیڑی چھپیں مراد علی منگی بنادیں گے۔“

دو دنوں نے اسے جمرانی سے دیکھا۔ مراد نے کہا۔ ”اب بولو کتنا مزہ آئے گا جب دشمن پورے مراد کی جگہ آدھے مراد کو دیکھیں گے اور آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی یقین نہیں کریں گے کہ تم مراد ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہ مجھے تمہارے ساتھ دیکھیں گے اور ایمان علی سمجھتے رہیں گے۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”تمہارے دماغ میں بڑا اچھا خیال آیا ہے۔ ابھی اس کے کئی پہلوؤں پر غور کرنا ہوگا۔ دشمن حاضری طور پر چکرا جائیں گے۔ انہیں جادو منتر اور آتما شکتی والی کوئی کہانی سنانی پڑے گی۔ یہ کہا جائے گا کہ تمہیں کالے جادو کے ذریعے ایک سے آدھا کر دیا گیا ہے۔“

کبڈی نے کہا۔ ”جب میں بڑی کامیابی سے مراد کے انداز میں بولوں گا، اس کی طرح چلتا پھرتا رہوں گا اور اس کی طرح خود کو فائز اور گمن گمن ثابت کروں گا تو سب حیران بھی ہوں گے اور اصلیت معلوم کرنے کے لیے میرے پیچھے بھی بڑ جائیں گے۔“

وہ مراد کے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”یار! بہت مزہ آئے گا ہم دن رات تمہارے کرتے رہیں گے۔“

ڈاکٹر ٹینیسن نے کہا۔ ”مراد! تم انہوں کے اور بچوں کے درمیان میں رہو۔ ان کے سامنے بڑی ہی کمزور یعنی آدھے مراد علی منگی کو کس طرح پیش کرو گے؟ کسی باتیں بناؤ گے؟ پہلے یہ اچھی طرح سوچ لیج لو۔ رات بہت ہو گئی ہے ابھی جا کر سو جاؤ۔ سوچتے سمجھتے کا بہت وقت ہے۔ میں کل شام کو کبڈی کا چہرہ تبدیل کروں گا۔“

ڈاکٹر اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”آئیڈ یا زبردست ہے۔ لیکن خوب سوچ سمجھ کر اس پر عمل کرنا ہوگا۔“

مراد اور کبڈی ایک کمرے میں آکر ایک ہی بیڈ پر لیٹ گئے۔ ایسی پہچاننے والی بات ذہن میں آئی تھی کہ انہیں فوراً ہی نیند نہیں آ سکتی تھی۔ کبڈی آئندہ مراد بننے کے لیے اس کا لب و لہجہ سیکھ سکتے ہو گئے۔ مراد جھکا ہوا تھا، اسے بھی نیند آگئی۔

☆☆☆

مرینہ بہت خوش تھی۔ اس نے MET آفیسر کے عہدے کا چارج سنبھال لیا تھا۔ اسے آفیسر کا جج اور آفیسر آن ایٹیل ڈیوٹی کا آئی ڈی کا رول کیا تھا۔ اسے قانونی طور پر ایسے اختیارات حاصل ہو گئے تھے جنہیں وہ غلط طریقوں سے بھی استعمال کر سکتی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ میں کل تک اسے وہاں سے نکال لاؤں گا۔ مجھے اس کا پتا بناؤ۔“

بلا بلو پستان کے ایک علاقے میں چھپا ہوا تھا۔ مراد نے اس کا پتا بتایا پھر کہا۔ ”جس طرح میں آپ کے لیے ہیرا ہوں، اسی طرح بلال احمد عرف بلا میرے لیے ہیرا ہے۔ آپ فوراً اس پر توجہ دیں۔ وہ مصیبت میں ہوگا۔“

”فکر نہ کرو۔ وہ کل تک اپنی بیوی کے ساتھ میرے پاس آجائے گا۔ اور بولو؟“

”اور کچھ نہیں بولنا ہے۔ مجھے اطمینان ہو گیا ہے کہ وہ کل تک آپ کی چھتر چھاپیں بیچ جائے گا۔“

”تم کمال کر رہے ہو مراد! دھرم داس نے بتایا ہے کہ تم نے میرے دشمن ریڈ الرٹ والوں کو پھر نقصان پہنچایا ہے۔ آج دھرم داس اور اس کی بیٹی کو سیکورٹی دیتے ہوئے تم نے ریڈ الرٹ کے پانچ شوڑو مار گرایا ہے۔ آئی ایم براؤڈ آف نو۔ تمہارا ہیرا بلال یہاں آجائے گا۔“

اس سے رابطہ ختم ہو گیا۔ مراد اپنے فون کی سم بدلتے لگا۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”کیا کر رہے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”مرینہ کی وقت بھی کال کرنے والی ہے۔ میں ایک آدھ گھنٹے بعد اس سے باتیں کروں گا۔ پہلے سوچوں گا کہ چہرے کی تبدیلی کے محتاج اسے بناؤں یا نہ۔ چال چلوں جو میرے ذہن میں ابھی تک رہی ہے۔“

عبداللہ کبڈی نے کہا۔ ”ابھی تم نے مجھے بار بار دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ تمہارے ذہن میں کوئی بات یک دہی ہے۔ کیا پھوڑی نکال رہے ہو کچھ بولو تو سہی؟“

مراد نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”آپ نے مجھے غائب کر دیا ہے۔ اگر کوئی دوسرا مراد علی منگی پیدا ہو جائے تو؟“

ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”دوسرا کہاں سے پیدا ہو جائے گا؟“

”آپ غائب کرتے ہیں تو آپ پیدا بھی کریں گے۔ کسی دوسرے کو میرا چہرہ دے سکیں گے۔“

”اچھا تو تم چاہتے ہو میں سر جری کے ذریعے کسی دوسرے کو مراد بنا دوں؟ کیا پک رہا ہے تمہارے دماغ میں؟“

”سوچ رہا ہوں ایک تو میں ایمان علی کے پیچھے چھپ کر دشمنوں کو دھوکا دیتا رہوں گا۔ پھر آپ کا دوسرا بنایا ہوا مراد علی منگی بھی انہیں اٹو بناتا رہے گا۔“

ڈاکٹر نے ہلکا کر کہا۔ ”اچھا آئیڈ یا ہے۔“

کبڈی نے ہنستے ہوئے اس کی ران پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”یار! بڑا مزہ آئے گا۔“

مراد نے کہا۔ ”مزہ اس وقت زیادہ آئے گا جب

ڈاکٹر نے کھانے کی میز پر کہا۔ ”تم دونوں میرے سامنے انگلی لٹکون میں بولتے رہو۔ میں تمہیں برطانوی لہجہ اسٹائل اور محاورے وغیرہ بتاتا رہوں گا۔“

وہ کھانے کے دوران ان کی کلاس بھی لیتا رہا اور ضروری باتیں بھی کرتا رہا۔ مراد بار بار عبداللہ کبڈی کی کو دیکھتا جا رہا تھا اور کچھ سوچتا جا رہا تھا۔ وہ کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں آکر چائے پینے لگے۔ کبڈی نے کہا۔ ”ایمان! تم بار بار مجھے دیکھ رہے ہو اور سوچ رہے ہو بات کیا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”میرے ذہن میں ایک بات پک رہی ہے۔ ذرا یہ پک جائے تو بولوں گا۔“

ایسے وقت ماسٹر کو بولو نے اسے فون پر مخاطب کیا۔ وہ بولا۔ ”لیس ماسٹر! میں حاضر ہوں۔“

ماسٹر نے کہا۔ ”ابھی دھرم داس نے بتایا ہے کہ تم ایک نئے چہرے کے پیچھے چھپ گئے ہو۔ یہ تم نے بہت ہی دانشمندی کی ہے۔ اب کوئی دشمن تمہیں پہچان نہیں سکے گا۔“

وہ بولا۔ ”میں اس نئے چہرے کا راز دار کی کو نہیں بنانا چاہتا۔ صرف میرے اپنے اعتماد کے لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے۔ آپ مجھے مشورہ دیں کیا مجھے اس سلسلے میں چھپت راز پر بھروسہ کرنا چاہیے؟“

”جیت راز! مجھے چھپنے چھپوں سے مراد فائدہ ہے اس پر بھروسہ کر سکتے ہو۔ میرے دوسرے وفاداروں پر نہ کرو۔ میں یہ بات چھپت راز کو سمجھا دوں گا۔ وہ ابھی تم سے بات کرے گا۔“

مراد نے کہا۔ ”ماسٹر! میرے ایک وفادار نے ریڈ الرٹ کے پاکستانی ایجنٹ عالی جناب کو جہنم میں پہنچا دیا ہے۔ آپ نے اس کی تعریف نہیں کی۔“

”سوری مراد! میں بہت زیادہ مصروفیات کے باعث بھول گیا تھا۔ وہ تمہارا دوست راست کہاں ہے؟ واقعی انعام کا حق دار ہے۔ میں اسے منہ مانگا انعام دوں گا۔“

”وہ بے چارہ دشمنوں سے اور قانون کے محافظوں سے چھپتا پھرتا رہا ہے۔ آپ اسے سیکورٹی دیں۔ یہی اس کا انعام ہوگا۔“

”میں اسے پاکستان میں سیکورٹی نہیں دے سکوں گا۔ البتہ وہاں سے اسے نکال کر کسی دوسرے ملک میں پہنچا دوں گا۔“

”وہ میری طرح آپ کے بہت کام آنے والا بندہ ہے۔ یہ میری دلی خواہش ہے کہ آپ اس کی بیوی کے ساتھ اسے اپنے پاس سن سٹی میں بلا لیں۔“

مرینہ نے فون بند کر دیا۔ اس نے پچھلی رات انڈین ٹائم کے مطابق ایک بجے فون کیا تھا۔ تب اسے پتا چلا تھا کہ مراد کا فون بند ہو چکا ہے۔ یعنی گیارہ بجے ماروی سے بات کرنے کے بعد اس نے اپنے فون سے سم نکال دی تھی۔ آئندہ نئی کم کے ذریعے ہی وقت اپنی معنویت سے بولنے والا تھا۔

وہ مٹھیاں بھینچ کر سوچنے لگی۔ کیسا کمینہ ہے؟ اس نے ماروی کو بتایا کہ کم بدلنے والا ہے۔ مجھے نہیں بتایا۔ اب کم بدل کر مجھے اندھیرے میں رکھنا چاہتا ہے۔

یہ اچھی طرح سمجھ گئی ہوں کہ میں اسے دھوکا دے رہی ہوں۔ وہ بھی مجھے دھوکا دے رہا ہے۔ آئندہ میرے قابو میں نہیں رہے گا۔ اب تو اس کی کمینگی اچھی طرح سمجھ میں آگئی ہے۔ اب میں اس دشمن کو تلاش کرتے ہی ریڈ الارٹ کے حوالے کر دوں گی۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ اس کا پیپر میرے پیٹ میں آ رہا ہے۔ اگلے مہینے تصدیق ہو جائے گی۔

وہ جتنی طرف جانے کے لیے ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوئی، ایسے ہی وقت اس کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ کچھ محسوس کر رہی تھی اور انکار میں سر ہلا رہی تھی۔

”نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ چیخ کر اٹھ اٹھی اور اپنے دماغ میں کئی سوالات اس کی بڑبڑاہٹ ستانی دے رہی تھی۔ پھر اس کی چیخ ستانی دی اور خاموشی چھا گئی جیسے مرگئی ہو۔ مراد کے بچے کی ماں بننے کی امید دم توڑ چکی تھی۔ جس کے باپ کے سر کا سودا کرنے کا ارادہ کر چکی تھی وہ بچہ ہی وجود میں آنے سے پہلے ناپود ہو چکا تھا۔

وہ تھوڑی دیر بعد واش روم سے نکل کر کمرے میں آئی اور سر جھکا کر چلتی ہوئی صوفے کے پاس آئی پھر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ حالات نے اسے اٹھا کر کھینچ دیا تھا۔ بعض عورتیں مرینہ کی طرح پاگل ہوتی ہیں۔ اپنے مرد کے بچے کو کوکھ میں رکھنے اور اسے جنم دینے کے لیے ایک ایک دن کتنی رتی رتی ہیں۔ اس روز اس کی کتنی ختم ہو گئی تھی۔ کتنی شریعت کرنے کے لیے پھر مراد ملنے کی مراد مل گئی اسے پکار رہی تھی۔

ہائے کس دل سے اس کے سر کا سودا کروں گی؟ ہرگز نہیں کروں گی۔ وہ شاید مجھ سے بدظن نہیں ہوا ہے۔ مجھ پر شاید نہیں کر رہا ہے۔ مجبوراً مجھ سے رابطہ نہیں کر رہا ہے۔ آج شام تک یا رات تک ضرور نئے نمبر سے بات کرے گا۔

اس کی سوچ پہلے منہ کی پھر ثبت ہونے لگی۔ وہ پٹری

فون پر رابطہ رکھتا ہے یا نہیں؟ یہ معلوم ہوتا تو پتا چل جاتا کہ مراد نے اپنے فون کی کم بدل دی ہے اور ایسا اس نے صرف اپنی ماروی سے باتیں کرنے کے لیے کیا ہے۔ وہ ہر حال میں اسے اہمیت دیتا ہے۔

وہ اپنے فون کو دیکھ کر سوچنے لگی کیا کرے؟ کیسے معلوم کرے؟ وہ تو فون اینڈ نہیں کر رہی ہے۔ اس نے مجبوراً پھر ماروی کے نمبر پر کیے پھر چاچی کی گالیاں سننے کے لیے تیار ہو گئی۔

دوسری طرف کال تیل جاری تھی پھر بند ہو گئی۔ منی اینڈ نہیں کر رہی تھی۔ مرینہ نے زہرباب کہا۔ ”کب تک فون کا قاتی رہے گی۔ ایک بار گالیاں دینے کے لیے ضرور بولے گی۔ اس سے پہلے ہی چاچی بیٹی کے دماغوں کو ایسا جھٹکا پہنچاؤں گی کہ وہ فون ہی ترے پیچھے لگیں گی۔“

اس نے پھر نمبر پر کیے۔ رابطہ ہونے پر ماروی کی آواز سنائی دی۔ ”تم کیوں ہمارے پیچھے پڑی ہو؟“ مرینہ نے کہا۔ ”مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے یہ اطلاع دینے کے لیے فون کیا ہے کہ مراد پر چکا ہے۔“ فون پر ماروی کی چیخ ستانی دی۔ ”نہیں۔ نہیں وہ نہیں مر سکتا۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔“

وہ بولی۔ ”تم کوئی ریلوے میں جاتی ہوں کہ اس کی لاش کہاں پڑی ہے۔“

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ ابھی اسے معلوم ہونے والا تھا کہ مراد اس سے رابطہ رکھتا ہے یا نہیں؟ اس کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ مرینہ نے مسکرا کر اپنے فون کو دیکھا پھر پٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر طنز یہ انداز میں پوچھا۔ ”مجھے گالیاں دے رہی تھیں۔ اب کیوں فون کر رہی ہو؟“

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”مرینہ! تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ سچ بولو۔ مراد زندہ ہے؟“

”مجھے سے کیا پوچھتی ہو، اسے فون کرو۔ خود معلوم کرو۔“ وہ بے چاری نہیں جانتی تھی کہ کیسی مکاری سے سچ معلومات حاصل کر رہی ہے۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”مراد نے پچھلی رات کہا تھا کہ فون کی کم بدل دے گا۔ پھر مجھ سے باتیں کرے گا۔ ابھی میرے پاس اس کا نمبر نہیں ہے اور اس نے کل رات سے اب تک مجھے کال نہیں کی ہے۔“

”اس نے آخری بار تم سے کب بات کی تھی؟“

”کل رات گیارہ بجے۔“

ہے۔ ماسٹر اسے چھپا رہا ہے۔ پھر مجھے اٹو بنا رہا ہے۔ اگر ایسا ہو رہا ہے۔ تو میں ماسٹر کو بولو کے سٹڈیٹ کو کس کس کر کے رکھ دوں گی۔ اب میں مراد کے جھانسنے میں نہیں آؤں گی۔ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اسے کیش کروں گی۔ پورے پچاس لاکھ وصول کروں گی۔“

وہ صوفے کے ہتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ”ڈی جی جان اتھوئی درست کہتا ہے۔ مجھے اس کی دیوانگی سے باز آ جانا چاہیے۔ مجھے کسی بھی پہلی فلائٹ سے انڈیا جا کر اسے ڈھونڈ کر پچاس لاکھ ڈالر جیسی بڑی رقم وصول کر لینا چاہیے۔“

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”مگر وہ کہاں چھپا ہوگا؟“ سوکن کے دماغ نے کہا۔ ”ماروی کے اندر چھپا ہوگا۔ ہاں وہ کہیں بھی ہوتا ہے، کسی بھی حال میں ہوتا ہے۔ موت سے بھی لڑتا رہتا ہے۔ تب بھی ماروی سے ضرور رابطہ رکھتا ہے۔“

وہ ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر سوچنے لگی، پھر اس نے ماروی کے نمبر پر کیے۔ ”اُوروہ مراد کے بچے سے کئی ہوئی تھی۔ سچ اپنے باپ کی طرح خندی تھا۔ وہ اسے کھلونوں سے بہلا رہی تھی۔ خندی جو نیم مراد ابھی روتے روتے جب ہوا تھا اس نے فون پر اپنے نمبر پر کیے پھر کہا۔ ”ابھی پتا نہیں کون ہے۔ لو تم بات کرو۔“

منی نے فون لے کر پٹن دبا کر کان سے لگایا۔ پھر پوچھا۔ ”ہیلو کون ہو بھائی؟“

مرینہ نے پوچھا۔ ”تم کون ہو؟“

منی نے کہا۔ ”میں میں پوچھ رہی ہوں۔ تم کون ہو؟“

”میں مرینہ ہوں۔ ماروی سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”اچھا تو تو شیطان کی بیٹی؟ تو ماروی سے کیا بات کرے گی؟ اور کیوں کرے گی؟“

مرینہ نے کہا۔ ”لیکچرنگ پلیز۔“

وہ بولی۔ ”میں انگریزی سمجھ لیتی ہوں۔ تیری پلیز کو جھاڑو ماروں۔ چل بھاگ یہاں سے۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ ماروی نے کہا۔ ”تم نے ابھی سنائی ہے۔ کبھت ہمارے پیچھے لگنے سے باز نہیں آ رہی ہے۔“

آپ کے کام آتی رہوں گی۔ ابھی میں نے اسی کی بات کرنے کے لیے آپ کو کال کی ہے۔“

ماسٹر کو بولو سمجھ گیا کہ وہ کیا بولنے والی ہے۔ اس نے کہا۔ ”مراد کی بات کیا کر گئی؟ چپیت راؤ نے اسے دشمنوں سے بچا کر راتوں رات کو لکھتے پہنچا دیا تھا۔ وہاں پہنچنے کے بعد وہ لاپتا ہو گیا ہے۔ فون سے بھی رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ میں اس کی خبر ختم سے پوچھنے والا تھا۔“

”میں بھی اسے کال کر رہی ہوں لیکن بات نہیں ہو رہی ہے۔ وہ ضرور کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔“

”ہمارا بھی یہی خیال ہے، وہ ایسی مصیبتوں میں ہے کہ اپنے فون سے بھی محروم ہو گیا ہے۔“

مرینہ نے کہا۔ ”ماسٹر! ایک گھبراہٹ سی ہے۔ کہیں کسی دشمن نے اسے گولی تو نہیں مار دی؟“

”ایسی بات نہیں ہے۔ جب بھی وہ دشمنوں کے ہاتھوں مرے گا وہ خوشیاں منا میں گے بلکہ جشن منائیں گے اور مجھے طعنے دینے کے لیے فون کریں گے۔ اس کے لیے اچھا سوچو۔ وہ موت کا رخ پھیرنے والا شیر دلیر کہیں زندہ ہے۔ ہم جلد ہی اسے شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے سنیں گے۔“

مرینہ نے کہا۔ ”میں کوئی ایسا فون نہیں دیکھ رہی ہوں۔“

”جب سے اسے چھوڑ کر آئی ہوں۔ وہ در بدر ہو رہا ہے۔ نہ تو آئی MET فیسر نہ منی۔ ایک طرف سے فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔ دوسری طرف سے نقصان اٹھا رہی ہوں۔ مجھے جلد سے جلد انڈیا جانا ہوگا پتا نہیں وہ کہاں پھنسا ہوا ہے اس میں ہی وہاں سے نکال کر لاکھوں گی۔“

پھر اچانک ہی دل میں ایک خیال آیا۔ ”کہیں وہ مجھے دھوکا تو نہیں دے رہا ہے؟“

ایسا سوچتے ہی اس کی پیشانی پر کھٹکٹیں پڑ گئیں۔ اسے یاد آیا کہ پہلے بھی ماسٹر کو بولو اور جگ دیو نے مراد کو اس سے چھپا دیا تھا۔ اسے دھوکا دیا تھا۔

اسے کہا تھا کہ مراد انڈیا روڈ لڈ کے وینکٹ راؤ کے لیے کام کر رہا ہے۔ وہ ماسٹر و فلم حاصل کرنے میں اس لیے ناکام رہی تھی کہ ماسٹر نے بڑی رازداری سے مراد کو وہ ماسٹر و فلم حاصل کرنے کے لیے اس پر سوا سیر ہونے کے لیے بھیجا تھا۔ پہلے بھی ماسٹر جگ دیو اور مراد نے دہری چالیں چل کر اسے اٹو بنایا تھا۔ اب بھی یہی کر رہے ہوں گے۔

وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے سوچنے لگی۔ ”میں دھوکا کھا رہی ہوں۔ وہ مجھیں بدل کر کہیں آرام سے

تھی اور اس سے جسمانی تعلقات قائم کیے تھے۔
کبڑی نے کہا۔ ”میں پھر سے تمام باتیں یاد کرتا ہوں۔ کوئی بات بھولوں گا تو تم سے پوچھ لوں گا۔“
ڈاکٹر نے آکر کہا۔ ”بات ہوگئی ہے اس کے تینوں بچے خالی ہیں۔ تم دونوں کل صبح مالک مکان کے پاس جا کر ایک لاکھ روپے ایڈوائس کے طور پر ادا کرو۔“
مراد نے کہا۔ ”ہم وہاں ایک ہفتے سے زیادہ نہیں رہیں گے۔ مرینہ سے ملاقات کے بعد اس سے ضرور دھمنی ہوگی۔ اس کے جاتے ہی ہم وہ بنگلا چھوڑ دیں گے۔“
ڈاکٹر نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔“
وہ رہائش کا انتظام کر رہا تھا۔ کبڑی کی مرینہ کو سبق کی طرح یاد کر رہا تھا۔ مراد ان سے کچھ دور ایک صوفے پر آکر بیٹھ گیا پھر اس نے ماروی کے نمبر کچے۔
ماروی نے فون کی تھمی سی اسکرین پر انجانے نمبر پڑھے۔ مراد اس سے کہہ چکا تھا کہ وہ آئندہ ہم بدل کر رابطہ کرے گا۔ اس نے بین دبا کر فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ”ہیلو؟“

اس کی آواز سنائی دی۔ ”ماروی! میں بول رہا ہوں۔“
وہ خوش ہو کر بولی۔ ”میں پچھلی رات سے انتظار کر رہی ہوں۔“
اس نے بے توجہ کر کے کہا۔ ”اچھا! میں آتی ہوں۔“

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”اوگا ڈو...! اس نے تمہیں کال کی تھی؟ میں نے اسے سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ تمہاری طرف بھی رخ نہ کرے۔“

”وہ کب ماننے والی ہے۔ پہلے تو تمہاری موت کی جھوٹی خبر سنائی۔ پھر دوسری بار فون کر کے معافی مانگی۔ کہہ رہی تھی کہ اسے بھی کسی نے تمہارے بارے میں غلط اطلاع دی تھی پھر اس نے مجھے بہن کہا اور وعدہ کیا کہ ابھی تمہارے سامنے نہیں آئے گی۔ اپنی زبان سے تمہارا نام بھی نہیں لے گی۔“

”مراد! میں کیا سمجھوں؟ وہ اچانک ہی شیطانی بلا کی طرح نازل ہو جاتی ہے۔ کیا وہ تمہارا چچا چھوڑ سکتی ہے؟“
”وہ ایک نمبر کی جھوٹی اور مکار ہے۔ وہ بھلا میرا چچا کیا کرے گی۔ تم اطمینان رکھو، وہ آئندہ میرے سننے بہرہ میں بھی مجھے پہچان نہیں سکے گی۔ ماروی! میں پندرہ یا بیس دنوں میں ایک زبردست پلاننگ پر عمل کرتے ہوئے تمہارے پاس آؤں گا۔ اب میں جو کہہ رہا ہوں اسے توجہ سے سنو۔“

وہ عہد اللہ کبڑی کے بارے میں اسے بتانے لگا۔ وہ

کر دیا ہے۔ میں مرینہ کو اور محبوب علی چانڈیو کو اور اس کے ساتھ رہنے والے معروف گلی اور میرا کو بھی کہانی سناؤں گا لیکن ابھی ایک کمی ہے۔ میں ان سب کو چہروں سے نہیں پہچانتا ہوں۔ وہاں سے ان کی تصویریں حاصل کرو۔“
ڈاکٹر نے کہا۔ ”مراد! تم ماروی سے حقیقت نہیں چھپانا چاہتے۔ اسے بتانا چاہتے ہو کہ کبڑی کو مراد بنا یا گیا ہے۔ ماروی سے کہو کہ ان سب کی تصویریں میرے ای میل پر Send کرے۔ یہ مسئلہ ہو جائے گا۔“
مراد نے کہا۔ ”میں ابھی ماروی سے بات کروں گا اور اسے اپنا راز دار بناؤں گا۔ کبڑی! تم جب تک ان سب کے چہرے اچھی طرح ذہن نشین نہیں کرو گے اور ان میں سے ہر ایک کے بارے میں تفصیلی باتیں یاد نہیں کرو گے اور میں جب تک برطانوی لیجے میں انگریزی بولنا نہیں سیکھوں گا جب تک ہم پاکستان نہیں جا سکیں گے۔“
اس نے کہا۔ ”میں تو بہت بڑا انتقال ہوں۔ دس بارہ دنوں میں تمام سبق یاد کر لوں گا۔“

”اس سے پہلے تمہیں مراد کی حیثیت سے مرینہ کا سامنا کرنا ہے۔ میں اس کے بارے میں بہت سی اہم باتیں تمہیں یاد کرواؤں گا اور آج رات دس بجے فون پر اس سے بات کرواؤں گا۔“
کبڑی نے کہا۔ ”وہ یہاں آنے کے لیے پہل جلائے گی۔ میرا پتا پوچھ لے گی۔“

اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”میں یہاں سے دور ایک بنگلا کرائے پر لیٹا ہوگا۔ مرینہ کو بتایا جائے گا کہ مراد وہاں چھپ کر رہتا ہے۔ وہ وہیں اس سے ملنے آئے گی۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”یہاں سے بہت دور آگرہ میں میرے ایک ڈاکٹر دوست کے تین بچے ہیں۔ کیا آگرہ جا کر رہنا چاہو گے؟“

”چھپ کر رہنے کی خاطر آگرہ زیادہ دور نہیں ہے۔ آپ اپنے دوست سے بات کریں۔“

ڈاکٹر نے فون سے رنگ ٹون سنائی دی۔ وہ فون اٹھا کر بولا۔ ”میں یہ کال انیڈر کرنے کے بعد اپنے دوست سے بات کروں گا۔“

مراد اور کبڑی ڈرائنگ روم میں آگئے۔ وہ کبڑی کو مرینہ کی باتیں ابتدا سے بتانے لگا۔ مرینہ سے ہونے والی گفتگو جتنی اسے یاد تھی وہ سب اسے یاد کرانے لگا۔

اس نے وہ واقعات تفصیل سے بتائے جب مرینہ اسے گولی مار کر زخمی اور لاچار بنا کر ایک مکان میں لے آئی

”ہاں۔ اسی خوشی میں مجھے معاف کرو۔“
وہ بولی۔ ”میں نے معاف کیا، میرے خدا نے معاف کیا۔“

”وعدہ کرو۔ مراد سے کہو کہ ہم بہنیں بن چکی ہیں اور آئندہ میں کبھی اس کے سامنے نہیں جاؤں گی۔“

”مرینہ! خدا تمہارے اس نیک ارادے پر تمہیں قائم رکھے۔ مراد فون کرے گا تو میں ضرور اس سے کہوں گی کہ تم بالکل ہی بدل گئی ہو۔ میری بہن بنی ہو۔ ابھی کچھ خیال نہ کرنا، فون بند کر رہی ہوں۔ شکرانے کی نماز ادا کرنے جا رہی ہوں۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ مرینہ نے اپنے فون کو دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔ ”نماز پڑھنے کی ہے۔ خدا سے کہنے کی ہے کہ میں مراد کے سامنے کبھی نہ جاؤں۔ اسے کبھی ہاتھ نہ لگاؤں۔“
”لو کی پٹنی! مراد کو اپنے باپ کی جاگیر چھٹی ہے۔“

وہ جاگیر دار پہلے میری زمین کا ہے۔ میں اسے تیری زمین تک پہنچنے ہی نہیں دوں گی۔“

وہ اپنی فطرت سے باز آنے والی نہیں تھی۔ پھر سے وہی سبق دہرانے والی تھی یعنی پہلے محبت سے اسے راضی کرنے والی تھی۔ وہ راضی نہ ہوتا تو پھر اسے اپناج قیدی بنا کر حاصل کرنے والی تھی۔ یہی سب سے بڑا سبق تھا۔ اس نے بچے کو جہنم دینے والی ہے تو پھر اس قربانی کے بکرے کو پچاس لاکھ میں ضرور فروخت کر دیتی۔

☆☆☆

اس سرجری روم کا آئینہ جادوئی کمالات دکھاتا تھا۔ ایک دن پہلے اس آئینے میں مراد کا چہرہ غائب ہو گیا تھا اور ایمان علی کا چہرہ ابھر آیا تھا۔ اب اسی آئینے میں عبداللہ کبڑی کا چہرہ مٹ گیا تھا۔ مراد کا چہرہ پھر سے ابھر آیا تھا۔

مراد کبڑی کے سامنے بیٹھا اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا اور ڈاکٹر کئی سن فاقہ نما انداز میں مسکرا رہا تھا۔ حالات کا تقاضا تھا۔ چوبیس گھنٹوں میں دو چہرے بدل گئے تھے۔

کبڑی نے مسکرا کر مراد کے انداز اور لب و لہجے میں کہا۔ ”سائیں! مجھ کو کیا دیکھتے ہو؟ میں تو آپ کا خادم ہوں۔ میرا نام مراد علی مکی ہے۔“

مراد نے ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارے ہوئے کہا۔ ”تم کسی شک و شبہ کے بغیر مراد بن گئے ہو۔ صرف قد سے مات کھا گئے ہو۔“

”قد کے معاملے میں یہ کہانی یاد کر لی ہے کہ کس طرح ایک تاتیرک مہاراج نے کرودھ میں آکر میرے قد کو آدھا

بدل کر سوچ رہی تھی۔ میں خوا خواہ اس سے بدلن ہو رہی ہوں۔ نہیں! میں پھر اسے محبت سے قابو میں کروں گی۔ وہ ضرور مجھ سے رابطہ کرے گا۔ وہ مجھے بھولی ہی نہیں سکتا۔“

دیکھتے ہی دیکھتے حزان بھی بدل گیا۔ ارادے بھی بدل گئے۔ اب وہ آئندہ ہونے والے بچے کے باپ کو کیجیے سے لگانے کی تدبیر سوچ رہی تھی۔ سوچتے رہنے سے یہ بات عقل میں آئی کہ مراد کو جتنے کے لیے ماروی کا دل بھی جیتنا ہوگا۔ اگرچہ یہ مشکل ہے پھر بھی کوشش تو کی جاسکتی ہے۔

اس نے ماروی سے بات کرنے کے لیے پھر فون کاٹھایا۔ دوسرے ہائے ہائے کر رہی تھی کہ مراد مارا گیا ہے اور اس کی لاش کہیں پڑی ہوئی ہے۔ مٹی لے کر تھا۔ ”مٹی! اس ڈائن کی بات پر بھروسہ نہ کرو۔ وہ کچی جھوٹی اور مکار ہے۔“
وہ آنسو پوچھتے ہوئے بولی۔ ”میں کیسے معلوم کروں کہ وہ زندہ ہے؟“

”ذرا صبر کرو۔ وہ جیسے ہی کسی مشکل سے نکلے گا، سب سے پہلے تمہیں فون کرے گا۔“

تھوڑی دیر بعد ہی رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ ماروی نے لپک کر فون کاٹھایا پھر دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے تھمی سی اسکرین کو دیکھ کر بولی۔ ”یہی جڑیل ہے۔“
مٹی نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ”لاؤ مجھے دو۔ ابھی اسے کھری کھری سنائی ہوں۔“

”نہیں چائی! میں دیکھتی ہوں۔ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔“
اس نے بین کو دبا کر اسے کان سے لگا لیا پھر کہا۔ ”ہاں بولو۔ کیا بولنے آئی ہو؟“

”ہاں ماروی! اس وقت میں غصے میں تھی۔ جو منہ میں آیا بول گئی۔ مجھے معاف کرو۔“

”توجہ! تم مجھ سے معافی مانگ رہی ہو۔“

”اگر معاف کر دو گی تو میں تمہاری بہن بن کر رہوں گی اور بہن کے حق پر ڈاکٹریں ڈالوں گی۔ مراد سے ملنا تو دور کی بات ہے، اس کا نام بھی زبان پر نہیں لاؤں گی۔“

”میں تمہاری اس تبدیلی پر حیران ابھی ہوں اور خوش بھی ہوں۔ یہ مجھے سے قاصر ہوں کہ جلدی جلدی کیسے بدل جاتی ہو۔ تم کہہ رہی ہو کہ میرے حق پر ڈاکٹریں ڈالو گی۔ مراد سے بھی نہیں ملو گی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ زندہ ہے۔“

”ہاں ماروی! خدا اسے دشمنوں سے بچائے۔ مجھے غلط خبر ملی تھی۔ دشمنوں نے مراد کے دھوکے میں کسی اور کو مار ڈالا ہے۔“

وہ خوشی سے چیخ کر بولی۔ ”یا اللہ! میرا مراد زندہ ہے۔“

دانتوں کے درد، مسوڑھوں سے

نحون آنا، ٹھنڈا گرم لگنا اور

دیگر تکالیف کے لیے

10 پر اہل
10 پر اہل

MEDICAM

Dr. Atta-ur- Rehman
Dental Surgeon

مریخ کا بہروسہ ڈاکٹر

ڈاکٹر کا بہروسہ 25 سال سے میڈی کیم ڈینٹل کلیم

ایک اور بات سنو۔ میں ہڈن کو سیکورٹی پہنچا رہا ہوں اور یہ مجھے کہہ رہا ہے کہ میں دہری چائیں چل رہا ہوں۔ ریڈارٹ سے کسی نے اسے فون پر کہا ہے۔ میرے خلاف زہر اگلا ہے کہ مراد کو دھرم داس کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔

”اچھا تو ہڈن بھی آپ سے پوچھ رہا ہے کہ آپ نے مجھے کہاں چھپا رکھا ہے؟“

”ہاں کہتا ہے، اگر میں تمہاری خفیہ پناہ گاہ کا پتا بتا دوں تو وہ مجھے دس لاکھ ڈالر دے گا۔“

مراد نے کہا۔ ”میری جان کے دشمن سودے بازی سے باز نہیں آئیں گے۔“

کبڈی نے کہا۔ ”پرائیویسی ڈریس شو میں چلو۔ تقریب بھی رہے گی۔ اس دشمن سے نمٹ بھی لو گے۔“

مراد نے کچھ سوچ کر فون پر پوچھا۔ ”دھرم جی! کیا ہڈن آپ کے ساتھ ہے؟“

اس نے کہا۔ ”ابھی ایک گھنٹے بعد وائی ایم سی اے ہال میں جانے کے لیے وہ میری کار میں بہن کے ساتھ بیٹھے گا۔ آگے پیچھے گاڑیوں میں گارڈز ہوں گے۔“

”آپ جن راستوں سے گزریں گے وہاں کسی جگہ کرسس ٹائٹ منایا جا رہا ہوگا؟“

”ہاں جی! کلرین ٹیمیں سڑکوں اور پولوں پر سجایا گیا ہے۔ جوان لڑکیاں اور لڑکے کروہ کی صورت میں مستیاں کرتے پھر رہے ہیں۔“

”آپ کوئی ایسی جگہ بتائیں جہاں ناچ گانا ہو رہا ہو۔“

”وومن کلب کے سامنے ناچ گانے اور طرح طرح کے نمائشے ہوتے ہیں۔“

”خبیث ہے۔ ہڈن کو وہاں مراد نظر آئے گا۔“

”کیا تم پھر اصلی روپ میں آگے ہو؟“

”نہیں۔ وہ ایک نقلی مراد ہوگا۔ آپ کو اس کے بارے میں پھر کسی وقت بتاؤں گا۔ جب آپ ہڈن کو لے کر نکلیں گے، تب ہم بھی یہاں سے نکل پڑیں گے۔“

مراد نے رابطہ ختم کر کے صوفے سے اٹھتے ہوئے کبڈی سے کہا۔ ”چلو، دشمنوں کے سامنے آؤ اور انہیں اپنے پیچھے دوڑاؤ۔“

مراد نے اپنے کمرے میں آکر ساتا کلاز کا ماسک اور لباس پہن لیا۔ دونوں نے اپنی اپنی گمنام اچھی طرح چیک کر کے لباس کے اندر چھپایا۔ پلٹس سے بھرے ہوئے میگزین ساتا کلاز کے بیگ میں رکھے پھر وہاں سے چل پڑے۔

ادھر لیزا اور ہڈن اپنے بنگلے سے باہر آئے۔ اس وقت

جیرانی سے مسکراتے ہوئے سننے لگی کہ اب دنیا والوں کو چار فٹ کا پونا مراد علی منگی نظر آیا کرے گا۔

وہ پونا مراد اس سے ملنے کراچی آئے گا تو اس کے ساتھ ایک نوجوان ایمان علی ہوگا۔ وہی ماروی کا اصل مراد ہوگا۔

وہاں ماروی کی کوشی میں مراد اور کبڈی کی کس طرح ہیرا پھیری سے رہیں گے، یہ باتیں ماروی کو تفصیل سے بتانے لگا۔ وہ تمام باتیں اچھی طرح سننے اور سمجھنے کے بعد

بولی۔ ”تم کہتے ہو تو میں اس بونے مراد کو سب کے سامنے اپنا مراد تسلیم کر لوں گی اور اس سے لگاؤ ظاہر کرتی رہوں گی لیکن تم سے کیسے ملوں گی؟“

”میں رازداری سے ملنے کے راستے نکال لوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ فی الحال محبوب، مصروف جلی، سمیرا چاچی، چاچا اور میڈم روزی کی تصویریں چاہتا ہوں۔ تم یہ تمام تصویریں

چاچا کو دے کر کہو کہ وہ کسی نیٹ کیسے میں جا کر میرے بتائے ہوئے ای میل ایڈریس پر انہیں بھیج دیں۔ ہماری اس پلاننگ میں صرف چاچی اور چاچا جی رازدار رہیں گے۔ میں

یہاں کا ای میل ایڈریس Send کر رہا ہوں۔“

اس نے ماروی کو اپنے موجودہ حالات اور منصوبے سے اچھی طرح آگاہ کر دیا۔ اس کے بعد مرید نے مساتھا ڈاکٹر نے اپنا فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے

کہا۔ ”دھرم جی تم سے کچھ بولنا چاہتے ہیں۔“

مراد نے اپنی سم نکال دی تھی۔ دھرم داس کو کیا نمبر معلوم نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ”مراد! آج کرسس ٹائٹ کی بڑی دھوم دھام ہے۔ تم فنیسی ڈریس شو کی تقریب میں آنے والے

تھے۔ کیا یہاں وائی ایم سی اے ہال میں آ رہے ہو؟ میں خود کو اور ہڈن کو یہاں بھر پور سیکورٹی دے رہا ہوں۔“

اس کے سر کا سودا کرنے والوں میں ایک ہڈن بھی تھا۔ مراد نے اس کی بہن لیزا کو دشمنوں سے بچایا تھا لیکن

اس کے بھائی کو زندہ چھوڑنے والا نہیں تھا۔

وہ فی الحال کبڈی کو مراد بنانے کے سلسلے میں اس قدر مصروف ہو گیا تھا کہ ہڈن کو نظر انداز کر رہا تھا۔ سوچ رہا

تھا پھر کسی دن اسے موت کے سردخانے میں پہنچائے گا۔

اس نے دھرم داس سے کہا۔ ”میں اپنے معاملات میں بہت مصروف ہوں، گھر سے نکلتا نہیں جاتا۔ کیا آپ

میری ضرورت محسوس کر رہے ہیں؟“

”ہاں تم رہتے ہو تو لگتا ہے کہ سیکورٹی کے لیے پوری فوج آگئی ہے۔ تمہارے آگے دشمن دم نہیں مارتے ہیں۔“

لیز ایک لومڑی کے بہروپ میں تھی۔ ہڈن نے جیسے کا ماسک پہن لیا تھا۔ وہ دونوں دھرم داس کی کار میں آکر بیٹھ گئے۔ دھرم داس اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ تھا۔ وہ ڈرائیور بھی ہتھیاروں سے لیس تھا۔ بہت محتاط سیکورٹی تھی۔ وہ وہاں سے روانہ ہوئے تو ان کے آگے پیچھے سب گارڈز کی گاڑیاں تھیں۔

ہڈن نے راستے میں دھرم داس سے کہا۔ ”مسٹر داس! میں نے مراد کے سلسلے میں آپ پر شبہ کیا۔ مجھے افسوس ہے۔ میں نے بعد میں سوچا کہ ریڈ الارٹ کے کسی کارندے نے مجھے آپ کے خلاف جھوٹے گمانے کے لیے جھوٹ کہا ہے۔ بھلا آپ جیسا معزز ایم این اے مراد کے ساتھ کیوں دیکھا جائے گا جبکہ آپ اس کے خلاف مجھے سیکورٹی دے رہے ہیں۔“ دھرم داس نے کہا۔ ”مسٹر ہڈن! آپ نہیں جانتے ریڈ الارٹ والے میرے بھی پیچھے پڑ گئے ہیں۔ وہ صرف مجھ پر ہی نہیں میری بیٹی پر بھی حملہ کر چکے ہیں۔“

”ایسا لگتا ہے ہم سب نے موت سے ڈرنا چھوڑ دیا ہے۔ تم پر، ہم پر، حملے ہو رہے ہیں۔ پھر بھی ہم لائف انجوائے کرنے کی ڈریس شوٹیں جارہے ہیں۔“

”کتنے ہی مسائل اور مصائب موت بن کر دھمکیاں دے رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو حتمی ہیں۔“

”سے باز نہیں آتا۔ میرے بیٹے بیٹیاں بھی مسلح کرنے کے باوجود بچنے اور ناپتے گانے کے لیے وہاں موجود ہوں گے۔“ وہ بولتے بولتے رک گیا پھر ڈرائیور سے بولا۔ ”گاڑی روکو فوراً گاڑی روکو۔۔۔“

گاڑی رُک گئی۔ ہڈن نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“ وہ بولا۔ ”مسٹر ہڈن!... دو من کالج کے سامنے دیکھو۔ سب ناچ رہے ہیں۔ وہاں مراد ہے۔“

ہڈن کے اعصاب یکھت تن گئے۔ اس نے فوراً ہی اپنا ریو اور نکال لیا پھر کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کہاں ہے...؟ وہ کہاں ہے...؟“

کلب کے سامنے درجنوں لڑکیاں اور لڑکے ایک قلمی گانے کی دھن پر ناچ رہے تھے۔ ان کے ساتھ مراد علی منگلی بھی بہت مست ہو کر ناچتا گا تا دکھائی دے رہا تھا۔

دھرم داس اور ہڈن آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بے چینی سے دیکھ رہے تھے۔ ہڈن نے کہا۔ ”ارے یہ تو آدھا ہے۔“

دھرم داس کو معلوم نہیں تھا کہ ڈاکٹر منگلی بن نے عبداللہ کبڑی کو مراد بنا دیا ہے۔ وہ بھی جبرانی سے بولا۔ ”یہ تو بونا ہے لیکن بالکل مراد ہے۔ یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

ہڈن نے کہا۔ ”میں نے سوچا تھا کہ اسے دیکھتے ہی گولی ماروں گا مگر کیا اسے ہلاک کرنا مناسب ہوگا؟“

دھرم داس نے کہا۔ ”نہیں ہڈن! اپنا نہیں یہ کون ہے۔ اسے خواہ مخواہ ہلاک نہیں کرنا چاہیے۔“

لیز نے ہنسنے ہوئے کہا۔ ”کیا سنگ سنگ کر ڈانس کر رہا ہے۔“

دھرم داس نے کہا۔ ”میں گارڈز سے کہتا ہوں اسے پکڑ کے لے چلیں۔ اس سے معلوم کریں کہ یہ کون ہے؟“

آگے پیچھے کی دو گاڑیوں سے دو گارڈز اتر کر دھرم داس کے پاس معلوم کرنے آئے کہ وہاں لڑنے کی وجہ کیا ہے؟

ہڈن نے کھڑکی سے سر نکال کر گارڈز سے کہا۔ ”وہاں دیکھو ایک یونا ڈانس کر رہا ہے۔ اسے پکڑ کر اپنی گاڑی میں بٹھالو۔“

دھرم داس نے کہا۔ ”جاؤ۔ اسے پکڑو۔۔۔“

ایسا کہتے ہوئے انہوں نے ڈانس کرنے والی لڑکیوں اور لڑکوں کے جھوم میں دیکھا تو چونک گئے۔ وہ نہیں تھا۔ بھٹیر میں کم ہو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا پلنگ جھپکتے ہی غائب ہو گیا ہے۔

وہ دونوں کار کے دروازے کھول کر تیزی سے باہر آئے پھر جھوم کی طرف جاتے ہوئے گارڈز سے بولے۔ ”جلدی آؤ اس کو پکڑو۔ وہ کونسا ہے؟“

وہ ادھر ادھر جا کر اسے ڈھونڈنے لگے۔ جس مراد کو ڈھونڈ رہے تھے، وہ ایمان علی بن کر وہاں موجود تھا۔

دھرم داس... اسے دیکھ کر اس کا بازو تمام کر جھوم سے دور آکر بولا۔ ”تمہارے کہنے کے مطابق میں نے یہاں گاڑی رکوائی ہے لیکن میں نے یہاں ایک چنگار دیکھا ہے۔ بالکل تمہاری شکل صورت کا ایک یونا یہاں ناچ رہا تھا۔ تم یہاں کب سے ہو؟ تم نے اپنے ہم شکل کو دیکھا ہوگا۔“

وہ بولا۔ ”دیکھا ہے۔ آپ ایمان علی کے دوست عبداللہ کبڑی کو جانتے ہوں گے؟“

”ہاں اچھی طرح اس بونے کو جانتا ہوں۔“

اس نے کان کے پاس سرگوشی کی۔ ”دھرم جی! یہ وہی ہے۔ ڈاکٹر ڈیڈی نے اسے میرا ہم شکل بنایا ہے۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”بے جھگو! یہ تم لوگوں کو کیا سوچھی ہے؟“

پھر وہ ہنسنے ہوئے بولا۔ ”میں کبڑی کو جانتا ہوں پھر بھی دھوکا کھا گیا۔ دھن تو اس کے پیچھے ناپتے پھر ہیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”اچھا میں جا رہا ہوں۔ کبڑی میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ اب ہم وائی ایم سی اے ہال میں نظر

آجین گے۔“

وہ سب اسے جھوم میں تلاش کر رہے تھے۔ مراد تیزی سے چلتا ہوا دھرم کلب کے پیچھے جانے لگا۔ وہاں انہوں نے اپنی موٹر سائیکل کھڑکی کی تھی۔ مراد ادھر پہنچے ہی خشک گیا۔

کلب کے پیچھے تیار کی میں کبڑی موٹر سائیکل کے پاس دونوں ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ اس کے سامنے ایک شخص اپنی گن سے اس کا نشانہ لیے کھڑا تھا۔

کبڑی چاہتا تو جتنا سنگ کا کرجب دکھا کر اس کی گن مگر اسکا تھا لیکن وہ اس کی باتیں سن رہا تھا۔

وہ گن میں حیرانی سے پوچھ رہا تھا۔ ”تم آدھے کیسے ہو گئے؟ یہ کیا راز ہے جلدی بناؤ؟“

وہ بولا۔ ”جلدی کیا بناؤ۔ میں پیدا کئی یونا ہوں۔ میرا نام عبداللہ کبڑی ہے۔“

وہ سخت لہجے میں بولا۔ ”کواس مت کرو۔ میں اندھا نہیں ہوں۔ آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں تم مراد علی منگلی ہو۔ جلدی بناؤ! اتنے چھوٹے کیسے ہو گئے ہو؟“

کبڑی نے کہا۔ ”جب سے پیدا ہوا ہوں کسی نے مجھے گود میں نہیں اٹھایا۔ ایسا کرو۔ مجھے گود لے لو۔ میرے گھر چلو۔“

اس نے کہا۔ ”میں اس کی باتیں سن رہا ہوں۔“

پھر وہ بچوں کے ملبے اچھلتے ہوئے بولا۔ ”کبڑی کبڑی۔ کبڑی کبڑی۔... کبڑی کبڑی۔ کبڑی کبڑی۔“

ٹوٹو۔ ٹوٹو۔ کہاں کاش اور کہاں کاش۔ آؤ ٹوٹو۔ ٹوٹو۔۔۔“

اس نے یکبارگی فضا میں اچھل کر اس کے ہاتھوں پر لگ ماری۔ جیسے پتھر آکر لگا ہو۔ اس کے حلق سے کراہ لگی۔

گن ہاتھوں سے نکل کر فضا میں اوپر کی طرف گئی۔ جب نیچے آئی تو مراد نے اچھل کر اسے کچل کر لیا۔

اس نے سر ہٹا کر دیکھا تو مراد نے گن کے دستے سے اس کے منہ پر ضرب لگائی پھر پوچھا۔ ”کون ہو تم؟ جلدی بولو کس کے لیے کام کر رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”مم... میں نہیں جانتا۔ میرا ایک ساتھی کسی کے لیے کام کرتا ہے۔ اس نے مجھے مراد کی تصویر دی تھی اور اس پر ارادے دیے تھے کہا تھا کہ اسے ہلاک کرو گے تو اور جیسے ہزار روپے دیے جائیں گے اور کہا تھا کہ اسے زخمی کر کے قیدی بناؤ گے تو اور اسے ہزار یا دہلیس گے۔“

کبڑی نے اپنے ریو اور میں سائیکسٹر لگا کر پوچھا۔ ”تمہارا ساتھی کہاں ہے؟“

”وائی ایم سی اے ہال میں ہے۔“

کبڑی نے اسے گولی مار دی۔ پھر مراد سے کہا۔ ”تم کیا صورت لے کر پیدا ہوئے ہو؟ مجھے یہ صورت ملی ہے تو اب ساری بندوبست میری طرف آتی رہیں گی۔ کیا جب پیدا ہوئے تھے میرے پار! تو اس پاس گولیاں چل رہی تھیں؟“

مراد نے اس کی پیٹھ پر ایک دھبہ جھاتے ہوئے کہا۔ ”چلو بیٹھو۔ آگے تمہاری صورت کا استقبال کرنے والے اور ملیں گے۔“

اس نے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا۔ کبڑی پیچھے آکر بیٹھ گیا۔ پھر وہ رفتار بڑھاتے ہوئے وہاں سے جانے لگے۔

جب وہ چلے گئے تب بونے مراد کو تلاش کرنے والے ادھر آئے۔ وہاں سناٹے اور ویرانی میں ایک لاش پڑی تھی۔ کمرس کی رنگینیاں سامنے شاہراہوں پر تھیں۔ وہ سب کمرس ٹائٹ انجوائے کرنے نکلے تھے۔ ایک لاش کی رپورٹ دے کر تھانے پولیس کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ چپ چاپ اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر وہاں سے جانے لگے۔

ہڈن نے کہا۔ ”تعب ہے۔ وہ بونا چھلاوا تھا۔ ادھر دکھائی دیا۔ ادھر غائب ہو گیا۔“

دھرم داس نے کہا۔ ”میں اس کو جانتا ہوں۔“

”کہا۔“ مجھے تو دیکھ کر بھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ ہم نے مراد علی منگلی کو دیکھا تھا۔ بھلا وہ ایک سے آدھا کیسے ہو جائے گا؟“

ہڈن نے فون پر ڈائریکٹر جنرل سے کہا۔ ”ابھی میں نے مراد علی منگلی کو دیکھا ہے۔ مگر وہ ایک بونا ہے۔“

ڈائریکٹر جنرل جان اتھوئی نے پوچھا۔ ”کیا تم نے کسی بونے کو مراد کا ہم شکل پایا ہے؟“

”میں سراوہ ہو بہو مراد تھا۔ ہم اسے پکڑ کر اس کی اصلیت معلوم کرنا چاہتے تھے لیکن وہ اچانک ہی ہمیشہ میں کہیں کم ہو گیا۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اسے کہاں تلاش کریں؟“

جان اتھوئی نے کہا۔ ”کیوں تلاش کرو گے؟ وہ مراد تو نہیں ہے۔ میں کمرس ٹائٹ انجوائے کر رہا ہوں۔ تم نے ایک بونے کو دیکھ کر خواہ مخواہ مجھے ڈسٹرب کیا ہے۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ ہڈن زیر لب بڑبڑانے لگا۔ ”وہ کون تھا؟ اس نے ابھجا دیا ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک مراد تھا۔ اگر مراد تھا تو پانٹ ایڈیشن کیسے بن گیا ہے؟“

اس نے پاس بیٹھی ہوئی بہن کو دیکھ کر پوچھا۔ ”جس نے تمہیں دشمنوں سے بچایا تھا وہ پورا تھا یا آدھا؟ میرا

مطلب ہے کیا وہ چھوٹے قد کا تھا؟“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ”وہ تو بہت اونچا پورا لمبا چوڑا تھا۔ میں اس کی بائیک پر پیچھے بیٹھی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے پہاڑ کے دامن میں بیٹھی ہوں۔“

کبڈی منظر عام پر آ کر ایک دشمن کی موت اور دوسرے دشمنوں کی پریشانی بن گیا تھا۔ اب وہ مراد کے ساتھ فنیسی ڈریس شو میں پہنچ گیا تھا۔ وہاں تو مختلف ماسک کے پیچھے دشمن ہی دشمن تھے۔

اس محفل میں ہر دشمن کی جلوہ نمائی تھی۔ شباب کی گرمی سے ان کا رنگ بے ہال گرم ہو رہا تھا۔ دھڑکیں ٹوٹ کر لڑائی ہوئی سردی تھی۔ ایسے میں حسناؤں کی وجوہ نکل آتی تھی اور آتش کو جواں رکھنے کے لیے شراب پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔

عورتوں اور مردوں نے طرح طرح کے ماسک پہنے ہوئے تھے۔ کوئی لومڑی بنی ہوئی تھی، کوئی بی اور کوئی خرگوش اور اسی کے مطابق انہوں نے بڑے ہی دیدہ زیب لباس پہنے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو ماسک کے بغیر اصلی شکل میں تھے۔ مراد سناٹا کلاز بنا ہوا تھا۔ دھرم داس نے اسے بتا دیا تھا کہ ہڈن ٹانگیر کے ماسک میں چھپا ہوا ہے۔ عبداللہ کبڈی ماسک کے بغیر مراد کا چہرہ لے کر ہال میں پہنچا تو جیسے بونے شعلوں میں کھائی پیدا ہوئی۔

جو مراد کو تلاش کرنے اور ہڈن کو ہلاک کرنے آئے تھے وہ آدھے مراد کو دیکھ کر الجھ گئے تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اگر مراد ہے تو یوں کیسے بن گیا؟ عقل کہہ رہی تھی کہ وہ مراد نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو حرام موت مرنے منظر عام پر نہ آتا۔

وہ سب پی رہے تھے۔ ان کا قول تھا کہ پیتے رہنے سے مرنے کا خوف نہیں رہتا۔ مارنے کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ اور یہ بھی سچ تھا کہ پینے کے بعد ایک کے دونوں آتے ہیں۔ گدھا، گھوڑا اور گھوڑا گدھا دکھائی دیتا ہے اور قد آور شکوہ کو بون بن کر پٹے لگتا ہے۔

کبڈی کی ایک اسٹج نما چوڑے پر کچھ لوگوں کے ساتھ تاج رہا تھا۔ شیطان کے ماسک والا ایک شخص نشے میں مست ہو کر کبڈی کے پاس آیا پھر اس پر چمک کر بولا۔ ”ہیلو مراد!“

اس نے موسیقی کی دھن میں تھرکتے ہوئے کہا۔ ”تم نے زیادہ پی لی ہے۔ میں مراد نہیں عبداللہ کبڈی کی ہوں۔“

وہ بولا۔ ”یہ ہو نہیں سکتا۔ اتنا بتا دو تمہارا قد فنیسی پرسنٹ کیسے ہو گیا۔ تم تو ہینڈ رڈ پرسنٹ تھے۔“

کبڈی نے دور کھڑے ہوئے مراد کو آنکھ ماری۔ وہ

تیزی سے چلتا ہوا آیا پھر شیطانی ماسک میں کا بازو پکڑ کر ایک طرف لے جاتے ہوئے بولا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں بونے مراد کا ایک راز بتاتا ہوں۔“

وہ اسے ہال سے باہر ایک اسٹور روم میں لے آیا پھر بولا۔ ”تم کس کے لیے مراد کو ڈھونڈ رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”تم کوئی سوال نہ کرو۔ مجھے بونے مراد کا راز بتاؤ۔“

مراد نے سائیکسٹر لگے ہوئے ریوالور کو اس کے سینے سے لگا کر کہا۔ ”ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر فون نکالو اور اپنے پاس کو بولو۔ مراد تمہارے سامنے کھڑا ہے۔“

موت سینے سے آ کر لگی تو نشے کی مستی ہوا ہو گئی۔ اس نے فون پر نمبر پیچ کیے۔ اسے کان سے لگا دیا۔ پھر رابطہ ہوتے ہی بولا۔ ”باس! میں مراد کے نشانے پر آ گیا ہوں۔ اس سے کسی طرح بچھو تا کرو۔ مجھے بچالو۔“

باس نے کہا۔ ”مراد سے میری بات کراؤ۔“

وہ فون بڑھا کر بولا۔ ”باس تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

وہ فون کو کان سے لگا کر بولا۔ ”کچھ کہنے سے پہلے یہ بتاؤ ریڈ الارٹ ہو یا ڈیٹیکٹر ریکٹ؟“

”میں ڈیٹیکٹر ریکٹ کا ڈی بلیک بول رہا ہوں۔“

”میں ریڈ الارٹ میں رہا ہوں۔“

اس کی دھیمی آواز کون سکوکے۔

یہ کہتے ہی اس نے پچپاک کی آواز کے ساتھ گولی مار دی، فون کو ایک طرف پھینک دیا پھر ریوالور کو لباس میں چھپا کر بڑے ہال کی رنگین محفل میں آ گیا۔ وہاں کبڈی موسیقی کی دھن پر گارہا تھا اور لڑکیوں کے ساتھ تاج رہا تھا۔

میں ہوں بونا بازی گر۔ میں ہوں بونا بازی گر۔

میں ہوتا ہی رہتا ہوں دشمن کو تاج چھپا کر۔

ایک بی بی بونے مراد سے دوا کر آ کر گنگرائی تھی پھر تیزی پر آ کر اس سے لپٹ گئی۔ وہ خود کو اس سے چمڑانے لگا۔ وہ کھیل جیتے ہوئے بولی۔ ”میں تین راتوں تک تمہارے پیسے میں نہاتی رہی تھی۔ یہ پریمنا تمہارے پیسے کی بونے تمہیں پچیان رہی ہے۔“

”میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہی ہو۔“

اور واقعی پریمنا اس کے پسینے کو پچپانے کا غلط دعویٰ کر رہی تھی۔ جس رات بن کن یا ایمان علی کے ساتھ راتیں گزار چکی تھی، اب وہ نہ جانے کہاں تھا۔ وہ نشے میں تھی۔ بول رہی تھی۔ ”مجھے بازوؤں میں اٹھا کر لے چلو۔ یہاں فرسٹ فلور

میں کئی کمرے خالی ہیں۔“

ماروی

وہ بولتے وقت بہت ہی جذباتی ہو کر اپنے بھرے ہوئے بدن سے اس کے بدن کو سہارا دیتی تھی۔ مراد نے الگ ہونے کے لیے ایک زور کا جھٹکا دیا تو وہ پیچھے کی طرف لڑکھرائی ہوئی شراب کی بوتلوں سے بھری ہوئی شرابی پر مری۔ کئی بوتلیں اور شیشے کے نازک جام ایک دوسرے سے ٹکرائے اور پریمنا کے ساتھ نیچے جا گرے۔ کتنے ہی لوگ اسے اٹھانے کے لیے اس کی طرف لپکے۔ مراد ناچنے والوں کی بھیڑ میں دوسری طرف چلا گیا۔

وہ غصے میں بول رہی تھی۔ ”یو ایڈ نہ۔ نان سنس! میں تجھے زندہ نہیں رہنے دوں گی۔ آئی ول کل یو۔۔۔“

وہ کئی ہاتھوں کا سہارا لے کر اٹھ گئی۔ دوسرے دیکھنے لگی۔ اس کا سر چکر رہا تھا۔ مراد نظر نہیں آ رہا تھا۔ دھرم داس نے آ کر اسے سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”تم نے بہت پی لی ہے۔ چلو یہاں سے۔“

ایک عورت وچ لیڈی (جادو گرینی) کے ماسک میں تھی۔ وہ کبڈی کا ہاتھ تمام کر ڈاس کرتی ہوئی اسے پیچ کر ایک طرف لے گئی پھر کہا۔ ”مراد علی منگی! یہ کیا مجید ہے؟ تم سب کو حیران کر رہے ہو۔ تمہارا قد چھوٹا کیسے ہو گیا ہے؟“

وہ بولا۔ ”میں کئی کئی بار قتل ہو چکا ہوں۔ اور اب میں زندہ ہوں۔“

ہماری دنیا میں ایسا نہیں ہوا اور میں کوئی منگی وکی نہیں ہوں۔ ویکیو میوزک آن ہے۔ میں گارہا ہوں۔ مجھے جانے دو۔“

وہ ہاتھ چمڑا کر پھر قہقہے کرنے والوں کے درمیان ناچنے لگانے لگا۔ مراد نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ کوئی وچ لیڈی اسے ایک طرف لے جا کر اس کے مراد ہونے کی تصدیق کر رہی تھی۔

کبڈی نے ہاتھ کے اشارے سے سمجھایا۔ ”ابھی اس عورت کا ہاتھ پکڑ کر بتاؤں گا کہ وہ کون تھی؟“

وہ گانے لگا۔ ”میں ہوں بونا بازی گر۔ میں ہوں بونا بازی گر۔“

وہ ناچتے ہوئے ایک ایک عورت کو چھو کر کہنے لگا۔

”اگر تو مجھ سے بونے ہو تو بونے ہو۔“

سوشل نکلا دھاگا۔ ارے پکڑ دشمن بھاگا۔“

اس نے وچ لیڈی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ شراب کا جام ہونٹوں سے لگائے پی رہی تھی۔ مراد نے آ کر اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا۔ وہ ہنسنے لگی۔ ”ارے چھوڑو۔ میں جواں لڑکی نہیں ہوں۔“

وہ اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر بولا۔ ”میں ریڈ الارٹ کا شو رہوں۔ پچاس لاکھ ڈالر حاصل کرنے آیا ہوں۔“

وہ ہال کے باہر آ گئے تھے۔ وہ پھلکی کی طرح پھڑپھڑا کر اس کے بازوؤں سے اتر گئی۔ پھر اسے گھور کر بولی۔ ”وہ سامنے والا کرا خالی ہے۔ دروازہ کھلا ہے۔ فوراً چلو۔ ورنہ یہاں کہیں سے اندھی گولی آ کر ہم میں سے کسی کو چاٹ جائے گی۔“

وہ اس کے ساتھ تیزی سے چلتا ہوا کمرے میں آیا۔ وچ لیڈی نے فوراً ہی دروازے کو اندر سے بند کر کے لباس کے اندر سے سائیکسٹر لگا پستول نکال لیا۔ اس کا نشانہ لیتے ہوئے بولی۔ ”ختمو ہے تمہارے پچاس لاکھ ڈالر پر۔ وہ مراد علی منگی میرے دیں میں ہے۔ اس کی رکھشا کرنا میرا کرتو (فرض) ہے۔ کوئی اسے ہاتھ بھی لگائے گا تو میں اسے نرک میں پہنچا دوں گی۔“

یہ کہتے ہی اس نے ٹریگر کو دبایا۔ دھیمی آواز میں گولی چلی وہ عین وقت پر اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ پھر جھک کر اس کے دونوں ہاتھوں کو جکڑ کر اوپر اٹھا دیا۔ دوسری گولی چھت پر جا کر لگی۔ یہ اپنا بچاؤ کر رہا تھا۔ وہ زبردست لڑاکا عورت تھی۔

مراد نے اسے اٹھا لیا۔ اس کی دھیمی آواز میں گولی چلاؤ۔ میں دشمن نہیں ہوں۔ میں نہیں۔۔۔

بات پوری ہونے سے پہلے اس نے مراد کے پیٹ میں گھٹنا مارا۔ وہ تکلیف سے دہرا ہو گیا لیکن ایسی بھی تکلیف نہیں تھی کہ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ جاتے۔ اس نے وچ لیڈی کو دبوچ کر رکھ دیتے ہوئے پیچھے دیوار سے ٹکرا دیا۔ اس کے حلق سے کراہ نکلی۔ اس کا سر ذرا جھکا تو مراد نے اس کی گردن میں بازو کا پھندا ڈال دیا۔ ذرا زور لگایا تو اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ ایسے میں پستول ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس نے لانے والی کو ایک جھٹکے سے فرش پر پھینک دیا۔ پھر پستول کو اٹھا کر اسے نشانے پر رکھ لیا۔

وہ ہنسی ہو کر ٹھنڈی پڑ گئی۔ فرش پر سے اٹھتے ہوئے مراد کو نفرت سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں موت سے کھلیکتی رہتی ہوں۔ چل گولی چلا۔ یہاں سے باہر نکلتے ہی مرے گا۔ میری بیٹیاں تجھے زندہ نہیں چھوڑیں گی۔“

”میں گولی نہیں چلاؤں گا کیونکہ دشمن نہیں ہوں اور ریڈ الارٹ کا شو بھی نہیں ہوں۔“

وہ ہنسنے سے بولی۔ ”ابھی تو نے کہا تھا۔“

”میں جھوٹ بول کر معلوم کرنا چاہتا تھا کہ تم کس گروہ

سے تعلق رکھتی ہو؟

”میں کیسے یقین کروں کہ اب سچ بول رہے ہو؟“ وہ بڑی محبت سے بولا۔ ”تم مراد کے لیے ٹیک جذبات رکھتی ہو۔ پچاس لاکھ ڈالرز پر تھوکی ہو۔ میں تمہیں سلام کرتا ہوں۔“

اس نے جھک کر پستول اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے حیرانی اور بے یقینی سے مراد کو دیکھا پھر پستول لے کر فرش سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ”تم کون ہو؟“

وہ بولا۔ ”میلے تم اپنے بارے میں بتاؤ؟“ وہ بولی۔ ”میرا نام جگتی بانی ہے۔ میری نین بنیال اور ایک بیٹا ہے۔ ہم نے انیائے (نافضانی) کے خلاف لڑنے کے لیے ایک تنظیم بنائی ہے۔ اس تنظیم کا نام گھمراہ پٹن (Peticoat Army) ہے۔ یہ نام ہم نے نہیں لوگوں نے رکھا ہے کیونکہ ہماری دل (جماعت) میں صرف تعلیم یافتہ ہنرمند اور خطرناک فائٹر کھیلنے والی عورتیں ہیں۔

”ہم نے مراد علی سنگی کی ہسٹری معلوم کی ہے۔ وہ بے قصور ہے۔ پاکستانی جاسوس نہیں ہے۔ ہم اسے انصاف دلائیں گے۔ جو اس کا مدفن ہوگا اسے ہم جینے نہیں دیں گے۔“ مراد اسے بڑی محبت اور عقیدت سے دیکھ رہا تھا جگتی بانی نے کہا۔ ”تم بولو کون ہو؟ کیا اس نے مراد کو جانتے ہو؟“

مراد نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”ہاں بے چارہ مراد۔۔۔ میں تمہارے اندر انسانی ہمدردی اور مراد سے انہایت دیکھ کر کچھ کہوں گا۔ ابھی ہم نے یہ راز کسی کو نہیں بتایا ہے۔ پہلے تمہیں بتا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے تم جاوڑوں کو اور کسی تاتیرک مہاراج کی جادوئی خفتوں کو مانتی ہو؟“

”کیوں نہیں مانوں گی؟ ضرور مانتی ہوں۔ ہمارے دیس میں جادو تو نا بہت ہے۔“

”تو سنو؟ ابھی جو ہال میں ناچ رہا ہے اور گاربا ہے وہی مراد علی سنگی ہے۔ ایک تاتیرک مہاراج نے کروڑھ (تیس) میں آکر اسے جادوئی خفتی سے بونا بنا دیا ہے۔“ جگتی بانی نے حیرت سے اپنا ہاتھ کھلے ہوئے منہ پر رکھ لیا۔ مراد نے کہا۔ ”بے چارہ مراد دشمنوں سے چھپنے کے لیے شیشاں گھاٹ میں گیا تھا۔ وہاں ایک تاتیرک مہاراج ایک قہال میں گیندے کے پھول ماش کی دال کا آٹا سمندر اور تلی کا تیل رکھ کر آسن جمائے بیٹھے تھے اور کوئی منتر پڑھ رہے تھے۔ مراد دشمنوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے ادھر سے بھاگتا ہوا جانے لگا تو مہاراج کی قہال کو ٹھوک لگی۔ ان

کے تمام جنتر منتر کا سامان دور تک بکھر گیا۔ سب ہی مٹی میں مل گیا۔

”جب تاتیرک مہاراج نے کروڑھ میں آکر ایک منتر پڑھ کر اس پر پھونک ماری تو وہ نکلوتا اور چھوٹا ہوتا چلا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا قد گھٹ گیا اور وہ یونا بن گیا۔“

جگتی بانی نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”ہائے۔۔۔ بے چارہ! ہم اس تاتیرک مہاراج سے ملیں گے۔ اس سے پتی کریں گے۔ اس کے چروں میں گر جائیں گے تو وہ اسے واپس قہار بنا دیں گے۔“

”بے چارہ مراد نہیں جانتا کہ وہ مہاراج کون تھے۔ کہاں سے آئے تھے اور اب وہ کہاں ہوں گے؟“ دروازے پر دستک سنائی دی۔ پھر کسی لڑکی کی آواز آئی۔ ”ناجانی! تم بڑی دیر سے یہاں ہو۔ خیریت تو ہے؟“ جگتی بانی نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”میری بیٹی ورشا آئی ہے۔“

اس نے دروازہ کھولا تو وہاں تین جوان لڑکیاں کھڑی تھیں۔ ان کے پیچھے دور عبد اللہ کبڈی چھپا ہوا تھا۔ اسے تشویش تھی کہ مراد بند کمرے سے باہر کیوں نہیں آ رہا ہے؟ مراد نے ہاتھ اٹھا کر اسے آنے کا اشارہ کیا۔ لڑکیاں اندر آ دیں۔ کبڈی بھی ان کے پیچھے گریں۔ جگتی بانی نے اپنی ماں سے کہا۔ ”ناجانی! یہ دیکھو مراد آ رہا ہے۔“

دوسری نے کہا۔ ”مراد نہیں اس کا ہم کچھ ہے۔“ تیسری نے کہا۔ ”میں شرط لگانے کو تیار ہوں مراد تو پہاڑ جیسا ہے، وہ بونا ہو ہی نہیں سکتا۔“

وہ آپس میں بحث کرنے لگیں۔ جگتی بانی نے ڈانٹ کر کہا۔ ”چپ ہو جاؤ۔ یہ مراد علی سنگی ہے۔“

سب نے اسے حیرانی سے دیکھا جگتی بانی نے آگے بڑھ کر کبڈی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میں نے ابھی تمہارے دوست نے بتایا ہے۔ تاتیرک مہاراج نے تم پر برا ظلم کیا ہے۔ ہم اس مہاراج کو ڈھونڈیں گے۔ اگر وہ سیدھی طرح تمہیں واپس قہار نہ بنائے گا تو ہم عورتیں اسے الٹا لٹکا دیں گی۔“

وہ تینوں لڑکیاں ہمدردی اور محبت سے کبڈی کو دیکھ رہی تھیں۔ جگتی بانی اسے سینے سے لگا کر بولی۔ ”آج سے میں تمہاری ماں ہوں۔ تم دشمنوں کے مقابلے میں اکیلے نہیں رہو گے۔ یہاں سے کوکھ تک گھمراہ پٹن (Peticoat Army) میں دو سو فائٹر عورتیں ہیں۔“ وہ جگتی بانی کی پیشانی کو چوم کر بولا۔ ”میری اتنی

ماروی

ہڈن اپنے ماسک کی وجہ سے محفوظ تھا۔ کسی قاتل کو نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن شراب اسے لے ڈولی۔ اس پر نشہ حاوی ہو گیا تھا۔ اس نے ایک جوان عورت کو آنکھوں میں لے کر چومنے کے لیے ماسک کو چہرے سے ہٹا لیا تو ایک شوٹرنے اسے دیکھ لیا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھتا ہوا اس کے پیچھے آیا پھر اس کی پشت سے ریولور کی نال کو لگاتے ہوئے کہا۔ ”کن میرے کوٹ کی جیب میں ہے، کوئی دیکھ نہیں سکے گا۔ چپ چاپ باہر چلو۔ منہ سے ذرا آواز نکالو گے تو میںیں گولی مار دوں گا۔“

وہ سہم کر بولا۔ ”ہیلز گولی نہ چلانا۔ مجھ سے دوستی کرو۔ میں تمہارا مطالبہ کرنی کی صورت میں ادا کروں گا۔“ ”اوکے باہر چل کر باتیں ہوں گی۔ کن، آگے بڑھو۔“ اسے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ اس کے لباس کے اندر بھی ایک پستول تھا۔ سوچ رہا تھا جب جان دینی ہی ہے تو باہر جاتے جاتے پستول نکال کر اس سے مقابلہ کرے گا۔ شوٹرنے بھی مجبور تھا۔ اس عمارت کے اندر گولی مار کر بھاگنا چاہتا تو درجنوں سیکورٹی والے اسے گولی مار دیتے۔ وہ بڑے ہال سے باہر آگئے۔ عمارت کے مختلف حصوں سے گولے مارنے لگے۔ شوٹرنے اسے والے سے سوچا ہے اور اسے گارڈز بھی کھڑے ہوئے تھے۔

شوٹرنے کہا۔ ”تیزی سے چلو۔“ ہڈن اس کے آگے تیزی سے چلتے چلتے اچانک بیٹھ گیا۔ اس حرکت سے پیچھے والا فوراً ہی رک نہ سکا۔ ہڈن کے اوپر سے گزرتا ہوا آگے آکر گرا۔ اتنی سی مہلت ملنے ہی ہڈن نے لباس سے پستول نکال کر اسے گولی مار دی۔

دور کھڑے ہوئے گارڈز دوڑتے ہوئے اس کی طرف آنے لگے۔ مراد ایک ستون کی آڑ میں تھا۔ اس نے گولی چلائی تو وہ ہڈن کے ہاتھ میں لگی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور چلا گیا۔ اس کی طرف آنے والے گارڈز پلٹ کر اس سے دور ہو گئے۔ جو باگولیاں چلانے سے پہلے ادھر ادھر چھپنے لگے۔

ایسے ہی وقت ہر سٹار کی چھانگنی۔ کسی نے مین سوئچ کو آف کر دیا تھا۔ ریڈ الارٹ کے شوٹرز متحد ہو کر بڑی پلاننگ سے انکیشن میں آئے تھے۔ ان میں سے دو شوٹرز مین سوئچ کے پاس تھے۔ جو گارڈ اسے آن کرنے آ رہا تھا۔ اس کی طرف گولیاں چلا رہے تھے۔ باقی شوٹرز اس سے تھے جہاں ہڈن فرش پر پڑا ہوا تھا۔ وہ تاریکی میں

وقات پا چکی ہیں۔ میں آپ کو اتنی کہوں گا۔ آپ میرے لیے فائٹ کریں۔ بھارت سرکار کو یقین دلائیں کہ میں نہ تو پاکستانی جاسوس ہوں اور نہ ہی پیشہ در بجرم ہوں۔“

”فکر نہ کرو۔ گھمراہ پٹن میں چھ مانی ہوئی ہیر سٹر ہیں۔ پندرہ پریس رپورٹر اور نو گرافر ہیں۔ دور کی کوڑیاں لانے والی جاسوس ہیں۔ یہ سب کی سب تمہارے لیے فائٹ کریں گی۔“

پھر وہ اپنی بیٹیوں کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگی۔ وہ بیٹیوں بہت مایوس ہو کر بونے مراد کو دیکھ رہی تھیں۔ جگتی بانی نے کہا۔ ”مراد! ان تینوں نے تمہیں اپنا آئیڈیل بنایا تھا۔ ایک دوسرے سے لڑتی تھیں اور اب جگتی ہیں کہ وہ سے شادی کریں گی۔“

ان تینوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ ان کی ماں کہہ رہی تھی۔ ”یہ میری بڑی بیٹی جیتا ہے۔ یہ دوسری ڈولی ہے اور یہ سب سے چھوٹی ورشا ہے۔“

ورشا چور نظروں سے سنا کلاز کو دیکھ رہی تھی اور انجانے میں اصلی مراد کی طرف جا رہی تھی۔ وہ بونے مراد کے مقابلے میں چھ فٹ سے بھی اونچا صحت مند جوان تھا۔ لڑکیاں ایسی شخصیت کا تصور کرتی ہیں۔

مراد نے کبڈی سے کہا۔ ”میں ہال میں جانا ہے اور دشمنوں سے ملتا ہوں۔“ کبڈی نے جگتی بانی سے کہا۔ ”اٹنی! آپ اپنا ٹون نمبر دیں اور میرا نمبر لیں۔ میں کل آپ سے بات کروں گا اور آپ سے ملنے کے لیے آؤں گا۔“

انہوں نے ایک دوسرے کے نمبر Save کر کے کبڈی تینوں لڑکیوں کے سامنے آ کر بولا۔ ”نام نہ کرو۔ اگر میں تمہارا آئیڈیل تھا تو پھر ماتم کیسا؟ ابھی تو میں زندہ ہوں۔ تم تینوں میرے ہاتھ پاؤں پکڑ کر روز اپنی اپنی طرف بھاگتی رہو گی تو کہاں ہو جاؤں گا۔“

جگتی بانی ہنسنے لگی۔ وہ دونوں کمرے سے نکل کر بڑے ہال میں آگئے۔ وہاں کمرس نائٹ کا جشن شباب پر تھا۔ طرح طرح کے لذیذ کھانوں کے علاوہ شراب کی ٹرالیوں بھی گردش میں تھیں۔

ریڈ الارٹ اور ڈنجرس ریکٹ کے شوٹرز بھی پی کر مس تھے۔ بونے مراد نے انہیں ابھادیا تھا۔ وہ اس سے مایوس ہو کر ہیلری ہڈن کو ڈھونڈ رہے تھے۔ ڈی بلیک نے حکم دیا تھا کہ ہڈن کو گولی مار دی جائے تب ہی ڈائریکٹر جنرل مجبور ہو کر مراد کا پتا بتائے گا جبکہ MET ڈیپارٹمنٹ کی مرید بھی اس کا موجودہ پتا نہیں جانتی تھی۔

ریٹنگ ہوا اپنے پستول کی طرف جارہا تھا لیکن صبح سمت سے
مجبور کیا تھا اور مراد کی طرف ستون کے پاس چلا آ رہا تھا۔
اندھیرے میں شوژر گولیاں چلا رہے تھے۔ فائرنگ کے
لحمائی شعلے مل بھر رہے تھے۔ مراد نے ستون کے پیچھے محفوظ
رہ کر ان لحمائی شعلوں کی سمت گولیاں چلا رہی تھیں تو دواغزادی
چٹخیں سنائی دیں۔ پتا نہیں وہ دشمن تھے یا گاڑوڑ تھے؟ پھر
اس نے فرش پر بیٹھ کر ذرا جھک کر کسی کے سانس لینے کی آواز
سنی۔ پرفیوم کی مہک سے پہچانا کہ وہ ہڈن ہے۔

اس نے دہمی آواز میں کہا۔ ”فوراً لٹ جاؤ۔ ورنہ
کوئی گولی ابھی ادھر آئے گی۔“
وہ محوڈے کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں سے چلتا آ رہا
تھا۔ فوراً ہی فرش پر اوندھا لٹ گیا۔ مراد نے کہا۔ ”میں
تمہارے پرفیوم کی مہک سے پہچان رہا ہوں۔ تم ہڈن
ہو۔ ڈرو نہیں۔ میں وہی ہوں جس نے تمہاری بہن لیزا کی
جان بچائی تھی۔“
وہ بولا۔ ”تھینکس گاڈ اچھے ایک ہتھیار دو۔ مہربانی
ہوگی۔“

”میرے پاس ایک ہی ریوالور ہے۔ میرا لباس
تھام کر ریٹنگتے ہوئے چلو۔“
اس کی بات پر ہڈن نے ہاتھ پاؤں سے چلتا آ رہا
آئی۔ اس نے منہ سے آواز نکال کر دانی کی مٹی۔ چونکہ وہ
فرش پر لیٹے ہوئے تھے اس لیے بچ گئے۔ تیزی سے ریٹنگتے
ہوئے ایک سمت جانے لگے۔

مراد کی بھی نئی جگہ جاتا تھا تو پہلے وہاں سے نکلنے کے
راستے ذہن نشین کر لیتا تھا۔ وہ دانی کی مٹی سے کیمارت
سے بھی نکلنے کے راستے دیکھ چکا تھا۔ اس وقت فرش پر چپ
چاپ ریٹنگ ہوا ہڈن کو اپنی راہنمائی میں لے جا رہا تھا۔

وہ خطرے سے دور ہو گئے تھے۔ ٹھہر ٹھہر کر فائرنگ کی
آوازیں آ رہی تھیں۔ کرائے کے شوژر اور سبھیوں کے
درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ مراد نے فون کے ذریعے
کبڈی کو مطلع دیا۔ ”گاڑی کے پاس آؤ۔ میں آ رہا ہوں۔“
پھر وہ دونوں فرش پر سے اٹھ گئے۔ باہر شاہراہ کی روشنی
کے باعث اندر گہری تاریکی نہیں رہی تھی۔ وہ جھٹکتے ہوئے،
چھپتے ہوئے عمارت کے باہر ایک پتلی کی گلی میں نکل آئے۔

وہاں کچھ فاصلے پر موٹر سائیکل کے پاس کبڈی کھڑا ہوا
تھا۔ ہڈن اسے دیکھ کر خشک کیا۔ کبڈی نے کہا۔ ”رک کیوں
گئے۔ میرے سر کی قیمت حاصل کرنے کے لیے اپنے دن
رات حرام کر رہے ہو۔ آؤ میرے شانے سے سرائتا رلو۔“

ہڈن نے کہا۔ ”تم نے مجھے الجھا دیا ہے۔ میں ہال
میں بھی نہیں دیکھتا رہا۔ کسی پہلو سے تعین نہیں آ رہا ہے کہ
تمہارا قد اتنا چھوٹا ہو گیا ہے۔“

وہ سائیکلر لگا ہوا ریوالور نکال کر اس کا نشانہ بنے
ہوئے بولا۔ ”میں پچاس لاکھ ڈالر ہوں۔ گولی چلے گی تو
تعین آ جائے گا لیکن تعین کرنے والے دیر ہو چکی ہوگی۔“
ہڈن نے فوراً ہی پلٹ کر مراد کو دیکھا پھر چیخ کر
کہا۔ ”مجھے اپنا ریوالور دو۔“

مراد نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ مار
کھا کر کبڈی کی طرف ریوالور کے نشانے پر آ گیا۔ پیچھے
سے مراد نے اس کی کمر سے ریوالور لگا کر کہا۔ ”میں وہیں
ہال میں تمہیں ختم کر سکتا تھا لیکن نہیں کیا۔ ایک فون کلل
ضروری تھی۔ چلو اپنا فون نکالو اور میرے کولک کر دو۔“

اس کے آگے پیچھے موت تھی۔ اس نے حکم کی تعمیل
کی۔ رابطہ ہونے پر دوسرے طرف موسیقی گانے اور
فہمبول کی آوازیں سنائی دیں۔ وہاں بھی کمرس ٹائٹ کی
دھوم دھام تھی۔ سرینے بھی شے میں مست ہو رہی تھی۔ اس
نے پوچھا۔ ”ویل ہڈن! کیا تم وہاں انجوائے کر رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”وہاں بہت شور ہے۔ کہیں دور آ کر بات
کرنا اور میری بات نہ سنو۔ میرے آگے پیچھے موت ہے۔“
”جسٹ اے منٹ! میں دوسری جگہ جا رہی ہوں۔“
ہڈن نے مراد سے پوچھا۔ ”میں سرینے سے کیا بولوں؟“
”بولو کہ تم مراد کو دیکھ رہے ہو اور وہ یونا ہو گیا
ہے۔ اس سے یہ نہ کہنا کہ مراد کے ساتھ یہ سائتا نکلاؤ
تمہارے پیچھے ہے۔“

دوسری طرف سرینے کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو ہڈن!
یہاں شور ہنگامہ نہیں ہے۔ اب بولو۔“

”میں کیا بولوں؟ ایسے وقت بولتے ہیں، پیچھے کتوں
آگے کھائی۔ میں کیا کروں میری مانی؟ مراد موت بن کر
آ گیا ہے۔ یہ شاید مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس سے کسی
طرح بچھوٹا کرو۔“

وہ خوشی سے چیخ کر بولی۔ ”کیا مراد وہاں ہے؟ اسے
فون دو۔ ہائے، میں اس کی آواز سننا چاہتی ہوں۔“

ہڈن نے کبڈی کی طرف فون بڑھاتے ہوئے
کہا۔ ”سرینہ! تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔“
کبڈی نے فون نہیں لیا۔ اُدھر منہ کر کے بولا۔
”سوری مرینہ! میں ایک گھنٹے بعد تم سے بات کروں گا۔ سو
سوری! ابھی دشمنوں سے منٹ رہا ہوں۔“

ماروی

ادھر سے سرینے نے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟ یہ مراد کے
لب و لہجے میں بول رہا ہے لیکن آواز وہی نہیں ہے۔“
ہڈن نے کہا۔ ”اس کی آواز دب گئی ہے اور قد کمزور گیا
ہے۔ تمہارا مراد یونا ہو گیا ہے۔“

وہ بولی۔ ”کیا کو اس ہے۔ وہ پہاڑ جیسا مراد یونا کیسے
ہو جائے گا؟ اس سے بولو، مجھ سے بات کرے۔“
کبڈی نے مراد کا اشارہ پاتے ہی کوئی بات نہیں
کی۔ ہڈن کو کوئی مار دی۔ وہ کراہتا ہوا فون سمیت زمین پر
گر پڑا۔ مراد نے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر کک ماری۔ کبڈی
ہڈن کا فون اٹھا کر پیچھے آ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی آگے بڑھ
گئی۔ فون سے سرینے کی آواز آ رہی تھی۔ ”ہڈن! اچپ کیوں
ہو گئے؟ بولنے کیوں نہیں؟“

”کبڈی! فون کومنہ کے سامنے لا کر گانے لگا۔
”میں ہوں یونا بازی کر۔ مجھے سے کرو نہ اگر مگر۔ میں
ہوں یونا بازی کر۔“
اس نے فون کو دور پیچھ کر دیا۔ موٹر سائیکل تیز رفتاری
سے چلی جا رہی تھی۔

☆☆☆

دوسری صبح انڈیا کے تمام چھوٹے بڑے اخبارات کے
پا کر جتنے ہی حصے تھے۔ ”آج کی تازہ خبر۔ وہ دلی کی کمرس
ٹائٹ میں خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں شراب پیئے والوں کے
اندز بھو باہر۔ آج کی تازہ خبر۔ آج کی تازہ خبر۔“

اخبارات کی سرخیاں کہہ رہی تھیں۔ ”دانی ایم سی
اے ہال میں جہاں کمرس ٹائٹ مٹا رہے تھے وہاں
دہشت گرد گولیاں برس رہے تھے۔“

تمام ٹی وی چینلز کہہ رہے تھے وہ دہشت گرد نہیں
تھے۔ برطانوی سفارت خانے کے منتظم ہیلری ہڈن کے
دشمن تھے۔ اسے ہلاک کرنے آئے تھے۔ خبروں میں یہ بھی
کہا جا رہا تھا۔ ہڈن نامزد قاتل ہیردی تھیں۔ انکوں سے آ رہے ہیں
اور کسی مراد علی منگی کو تلاش کر رہے ہیں۔ مراد علی منگی پاکستانی
جاسوس ہے۔ وہ یہاں سے ایک اہم راز چرا کر فرار ہونا
چاہتا تھا۔ سب ہی کے بیانات کا لب لباب یہی تھا۔

اب تک راجستھان اور یوپی کے علاقوں میں مراد کا
چرچا محدود دیکھنا پڑتا تھا۔ اس روز 25 دسمبر کو کبڈی ہال کا
نام پورے ہندوستان میں گونج رہا تھا۔ تمام اخبارات اور
ٹی وی چینلز کے ذریعے اس کی تصویریں دکھائی جا رہی
تھیں۔ یہ کہا جا رہا تھا کہ اب وہ کسی علاقے میں چھپ کر نہیں
رہ سکے گا۔

پھر اسی دن اخبارات کے صفحے شائع ہوئے۔ ٹی وی
کی خبروں میں بتایا گیا کہ پچھلی رات مراد کو دانی ایم سی اے ہال
میں دیکھا گیا تھا۔ وہ چھپنے والا سرعام آ گیا تھا اور وہاں ناچتا
گا تا رہا تھا۔

ان خبروں میں ایک حیرت انگیز اور ناقابل یقین بات
کبھی مٹی کے مراد علی منگی کا قد چھٹ سے کچھ زیادہ تھا۔ اب وہ
گھٹ کر چار فٹ کا یونا ہو گیا ہے۔
یہ واقعی یقین کرنے والی بات نہیں تھی۔ لوگ ہر گلی اور
تعلقے میں اس بوئے پرتھر سے کر رہے تھے اور اس کے متعلق
اپنے اپنے طور پر خیال آرائی کر رہے تھے۔

ایم این اے دھرم داس نے بیان دیا۔ ”میں نے
اس بوئے کو آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس سے باتیں کی
ہیں۔ وہ ہرگز مراد علی منگی نہیں ہے۔ وہ ایک سیدھا سادہ سا
ناچنے گانے والا اور قماشے دکھا کر ہٹانے والا جو کر ہے۔
میں اسے ڈائریکٹر جرنل آف پولیس اور انڈین نیشنل
والوں کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا تاکہ اس کی صحیح شناخت
ہو جائے اور وہ بے چارہ معصوم یونا مراد علی منگی کے دھوکے
میں مارا نہ جائے۔“

”اس نے مجھے کہا تھا کہ کمرس ٹائٹ کے جشن کے
بعد میرے پاس آئے گا لیکن وہاں گولیاں چلنے لگی
تھیں۔ سب اپنی اپنی جان بچانے کی فکر میں تھے۔ وہ بھی
خوف زدہ ہو کر نہیں چلا گیا ہے۔“

”مجھے امید ہے وہ مجھ سے رابطہ کرے گا۔ میرا فون
نمبر اس کے پاس ہے۔ ایک تو مجھے اس بوئے سے ہمدردی
ہے، دوسری بات یہ ہے کہ اصل مراد علی منگی جو پاکستانی
جاسوس ہے وہ بوئے کا ہم شکل ہو کر فائدہ اٹھائے گا۔ وہ ہم
سب کی توجہ اس بوئے کی طرف لگا کر فرار ہو سکتا ہے۔ ہم
اس جاسوس کو سرحد پار نہیں کرنے دیں گے۔“

دھرم داس آخرچہ دیس بھگت بن کر مراد علی خلاف
بیان دے رہا تھا لیکن اپنے دل اور دھرم سے اور یقینی سچائی
سے مراد کو بے قصور مانتا تھا۔ وہ اس پر سے پاکستانی جاسوس
ہونے کا جھوٹا الزام منانے سے سکتا تھا لیکن در پردہ اس کا حامی
ہو کر اسے سرحد پار کر سکتا تھا۔ اس کے لیے وہ بہت کچھ کر
رہا تھا۔ ایمان علی کی حیثیت سے مراد کا نیا شناختی کارڈ اور
پاسپورٹ بنوا چکا تھا۔ آئندہ عبداللہ کبڈی کی کوآئی جی آف
پولیس اور انٹیلیجنس والوں کے سامنے پیش کر کے اس کا بھی
شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوانے والا تھا۔

دوسرے دن جیجی بائی نے کبڈی کو فون پر مخاطب

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

تما جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

پھلہری

قابل علاج مرض ہے

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ملش ایوارڈ بولڈر اجمل زیدی کے دور میں پاکستان کے مستحق و فخری



اسلام آباد

اپنا 30 سالہ تجربہ
میرزا گل خان صاحب
فون: 2854595 - 2255880 (051)
موبائل: 0300-8566188
فکس: 2261636

9- اپریل 30 تا
9- اگست 30 تا
9- دسمبر 30 تا



ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD



AWARD PILLAR OF LEUCODERMA



AWARD OF BEST ACHIEVEMENT

لاہور

پشاور

گلف سینٹر
آفس نمبر: 16
فیروز چورنگ روڈ سوات چنگی
خود مشہد (ٹولڈا) لاہور
موبائل: 0300-8566188

پیشہ ورانہ
نئی روڈ نزد بھگتی چوک چٹانہ
فون: 2218215-9 (0521)
موبائل: 0300-8566188

ملتان

کراچی

پیشہ ورانہ
اپنا 30 سالہ تجربہ
فون: 4518061-62 (061)
4582803 (0300-8566188)

اپنا 30 سالہ تجربہ
نئی روڈ نزد بھگتی چوک چٹانہ
فون: 2218215-9 (0521)
موبائل: 0300-8566188

E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

دیکھا ہے پھر آدھی رات کے بعد ہڈن نے مجھے فون کیا تو تم وہاں موجود تھے۔ ہڈن نے کہا تھا کہ تمہاری آواز دب گئی ہے اور قد کھڑک گیا ہے۔ تم بولنے ہو گئے ہو۔

”یہ کیا بچوں جیسی باتیں ہیں۔ پلیز سچ بتاؤ۔ تم کون ہو؟ میں نہیں جانتی کہ مراد یوں ہو گیا ہے؟ یہ سچی ہوئی نہیں سکتا۔ میں تو بھی نہیں مانوں گی۔“

”ٹھیک ہے کہ یہ نہ ماننے والی بات ہے، کیا مجھے آنکھوں سے دیکھ کر بھی نہیں مانو گی؟“

اس نے یہ کہتے ہوئے تکلیف سے کراہنے کے بعد ایک لمبی سانس لی۔ مرینہ نے پوچھا: ”کیا تم کسی تکلیف میں ہو؟“

”ہاں واٹ روم میں ہوں۔“

وہ ناگواری سے بولی۔ ”یو تان سنس اکیا ایسے وقت مجھ سے بات کر رہے ہو؟“

”مجھوری ہے۔ دشمنوں نے اتنا مصروف کر دیا ہے۔ تم سے کیا چھپانا۔ جب ہم بچے پور میں چھپے ہوئے تھے۔ یاد کرو وہاں تم میرے ساتھ شاور لیتی تھیں۔ اسی طرح اس وقت بھی میرے تن پر کچھ نہیں ہے۔ ہائے مرینہ! آ جاؤ نا۔“

وہ عمارت سے بولی۔ ”اے بولنے...! باشت پھر کے دو۔ ایک ایک بات کہہ دو۔ میں جا کر کرے گا۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کیا قد گھٹ جانے سے پیار بھی گھٹ گیا ہے۔ کیا آئندہ میرے ساتھ نہیں رہو گی؟“

”تو بے کون؟ یہ پوچھنا مراد کیسے بن گیا ہے؟ یہ تو بالکل ہی ناممکن ہے۔ تو مراد علی منگی ہوئی نہیں سکتا۔“

”اگر میں ثابت کر دوں تو کیا مجھے گود میں لے کر میرے بچے کی ماں نہیں بنو گی؟“

مرینہ کا دکھ تازہ ہو گیا۔ وہ ماں بنتے بنتے رہ گئی تھی۔ اسے پھر سے مراد کی ضرورت تھی لیکن جو مراد آنے والا تھا اس کے گلے گلے کے لیے اسے گود میں اٹھانا پڑتا۔

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”کل رات ہڈن نے کہا تھا کہ مراد اس کے سامنے ہے۔ سچ یوں کہہ کر ہڈن نے کوئی ماری گی یا وہاں اور بھی کوئی تھا؟“

”میں جتنا تھا۔ میں نے ہی اسے گولی ماری تھی۔ جب سے تم مجھے بچے پور میں چھوڑ کر گئی ہو، جب سے ہڈن اور اس کے آدمی مجھے مار ڈالنے کے لیے ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس لیے میں نے اس کا قصہ ہی تمام کر دیا ہے۔“

”کیا تم ثابت کر سکتے ہو کہ تم ہی مراد علی منگی ہو؟“

کیا۔ وہ نیند سے بیدار ہو کر بجائی لیے ہوئے بولا۔ ”سوری امی! تمام رات بڑی بھاگ دوڑ رہی۔ اس لیے لمبی تان کر سوراہا تھا۔“

”چلو میں نے جگا دیا۔ نیند تو پوری ہو گئی ہے نا؟“

”ہاں۔ آپ اجازت دیں گی تو شاور لے کر فریش ہو کر آپ سے بات کروں گا۔“

”تم جب بھی بات کرو۔ ابھی یہ سن لو کہ اچانک ہی پورے دیس میں تمہارا نام گونجنے لگا ہے۔ ٹی وی دیکھو۔ اخبار پڑھو۔ تمہیں بہت سی باتیں معلوم ہوں گی۔ تمہیں فون اس لیے کیا ہے کہ میں نے آج شام کو پریس کانفرنس بلائی ہے۔ الیکٹرونک میڈیا کے لوگ بھی آئیں گے۔ میری گھاکھ اپلشن کی اہم عورتیں بھی ہوں گی۔“

”گھاکھ اپلشن کی طرف سے اخبارات اور ٹی وی کو بیان دیا جائے گا کہ تم مراد علی منگی نہیں ہو۔ تمہیں پاکستانی جاسوس نہ سمجھا جائے اور اسی طرح کی بہت سی باتیں کہنے کے لیے تم... سے میں تنگ ضروری ہے۔ تم نہادھو کر فریش ہو جاؤ۔ میں ٹھیک دو بجے گاڑی لے کر آؤں گی اور تمہیں ساتھ لے جاؤں گی۔ اپنا پتا بتاؤ۔“

کبڑی نے کہا۔ ”میرا جگری دوست ایمان علی بھی ساتھ ہے۔ آپ کی کوئی بات کہہ سکتا ہوں۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ مراد سو رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر کہا۔ ”تم ہاتھ روم سے آ جاؤ گے تو میں جاؤں گا۔“

اس نے کہا۔ ”دو بجے اٹی آنے والی ہیں۔ واقعی ایک ماں ہونے کا حق ادا کر رہی ہیں۔ تم پر سے یعنی مجھ پر سے پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام ختم کرنا چاہتی ہیں۔“

”یار! مرینہ کل سے ہمارے فون کے انتظار میں سلگ رہی ہوگی۔ میں نے جیسا تمہیں سمجھایا ہے اسی طرح اس سے دو باتیں کر لو۔ دیکھو وہ کیا کہتی ہے۔“

وہ ہاتھ روم میں جاتے ہوئے بولا۔ ”آل رائٹ! میں ابھی اسے کال کر رہا ہوں۔“

اس نے ہاتھ روم میں آ کر دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر فون پر مرینہ کے نمبر پر کال کر کے اپنا لباس اتارنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اندر آئی۔ ”ہیلو کون؟“

وہ فون کے پاس آ کر بولا۔ ”میں ہوں تمہارا مراد۔“

وہ جھٹکا کر بولی۔ ”تم مراد کیسے ہو سکتے ہو؟ ہڈن نے پہلے ڈائریکٹر جنرل سے کہا تھا کہ اس نے ایک بولنے مراد کو

☆☆☆

جنگی بانی تینوں بیٹیوں کے ساتھ اپنی کار میں آئی۔ مراد اور کبڑی نے انہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھایا۔ وہ اور عبداللہ کبڑی کی ماں بیٹے بن گئے تھے لیکن اس مراد کے بونے پن نے تینوں لڑکیوں کو بہت مایوس کیا تھا۔ ان تینوں نے مراد علی مٹکی کے متعلق سنا تھا کہ وہ دیسی بدیسی مجرموں کے ساتھ تھلاڑتا آ رہا ہے اور دشمنوں کو نرک میں پہنچاتا جا رہا ہے۔ ایسی دلیری اور جان بازی کی باتیں لڑکیوں کو متاثر کرتی ہیں۔ ٹینا ورشا اور ڈولی تینوں نے اسے اپنا آئیڈیل بنالیا تھا اور اس آئیڈیل نے اپنا قد گھٹا کر ان تینوں کے عشق کو اور ان کے جوش جذبات کو کھٹاکے خاک میں ملا دیا تھا۔ اب وہ پٹری بدل کر ایمان علی کی پٹری پر آ رہی تھیں۔ وہ اپنے چہرے، اپنے قد اور جسامت کے اعتبار سے بہت ہی خوب صورت تھا۔ دیکھنے والیاں اس کی طرف کھینچ جاتی تھیں۔ اس وقت وہ ڈرائنگ روم کے جس صوفے پر بیٹھا تھا، وہاں ورشا آکر اس سے لگ کر بیٹھ گئی۔ ٹینا نے اس کے سامنے آکر ذرا تن کر کہا۔ ”ورشا! میں تم سے بڑی ہوں۔ مجھے یہاں بیٹھنے دو۔“

ورشا نے کہا۔ ”اس صوفے پر چھوٹی بڑی عمر کا سب سے بڑا لڑکا بیٹھا ہے۔ اس کے ساتھ بیٹھنا مناسب نہیں ہے۔“ ڈولی نے کہا۔ ”یہ ورشا بڑی چالاک ہے۔ جس پر چاہتی ہے اپنا قبضہ ہمارا بیٹھ جاتی ہے۔“ پھر وہ مراد کے پاس آکر اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ”ایمان! چلو تم میرے پاس آکر بیٹھو۔“

ٹینا نے مراد کا دوسرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”یہ کسی کے پاس نہیں میرے پاس بیٹھیں گے۔“ ورشا اٹھ کر صوفے پر گھٹنے فیک کر مراد سے لپٹ گئی۔ پھر بولی۔ ”میں بھی دیکھتی ہوں کس میں ہم ہے۔ میرے ایمان کو کون یہاں سے لے جائے گا۔“ جنگی بانی یہ تماشا دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ بڑے پیار سے بڑی ممتا سے کہہ رہی تھی۔ ”ان لڑکیوں کا بیچنا نہیں جاتا۔ جب دیکھو بچوں کی طرح لڑتی جھگڑتی رہتی ہیں۔“ ورشا تو پہلے لگ کر بیٹھی تھی۔ اب اچھی طرح لپٹ کر مراد کا دل دھڑکا رہی تھی اور ماں اسے پیکی کہہ رہی تھی۔ پھر وہ بڑے پیار سے ڈانٹ کر بولی۔ ”اے لڑکیو! بہت ہو چکا۔ چلو اب دھر آکر بیٹھو۔ ہمیں کام کی باتیں کرنے دو۔“ ماں نے اٹھ کر انہیں کھینچ کر وہاں سے ہٹایا پھر ورشا کا کان پکڑ کر کہا۔ ”چل چھوڑ ایمان کو۔ ادھر جا! میں یہاں

جے پور میں مراد کو جا کر پکڑے۔ یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ آپ نے میرے اعتماد کو نہیں پہنچائی ہے۔“

”تم کو اس کر رہی ہو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ میں نے ہڈن کو ایسا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔“

”آپ نہ مائیں۔ اس ایک غلطی سے ہڈن ڈیجٹرس ریٹ اور ریڈارٹ والوں کی نظروں میں آ گیا تھا۔ دشمن یہی سمجھ رہے ہیں کہ آپ اور ہڈن میرے وہاں سے آنے کے بعد مراد پر نظر رکھتے ہیں اور اس کی خفیہ پناہ گاہ سے واقف ہیں۔“

”اسی لیے آپ کو فون پر دھمکی دی گئی۔ لندن پہنچنے ہی مجھ پر حملہ کیا گیا اور کل رات ہڈن کو انہوں نے مار کر ہی دم لیا ہے۔ آپ نادان نہیں ہیں۔ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہڈن کے بعد صرف میں ہی نہیں، آپ بھی ان کے ڈیوٹی وارنٹ میں ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم جان بوجھ کر مراد کے ساتھ کانفول کے بستر پر سونے جا رہی ہو؟“

”آپ کے دل کی بات کہہ رہی ہوں۔ اب میں مراد کو ہاں نہیں چھوڑ دوں گی، اسے یہاں لے آؤں گی۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔ ”کیا کچھ کہہ رہی ہو؟“

”اس شرط پر لاؤں گی کہ آپ بجاس لاکھ حاصل کرنے کی جلدی نہیں کریں گے۔ میرے ماں بے کا انتظار کریں گے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں۔ جب تک اس کے بچے کی ماں نہیں ہوگی، ہم اس کے سر کی قیمت وصول نہیں کریں گے۔ تم کسی بھی پہلی فلاح سے انڈیا چلی جاؤ۔ میں انہی ٹکٹ او کے کرتا ہوں۔“

وہ فون بند کر کے زیر لب بولی۔ ”وہ میرا قد آور مراد ہوگا۔ تب اسے چارے لاؤں گی۔ بونا ہوگا تو ایسا ہاتھ ماروں گی کہ کھڑے کھڑے زمین میں دھنس جائے گا۔“

اس نے تھوڑے وقت میں قد آور مراد کو دیکھا پھر اس کے نمبر بچے کے دل کہہ رہا تھا کہ وہ اس بار قد آور کی آواز سنے گی لیکن دوسری طرف سے ٹیپ چل رہا تھا۔ ایک ٹریلی آواز کہہ رہی تھی کہ کسی وجہ سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔

اس نے آدھے گھنٹے بعد کال کی پھر وہی آواز سنائی دی۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ کبھت بونا کو بھی ہوسم بدل کر بولتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ڈائریکٹر جنرل نے اسے فون پر کہا کہ اسے دوسرے منج آٹھ بجے کی فلاح سے جانا ہے۔ اس کی سیٹ او کے ہو گئی ہے۔

رہی تھی۔ لیکن وہ نہیں گھٹ رہا تھا۔ پہاڑ کو تصور میں تنکا ہٹانے سے وہ تنکا نہیں بن جاتا۔ مراد قدم بلند ہوا تھا اور اس کے حواس پر چھار ہاتھ۔

وہ زیر لب بڑبڑاتی۔ ”نہیں۔ وہ بونا کوئی بہرہ دہ ہے۔ وہ پلاسٹک سرجری کے ذریعے مراد کا ہم شکل بن گیا ہے۔“

”اس کے ذہن میں سوال پیدا ہوا پھر اصلی مراد کہاں ہے؟“

اس نے ذہانت سے سوچا۔ وہ چہرہ بدل کر چھپا ہوا ہے۔ ایک بونے کے ذریعے دشمنوں کو دھوکا دے رہا ہے۔ وہ مضامین سمجھ کر بڑبڑاتی۔ ”میں جاؤں گی اور اس بونے کی گردن دیو بچ کر اصل مراد کو سامنے آنے پر مجبور کروں گی۔ وہ سچ نہیں اگلے کا تو اسے گولی مار دوں گی۔“

وہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی کہ انڈیا پہنچ کر کس طرح محتاط رہنا تھا۔ محتاط رہنے کے لیے لازمی تھا کہ مراد پر بھر سانس نہ کرے۔

اگر وہ قد آور مراد سامنے آئے گا، اس سے وقتی رکے گا تو اس کے بچے کی ماں بننے تک نہ اسے نقصان پہنچائے گی۔ نہ کسی کو پہنچائے دے گی اور اگر یہ درست ثابت ہوگا کہ کسی تاتیرک مہاراج نے اسے بونا بنا دیا ہے تو وہ اس بات پر بھر کے مراد کے بچے کی ماں بن کر نہیں ہٹے گی۔ اسے کو اپنے وجود پر یقین ہے۔ اس نے مار کے پچاس لاکھ ڈالر وصول کر لے گی۔ اس نے ڈائریکٹر جنرل جان اتھوٹی سے فون پر کہا۔ ”سر! میں ایک ہفتے کی چھٹی چاہتی ہوں۔“

جان اتھوٹی نے مسکرا کر بڑے یقین سے کہا۔ ”میں سمجھ گیا۔ انڈیا جاؤ گی۔ مراد کے پاس۔“

”آپ صرف مراد کے حوالے سے کیوں بول رہے ہیں۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کا ایک سیکرٹ ایجنٹ ہڈن مارا گیا ہے۔ میں اس کے قاتلوں کو پکڑنے جا رہی ہوں۔“

وہ بولا۔ ”ہڈن کی ہلاکت کے سلسلے میں وہاں ہمارے جاسوس تحقیقات کر رہے ہیں۔ تمہیں ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے جانے کو نہیں کہا گیا ہے اور نہ ہی میں بھوں گا۔ اب سچ بول دو انڈیا کیوں جاؤ گی؟“

”مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کی غلطی درست کرنے جاؤں گی۔“

وہ غصے سے بولا۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟“

”آپ نے مجھے بے خبر رکھ کر ہڈن کو حکم دیا تھا کہ وہ

”ہاں تمہیں یقین کرنا چاہیے۔ ایک تاتیرک مہاراج نے مجھ سے ناراض ہو کر مجھے پورے سے آدھا کر دیا ہے۔“

وہ اسے بتانے لگا کہ ششمان گھاٹ میں تاتیرک مہاراج کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ بولی۔ ”میں مانتی ہوں۔ جا دو تو نے کے ذریعے عجیب ہیبت ناک تماشے ہوتے ہیں لیکن یہ نہیں مانوں گی کہ کسی مہاراج نے تمہیں چھوٹا کر بونا بنا دیا ہے۔“

”پھر تم کیسے یقین کرؤ گی کہ میں تمہارا مراد ہوں؟“

وہ بولی۔ ”میری اور مراد کی ایسی پرستل بات بتاؤ جسے میں اور وہ جانتا ہے۔ کوئی تیسرا جان ہی نہیں سکتا۔“

وہ بولا۔ ”رات کو تمہاری میں بند کر کے کے اندر کوئی تیسرا دیکھنے نہیں آتا۔ میں تیسرا نہیں ہوں۔ تمہارے ایک ایک انداز کو بیان کر رہا ہوں۔“

وہ بیان کرنے لگا تو مرینہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ ایسی باتیں بتا رہا تھا جسے وہ جانتی تھی اور صرف مراد جانتا تھا۔

بونے نے پوچھا۔ ”کیا ہوا چپ کیوں ہو گئیں؟ مجھ سے اور کوئی سوال کرنا چاہتی ہو؟“

وہ بولی۔ ”ہماری دنیا میں بہت سی ناممکن باتیں ممکن ہو جاتی ہیں۔ مجھے آتا ہے ہوگا۔ تمہیں آگے بڑھنے سے دیکھنا ہی ہوگا۔“

”آنے سے پہلے یہ اچھی طرح سن لو۔ میں نے اب تک کسی کے سامنے اعتراف نہیں کیا ہے کہ میں مراد ہوں۔ یہاں میرے حمایتی مجھے ایک سیدھی سادی سی زندگی گزارنے والا بونا ثابت کرنے والے ہیں۔“

”یہ راز صرف تمہیں بتا رہا ہوں۔ تم وہاں کسی سے یہ بول کر نہیں آؤ گی کہ ایک بونے مراد سے ملنے جا رہی ہو۔ یہ کہو گی کہ تمہارا مراد بونا ہو ہی نہیں سکتا۔ کہنے کا مطلب ہے کہ تم جانے انجانے میں دشمنوں کو ساتھ لگا کر نہیں آؤ گی۔“

”مجھے نہ سمجھاؤ۔ میں تم سے زیادہ سمجھتی ہوں کہ مجھے کس طرح محتاط رہ کر وہاں آنا چاہیے۔ اپنا پناہ بتاؤ۔“

”جب یہاں از پورٹ کے باہر آؤ گی تو بتاؤں گا۔ تم بتاؤ کب آ رہی ہو؟“

”میں ٹکٹ او کے کرانے کے بعد بتاؤں گی۔“ ان کا رابطہ ختم ہو گیا۔

مرینہ خاموش فون کو ہاتھ میں لیے مراد کو تصور میں دیکھ رہی تھی اور دیکھنے کے دوران میں بار بار اس کا قد گھٹتا

بٹھوں گی۔“

وہ بیٹی کو بنا کر مراد کے پاس بیٹھ گئی۔ یوں اس ماحول میں جو بچپن پیدا ہوئی تھی وہ ختم ہو گئی۔

وہ جتنی بائی سے بولا۔ ”صرف آپ یہ راز جانتی ہیں کہ یہ عبداللہ کبڑی نہیں ہے مراد علی منگی ہے۔ ایم این اے دھرم داس بھی ہماری بہتری چاہتے ہیں۔ انہوں نے فون پر کہا ہے کہ وہ مراد کو کل قانون کے اعلیٰ محافظوں کے پاس لے جائیں گے۔ انہیں یقین دلا دیں گے کہ یہ مراد نہیں ہے۔ یہ بے چارہ سونا می سے تباہ و برباد ہو جانے والا ایک مظلوم یونا ہے۔“

کبڑی نے کہا۔ ”میں بیان دوں گا کہ چھپلے برس جو سونا می آیا تھا، اس میں میرا پورا خاندان نیست و نابود ہو گیا ہے۔ اس سمندر کی طوفان کے وقت میں ناگپور میں تھا۔ اس لیے ابھی زندہ سلامت نظر آ رہا ہوں۔“

مراد نے کہا۔ ”کوئی اس کے بیان کو جھٹلا نہیں سکے گا۔ اس کے ماں باپ اور رشتے دار اور دوست یا دشمن سچ بولنے کے لیے اس دنیا میں نہیں ہیں۔“

جتنی بائی نے کبڑی سے کہا۔ ”مراد! تم یہی بیان ابھی پریس کانفرنس میں دو گے۔ ہم عورتیں تمہاری تائید کریں گی اور پولیس کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ وہ بڑے بڑے لوگ کھیل مٹا کر دے گا۔ تو ہم اچھا کھاتے کھاتے ہو اور اب۔۔۔ گھبراہٹ میں کی چتر چھایا میں پناہ لینے آئے ہو۔“

وہ سوچ سمجھ کر پلاننگ کر رہے تھے۔ یہ طے کر رہے تھے کہ انہیں دنیا والوں سے آئندہ کیا کہنا ہے اور کس طرح قانون کے محافظوں کا اعتماد حاصل کر کے جلد ہی یہاں سے پاکستان جانا ہے۔

مراد کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے ٹھن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے چپت راؤ کی آواز سنا دی۔ اس نے پوچھا۔ ”کہاں ہو تم؟ اپنی سم بدل دی ہے۔ مجھے یہ نمبر دھرم داس نے دیا ہے۔“

مراد نے کہا۔ ”سوری میں مصروفیات کے باعث نیا نمبر دینا بھول گیا تھا۔ یہ بتاؤ کیسے فون کیا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”مرید تم سے رابطہ کرنے کے لیے مچل رہی ہے۔ تمہیں یہ بتانے کے لیے بے چین ہے کہ کل صبح آٹھ بجے کی فلاح سے آ رہی ہے۔ یہاں دہلی شام چار بجے تک پہنچے گی۔“

پھر وہ چپتے ہوئے بولا۔ ”کیوں اسے تیار ہے ہو؟ بے چاری سے دو باتیں کرلو۔“

مراد نے کہا۔ ”تم اسے بیماری کہہ رہے ہو؟ چنانچہ وہ کیسی آفت ڈھانے آ رہی ہے۔ میں اپنے طور پر سمجھ رہا ہوں کہ وہ کیا سوچ کر آ رہی ہے اور کیا کرنے والی ہے؟ بہر حال میں ابھی اس سے بات کروں گا۔“

رابطہ قائم ہو گیا۔ جتنی بائی نے پوچھا۔ ”کیوں بے چاری ہے جو آفت ڈھانے آ رہی ہے؟“

کبڑی نے کہا۔ ”اس کا نام مرید ہے۔ یہ مجھ سے پیار بھی کرتی ہے اور مجھ پر وار بھی کرتی ہے۔ میرے ذریعے پچاس لاکھ ڈالر حاصل کرنے آ رہی ہے۔“

وہ بولی۔ ”مجھ سے اس پر۔ یہاں آتو جائے ہم عورتیں اس کا بیٹا حرام کر دیں گی۔“

کبڑی نے کہا۔ ”تمہیں اتنی امیں اس عورت سے تنہا نمٹنا چاہتا ہوں۔ کیسی جگہ اس سے ملنا چاہتا ہوں جہاں کی مداخلت کے بغیر اس سے نہٹ سکوں۔“

”اس شہر کے باہر ہمارا ایک فارم ہاؤس ہے، وہاں تم اس بلا سے نہٹ سکو گے۔“

مراد نے خوش ہو کر کہا۔ ”اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی۔ آپ کا یہ بیٹا مراد علی ہی اسے یہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دے گا یا ہمیشہ کے لیے بھٹکا کر دے گا۔“

”دو خدا کا بلا ہے تو اسے تو اسے ہی کہو۔“

”وہ بڑی عجیب بلا ہے۔ ابھی ہم قید کر دیں گے کہ اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے گا۔“

”نیٹانے کہا۔“ ماتاجی! اب ہمیں چلنا چاہیے۔ دو گھنٹے بعد کانفرنس شروع ہونے والی ہے۔“

ماں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں چلو۔“

ڈولی نے کہا۔ ”ہم سب ایک کار میں کیسے سامنے گے؟ ہم چار ماں بیٹیاں ہیں اور یہ دوسرے ہیں۔“

مراد نے کہا۔ ”فکر نہ کرو۔ یہ مراد تم لوگوں کے ساتھ کار میں بیٹھے گا۔ میں پیچھے پیچھے موٹر سائیکل پر آؤں گا۔“

ورثا یہ سننے ہی باہر چلی گئی۔ جب وہ سب باہر آئے تو انہوں نے دیکھا، وہ موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر قبضہ جمائے بیٹھی تھی۔ انہیں دیکھ کر بولی۔ ”میں کار میں تنگ ہو کر نہیں بیٹھوں گی۔ اس بائیک پر ہوا کھاتی ہوئی جاؤں گی۔“

نیٹانے غصے سے کہا۔ ”دیکھو ماتاجی! یہ اتنی سچی چالاک ہے۔ ہم سے پہلے یہاں آ کر بیٹھ گئی ہے۔“

ماں نے کہا۔ ”میں نے تم سب کو بھجایا ہے جو چالاک ہوتے ہیں وہ بازی مار لیتے ہیں۔ باقی دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ چلو گاڑی میں بیٹھو۔“

مدادی

پھر وہ مراد سے بولی۔ ”بیٹے! ہم چھوٹی سی گاڑی میں ایزی ہو کر بیٹھیں گے، تم ورثا کو بائیک پر لے چلو۔“

وہ جواب سے بغیر کبڑی کی اور دو بیٹیوں کے ساتھ کار میں جا کر بیٹھ گئی۔ مراد نے پریشان ہو کر ورثا کو دیکھا۔ وہ جیسے بائیک پر نہیں اس کے سر پر بیٹھی سرکاری تھی۔

وہ موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”ایک بات تمہیں سمجھا دوں کہ میں لڑکیوں سے دوستی نہیں کرتا۔“

وہ بولی۔ ”میں بھی کسی کو منہ نہیں لگاتی۔ دوستی تو ہوتے ہوتے ہو جاتی ہے۔“

کار آگے چل پڑی تھی۔ اس نے کلک مار کر بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے سوچا۔ ایک کلک اسے ماروں گا تو پیچھے لگ کر بیٹھنا بھول جائے گی۔ وہ بولا۔ ”پلیز ڈرال الگ ہو کر بیٹھو۔“

یہ کہہ کر اس نے بائیک آگے بڑھائی تو وہ جھٹکا کھا کر اس سے لپٹ گئی۔ ”ہائے میں کیا کروں؟ تمہیں کس کے نہیں پڑوں گی تو گر پڑوں گی۔“

اس نے تو ابھی طرح کس لیا تھا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ اس سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مجھے چھوڑ دو اور گر پڑو۔

بلا میں اسی طرح نازل ہوئی ہیں۔ بائیک تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ آگے دھمکی سرد ہوا میں تھیں۔ پیچھے جون

چلائی کی گئی تھی۔ جب وہ موٹر سائیکل پر لپٹا تو اس کے منہ دو عالم موم بیک وقت ٹھکڑے ہو گئے۔ ورثا کے منہ کو اور اس کی صحت مندی کو متعارف کر رہے تھے۔

وہ دل میں کہہ رہا تھا۔ ”یا اللہ! اس سے پہلے کہ میں ڈمگاؤں یہ گاڑی ڈمگا جائے۔ مجھے یہ نظر آ رہا ہے کہ کوئی حادثہ ہوگا تب ہی یہ الگ ہوگی۔“

اس کی دعا قبول ہو گئی۔ حادثہ تو نہیں ہوا۔ کچھ اور ہو گیا۔ آگے جانے والی کار رک گئی تھی۔ وہ خود نہیں رکی تھی۔ اسے دو گھنٹوں نے آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔

مراد ان سے کچھ دور تھا۔ اس نے اپنی گاڑی روک کر ورثا سے کہا۔ ”فورا کسی دکان میں جا کر چھپ جاؤ۔ تم دیکھ رہی ہو لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ ابھی گولیاں چلنے والی ہیں۔“

وہ اپنے بیٹی کوٹ سے ایک پتوں نکالتے ہوئے بولی۔ ”ماتاجی نے ہمیں بھاگنے اور چھپنے کی نہیں مقابلہ کرنے کی تربیت دی ہے۔“

مراد نے مسکرا کر اپنا رپورٹ نکال لیا۔ ادھر دو گھنٹوں میں کار کی اگلی دو کھڑکیوں پر آکر جگہ کر اندر کھڑے تھے۔ جتنی بائی ڈرائیونگ سیٹ پر تھی۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر عبداللہ

کبڑی تھا۔ پیچھے دو بیٹیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک گن میں نے کہا۔ ”تم نے پریس کانفرنس بلانی ہے۔ کیا ارادہ ہے؟ اس بوئے مراد کا قانونی طور پر سیکچر رتی دینے کی باتیں کرنے والی ہو؟“

وہ بولی۔ ”ہاں۔ کیا مجھے یہ نیک کام نہیں کرنا چاہیے؟“

”نضر و کرو۔ اس طرح یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ یونا ہی اصلی مراد علی منگی ہے۔ چنانچہ کس طرح یونا میں گر نہیں الجھا رہا ہے۔“

کبڑی نے کہا۔ ”میں مراد کا مکمل شکل ہو کر مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔ میں باہر آ رہا ہوں مجھے اچھی طرح دیکھ لو۔ میں نے زندگی میں بھی بندوق نہیں پکڑی۔ مراد علی منگی کیسے بن جاؤں گا۔“

وہ دروازہ کھول کر باہر آیا۔ گویا سپاہی میدان میں اتر آیا۔ ایک گن میں نے اس کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ”ہماری گاڑی میں بیٹھو۔ ہم تمہیں لے جا کر تمہاری اصلیت معلوم کریں گے۔“

اسی وقت فائرنگ کی آواز کے ساتھ گن میں کے حلق سے کراہ نکلی، اس کے ہاتھ سے گن نکل گئی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے گیا۔

مراد انہیں ہانک کر بلاتا تھا۔ قانون کے حکم سے آکر ان سے سننے والے تھے۔ دوسرا گن میں مکمل جگہ سے بھاگ کر کہیں چھپ کر دیکھنا چاہتا تھا کہ گولی کہاں سے چلائی گئی ہے۔ کبڑی نے اچھل کر اس کی ٹانگ پر ایک لالت ماری تو اس کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ ادھر سے منہ پڑا۔ اسی لمحے میں ورثا نے ایک گولی ٹھونک دی۔

لڑکیاں بڑی تیز تھیں۔ جتنی بائی نے اچھی ٹریننگ دی تھی۔ کار کے پیچھے حصے میں بیٹھی ہوئی بیٹا اور ڈولی دروازے کھول کر چھلانگیں لگاتی ہوئی دشمنوں کے پاس آئیں۔ وہ پہلے ہی نیم مردہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے دو چار ٹھوکریں ماریں تو وہ زمین پر ہی پڑے رہ گئے۔

پھر ہر طرف سے لوگ دوڑتے ہوئے آنے لگے۔ اب انہیں ڈر نہیں لگ رہا تھا کیونکہ گولیاں چلانے والے قابو میں آگئے تھے۔ پولیس کی ایک گاڑی سائرن بجاتی ہوئی آگئی۔

جتنی بائی کو سب ہی جانتے تھے۔ کتنی پولیس کے افسر نے پوچھا۔ ”مائی! انہوں نے آپ پر ایک کیوں کیا تھا؟“

وہ بولی۔ ”آپ انہیں لے جائیں۔ میری پریس کانفرنس کا وقت ہو گیا ہے۔ میں دو چار گھنٹے بعد تھانے آکر بیان دوں گی یا ہو سکے تو آپ پریس کانفرنس میں آجائیں۔“

یہی رومانجک جگہ ہے۔ وہاں کوئی روکتا ٹوکتا نہیں ہے۔ ہمیں بڑی آزادی ہوگی۔“

مراد نے مسکرا کر کہا۔ ”تم بڑی وہ ہو۔ چلو اندر جاؤ۔ پارکنگ ایر یا میں گاڑی کا ٹوکن لے کر آتا ہوں۔“

اس نے جواب سے بغیر ٹائیک آگے بڑھائی۔ ڈولی کھڑی ہوئی تھی، ہاتھ ہلا کر بولی۔ ”پارکنگ ادھر ہے ادھر کہاں جا رہے ہو؟ سنو تو۔ ارے کہاں جا رہے ہو؟“

وہ رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ اس کے دیدے حیرت سے پھیل گئے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ مسکے میں ڈوبے ہوئے شباب کو چھوڑ کر جا رہا تھا۔ وہ تمام راستے بھرے بھرے بدن کا تعارف پیش کرتی آرہی تھی۔ وہ پھر بھی نہیں پکھلتا تھا۔

مراد نے ایک جگہ موٹر سائیکل روکی پھر فون پر بھنی بانی سے کہا۔ ”آپ کی بیٹیاں بڑی شوخ اور چھل ہیں۔ آپ نے ورشا کو دیکھا تھا۔ اس نے کیسے میری پائیک پر قبضہ کر لیا تھا۔“

بھنی بانی ہنستے ہوئے بولی۔ ”نادان ہیں۔ ابھی ان کے ہنسنے کی عمر ہے۔“

”میں ہاں۔ ڈولی ہنسنے کیلئے ہوئے مجھے راستے سے ہٹا کر ایک پارک میں لے گئی تھی۔ یہاں کسی نہیں سمجھتا رہی تھی جبکہ مجھے کانفرنس اٹینڈ کرنی تھی۔“

”میں ابھی ڈولی کے کان پکڑتی ہوں۔ فون اسے دو۔“

”میں اسے پارک کے سامنے چھوڑ کر بھاگ آیا ہوں۔“

”یہ تم نے بہت ہی اچھا کیا۔ ابھی نادان ہے بچا ہے۔ ایسی سزا ملے گی تو عقل آئے گی۔“

”وہ بچی تو راستہ جانتی ہے۔ یہ بچہ نہیں جانتا۔ یہاں اندر راؤڈ کے فٹ پاتھ پر کھڑا ہے۔“

”انتظار کرو۔ پریشان نہ ہوتا۔ ابھی کسی کو بھیج رہی ہوں۔ وہ جہیں یہاں لے آئے گا۔“

وہ انتظار کرنے لگا۔ اس نے صبح کے بعد پھر ماروی سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ حالات اتنی فرصت ہی نہیں دے رہے تھے۔ وہاں فٹ پاتھ پر ٹریفک کے شور میں بات کرنا مناسب نہیں تھا لیکن دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ اسے یاد کرتے ہی رنگ ٹون بڑے پیار سے گنتانے لگی۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گزشتہ ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیے

سہی زخمی ہونے والے پھر محل کو اٹھا کر اپنی گاڑی میں ڈالنے لگے۔ بیٹھ چھٹنے لگی۔ بھنی بانی مراد اور کپڑی اپنی گاڑیوں کی طرف آئے تو ورشا ٹھٹک گئی۔ ڈولی اس سے پہلے آکر موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھ گئی تھی۔ مراد نے پریشان ہو کر کہا۔ ”یک نہ خد دو خد۔ دل میں ہو رہی ہے عہد بد۔ کہاں بھاگ کر جاؤں۔“

ورشا نے پاؤں جھٹکتے ہوئے آکر کہا۔ ”ڈولی! ابھی یہاں سے۔ یہ میری جگہ ہے۔“

ڈولی نے کہا۔ ”حکومت کرنے والے گدی چھوڑتے ہیں تو دوسری حکومت آکر بیٹھ جاتی ہے۔ آئی چیف یو۔۔۔ تم مجھے یہاں سے ہلانیں سکوگی۔“

ماں نے اپنی کار کے پاس سے آواز دی۔ ”ورشا! یہاں آکر بیٹھو۔ تم شائد کرو۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“

ورشا نے حسرت سے مراد کو دیکھا۔ پھر غصے سے پاؤں جھٹکتی ہوئی کار میں بیٹھنے چلی گئی۔ کار اور موٹر سائیکل کا قافلہ وہاں سے چل پڑا۔ مراد نے لگ مار کر بڑی بھولت سے بڑے آرام سے بائیک آگے بڑھائی۔ پھر بھی وہ جھٹکا کھا کر اس سے لپٹ کر بولی۔ ”کیسی لگتی ہوں؟“

وہ مٹھائی سے کیا بولے کہ بہت مٹھی ہو۔ مٹھائیں سے کیا بولے کہ مٹھائی دی ہو۔ اسے یہ حالت میں تو بڑے بڑے بار سائی تو بیٹھوڑ دیے ہیں۔ وہ بہت ہی ملال اور سر بھری تھی۔ تو پر کرنے کے باوجود مراد کے ہوش اڑ رہے تھے۔ جی میں آ رہا تھا گاڑی کو کیسں ٹکرا ہی دے۔ تب ہی نجات ملے گی۔ ویسے ایمان کی بات ہے۔ خدا اگر بچاتا ہے تو پہلے اپنے بندوں کی پارسائی کو آزما تا بھی ہے۔ مرینہ موزیکا پریمنا لیز اور شا اور اب ڈولی وہ ہر آزمائش مرحلے سے پارسائی کا بھرم رکھتا آ رہا تھا۔

آگے ٹریفک کا اتنا جھوم تھا کہ بھنی بانی کی کار دور تک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ مراد نے پوچھا۔ ”وہ اس چوراہے سے دائیں گئے ہیں یا بائیں یا ہمیں سیدھا جانا ہوگا؟“

ڈولی نے کہا۔ ”بائیں طرف چلو۔“

وہ ادھر چل پڑا۔ آگے گاڑیاں کم تھیں۔ راستہ صاف تھا لیکن ان کی کار دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے سڑک کے کنارے رک کر کہا۔ ”وہ کدھر گئے ہیں؟“

ڈولی ہنستے ہوئے بولی۔ ”انہیں تو کانفرنس اٹینڈ کرنا تھی۔ ہم وہاں جا کر کیا کریں گے۔ دیکھو ہم ٹھیک پارک کے پاس آکر رکے ہیں۔ بڑا خوبصورت پارک ہے۔ کئی جگہ جھاڑیوں کے درمیان لوا سپاٹ بنائے گئے ہیں۔ بہت



پہلے آئیے

مفتی رامام

عجب دستور ہے چاہے آپ حقدار ہوں یا نہیں، بس پہلے آئیے، پہلے پائے کے مطابق مطلوبہ چیز آپ کے حصے میں آجاتی ہے۔ یہی غم اس کے لیے کسی ناسور سے کم نہ تھا جس کی آرزو میں وہ زندگی کے دن کم کر پاتا تو وہی کسی اور کی تمنا بن کر اس سے دور ہو گئی تھی فقط اسی عجب دستور کے مطابق۔

وقت کو کارآمد کرنے والے ایک بے وقوف عاشق کا اگلا سفر

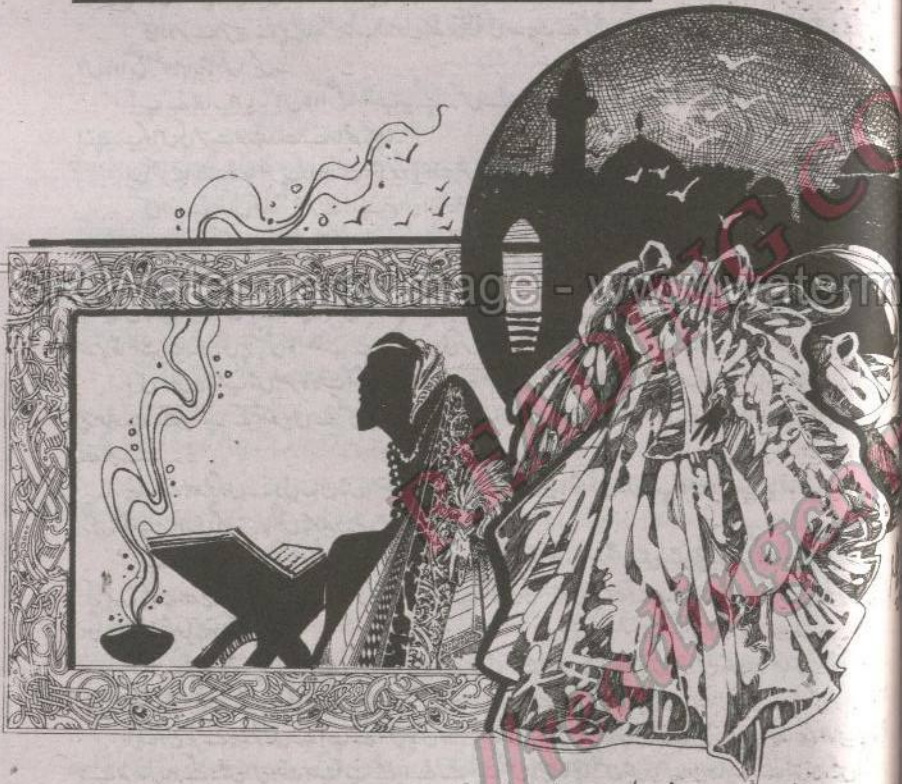
آپ نے فلموں میں ضرور دیکھا ہوگا۔ اس قسم کے سین ہر فلم میں ہوا کرتے ہیں جب فلمی تاب رہتے ہیں لیکن ظالم سماج و بوار بن کر دونوں کے درمیان کھڑا ہو جاتا ہے پھر ہیر و دعا مانگنے کی مزار پر پہنچ جاتا ہے۔ تو ابی ہو رہی ہوئی ہے جو پانچ منٹ تک جاری رہتی ہے۔ ہیر و اس دوران میں آنکھیں بند کیے کوئی دعا مانگ رہا ہے۔ قوالی ختم ہونے پر جب آنکھ کھولے تو ہیر و دن سامنے کھڑی نظر آتی ہے۔ اس قسم کے سین ہر فلم میں ہوا کرتے ہیں جب فلمی رائٹر کی سمجھ میں نہیں آتا کہ دونوں کو کس طرح ملوایا جائے تو وہ قوالی اور مزار کا سہارا لیتا ہے۔ یہ ابتدائی جوانی کی بات ہے۔ میں ایک لڑکی کے عشق میں پری طرح گرفتار ہو گیا تھا۔ وہ بہت شوخ قسم کی لڑکی تھی لیکن ہی خوبصورت ویسے یہ

اما ابو العباس

زیاتیم بلگرامی

زبانوں میں تاثیر اور دعائوں میں اثر بلا جواز نہیں... اس کے لیے بڑی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے... اور جو لوگ ان ریاضتوں کو اپناتے ہیں گویا اپنا آرام تیج کراڑ مائنشوں سے بھرے رستے کا انتخاب کرتے ہیں۔ آپ کا شمار بھی انہی اولیائے کرام میں ہوتا ہے جو اللہ کی رضا میں راضی رہتے ہیں اور جن کی رضا سے اللہ رب العزت خوش ہوتا ہے۔

راہ حق کی عنایتوں اور کرامتوں کا قصہ



مصر کے مشہور زانہ صوفی شیخ ابوالحسن شاذلی علم کا سمندر تھے۔ ان کے مریدوں اور ارادت مندوں میں ابوالعباس واحد وہ شخص تھے جنہیں شاذلی کے علم کا وارث قرار دیا گیا۔ شاذلی نے کوئی کتاب بھی نہیں لکھی لیکن اس کے باوجود ان کی تعلیمات محفوظ ہیں اور حفاظت کا یہ کام احمد ابوالعباس مرسی نے انجام دیا اور بعد میں انہیں سیدی امام احمد ابوالعباس کہا جانے لگا۔ شیخ ابوالحسن شاذلی سے کی گئی سوال کیا۔

... کہ وہ لڑکی اپنے ٹیوٹر سے محبت کرنے لگی ہے جو اصولوں کے سراسر خلاف ہے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ دعا میں نے مانگی اور فائدہ کسی اور کو ہوجائے۔

اور اسی وقت کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا وہی ٹیوٹر میرے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ”تم؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”تم یہاں کیوں آئے ہو؟“

”تم آؤ میرے ساتھ۔“ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔“

وہ مجھے قبر والے کمرے سے باہر لے آیا۔ احاطے میں اور بھی کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہ مجھے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر لے آیا۔ وہ بڑی نفاست سے سجا ہوا کمرہ تھا۔ چاروں طرف کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ گاؤں کی لگے ہوئے تھے۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ ”میں نے تمہارا شکوہ تمہارے پیچھے کھڑے ہو کر سن لیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”لیکن تم کیا ایسی کمرے میں رہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں یہ میرا کمرہ ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اور اس حمار کے چوڑوں اور سولی میں رہتا ہوں۔“

”لیکن تم تو ٹیوٹر ہو۔“ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ایک متولی کا بیٹا ٹیوٹر نہیں ہو سکتا!“ اس نے کہا۔ ”میں نے تمہارا شکوہ سن لیا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ صغیر مجھ سے محبت کرتی ہے۔“ ”ظاہر ہے صاحب حمار سے تمہاری رشتہ داری جو نکل آئی ہے۔ وہ تمہارا ساتھ نہیں دیں گے تو کس کا ساتھ دیں گے؟“

”یہ بات نہیں ہے بے وقوف۔ خود اندازہ کر لو، جب میں دن رات یہاں رہتا ہوں تو میں نے اس محبت کے لیے بہت پہلے سے دعا مانگی ہوگی۔ میری درخواست صاحب حمار کے پاس بہت پہلے پہنچی ہوگی۔“

اس کی یہ بات ایک لمحے میں سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ خٹک ہی کہہ رہا تھا۔ ہر جگہ پہلے آؤ پہلے پاؤ کا اصول چلتا ہے۔ اس معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ پھر کیا تھا، میں اٹھا اور دوسری سمت قدم بڑھا دیے۔ اسی لیے شاید اللہ نے اس کائنات میں چاروں جانب رستے ہی رستے بنائے ہیں۔ چاہے جس جانب نکل جاؤ۔

”بھائی تمہارا مسئلہ بھی تو ایسا ہے جتنا گڑبگڑا لوگے اتنا میٹھا ہوگا۔“ بابر علی نے بتایا۔

”چلو خٹک ہے میں کوشش کرتا ہوں۔“ بہر حال کسی نہ کسی طرح میں نے ایک دیگ غریبوں میں تقسیم کر دی۔ دو چار نے تو بہت دل کھول کر دعائیں دی تھیں جن سے یہ امید ہو گئی تھی کہ شاید میرا کام بن جائے گا۔ وہ ظالم مہربان ہو جائے گی۔ لیکن کچھ نہیں ہوا۔ وہ ظالم مہربان ہونے کے بجائے اور بھی سخت ہوتی چلی گئی۔ خواہ وہ بابا کے مزار پر جا کر میں خوار ہوتا رہا یا تو فلوں وغیرہ میں سب جھوٹ دکھاتے ہیں یا پھر کوئی اور بات ہوگی۔

اس لڑکی کا اس ٹیوٹر کے ساتھ کچھ چلتا رہا۔ دونوں کو خود میں نے نئی بار ایک ساتھ دیکھا تھا۔ لڑکی اس کے ساتھ چلتے ہوئے جیسے اس پر قربان ہوئے جا رہی تھی۔ بابر علی نے ایک دن مجھ سے کہا۔ ”بھائی میرا مشورہ ہے کہ تم اب اسے بھول جاؤ۔ تم محبت کے معاملے میں زبردستی تو نہیں کر سکتے۔“

”لیکن میں بابا کے مزار پر جا کر کٹھوہ ضرور کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی کہ اتنی خوشامدوں کے باوجود مجھے کچھ نہ ملے۔“

”تمہاری مرضی۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری دعاؤں میں غلطی شامل نہ ہو۔“

”جو اس مت کرو۔ میری دعا میں سوائے غلطوں کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔“ بابر علی نے مجھے منع بھی کیا تھا لیکن میں پھر دوسرے دن مزار پر پہنچ ہی گیا۔ میں صبح کے وقت گیا تھا اس وقت لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ مزار پر سوائے میرے اور کوئی بھی نہیں تھا۔ مزار کے مجاور اور گراں حضرات بھی اپنے اپنے کمروں میں تھے۔

میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ب آواز بلند یوں شروع کر دیا۔ ”بابا بہت پریشان اور مایوس ہو کر یہ شکوہ کر رہا ہوں۔ بابا آپ لوگ تو اللہ کے بہت پیارے بندے تھے اسی لیے آپ کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ کچھ دنوں پہلے میں نے آپ کے پاس صغیر نام کی ایک لڑکی کے لیے دعا کی تھی جس کے باپ کا نام غیاث الدین ہے۔ میں نے کہا تھا کہ آپ اس لڑکی سے میری محبت کا بندوبست کروادیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔“

”بابا میں نے ہزاروں فلوں میں ایسی صورت حال دیکھی ہے کہ دعا ختم نہیں ہوتی کہ محبوب سامنے آ جاتا ہے لیکن میرے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہو رہا؟ ایک بات اور بتا دوں

اس شخص نے جواب دیا۔ ”حضرت! آپ کو مکاشفے میں کیا نظر آیا؟ حالانکہ میں اتنی ہی بات کا گناہ کار ہوں کہ آج جب میں دربار شاہی سے آ رہا تھا تو میں نے ایک موٹر پر بڑی حسین عورت دیکھی۔ اس کا گدرا یا ہوا شاپاں اور جسم اور لباس سے اٹھتے ہوئے جوش اور مستی مجھے دھڑکتے عصیاں دے رہے تھے۔ اس عالم میں، میں نے بے اختیار خواہش کی اے کاش یہ مجھے مل جاتی اور میں اس کو نصرف میں لاسکتا۔ پھر مرشد! اگر آپ اس کو بدکاری تصور فرماتے ہیں تو میں واقعی گناہ کار ہوں۔“

ابو العباس نے تنبیہ کی۔ ”اول تو اپنی نظریں نیچی رکھا کرو اور جب تجھ کو اپنے آپ پر اتنا اختیار ہو جائے کہ خیالات اور تصورات بھی تیرے تابع ہو جائیں، اس وقت سر اٹھا کر چلنے میں کوئی حرج نہیں۔“

کسی مرید نے آپ کو یوں سرگوشی میں باتیں کرتے جو دیکھا تو دوسرے سے کہا۔ ”معلوم نہیں ابو العباس اس شخص کو کیا سمجھا رہے ہیں۔ اگر کوئی ایسی بات بتا رہا ہے تو اس اچھی بات سے دوسروں کو بھی آشنا کرنا چاہیے اور اگر کوئی بری بات کر رہے ہیں تو بری بات ان کو زیب نہیں دیتی۔“

آپ نے اس مرید کو آواز دی۔ ”اے مقترض! ذرا میرے پاس تو آ۔“

وہ شخص آپ کے قریب چلا گیا۔ آپ نے کہا۔ ”اے شخص! خدا تجھ کو پسند نہیں کرتا۔ اگر میں دوسروں کے راز کھولنا شروع کروں تو اس مجلس کے کتنے ہی چہرے شرم اور ندامت سے جھک جائیں گے اور کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہیں گے۔ خدا سدا العیوب ہے۔ خدا نے اپنی یہ صفت اپنے بندوں میں بھی رکھ دی ہے۔“

اس شخص نے کہا۔ ”پھر مرشد! میں اپنی بات پر شرمندہ ہوں، مجھے معاف کر دیجیے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں کیا معاف کروں گا، معاف کرنے والا تو اللہ ہے، اس سے معافی مانگ۔“

اس شخص کے ہاتھ میں بڑی سی پوتی تھی۔ اسے آپ کے سامنے رکھ دیا، بولا۔ ”حضرت! اس وقت میں اس لیے حاضر ہوا تھا کہ آپ کو چند روز سے میرے کچن میں کھاناؤں۔ آپ اسے قبول فرمائیں اور میرا دل رکھنے کے لیے میرے سامنے ہی اس کو تناول فرمائیں۔“

آپ نے پوتی کھانوی تو اس میں سے کباب، گوشت، روٹیاں اور پھولیں نکلیں۔ آپ نے ان چیزوں کی طرف ہاتھ بڑھایا تو قریب موجود لوگوں نے ایک عجیب و غریب مہم تشدد دیکھا۔ ابو العباس کی پانچوں انگلیاں بچھ کر کہیں۔ بالکل ایسا لگا کہ گویا انگلیوں کی ساری ریں متحرک ہو گئی ہیں۔

آپ نے کھانے پر سے ہاتھ کھینچ لیا اور اس شخص سے پوچھا۔ ”میں یہ کھانا نہیں کھا سکتا اگر کھانے سے پہلے میں تجھے سے چند سوال کروں گا۔ تو ان کے صحیح جواب دے گا کیونکہ تجھ جی تو اس میں ہی تیری نجات ہے ورنہ میں تجھ سے دست کشی اختیار کر لوں گا۔“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”حضرت! میری یہ حال کہ میں آپ سے غلط بیانی کروں۔ میں اگر جھوٹ بول بھی دوں گا تو آپ اس جھوٹ کا اپنے شرف سے پتا چلائیں گے۔ اس لیے جھوٹ کا فائدہ؟ آپ جو چاہیں پوچھیں، اللہ نے چاہا تو میں سچ ہی بولوں گا۔“

آپ نے پوچھا۔ ”سچ بتا، کیا یہ کھانا تیرے گھر کا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”حضرت! سچ بات تو یہ ہے کہ میرے ایک دوست نے میری دعوت کی تھی۔ میں دعوت میں گیا لیکن کھانا نہیں کھایا اور وہ کھانا لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اب آپ تناول فرمائیں گے تو مجھے خوشی ہوگی۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اے شخص! اپنا یہ کھانا واپس لے جا کیونکہ درویش مشیت کھانا نہیں کھا سکتے۔“

اس شخص نے کہا۔ ”حضرت! مشیت کھانا کیسا؟ یہ بالکل سچ ہے۔ میں آپ کو کھانے کی پاکیزگی کا یقین کس طرح دلاؤں؟“

آپ نے فرمایا۔ ”اگر تو اس پر مصر ہے کہ میں تیرے میزبان کی قلمی کھول دوں تو سن، تیرا میزبان شراب کا کاروبار کرتا ہے۔ اس کا رو بار کی کمائی تجھ پر اور میرے خنوں پر حرام ہے لیکن تم پوچھ سکتے ہو کہ میرے بیٹے کہاں ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ میرے سعادت مند اور صالح مرید ہی میری اولاد ہیں۔“

اس شخص نے سر جھکا لیا اور آہستہ سے پوچھا۔ ”حضرت! مجھے تو بس یہ بات بتائیے کہ آپ نے یہ کس طرح معلوم کر لیا کہ یہ کھانا مشیت ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”جب میں نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو تونے میرے ہاتھ اور انگلیوں میں کوئی تبدیلی محسوس کی تھی؟“

مرید نے کہا۔ ”جی ہاں، میں نے آپ کے ہاتھ، انگلیاں اور ان کے اعصابی نظام کو درہم برہم اور کانپتے ہوئے دیکھا تھا۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوا تھا؟“

”حضرت! آپ زندگی بھر جو کچھ فرماتے رہے یا تعلیم دیتے رہے، اسے اگر تحریر بھی فرما جاتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”کون کہتا ہے کہ میں نے اپنے پیچھے کتا نہیں چھوڑی؟“

سوال کرنے والے نے عرض کیا۔ ”مگر آپ نے کتا نہیں صنف کی ہیں تو ان کا مجھے علم نہیں ہے اور میں اپنے سوال پر شرمندہ ہوں۔ براہ کرم اپنی تصانیف سے مطلع فرمائیے تاکہ ان سے مسلسل اور مستقل فیض حاصل کیا جائے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اے شخص! میری کتابیں میرے اصحاب ہیں اور ان میں احمد ابو العباس میری مستقل، جامع اور شرح تصنیف ہے۔ میری بہت سی باتیں اور تعلیمات ابو العباس کے ذریعے ہی سمجھی جاسکتی ہیں۔“

شاؤلی کی وفات کے بعد کسی مرید نے ابو العباس سے پوچھا۔ ”ابو العباس! پھر مرشد فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کا ولی، اللہ کے ساتھ اس طرح رہتا ہے جس طرح شیرنی کا بچہ شیرنی کی گود میں۔ آخر اس کا مفہوم کیا ہے؟“

ابو العباس نے جواب دیا۔ ”اللہ کا ولی، اللہ کے ساتھ طمانیت اور سکون سے رہتا ہے۔ اس کو حرص، طمع، شہرت و نمود اور دوسرے نفسانی مسائل و رغلائے رہتے ہیں مگر اللہ اس ولی کی حفاظت کرتا ہے جس سے وہ ولی، اشرار دنیا سے محفوظ رہتا ہے بالکل شیرنی کی طرح جو اپنے بچے کو بھی گود رکھتا ہے یا پھسلانے والے کے حوالے نہیں کرتی۔“

کسی دوسرے مرید نے پوچھا۔ ”جناب! رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پیچھا نہ لیا نہ خود کو پیچھا، اس کا واضح مفہوم اشراف مائیں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو اس کی خواری اور عاجزی کے ساتھ پیچھا، اس نے اپنے رب کو اس کی عزت اور قدرت کے ساتھ پیچھا۔“

ان اشتریحات نے حاضرین کو جوش میں مبتلا کر دیا اور ہر طرف سے بحان اللہ، جزاک اللہ کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔

کسی اور نے سوال کیا۔ ”حضرت! ایک سوال اور۔ حضرت شاؤلی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ کسی ولی کی حقیقت کھول دی جائے تو وہ پوچھا جائے لگتا ہے۔ آخر اس کا کیا مطلب ہے۔ کیا ولی کی پرستش جائز ہے یا یہ گمراہی ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں پوچھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ تعبدوا لی اللہ (اللہ تعالیٰ کی تعبد کرو) اس کا اور مطلب ہے کہ شیطان تمہیں جس چیز کا حکم دے وہ تم نہ مانو، بلکہ شیطان کی اطاعت یا عدم اطاعت ہے۔ ولی کی پرستش کا مطلب ہے اس کی پیروی کرنا، اس کی اتباع کرنا۔“

انہی سوال و جواب میں عصر کا وقت آ گیا۔ نماز کی صفیں قائم ہوئیں اور ابو العباس کو امامت کے لیے کھڑا کیا گیا۔ جب وہ نماز پڑھا رہے تھے تو آپ کے مقتدیوں نے کسی ارادے کے بغیر ہی دیکھا کہ ابو العباس کا جسم نور سے بھر گیا اور ان پر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے۔

نماز کے بعد لوگوں نے دلی زبان میں استفسار کیا۔ ”حضرت! یہ نور کیا تھا جس میں آپ کا وجود چھپ گیا تھا اور وہ بارش کسی تھی جو آپ پر ہو رہی تھی..... بالکل پھواری کی طرح؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اگر تم لوگ اپنے سوال کا جواب چاہتے ہو تو سنو، وہ نور جس میں، میں چھپ گیا تھا اور وہ بارش جو پھواری کی طرح مجھ پر ہو رہی تھی، شرح، تفسیر اور معانی و مطالب کی تھی۔ اگر ان کی تجسیم کی جائے تو میرے عزیز و! ان کی شکل یا تو نور کی طرح ہوگی یا پھر بارش یا پھواری کی طرح۔“

لوگوں نے حقیقت طور پر شاؤلی کے اس قول کی تائید کی کہ میری کتابیں میرے اصحاب ہیں اور ان میں ابو العباس میری مستقل، جامع اور شرح تصنیف ہے۔ میری بہت سی باتیں اور تعلیمات ابو العباس کے ذریعے ہی سمجھی جاسکتی ہیں۔

ایک دن فجر کے بعد لوگوں نے آپ کے آس پاس ہجوم کیا اور سوالات کی بھرمار کر دی۔ آپ ان کے سوالات کے جواب دیتے دیتے نڈھال ہو گئے۔ عین اس وقت جب آپ اٹھنے والے تھے، ایک شخص ہانپتا ہانپتا مجلس میں داخل ہوا اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

آپ نے اپنے ایک مرید سے کہا۔ ”تو اس شخص کو بلاؤ۔“

ایک مرید نے اس شخص کو کٹھانے سے پکڑ لیا اور عرض کیا۔ ”بھائی! تجھے ابو العباس یا فرماتے ہیں، ذرا حمت کر۔“

وہ شخص آپ کے پاس آکھڑا ہوا۔ آپ نے اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا۔ ”اے شخص بتا، میں تیرا راز اپنا راز سمجھوں گا۔ خدا تجھ پر رحم کرے آن تو نے جو کچھ کیا ہے، اس میں ذرا کاشائے پایا جاتا ہے۔ آخر کیا ہے؟“

امیر کے دوست نے اس پر بے وقوفی سے عبرت پکڑی مگر اس کے دل کے کسی گوشے میں اب بھی یہ شبہ بیٹھا ہوا تھا کہ ابوالعباس بننے زیادہ ہیں، اتنے میں نہیں چنتا ان کے مریدوں اور عقیدت مندوں نے انہیں شہور کر رکھا ہے۔ اس کے دل میں آپ کو دیکھنے اور باتیں کرنے کی بڑی خواہش تھی چنانچہ وہ اسکندریہ سے قاہرہ پہنچا اور آپ کی مجلس میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ آپ وعظ فرماتے رہے۔ آپ نے دوران وعظ فرمایا۔

”لوگو! سونپنی اچھی بات نہیں ہے۔ جب تک تم خود کی شخص کے بارے میں ذاتی طور پر تعریف یا تردید نہ کرو اس کے متعلق حکمت سوچو۔“

اس انجمن کو ایسا محسوس ہوا گویا وہ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں، اس کے لیے اور اس کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں۔ آپ فرما رہے تھے۔

”اتفاق سے اس مجلس میں وہ شخص بھی موجود ہے جس نے اسکندریہ کے امیر کو رخلا کر مجھ سے لڑا دینا چاہا تھا۔ جو میرا امتحان لینا چاہتا تھا۔ فقراء کے منصب میں امر اکی اور باروداری شامل نہیں ہے لیکن اس شخص نے امیر اسکندریہ کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ مجھ پر بے جبر پابند چلا جائے۔ دربار میں طلب کر کے میرا امتحان لے۔ میں کچھ ہوں یا نہیں اس سے اس شخص یا اسکندریہ کے امیر کو نہ تو کوئی فائدہ پہنچتا اور نہ نقصان مگر یہ دونوں پھر بھی درپے آزار تھے۔“

اب یہ شخص خاموش نہ رہ سکا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور آپ کے سامنے مودب کھڑا ہو گیا اور عرض کیا۔ ”حضرت! آپ اپنی تقریر میں جس شخص کا ذکر فرما رہے ہیں، وہ میں ہی ہوں۔ میں اپنی غلطی پر تادم ہوں۔“ پھر حاضرین مجلس کی طرف منہ کر کے کہا۔ ”لوگو! یہ شخص بے وقوف کر رہا ہوں کہ فیض تو خدا کی دیا ہے اور جو کچھ بھی کہتا ہے ربانی مدد کے فیض سے کہتا ہے۔ آج میں تو یہ کہہ کر آپ کی مجلس میں شامل ہو رہا ہوں اور اس طرح شامل ہو رہا ہوں کہ اب یہاں سے نہیں اور جانے کا میں خیال تک نہ لائوں گا۔“

آپ کی ضرورت سے اسکندریہ جا رہے تھے۔ راستے میں اسکندریہ سے پہلے جس شہر میں قیام کیا، اس کے امیر نے آپ سے ملنے کی خواہش کی۔ آپ نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں امراء سے نہیں ملتا۔

امیر نے ہلکوا کر کہا۔ ”جناب! میں آپ کا مداح ہوں اور آپ سے ملاقات کی دیر نہ خواہش رکھتا ہوں۔“

آپ نے جواب میں ہلکوا کر کہا۔ ”وہ میرا مداح ہے لیکن میں اس کا مداح نہیں ہوں۔ مجھ کو کیا مداح ہے کہ خود تو قاہرہ میرے پاس پہنچا نہیں اور میں اس کے شہر سے گزرتے لگا تو میرا مداح بن گیا اور ملاقات کے لیے مجھ سے ملنے بیٹھ گیا۔“

امیر کے قاصد نے کہا۔ ”حضرت! آج فجر کے بعد امیر نے آپ کی خدمت میں حاضری دینے کا فیصلہ کیا ہے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”آج لیکن میں اس سے ملاقات نہیں کروں گا کیونکہ فقراء کو امر اکی کی تحفیں اس میں نہیں آتیں۔“

قاصد چلا گیا اور صبح امیر اپنے مصاحبین کے ساتھ جب آپ سے ملنے پہنچا تو معلوم ہوا کہ آپ فجر سے پہلے ہی اسکندریہ چلے گئے۔ امیر بہت مایوس ہوا اور مصاحبین سے کہا۔ ”یہ فقراء بھی عجیب لوگ ہیں جو امراء سے خواہ مخواہ بدلتن رہتے ہیں۔“

☆☆☆

ایک دن آپ نے پرہیز گاری، ہمت اور استغناء پر تقریر کی۔ پوری مجلس وجد میں آگئی اور لوگوں میں اس کا بہت چرچا ہوا۔ وعظ کے بعد آپ کو اپنے ایک ارادت مند کے پاس جانا پڑ گیا۔ ارادت مند نے آپ کی دعوت کی تھی ابھی کھانا شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ کسی طرف سے ایک کتا آگلا اور آپ کے سامنے بیٹھ گیا۔ آپ کو اس پر حرم آ گیا۔ آپ نے صاحب خانہ سے کہا۔ ”ایک روٹی لاؤ تاکہ میں اس کتے کو بھی دعوت میں شریک کر لوں۔“

صاحب خانہ نے آپ کے سامنے کئی روٹیاں لا کر رکھ دیں۔ آپ نے اس میں سے ایک روٹی نکال کر کتے کے آگے ڈال دی۔ کتے نے روٹی کی طرف دیکھا بھی نہیں، یوں ہی چپ چاپ بیٹھا رہا۔

آپ یہ سمجھ کر شاید کتے کی نظر روٹی پر پڑی نہیں ہے ورنہ ضرور کھاتا۔ روٹی کو اٹھا کر کتے کے منہ کے سامنے رکھ دیا۔ کتے نے روٹی پر ایک نظر ڈالی اور منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔

آپ نے کتے سے کہا۔ ”یہ روٹی میں نے تیرے لیے ڈالی ہے، کھانا کیوں نہیں؟“

کتے نے آپ کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

آپ نے روٹی اٹھا کر اس کے منہ سے لگا دی اور کہا۔ ”یہ روٹی میں اپنے ہاتھ سے چھو کھلا رہا ہوں، میری خواہش ہے کہ تو شکم بھر کر کھالے تاکہ میں تیری شکمیری سے سرت حاصل کر سکوں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”مجھ کو معلوم نہیں کہ مشہور صوفی حضرت حاجی کی کسی انگلی میں ایک ایسی رگ تھی جو انہیں مشیت کھانے سے بچھڑ کر باز رکھا کرتی لیکن میری انگلیوں میں ساٹھ ایسی رگیں ہیں جو مشیت کھانے کو اپنے قریب دیکھ کر بے اختیار پھڑکنے لگی ہیں۔“

وہ شخص اتنا خوف زدہ ہوا کہ کانپنے لگا اور کپکپاتی آواز میں بولا۔ ”حضرت! مجھ کو معاف فرمادیں کیونکہ میں نے یہ مشیت کھانا قصداً آپ کے سامنے رکھا تھا۔ اس طرح میں آپ کی بزرگی اور روحانیت کا امتحان لے رہا تھا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”سبحان اللہ، جس کی خدا خود حقائق کر رہا ہو، اس کو امتحان اور آزمائش میں ڈالنا کہاں کی عقل مندی ہے؟ اور خبردار جو تو نے کسی دل جملے کا امتحان لیا کیونکہ اگر اس نے تجھ کو آزمائش اور امتحان میں ڈال دیا تو معلوم نہیں تیرا کیا حشر ہوگا۔“

اس کے بعد آپ نے دُور جوش میں اپنی ڈاڑھی پکڑ لی اور فرمایا۔ ”اگر علمائے عراق اور شام کو یہ معلوم ہو جائے کہ ان بابوں کے پیچھے موجود شخص میں عقلیت اور بزرگی کا کتنا بڑا پہاڑ چھپا ہوا ہے تو وہ میری زیارت کو حاضر ہوں اور یہ بھی منہ کے بل دی جائے۔“

آپ کا قیام قاہرہ میں ہی تھا لیکن لوگوں نے آپ کو اکثر اسکندریہ میں دیکھا، اسکندریہ میں ان کے پیرواؤں کی شاڈلی رچے تھے۔ ان کی مجلس میں شریک ہوتے، وعظ سنتے اور ختم وعظ پر قاہرہ واپس چلے جاتے۔ شاذ و نادر ہی وفات کے بعد آپ کے ارادت مندوں نے آپ کے اس کمال کا دوسروں سے ذکر کیا تو انہیں یقین نہیں آیا۔ اس کے بعد جب یہ شہر ہوا کہ آپ مکانکشی سے دوسروں کے دلوں کی باتیں معلوم کر لیتے ہیں تو آپ کے ایک منکر کو بہت ہنسی آئی۔

اس نے کہا۔ ”یہ مشہور باز بھی کتنے غضب کے ہوتے ہیں، کیسے کیسے کر کے دکھا کر ایک زمانے کو اپنا قائل اور معتقد بنا لیتے ہیں لیکن مجھ کو آج تک کوئی بھی متاثر نہیں کر سکا۔“ اس نے اسکندریہ کے امیر کو مشورہ دیا کہ وہ ابو العباس کو قاہرہ سے طلب کرے اور ان سے کرامتوں کا مطالعہ کرے۔

امیر نے اسی وقت ایک فرمان جاری کر دیا اور حکم دیا۔ ”ابو العباس! تم میرا فرمان وصول کرتے ہی اسکندریہ آ جاؤ، ورنہ میں تمہیں زبردستی بھی بلواسکتا ہوں۔“

آپ نے یہ مختصر فرمان پڑھا اور نامہ بر کو زبانی جواب دے دیا۔ ”امیر سے کہہ دینا کہ ابو العباس کہتا ہے تو ہر صرف اسکندریہ کا امیر ہے اور میں جس امیر کا تابع ہوں وہاں اسکندریہ کا امیر میرے امیر کے وہاں نہیں ہے۔“

اس کے بعد اسکندریہ کے حاکم اسکندریہ کو جواب دیا۔ ”میرے موقع و مصلحت دیکھ کر اس نے فوراً ہی ایک دوسرا خط لکھ دیا۔ یہ خط نرم زبان میں لکھا گیا تھا اور پورے خط کا انداز فدو یا نثار عازز تھا۔ اس میں لکھا گیا تھا۔

”خیر و مرشد! مجھے اس احساس ہے کہ میری جانب سے آپ کو جو پہلا خط روانہ ہوا تھا، اس کا لب و لہجہ سخت تھا لیکن اب میں نرمند ہوں اور آپ سے اپنی پچھلی تصویر کی معافی مانگ رہا ہوں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اسکندریہ تشریف لے آئیں۔ میں آپ کی زیارت کر لوں گا اور آپ میرا ہاتھ پکڑ لیں گے۔ میں نے آپ کو غائبانہ اپنا پیار لیا ہے، اب آپ بھی مجھ کو اپنے مریدوں میں شامل کر لیں۔“

آپ نے خط پڑھا اور نامہ بر سے کہا۔ ”اگر تیرا حافظہ درست ہے تو میرا جواب امیر تک پہنچا دینا۔ یونان کا بادشاہ جب مصر آیا تھا تو موجودہ شہر اسکندریہ میں اتر آیا اور اسی کے نام پر اس شہر کا نام اسکندریہ پڑ گیا۔ اپنے آقا سے کہہ دینا کہ اسکندریہ اپنے ہم عصر بے غرض اور فاضل فلسفی دیوجانس سے ایک بار کہا تھا کہ دیوجانس! میرا فیض عام ہے اور میں نے بخشش اور انعام سے لوگوں کو بالامال کر دیا ہے اگر تو بھی کبھی آجائے اور اپنی خواہش کا اظہار کرے تو میں تجھ کو مالاکر دوں گا۔“

اسکندر کی پوری بات سن کر دیوجانس نے جواب دیا تھا۔ ”اسکندر! امیر ایک غلام ہے، میں نے اس کو کچھ کر لیا ہے لیکن اسی غلام نے تجھ کو اپنا غلام بنالیا ہے پھر میں اپنے غلام کے غلام سے کچھ کیا مانگوں، مجھ کو مانگتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔“

”چنانچہ اسے قاصد! اپنے امیر سے کہہ دینا کہ حرم طبع اور ثبوت کو میں نے اپنا غلام بنالیا ہے لیکن اس غلام نے اسکندریہ کے امیر کو اپنا غلام بنا رکھا ہے پھر میں اپنے غلام کے غلام سے کیوں تعلق پیدا کروں اور اس کے پاس کیوں پہنچوں۔ اور اپنے امیر سے سختی سے کہہ دینا کہ مجھ جیسے آدمی سے دل لگی نہیں کیا کرتے۔ ہم دونوں بھی یک جہت ہوں گے۔“

نامہ بر زبانی جواب لے کر چلا گیا۔ اس کے بعد امیر نے بڑی کوشش کی کہ خود قاہرہ جائے اور آپ سے ملاقات کرے لیکن وہ ناکام رہا اور ملاقات کی خواہش لیے ہوئے اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

کتنے نے روٹی کی طرف دیکھا اور کھائے بغیر وہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ جا بیٹھا۔
آپ کو کھینے کی حرکت تا گوار گزری اور کہا۔ ”کیوں کفرانِ نعمت کرتا ہے۔ خدا نے تجھے رزق بھیجا ہے تو اس کو کھالے۔ تیرے انکار کی وجہ میری سمجھ میں تو آئی نہیں۔“
ابھی ان کی بات پوری ہوئی تھی کہ انہوں نے محسوس کیا گویا کوئی انہیں مخاطب کر کے کہہ رہا ہے۔ ”اے ابو العباس! اتنے آج جس پر ہیز گاری، ہمت اور استغنا پر گھٹنوں وغٹھ کیا ہے افسوس کہ جب تیرے سامنے اس کی کوئی عملی شکل آئی تو تو شخص نابلد نظر آنے لگتا ہے۔“

آپ کے منہ سے پہلے نکل گئی اور بے اختیار زبان سے نکلا۔ ”اے ابو العباس! علت ہے تجھ پر کہ کتنا تجھ سے زیادہ پرہیزگار نکلا۔“ اس کے بعد آپ نے ہوش ہو گئے۔
ہوش میں آنے کے بعد آپ نے خلوت نشین اختیار کی اور لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ لوگ آتے اور گھٹنوں بیٹھ کر چلے جاتے۔ انہیں پریشانی تھی کہ آخر ابو العباس کو ہو کیا گیا ہے کہ ملنا جلنا اور بولنا ہی ترک کر دیا ہے۔
آخر ایک مرید نے آپ سے ملاقات کی اجازت چاہی۔ آپ نے اس کو اندر بلا لیا۔ اس نے اندر پہنچ کر یہ محسوس کیا کہ آپ ذرا دیر پہلے شاید روہے تھے۔ مرید نے پوچھا۔
”حضرت! آپ کے مزاج تو بے خبر ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”مجھ کو ٹھیک ہوں۔“
مرید نے کہا۔ ”حضرت! کیا ابھی ابھی اس ناچیز کی آمد سے پہلے آپ غمگین تھے؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں تو، یہ تو نے کس طرح سمجھ لیا؟“
مرید نے عرض کیا۔ ”میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ آگھوں کے نیچے غمگینی کے سیاہ ہلنے اور پی کو بے آسانی دیکھ اور محسوس کر لیتا۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”اس دنیا میں خوش کون ہے؟ صرف وہ شخص جو اپنے برے کی تیز نہیں کر سکا۔“
مرید نے عرض کیا۔ ”حضرت! آپ نے چند دنوں سے جو ہوش اختیار کر رہی ہے، اس سے مریدوں کو ہوا کی فکر لاحق ہو گئی ہے اور وہ اس تبدیلی کا سبب جاننے کے لیے تیز ہیں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کرن ترانیوں سے باز آ جاؤں گا کیونکہ خاموشی میں عظمت ہے۔“
مرید نے کہا۔ ”آپ کس چیز کو کرن ترانی فرما رہے ہیں؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”وہ سب کرن ترانی میں شمار ہوگا جو زبان سے تو نکل جائے مگر خود اس کے معیار پر پورا نہ اترے میں نے محسوس کیا ہے کہ میں نے جن باتوں کی تلقین کی ہے، میں خود ان پر پورا نہیں اترتا تھا۔“
مرید نے کہا۔ ”یہ آج آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟ میں تو ایک بات جانتا ہوں، وہ یہ کہ آپ اگر یوں خلوت نشین رہے اور اپنے عاشقوں اور اراکات مندوں کو اپنے دیدار اور کلام سے محروم رکھا تو وہ پاگل ہو جائیں گے اور آپ کی خلوت میں زبردستی داخل ہو جانے کی گستاخی کر بیٹھیں گے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”تو ہمارا جاکر شائقین سے کہہ دے کہ میں نے اپنے رب کے ایما پر خلوت نشین اور سکوت اختیار کیا ہے۔ اب جب وہی یہ حکم دے گا کہ میں باہر نکلوں اور لوگوں سے کلام کروں تو ہمارا جاکاؤں گا۔“
مرید نے خند سے کام لیا۔ ”حضرت! بحث و تکرار سے آپ کی کج خراشی تو ضرور ہوگی لیکن میں اپنے اور اپنے جیسے دوسروں کے اطمینان کے لیے یہ ضرور چاہوں گا کہ آپ کو اپنے رب کے ایما کا علم کیونکر ہوا؟“
آپ نے کئے والے واقعہ سن کر فرمایا۔ ”اس دن میں نے پرہیز گاری، ہمت اور استغنا پر جو کچھ کہا تھا، بعد میں مجھ کو یہ بتایا گیا کہ میں اپنے وعظ میں جولا ف گزاف مارتا رہا ہوں اور جو کن ترانیاں ہاکی ہیں، ان کے اصل مفہوم سے ایک کتا مجھ سے زیادہ واقف ہے مجھ کو اس سے سبق لینا چاہیے۔ چنانچہ اب میں اتنا خوف زدہ ہو چکا ہوں کہ باہر نکلنے اور بات کرنے کی ہمت ہی جواب دے گئی ہے۔“

مرید نے عرض کیا۔ ”لیکن آپ کے مرید آپ کی یہ باتیں نہیں مانیں گے اور آپ کو اس حجرے سے باہر نکلتا اور لوگوں سے کلام کرنا پڑے گا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے کہہ جو دیا کہ میں اپنے رب کے حکم پر ہی نکلوں گا اور کلام کروں گا تم لوگ میرے حق میں دعا کرو کہ اللہ مجھ کو محاف کر دے اور مجھ کو میرے کلام کے مطابق بنادے۔“
مرید باہر آ گیا اور اپنی گفتگو سے سب کو مطلع کر دیا۔ لوگ بہت آزرده ہوئے اور بہتوں نے اعلان کر دیا کہ ہم اس وقت تک یہاں سے نہیں نکلتے جب تک کہ آپ باہر نکل کر شرفِ کلامی نہیں بخشیں گے۔
اس بات کو بہتوں نے گزر گئے۔ آپ اپنے حجرے میں مستغرق رہے۔ لوگوں کو یہ انتظار تھا کہ آخر یہ قفل دور کس طرح ہوگا۔ آخر ایک دن حجرے میں آپ نے ایک روشنی محسوس کی۔ آپ پر وجد کا عالم طاری ہو گیا اور غشی کے عالم میں آپ نے سنا، کوئی کہہ رہا ہے۔

”اے ابو العباس! تجھ کو اس بات کا اتنا اثر نہیں لیتا جاسیے تھا۔“
انہوں نے کہا۔ ”میں شرمندہ اور نادام ہوں اے میرے رب! مجھ کو باہر نکلتے اور لوگوں سے کلام کرتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے۔ میں لوگوں کا سامنا کس طرح کروں گا اور لوگوں کو تعلیم و تلقین کس طرح کروں گا؟“
آواز آئی۔ ”تجھ کو جو علم دیا گیا ہے اور جو طاقتیں ملی ہیں، ان کی نشر و اشاعت بھی تجھ کو سونپی گئی ہے۔ تو حجرے سے باہر نکل اور حسبِ سابق اپنا کام شروع کر دے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اے میرے رب! میں اس حکم کی تعمیل کروں گا لیکن میری استدعا ہے کہ مجھ کو میرے کلام کے مطابق اعمال رکھنے کی توفیق بھی مرحمت ہو اور آئندہ کی پیشانیوں سے محفوظ رکھ۔“
اس بار انہیں سختی سے حکم دیا گیا۔ ”اے ابو العباس! اب زیادہ قیل و قال نہ کرو اور باہر نکل کر تشنگانِ علم کی پیاس بجھاو نہ یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے تجھ جو کچھ دیا گیا ہے اس کو چھین لیا جائے کیونکہ جو تجھ کو بخشا جا سکتا ہے وہ سب بھی کیا جا سکتا ہے۔“
آپ کو ایک جھٹکا سالک اور آپ ہوش میں آ گئے۔ اسی وقت حجرے سے باہر نکلے اور لوگوں سے کہا۔ ”لوگو! میں تم میں دوبارہ آ گیا ہوں اور اسی طرح تم میں اٹھوں بیٹھوں گا اور کلام کرتا رہوں گا جس طرح ہمیشہ کرتا رہا ہوں کیونکہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے۔“
لوگوں نے خوشی میں اٹھیں اٹھیں اور کلام کرتا رہے ہوئے اور احتراماً کھڑے ہو گئے، ہر ایک کے چہرے سے یہی محسوس ہو رہا تھا گویا یہ روزِ عید ہے اور وہ سب اہلِ مکہ کو شرفِ کلامی مل رہا ہے۔



آپ کے پاس ایک انجمنی شخص آیا۔ آپ نے اس پر خصوصی توجہ دی اور نہایت دلچسپی اور محبت سے کہا۔ ”آج بھائی بیٹھ جا بول، کیسے آتا ہوا؟“
اس شخص نے کہا۔ ”بعض خیالات مجھ کو بہت پریشان کرتے ہیں۔ میں ایک پیر کے پاس گیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا خدا پر بیٹھ جا۔ ابھی تیری بات سنتے ہیں۔ مجھ میں اتنا راکھاں تھا کہ صبر کر کے بیٹھ جاتا، چنانچہ میں آپ کے پاس آ گیا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تو کیا پوچھنا چاہتا ہے؟“
اس نے کہا۔ ”حضرت! میں نے کچھ لوگوں کو ملاحظہ میں آ دیکھا ہے اور ان کے برعکس کچھ ایسے بھی ہیں جو آنکھیں بند کیے خفا میں گم ہیں، میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ ان میں بزرگ اور برتر کون ہے؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”اے شخص! جو ظہور کا بندہ ہے اور جو خفا کو دوست رکھتا ہے وہ ظہور کا بندہ ہے اور جو خفا کو دوست رکھتا ہے، وہ خفا کا بندہ ہے لیکن جو خفا کا بندہ ہے اس کے لیے ظہور اور خفا دونوں ہی برابر ہیں۔“

اس شخص نے دوسرا سوال کیا۔ ”حضرت! مجھ کو موت سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں اس ڈر کو اپنے دل سے نکالنا چاہتا ہوں۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”اے شخص! تو یہ بات اچھی طرح اپنے دل میں بٹھالے کہ جس کی اللہ سے دوستی ہوگی، وہ موت سے ہرگز نہیں ڈرے گا۔ لیکن جو خفا کو دوست ہوگا، وہ موت سے اتنا ہی خوف زدہ ہوگا جتنا خیر اللہ نے فرمایا ہے۔ اگر تم سچے ہو تو موت کی آرزو کرو میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو شخص بھی خدا سے دوستی کا دعویٰ کرتا ہو، اس کو چاہیے کہ پہلے اس طرح خود کو کوئی پرس کر دیکھے، پتا چل جائے گا کہ اپنے دعوے میں وہ کتنا سچا ہے یا کتنا جھوٹا ہے۔“

وہ شخص مطمئن اور آسودہ سا ہو گیا اور جاتے جاتے کہہ گیا۔ ”اب میں اس در کا ہو گیا کیونکہ آسودگی اسی در سے ملتی ہے۔“
جب وہ چلا گیا تو ایک مرید نے کہا۔ ”حضرت! یوں تو ہر روز آپ کے پاس کوئی نہ کوئی انجمنی آتے جاتے ہیں لیکن آپ ان پر

کی دوسری کوئی مثال نہ ملتی مگر اس کے مغرور دل نے مجھ کو اس سے دور رہی دور رکھا۔
مریدوں کو جو اس کا علم ہوا تو اس عالم کے پاس گئے کہ اس کا تاثر معلوم کریں۔ اس عالم نے آپ کے مریدوں کو دیکھتے ہی ان کا مذاق اڑایا، کہا: ”افسوس کہ میں نے تو ابو العباس کا بڑا نام سنا تھا لیکن جب ان سے ملا تو مجھے اپنی برتری اور ان کی کسٹری کا محسوس ہی میں انکشاف ہو گیا۔ بفضل خدا میں ان سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہوں۔“
چند دنوں بعد ایک ایسا شخص آپ کی ملاقات کو حاضر ہوا جو اپنے برے افعال کی وجہ سے بدنام تھا۔ اس نے آپ کے مریدوں سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”بھائی! میں حضرت ابو العباس سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ کیا وہ مجھے شرف باریابی بخشیں گے؟“
ایک مرید نے آپ سے اس کے لیے اجازت ملاقات چاہی تو ابو العباس کو اس آنے والے پر بہت پیار آیا، بولے۔ ”اس کو فوراً بلاؤ۔ میں اس سے ابھی اسی وقت ملوں گا۔“
اس آنے والے کو فوراً ہی آپ کے پاس پہنچا دیا گیا۔ آپ نے اس کو بڑے تپاک سے لیا۔ ”ہاں بھائی کیسے ہو؟ خیریت ہے تو ہو؟“
اس نے جواب دیا۔ ”حضرت! خیریت ہے تو ہوں۔ بس آپ کے پاس آتے ہوئے ایک خوف سا محسوس ہوتا تھا۔ بڑی ہمت کر کے آیا ہوں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”کیوں، یہاں آتے ہوئے خوف کیوں محسوس ہوتا تھا؟“
اس نے جواب دیا۔ ”میں ہمیشہ سوچتا رہتا تھا کہ میں ایک گناہ گار انسان، آپ خاصہ خاصان، معلوم نہیں شرف باریابی ملے یا یوں ہی نا کام واپس آتا پڑے۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”میرے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے ہیں۔ یہ کسی بادشاہ یا امیر کا قصر نہیں، درویش کی کٹیا ہے اور وہ لوگ جنہیں اپنے گناہوں کا احساس ہے اور اپنے اعمال پر شرمندہ ہیں، ان کے لیے تو میری کٹیا کا در ہر وقت کھلا رہتا ہے۔“
آپ نے والا آپ کی باتیں سن کر رونے لگا، بولا۔ ”حضرت! آپ میرے حق میں دعا بھیجے کہ میں اپنے نامہ اعمال میں مزید گناہوں سے محفوظ رہوں اور دعا بھیجیں کہ میں آپ کے سامنے ہر وقت توفیق پاؤں۔“
آپ نے فرمایا۔ ”خدا تعالیٰ دعا مستور اور پشیمانی دیکھ رہا ہے، اس کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔“
آپ اس کو بڑی دیر تک نصیحتیں کرتے رہے اور اس کی ہمت افزائی کرتے رہے اور آخر میں کہا۔ ”اور جب تو یہ محسوس کر لے کہ خدا نے تیری توبہ قبول کر لی ہے اور خدا کی توفیق سے تو نے سیدھی راہ اختیار کر لی ہے تو سبب سے تو گویا ایک پل صراط پر کھڑا ہو جائے گا کیونکہ تقویٰ اور پرہیز گاری کے پہلو میں، اس سے متصل شیطان بھی آن موجود ہوتا ہے اور وہ ہر وقت تقویٰ اور..... پرہیز گاری پر غرور کر رہا ہے کہ اس کا تار ہوتا ہے۔ چنانچہ اس طرح سارا دھرا برباد ہو جاتا ہے اور آدمی ایک ایسی دلدل میں اتر جاتا ہے کہ اس دلدل سے خدا ہی نکالے تو انسان نکل سکتا ہے ورنہ ہر راہ بند ہو چکی ہوتی ہے۔“
اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”حضرت! میں تو آپ کے قدموں میں ہی رہتا چاہتا ہوں اور ہر قدم پر آپ سے راہنمائی چاہتا ہوں کیونکہ کسی راہنمائی کے بغیر یہ کام مشکل ہے۔“

اس کے بعد وہ شخص آپ ہی کے پاس رہ گیا۔ وہ دن بھر مزدوری کرتا اور شام کو آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ چنانچہ یہاں زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس شخص میں بزرگی اور عظمت کے آثار محسوس کیے جانے لگے۔ اس میں عاجزی اور انکسار کا یہ عالم تھا کہ ہر وقت لغزشوں اور گناہوں سے خوف زدہ رہتا تھا اور احتیاط اور عاجزی کا دامن ہر وقت پکڑے رہتا۔

☆☆☆

شہر میں ایک ایسے شخص کا بڑا چہرہ تھا جو جگہ جگہ کے واپس آیا تھا اور بہت عالم مشہور تھا۔ آپ کے مرید بھی اس کی شہرت سے خاصے متاثر تھے اور آپ سے دہلی زبان میں خواہش کرتے رہتے تھے کہ اس شخص سے ایک بار ملا ضرور چاہیے۔
آپ نے عاجز آ کر پوچھا۔ ”تم لوگ اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“
ایک مرید نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ وہ بہت عالم شخص ہے۔ اس کی طبیعت کا آس پاس کوئی جواب نہیں۔“
آپ نے پھر پوچھا۔ ”اس کے علاوہ اور کچھ؟“

اتنی جلدی تو جہیں فرماتے جس طرح آج اس شخص پر فرمائی ہے۔ کیا اس کا کوئی خاص سبب تھا؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں، اس کا ایک خاص سبب تھا، یہ شخص پہلے ایک دوسرے پیر کے پاس گیا تھا۔ اس پیر نے اس سے کہہ دیا کہ چند گھنٹے انتظار کر، اس کے بعد تیرے سوالوں کا جواب دوں گا۔ یہ شخص جس کرب اور بے چینی کا شکار تھا، اس میں چند گھنٹے انتظار کا راز نہیں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ یہ بھاگ کر میرے پاس آ گیا اور مجھ کو اس کی طرف فوراً ہی متوجہ ہو جانا پڑا۔“
ایک شخص نے دہلی آواز میں کہا۔ ”حضرت! اس طرح تو اس پہلے پیر کی مذمت ہو گئی جس کے پاس یہ آگئی شخص آیا تھا اور اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ دوسروں سے افضل اور برتر ہیں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”یہ بات نہیں ہے بلکہ میں نے جو بات کہی، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو طمانیت اور آسودگی جہاں سے بھی ملے، حاصل کر لے۔ تم لوگ میری صحبت میں ہو اور میں رہوں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اگر تمہیں کوئی اور شخص پانی کا چشمہ میسر آ جائے تو وہاں نہ جاؤ۔ تم نہیں بھی جاسکتے ہو۔“
ایک دن ایک مرید آپ کے لیے کھانا لایا۔ وہ کھانے کو اس طرح چپا کر لایا تھا کہ دوسروں کو اس کی خبر ہی نہ ہو سکی۔
کافی رات گئے جب لوگ چلے گئے تو یہ پیٹھ مارہ کیا۔ آپ نے پوچھا۔ ”تیرا کوئی کام ہے مجھ سے؟“
اس نے جواب دیا۔ ”نہیں تو، میں تو اس لیے رکھا ہوا تھا کہ آپ کے لیے جو کچھ لایا ہوں، لوگوں کے چلے جانے کے بعد آپ کی خدمت میں ادب سے پیش کروں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”تو کیا لایا ہے؟“
اس نے جواب دیا۔ ”کچھ کھانا ہے جو میں آپ کو کھلا کر واپس جاؤں گا۔“
آپ نے ناگواری سے پوچھا۔ ”مگر یہ تو بتا کہ تو کھانا چپا کر کیوں لایا؟“
اس نے جواب دیا۔ ”بس یونہی، میں نہیں چاہتا تھا کہ اس میں دوسرے بھی شریک ہوں۔“
آپ نے افسوس کیا۔ ”تو بہت برا کیا۔ تیرے خیالات فاسدانہ ہیں اور میں ایسا کھانا کسی حال میں نہیں کھاؤں گا جو اس شخص نے بڑی توخوشی کے ساتھ آپ کو کھانا کھانے میں آپ سے نہیں کھایا، کھانا واپس کر دیا۔“
چند دنوں بعد ایک دوسرے شخص نے سب کے سامنے اعلان کیا۔ ”حضرت کے لیے آج میں کھانا لاؤں گا۔“
آپ نے اس شخص کو منع فرمایا۔ ”تو یہ کیسا بھل اور بے ہودہ اعلان کر رہا ہے۔“
اعلان کرنے والے نے کہا۔ ”حضرت! اس میں بے ہودگی کیسی؟ میں واقعی کھانا لاؤں گا، میں جھوٹا اعلان نہیں کر رہا ہوں۔“
آپ نے جواب دیا۔ ”جس طرح میں وہ کھانا نہیں کھاتا جو دوسروں سے چپا کر لایا گیا ہو، اسی طرح میں وہ کھانا بھی نہیں کھا سکتا جس کا اس طرح اعلان کیا گیا ہو۔“
اس شخص نے بڑی مت ساجت کی لیکن آپ نہیں مانے اور وہ کھانا نہیں کھایا۔

☆☆☆

ایک ایسا شخص آپ کے پاس آیا جس کا زہد و تقویٰ بہت مشہور تھا اور جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ کسی وقت کی نماز قضا نہیں ہوئی۔ اس کی آمد کا ایسا شہرہ ہوا کہ آپ کے مریدوں میں بس یہی چہرہ ہونے لگا۔ مریدوں کا خیال تھا کہ آپ اس سے بہت اچھی طرح پیش آئیں گے لیکن وہ شخص آیا اور آپ کے انتظار میں کچھ دیر بیٹھا رہا۔ کچھ لوگوں نے خبر دی اور کہا۔ ”حضرت! یہ پرہیزگار شخص آپ سے ملاقات کا متنبی ہے لیکن آپ اس سے معلوم نہیں لیں کیوں نہیں رہے ہیں؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں! لوگ، جلدی کس بات کی ہے؟“
کسی نے کہا۔ ”وہ شخص واپس جانا چاہتا ہے۔“

آپ اٹھ کر اس کے پاس چلے گئے۔ دونوں میں علیک سلیک ہوئی لیکن دوسروں نے یہ بات اچھی طرح محسوس کی کہ آپ اس عالم اور زہد سے تپاک اور جوش سے نہیں مل رہے ہیں۔ گفتگو کا یہ عالم تھا کہ وہ شخص اگر کوئی بات کرتا تھا تو آپ اس کا مختصر جواب دے دیتے تھے، اپنی طرف سے کوئی بات بھی نہ کرتے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ عالم چلا گیا۔
آپ نے فرمایا۔ ”افسوس کہ اگر اس شخص کے دل میں اپنے علم اور زہد و تقویٰ کا غرور نہ ہوتا تو میں اس سے اس طرح ملتا کہ اس

آپ نہایت مایوس اور افسردہ اپنے حجرے میں واپس پہنچے اور مریدوں سے کہا۔ ”میں تم لوگوں کے کہنے پر اس شخص کے پاس چلا گیا تھا، ورنہ مجھ کو ان باتوں کا پہلے ہی سے علم تھا۔ میں تمہیں یہ باتیں پہلے ہی بتا سکتا تھا لیکن اس حجرے اور شاہدے سے پہلے تم لوگ شاید میری باتوں پر یقین نہ کرتے۔“

مریدوں نے بالاتفاق عرض کیا۔ ”ہمیں آپ کی ہر بات پر یقین ہے چنانچہ اگر آپ ہمیں یہ باتیں پہلے بتا دیتے تو ہم سب اس شخص کے پاس ہرگز نہ جاتے۔“

آپ کے مریدوں میں ایک ایسا بھی تھا جسے یہ دُغم ہو گیا تھا کہ اس نے آپ سے بہت کچھ سیکھ لیا ہے اور اتنا جانتا ہے کہ ابو العباس کے علاوہ کوئی اور اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا چنانچہ اس نے آپ کے پاس آنا بند کر دیا اور اس کا امیدوار ہوا کہ کوئی خود اس کے پاس پہنچے اور اسی ادب و احترام کا مظاہرہ کرے جس کا ابو العباس کی مجلسوں میں ہوتا رہتا ہے۔

آپ نے بھی اسے نظر انداز کر دیا اور اس کا کبھی ذکر تک نہیں کرتے۔ ایک عرصے بعد وہ آپ کی خدمت میں آیا اور چند مسائل بھی اپنے ساتھ لایا۔ آپ نے ایک نظر اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پوچھا۔ ”تو کہاں چلا گیا تھا؟ خیریت تو ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں موجود تو اسی شہر میں تھا لیکن میں نے ایک عرصے سے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اب مجھے کسی کی ضرورت ہی نہیں، میں خود مستغنی ہو چکا ہوں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اے شخص! تو نے یہ کیسی بات کہہ دی؟“

اس شخص نے پوچھا۔ ”کیسی بات؟ کون سی بات؟ میں جناب کا مطلب نہیں سمجھا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”جہاں تک استغنا کا سوال ہے، اس دنیا کا کوئی شخص بھی استغنا کا دعویٰ نہیں کر سکتا جس کا تو کر رہا ہے۔“ وہ شخص بہت شرمندہ ہوا اور سر ہچکا کر بیٹھ گیا۔ آپ نے فرمایا۔ ”اے شخص! کیا تو جانتا ہے کہ جب یہ زمین معرض وجود میں آئی تھی تو اس کا کیا حال تھا؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”میں حضرت! آپ ہی بتائیں گے تو بات معلوم ہو جائے گی۔“

آپ نے فرمایا۔ ”جو وہ زمین آیت ہی زمین کا ہے یعنی ظاہر ہونے لگی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بے چینی کو پہاڑوں کے پوچھ سے دبا دیا۔ بیٹھ ہی حال انسانی کا ہے، خدا کے جب نکل کو پیدا کیا تھا تو یہ کسی بہت بے چینی تھا۔ خدا نے اس کو بھی عقل کے پہاڑ سے دبا دیا۔“

آپ قاہرہ سے اسکندریہ جا رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ آپ نے ہجوم دیکھا۔ کوئی موٹا تازہ شخص وعظ کرنے میں مشغول تھا اور سامعین دین و دنیا سے بیکار اس کا وعظ سننے میں مشغول تھے۔ آپ اس کا وعظ سننے لگے۔ آپ کے پاس جو شخص کھڑا تھا، واعظ کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بار بار واعظ کو دیکھتا اور زربل کچھ کہہ کر جاتا۔

آخر آپ نے پوچھا۔ ”اے شخص! تو کس کرب و اذیت میں مبتلا ہے کہ وعظ بھی غور سے نہیں سن رہا؟“

اس نے آپ کو غور سے دیکھا اور جواب دیا۔ ”میرا خیال تھا کہ واعظ کی فربہی اور تر و تازگی میری طرح دوسروں کو بھی حیرت میں ڈال دے گی لیکن اب معلوم ہوا کہ یہاں میرے سوا ایک بھی صاحب نظر نہیں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں تیری بات نہیں سمجھا کہ تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”جناب! میں واعظ میں کوئی اسکی بات نہیں پاتا، جو اس کے زہد اور تقویٰ کی گواہی دیتی ہو۔ مجھ کو تو یہ شخص بڑا جھوٹا معلوم ہوتا ہے۔“

اس شخص نے یہ بات آہنی آہن سے کہی تھی کہ کسی اور کے سننے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ ابھی اس کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ واعظ نے دوری سے یہ آواز بلند کیا۔ ”اے شخص! جو مجھے سرگوشی میں جھوٹا کہہ رہا ہے ذرا سامنے تو آ تاکہ میں بھی اس سچے اور ایمان دار شخص کی شکل دیکھ لوں۔“

معرض اس لکار سے حیرت زدہ بھی ہوا اور غور نہ بھی۔ اس نے ایک بار پھر سرگوشی میں کہا۔ ”حضرت! اس شخص کو میرے اعتراض اور شبہ کا کس طرح علم ہو گیا؟“

اور آپ کے بجائے اس سوال کا جواب بھی اس واعظ نے دیا۔ ”اوجھوئے سروالے! تو نے میرے منائے پر اعتراض کیا تھا اور کہا تھا کہ میں کیسا اپنے رب کا عاشق ہوں کہ میرا مننا یا میرے دعوے کی تکذیب کر رہا ہے حالانکہ میرے دل میں

مرید نے جواب دیا۔ ”اور یہ کہ وہ حج کر کے آیا ہے اور وہاں سے متعلق بڑی انگیز باتیں کرتا ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تب پھر میں اس سے ضرورتوں کا تم سب بھی میرے ساتھ ہی چلو۔“

لوگ بھی خوش تیار ہو گئے اور کچھ دیر بعد آپ ان سب کے ساتھ اس شخص سے ملنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس عالم کو جب آپ کی تشریف آوری کا علم ہوا تو بہت خوش ہوا اور پھولا نہ سہا۔

آپ نے فرمایا۔ ”اے شخص! تو بڑا خوش قسمت ہے کہ خانہ خدا اور دیار حبیب ﷺ پر حاضری دینے کی سعادت حاصل کی۔“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”بڑی دشوار گزار راہیں تھیں اور راستے میں بھی رازنوں کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”دیار حبیب پہنچ کر شاید یہی کوئی شخص اپنے جذبات پر قابو نہ پا رہا ہو۔“

اس نے جواب دیا۔ ”میں تو جناب مدینے میں خوب گھوما پھرا بڑا مزہ آیا اور ایک مدینے پر کیا موقوف، کسی بھی شہر میں جائے دل خوش ہو جاتا ہے۔“

آپ نے مزید فرمایا۔ ”حرم پاک میں بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کرا اس دور تک کا زمانہ فاصلہ اور اس کے نشیب و فراز آنکھوں میں پھر رہے ہیں اور اس کی عظمت اور تقدس کا مرقع نظروں کے سامنے ہے۔“

جواب ملا۔ ”بھائی! میں نے تو وہاں ایسا ہجوم دیکھا کہ دم کھٹنے لگا، اور اس وقت بھی یہ حال ہے کہ جب ازدحام کے بارے میں سوچتا ہوں تو دشت ہونے لگتی ہے۔“

آپ نے پوچھا۔ ”جناب کالج کیکار ہا؟“

اس نے جواب دیا۔ ”جناب! بڑا استاساں تھا، پانی کی بہتات تھی اور وہاں ایک ایک چیز کا نرخ مجھ سے معلوم کر لیجیے۔ ایک ایک چیز اور اس کا نرخ میرے حافظے میں محفوظ ہے۔“

آپ نے فسوس سے کہا۔ ”اے شخص! تو نے میری ہر بات کا عجیب بے تکا جواب دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دیار حبیب میں

وہی غور و جہد ہوتا ہے جتنا تو ہو جاتا ہے اور اس کے جواب دیا کہ ایک مدینے پر کیا موقوف، کسی بھی شہر میں جائے دل خوش ہو جاتا ہے۔“

اس نے جواب دیا۔ ”میں تو جناب مدینے میں خوب گھوما پھرا بڑا مزہ آیا اور ایک مدینے پر کیا موقوف، کسی بھی شہر میں جائے دل خوش ہو جاتا ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”حرم پاک میں بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کرا اس دور تک کا زمانہ فاصلہ اور اس کے نشیب و فراز آنکھوں میں پھر رہے ہیں اور اس کی عظمت اور تقدس کا مرقع نظروں کے سامنے ہے۔“

جواب ملا۔ ”بھائی! میں نے تو وہاں ایسا ہجوم دیکھا کہ دم کھٹنے لگا، اور اس وقت بھی یہ حال ہے کہ جب ازدحام کے بارے میں سوچتا ہوں تو دشت ہونے لگتی ہے۔“

آپ نے پوچھا۔ ”جناب کالج کیکار ہا؟“

اس نے جواب دیا۔ ”جناب! بڑا استاساں تھا، پانی کی بہتات تھی اور وہاں ایک ایک چیز کا نرخ مجھ سے معلوم کر لیجیے۔ ایک ایک چیز اور اس کا نرخ میرے حافظے میں محفوظ ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”حرم پاک میں بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کرا اس دور تک کا زمانہ فاصلہ اور اس کے نشیب و فراز آنکھوں میں پھر رہے ہیں اور اس کی عظمت اور تقدس کا مرقع نظروں کے سامنے ہے۔“

جواب ملا۔ ”بھائی! میں نے تو وہاں ایسا ہجوم دیکھا کہ دم کھٹنے لگا، اور اس وقت بھی یہ حال ہے کہ جب ازدحام کے بارے میں سوچتا ہوں تو دشت ہونے لگتی ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”حرم پاک میں بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کرا اس دور تک کا زمانہ فاصلہ اور اس کے نشیب و فراز آنکھوں میں پھر رہے ہیں اور اس کی عظمت اور تقدس کا مرقع نظروں کے سامنے ہے۔“

جواب ملا۔ ”بھائی! میں نے تو وہاں ایسا ہجوم دیکھا کہ دم کھٹنے لگا، اور اس وقت بھی یہ حال ہے کہ جب ازدحام کے بارے میں سوچتا ہوں تو دشت ہونے لگتی ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”حرم پاک میں بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کرا اس دور تک کا زمانہ فاصلہ اور اس کے نشیب و فراز آنکھوں میں پھر رہے ہیں اور اس کی عظمت اور تقدس کا مرقع نظروں کے سامنے ہے۔“

جواب ملا۔ ”بھائی! میں نے تو وہاں ایسا ہجوم دیکھا کہ دم کھٹنے لگا، اور اس وقت بھی یہ حال ہے کہ جب ازدحام کے بارے میں سوچتا ہوں تو دشت ہونے لگتی ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”حرم پاک میں بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کرا اس دور تک کا زمانہ فاصلہ اور اس کے نشیب و فراز آنکھوں میں پھر رہے ہیں اور اس کی عظمت اور تقدس کا مرقع نظروں کے سامنے ہے۔“

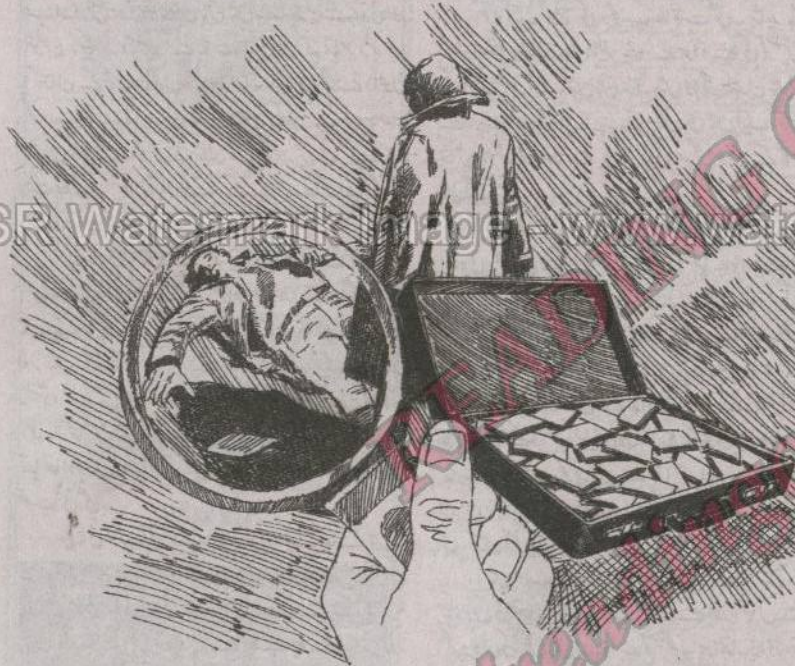
جواب ملا۔ ”بھائی! میں نے تو وہاں ایسا ہجوم دیکھا کہ دم کھٹنے لگا، اور اس وقت بھی یہ حال ہے کہ جب ازدحام کے بارے میں سوچتا ہوں تو دشت ہونے لگتی ہے۔“

ناقابل معافی

ڈاکٹر شیر شاہ سید

مغربی معاشروں کے جدید ایجادات اور دریافتوں کا انداز تو انسان اپنا لیتا ہے لیکن ان کی ترقیوں کا راز جان کر بھی اس سے نظریں چرا لیتا ہے کیونکہ ... ان پر عمل کرنے کا مطلب خود کو نظم و ضبط اور قوانین کا پابند بنانا ہوتا ہے جبکہ ہمارے یہاں کیسا نظم و ضبط اور کیسے قوانین۔ یہاں تو حلو اکھا نا اچھا لگتا ہے اور کڑواہام تھوکن پڑتا ہے۔

ایک مضبوط معاشرے کے منظم اصول اور اس کے اثرات و ثمرات کا احوال



ٹکولس ریکا لو او مسکیہ یونان سے آیا تھا۔
مجھے ای میل کے ذریعے پیغام ملا کہ ٹکولس کو
اپرٹ سے لیتا ہوگا۔ میں اس وقت مانسہرہ میں تھا جہاں ہم
لوگوں نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنالیا تھا اور جہاں سے مختلف کام کر
رہے تھے۔ مانسہرہ میں ہم نے دو کمپ بنائے تھے تاکہ
مناشرین رزلز دہاں رہیں، کمپ میں ان کے کھانے پینے کا
بھی انتظام تھا۔ میں ہزار ٹینٹ ہم لوگ بانٹ چکے تھے اور
اب ایک کمپ اسپتال کا بندوبست کرنا تھا۔
ٹکولس یونان کے کسی چھوٹے سے قصبے سے آ رہا تھا۔
مجھے الفریڈ وین کا کسی کا ای میل آیا پھر فون آیا کہ ایک

جو عشق الہی موزن ہے، اس نے تیری سرگوشی کو میرے دل تک پہنچا دیا۔“
آپ نے معافی چاہی۔“ اے واعظ! جب تو اپنے رب کا اتنا بڑا عاشق یا مراد ہے تو اس سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچا
کیونکہ سب کچھ اپنے سینے میں چھپا کر لے جاتا، یہ عاشقوں کی شان اور حوصلے کے خلاف ہے۔ اپنے علم اور بصیرت سے
دوسروں کو بھی فائدہ پہنچا۔“

واعظ نے دور ہی سے جواب دیا۔ ”جناب! آپ تو یہ نہ کیے۔ آپ کا جو مقام ہے اس سے میں واقف ہوں۔“
آپ نے فرمایا۔ ”اے شخص! میں نادم اور شرمندہ ہوں کہ تیرے مرتبے اور بزرگی کا ہر ایک کو علم ہو چکا ہے لیکن اس
کے باوجود لوں پر تیری زبان کا زور نہیں چل رہا۔ اپنے وعظ میں اثر بھر دے تاکہ جو بھی تیرا وعظ سن کر اٹھے، اپنے آپ میں
نہرے۔“

واعظ نے جواب دیا۔ ”اے ابوالعاس! اگر یہ بات اپنے بس کی ہوتی تو آپ کی مجلس کے لوگ آپ کی صحبت سے ہرگز
مستغنی نہ ہونے لگتے۔ جس دل میں جتنی صلاحیت ہوتی ہے میری باتوں کا اتنا ہی اثر قبول کر لیتا ہے اور سچ بات تو یہ ہے کہ اثر
پذیری کی توفیق اللہ ہی کی طرف سے ہے۔“

آپ یہاں سے اسکندریہ شریف لے گئے اور وہاں کچھ دن قیام کر کے پھر واپس قاہرہ آ گئے۔
ایک دن آپ بڑے جذبے اور جوش میں تھے، اپنے مریدوں سے پوچھا۔ ”کیا تم میں کوئی ایسا ہے جو مجھے فنی (جوان
مرد) اور فوت (جوانمردی) کا مطلب سمجھا دے۔“

کئی نے لب کھولنا چاہا لیکن ہمت نہیں پڑی۔ ایک نے سب کی یہ کیفیت محسوس کر لی، بولا۔ ”حضرت! ہم میں کئی
ایسے ہیں جو آپ کے سوال کا جواب دے سکتے ہیں لیکن آپ کا عرب ان پر غالب ہے اور ان میں اتنی قوت بھی نہیں کہ آپ
کے سامنے لب بلا سکیں شاید اگر وہ ایسا کر سکتے تو یہی فنی اور فوت کہلاتے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں، یہ بات ہرگز نہیں۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ صاحب فوت تھے، انہوں نے حسی بتوں کو
توڑ پھوڑ کر دکھ دیا تھا۔ اے لوگو! تمہارے سامنے بھی پانچ بت ہیں۔ پانچ معنوی بت اگر تم ان بتوں کو توڑنے میں کامیاب
ہو جاؤ تو ”فوت“ کہلاؤ۔“

کسی نے سوال کیا۔ ”پانچ معنوی بت کون کون سے ہیں؟“
آپ نے جواب دیا۔ ”پہلا بت نفس، دوسرا ہوا و ہوس، تیسرا شیطان، چوتھا ثبوت اور پانچواں دنیا ہے۔“

لوگوں نے نعرہ تحسین و آفریں بلند کیا اور بڑی دیر تک بے حال رہے۔ آپ فوت اور فنی پر بڑی دیر تک بولتے رہے۔
☆☆☆

آپ ایک عرصے تک اپنی تعلیمات اور تشریحات سے لوگوں کی تفریح بجاتے رہے۔ آپ زندگی کے ہر شعبے پر کھلی تنقید
کر دیا کرتے تھے، چنانچہ کسی فقیہ کو دیکھتے اور اس سے چند باتیں بھی کر چکے تو بڑے انوس سے فرماتے کہ حج معنوں میں
فقیر وہ ہے جس کے دل کا حجاب دور ہو چکا ہو۔“
مختلف صوفیوں اور عالموں کے بارے میں سوالات لے کر لوگ حاضریاں دیتے اور آپ ان سب کو اپنے مدلل اور ...
دل نہیں جواب سے خاموش اور مطمئن کر دیتے۔

آپ آخری عمر میں زندگی سے بے زار ہو گئے تھے اور جب 686 ھ میں آپ نے وصال فرمایا تو ہر طرف ایک کہرام
مچ گیا۔ آپ کے عقیدت مند روتے روتے بے حال ہو گئے لیکن وہ آفتاب عظمت و بزرگی ایک بار جو فنا کی وادی میں اترا تو
پھر بھی واپس نہ آیا۔ یوں تو کبھی کو مرنا ہے اور ہر روز لوگ مرتے رہتے ہیں لیکن ابوالعاس کی وفات آفتاب کے غروب
ہو جانے کی طرح تھی۔ چاروں طرف غلوں کی بدلیاں چھا گئیں اور لوگ اپنے دامنوں اور رداؤں میں منہ چھپا چھپا کر رو لیا
کرتے تھے۔

کہانی کے قارئین محاذ

سید ابوالحسن ندوی	ابن اثیر	منہاج سراج	علامہ عبدالوہاب	ابو جعفر ریاض ندوی	المسعودی
-------------------	----------	------------	-----------------	--------------------	----------

اقوال زریں

- ☆ برے لوگوں کے ساتھ بیٹھے سے تنہائی بہتر ہے۔
- ☆ کم بولنا عقلمندی ہے۔
- ☆ مصیبت کا شکوہ نہ کرو اس سے اللہ تعالیٰ ناراض اور دشمن خوش ہوتا ہے۔
- ☆ علم ایک ایسا بادل ہے جس سے رحمت برتی ہے۔

مرسلہ: محمد صفدر معادویہ، خانیوال

چھوٹے سے ناؤں میں زلزلہ زدگان کے لیے کچھ امداد جمع کی گئی ہے۔ کنولس اس ناؤں میں میز کا انکشن لڑنے والا تھا اور بہت زیادہ مقبول بھی تھا۔ اس نے امدادی مہم خود ہی منظم کی تھی جس کے بعد لوگوں نے اسے امداد دینا شروع کر دی۔ جب امداد جمع ہو گئی تو ناؤں ہال میں باضابطہ میٹنگ ہوئی اور کنولس ریگلو اوسکیو نے ڈنڈے داری لی کہ تمام رقم خود پاکستان کے شمالی علاقوں میں جا کر امدادی کام کرنے والوں کو دے گا۔ ناؤں ہال میں موجود لوگوں نے زبردست تالیاں بجا لیں۔ کنولس کی شان میں تقریریں کی گئیں جو اپنا وقت نکال کر اسلام آباد جانے کے لیے تیار تھا کہ امدادی رقم دلا کر وہاں تک پہنچا دے۔

یہ ساری باتیں مجھے الفریڈ وین کا سی نے بتائیں۔ الفریڈ میرا پرانا دوست تھا۔ ہم دونوں لندن کے ایک قلیٹ میں ایک ساتھ مقیم تھے۔ وہ ایک پب میں کام کرتا تھا اور میں چیئرنگ کر اس کے علاقے میں ایک پاکستانی ریسٹورنٹ میں بھرتا تھا۔ ان دنوں ہم دونوں لندن اسکول آف اکنامکس میں پڑھ رہے تھے۔ وہ انکسٹریچر پڑھنے آیا تھا اور میں سوشیالوجی میں ماسٹر زکر رہا تھا۔ ہم دونوں کی خوب جتنی تھی۔

یونانی لوگ بھی خوب مسالے دار کھانا کھاتے ہیں۔ تیز مرچیں، بہت سارا گوشت، ان کی اپنی ایک خاص قسم کی پیاز ملی ہوئی روٹی ہوتی ہے، اوپر سے شراب کے گلاس، نہیں بلکہ چار۔ الفریڈ کو میرے پکائے ہوئے چاول اور پاکستانی ہوٹلوں کا نان بہت پسند تھا۔ ہم دونوں کی خوب دوستی تھی۔ دونوں ساتھ گھومے، ساتھ ہی بہت سی شراب بھی پی اور بہت سی لڑکیوں دوستیاں بھی کیں۔ میرے عشق عام طور پر ناکام ہو جاتے تھے اور الفریڈ کی تلاش میں لڑکیاں گھومتی رہتی تھیں۔ اس کی شخصیت میں بڑی جاذبیت تھی۔ وہ

پیدا کی عاشق تھا اور کمال کاروان پرور۔

پاکستان واپس آنے سے چھ ماہ پہلے میں الفریڈ وکے ساتھ یونان بھی گیا، اس کے ماں باپ، دادا، دادی اور نانا، نانی سے ان کے گاؤں جا کر ملا۔ وہ بڑے گرم جوش لوگ تھے، بہت پیار سے ملے اور ایسے ہی خاطر کی جیسے ایبٹ آباد میں میرے گھر والے کرتے۔

الفریڈ نے تو مجھ سے اور اپنی بہن سے کہا بھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو بچھیں، ڈیننگ کریں اور مجھ سے اس نے ہنس کر کہا کہ یونان والے مجھے داماد بنالیں گے۔ اس کا خیال تھا کہ میں بھی اتنا ہی پاگل ہوں جتنا کہ یونانی پاگل ہیں۔

شاید اس کی بہن کو میں نہیں جانا یا اور یا جو داس کی خوب صورتی گرم پوچی دچی اور جاذب نظری کے میں اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر سکا کہ پاکستان واپس جانے کا پروگرام ختم کر دوں اور یونان کا داماد بن جاؤں۔

وہ ایک جتنے کی دلچسپ ملاقات تھی۔ شاید پانچ سا شعلہ دونوں طرف جلا، الفریڈ نے ہوا دینے کی کوشش بھی کی مگر یہ شعلہ آگ نہیں بن سکا۔ میں واپس لندن پھر لندن سے ایبٹ آباد آیا۔ ایبٹ آباد میں ہی میں ایک تنظیم میں شامل ہو گیا اور علاقے کی ترقیاتی سرگرمیوں کے کاموں میں لگ گیا۔

الفریڈ وکے بارے میں ملاقات میں اس کی بھی بات پر ہوتی رہتی تھی۔ پھر اچانک یہ زلزلہ آ گیا۔ ہمارے علاقے میں ایسے ہنگامی حالات بھی نہیں آئے، میں نے زندگی میں ایسی افراتفری نہیں دیکھی، دیکھتے دیکھتے ایبٹ آباد، مانسہرہ، بالا کوٹ، مظفر آباد، بشام میں دنیا بھر کے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ پاکستانی اداروں کے علاوہ فرانس کے ڈاکٹروں کی عالمی تنظیم کے ڈاکٹر، کینیڈا اور امریکا کے فوجیوں کا میڈیکل کیمپ، روس، یوکرین کے ڈاکٹر اور نرسیں، ترکی، ایران، سعودی عرب اور امارات کی ٹیم اور نہ جانے کون کون سی تنظیمیں آتی چلی گئیں۔

میں سب سے زیادہ کیوبا کی ٹیم سے متاثر ہوا۔ سیکڑوں کی تعداد میں یہ لوگ آگئے تھے اور انہوں نے نئی گروپوں کی شکل میں اپنے آپ کو منظم کیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر، نرس، سرجن، کارڈینل، آپریشن تھیٹر، فیکٹیشن، ڈسپینری، فارماسسٹ، پلاسٹر کرنے والے، صفائی کرنے والے وغیرہ وغیرہ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ یہ لوگ کہیں بھی رہنے کو تیار تھے، کسی بھی جگہ پر اپنے ٹینٹ لگا کر گرم ٹھنڈے پانی کی فکر سے بے نیاز۔ خدمت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

ہمارے پاکستانی ڈاکٹر اگر کچھ کر رہے تھے تو کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ یہ تو ہمارے اپنے لوگ تھے، ہم نہیں کرتے تو کون کرتا۔ کیوبا سے کیا تعلق تھا ہمارا، انہیں کیوں لکھی ہماری۔ ان ہنگامی حالات میں، میں نے یہ بھی دیکھا کہ بہت سے پاکستانی ڈاکٹر دو دن بھی کام نہیں کر سکے کہ انتظامات اچھے نہیں ہیں، پانی گرم نہیں ہے، رات بڑی ٹھنڈی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور تو اور کچھ لوگ تو صرف تصویریں کھینچنے آئے اور ٹیلی ویژن ماہر بن کر ایسی باتیں کرتے تھے کہ مجھے غصہ کم اور ہنسی زیادہ آتی اور اپنی قوم کے بڑے لکھے لوگوں کی حرکتوں اور ذہنی افلاس کو دیکھ کر نفوس ہوتا تھا۔

ہماری حکومتوں نے پچاس برسوں میں نہ پانی مہیا کیا، نہ سیوریج سسٹم اور نہ ہی پرائمری ہیلتھ کیئر۔ ہمارا علاقہ تو سیر و تفریح کی ایک ایسی جگہ تھی جسے ایک اغوا شدہ طوائف کی طرح لوٹا گیا ہو۔ عوام کی قسمت جیسی پہلے تھی اب بھی ویسی ہے۔ اب زلزلے کے بعد اربوں کی امداد آئی تھی اور حکومت امداد کو اپنے طریقے سے خرچ کر رہی تھی، اسی طریقے سے جیسے حکومتیں کرتی ہیں۔ کاش میرے بس میں ہوتا کہ میں بلائنگ کرنے والوں سے کہتا کہ کچھ نہ کریں صرف صاف پانی اور سیوریج کا نظام بنا دیں۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں تک پہنچتی ہیں سڑکیں پہنچا دیں، سبک ہیلتھ یونٹ کی بندوبست کرنا، پرائمری ہائیڈرو پمپ کی مرمت کرنا، دہاں ڈاکٹر اور نرسیں کا انتظام کر دیں۔ مگر یہ سارے کام تو بہت ہی چھوٹے کام تھے اور حکومتیں چھوٹے کام نہیں کرتی ہیں۔ ان کے بڑے کام ہوتے ہیں، میگا پروجیکٹ، موٹر وے، ایٹم بم، کالا باغ ڈیم وغیرہ وغیرہ۔

کنولس انرپورٹ پر آسانی سے مل گیا، وہ چھوٹے قدامت مونا سٹا گور اپنا آڈی تھا، بولتا بہت تھا اور اس کی انگلیں بھی اچھی تھیں۔ میں اسے انرپورٹ سے سیدھا مانسہرہ لے جانا چاہ رہا تھا مگر اس نے کہا کہ اسے جیڑت ہوئی ہے ہو کر جانا ہے۔ ہم لوگوں نے میری بحث میں چائے پی۔ کنولس نے کاؤنٹر پر کچھ معلومات حاصل کیں اور پھر ہم لوگ مانسہرہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ رات تنظیم کے دفتر کے مہمان خانے میں گزری تھی۔ کنولس نے بتایا کہ الفریڈ واکل کل بڑا سحانی بن گیا ہے۔ اس نے اپنے شہر کے بہت سارے قصبے سناے۔ اس نے بتایا کہ کس طرح سے الفریڈ نے اسے کہا تھا کہ پاکستان کے لیے میسج جمع کرے اور اس طرح سے انکسٹری سے پہلے ہی وہ توجہ کا مرکز بن گیا اور اب انکسٹری میں اس کی کامیابی تھیں تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کے چھوٹے سے ساحلی شہر کے

لوگوں نے کئی طریقوں سے زلزلہ زدگان کے لیے چندہ جمع کیا۔ پورٹ کے ملازمین اور اسکول ٹیچروں نے ایک دن کی تنخواہ دی، اسکول میں بچوں نے اپنے جمع کیے، شہر کے ہر دکاندار نے ایک ایک دن کی آمدنی کا تیس فیصد دیا اور اب اس کے پاس ستانوے ہزار یورو تھے جس کو اس نے یہاں خرچ کرنا تھا۔ یہ ساری باتیں اس نے ناشتے کی میز پر ہی کر لیں۔

ایک چھوٹے سے یونانی شہر میں پاکستان کے زلزلہ زدگان کے لیے اتنی رقم بھی جمع ہونا بڑی بات تھی۔ اس نے الفریڈ وکے بارے میں یہ بھی بتایا کہ وہ سیاست میں جانے

قارئین متوجہ ہوں

پرچا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایکٹیوٹیوں کا کردار بھی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

- ☆ بک اسٹال کا نام، پتہ، پرچا کے منسلک نام۔
- ☆ شہر اور ضلع کا نام۔
- ☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCCL یا سہیل انون نمبر

رابطہ اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت

C-63 فی 11 سینٹیشن ڈسٹری بیوٹنگ اتھارٹی بین کورنگی روڈ، کراچی

سرگرمیوں کی تلاش میں رہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

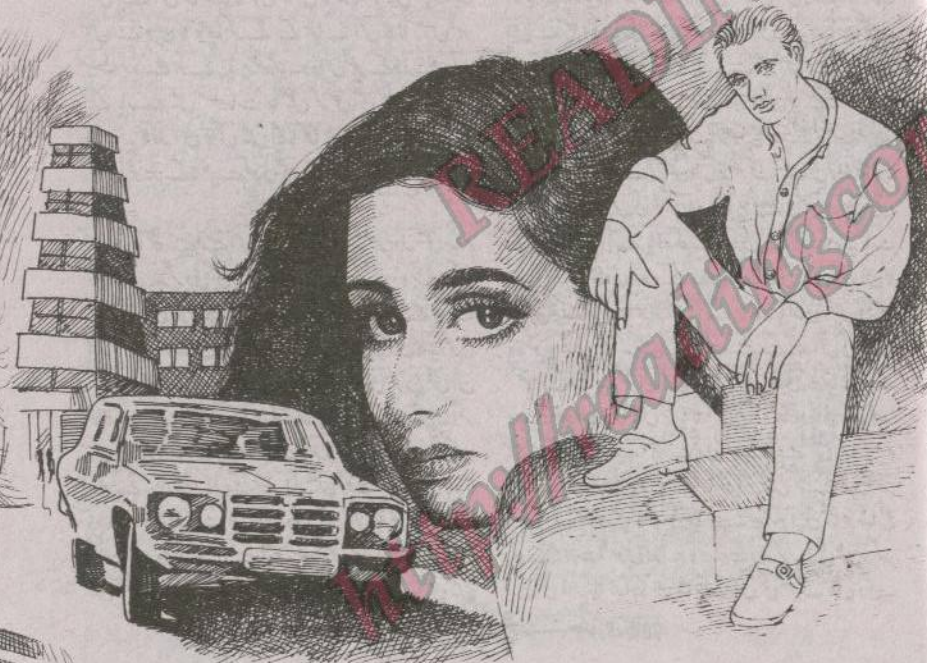
چھان بین

تنویر ریاض

جس طرح ایک دنیا انسان کے اندر اور دوسری باہر آباد ہوتی ہے اسی طرح سرحدوں کے اس طرف اور اس کی دوسری جانب زندگی کا رنگ ڈھنگ بھی ذرا الگ ہوتا ہے۔ اس نے مغربی ماحول میں آنکھ کھولی اور اس کی رنگینوں میں گم ہو گئی... اس کے باوجود کوئی ایک رنگ بھی اس کی شناخت نہ بن سکا حتیٰ کہ عاشقوں کی ایک لمبی فہرست تیار ہو گئی مگر کوئی ایک نام بھی آخری نہ ہو سکا۔

جیون ساتھی کی تلاش اور چھان بین میں جیون تمام کرنے والی ایک دو شیزہ کی سراغ رسانی

جب لینا نے جمیری کو اس کے پارٹنٹ کی بلڈنگ کے باہر کھڑی ارغوانی رنگ کی وین میں سوار ہوتے دیکھا تو اسے حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی۔ اس وین کی ڈرائیور والی سائڈ پر سفید رنگ سے میڈولارک نمبر لکھا ہوا تھا۔ یہ واقعی غور طلب بات تھی کہ جمیری اس وین میں کیوں سوار ہوا تھا، کیونکہ اس سے پہلے اس نے اسے ہمیشہ سفید رنگ کی سیدان کار چلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ لینا نے اس وین کو بھی اپنے ذہن میں موجود دوسرے سواہلوں کی فہرست میں شامل



ضرورت نہیں ہے بلکہ کولس کی مہانداری بھی بند کر دی جائے۔ یہ رویہ بالکل بھی قابل قبول نہیں تھا۔

الفریڈو نے زیادہ بات نہیں کی مگر اس کے لہجہ کا غصہ بتا رہا تھا کہ اسے بہت افسوس ہوا ہے۔ اسی وقت میں نے کولس کو جیسی کرا دی۔ اس نے میرے اس یکا یک فیصلے پر حیرت کا اظہار کیا مگر الفریڈو کے فون کے بعد وہ اس بات پر راضی ہو گیا کہ وہ فوراً ہی اسلام آباد چلا جائے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ میریٹ ہوٹل میں ٹھہرے گا۔

اسے میں نے ایک ہفتے بعد میریٹ ہوٹل میں ہی دیکھا۔ میں ڈبلوائچ اسے کی ایک مینٹگم کر کے باہر آکر بیٹھا تھا کہ مجھے وہ نظر آیا ایک کئی ناظم کے ساتھ۔ ان کے ساتھ دو عجیب قسم کی عورتیں بھی تھیں۔ بڑے بے ڈھنگے طریقوں سے وہ سب ہنس رہے تھے، مجھے یقین تھا کہ ان سب نے چڑھائی ہوئی ہے۔

وہ مجھے دیکھ کر میرے پاس آیا، ہاتھ ملایا اور بولا کہ میں نے پیسے ان لوگوں کو دے دیے ہیں۔ مجھے رسید بھی مل گئی ہے اور آج رات میں واپس جا رہا ہوں۔ میں کچھ نہیں کہہ سکا۔ کیا کہتا، گڈ لک بول کر آ گیا۔ میں اس ناظم کو جانتا تھا، اس کے بہت سے قصے مشہور تھے۔

دو ماہ بعد الفریڈو کا فون آیا، اس نے جانی بگئی کہ اس نے کولس کو پچھلے دنوں میں غلطی کی تھی۔ اس نے کولس کی بات اور ہے، میرے یا تمہارے چاہنے اور نہ چاہنے سے لوگ اپنا جسم بیٹا بند نہیں کریں گے۔ یہ تو چلتا رہا ہے اور چلتا رہے گا۔ اگر پاکستان جا کر وہ کسی طوائف کے ساتھ وقت گزارتا ہے تو کسی کو بھی تکلیف نہیں ہونی چاہیے لہذا میں نے تمہاری بات منی میں اڑادی تھی لیکن کولس نے جو جعلی رسید کی بات کی کہ وہ قابل برداشت نہیں تھی اور نہ ہو سکتی ہے۔ لوگوں کی جمع کی ہوئی رقم میں خیانت نہیں ہونی چاہیے۔

اس نے مجھے ہنس کر بتایا کہ مقبول ہونے کے باوجود کولس میز کا ایکشن ہار گیا ہے۔ الفریڈو نے ہی اس کے خلاف ہم چلائی تھی، لوگ ہر بات معاف کرنے کو تیار تھے لیکن یہ انہیں منظور نہیں ہوا کہ مالی بدعنوانی میں اس کا ساتھ دیں۔ لوگوں نے اس کے خلاف ووٹ ڈالا۔ وہ اپنے شہر کا میئر کی بدعنوان کو کیسے بناتے۔

مجھے کولس کے ساتھ بیٹھا ہوا ناظم یاد آ گیا جس نے اسے جعلی رسید بھی دی، طوائفیں بھی میپا کیں اور ایکشن بھی جیت گیا تھا۔

کے بارے میں سوچ رہا ہے اور اس کی حیثیت بہت مضبوط ہے کیونکہ اس کا نام ایک ایماندار صحافی کی طرح جانا جاتا ہے۔ میں حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔

اخبارات میں خبر تھی کہ مانسہرہ سے مظفر آباد کے راستوں پر ٹرک روک کر زبردستی امدادی سامان چھین لیا گیا ہے۔ ایک ناظم نے سامان اپنے گھر پر اتار لیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے افسوس ہوا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ جب لاکھوں لوگ زلزلے کا شکار ہو گئے ہوں، زندہ جسم لمبوں کے گھپ اندھیروں میں آہستہ آہستہ دم توڑ رہے ہوں، انسان، انسان کو لوٹے یہ تو بڑا اندھیرا ہے۔

شام کو عجیب بات ہوئی، میں نے کولس کے لیے مری میز کی کچھ یونٹوں کا انتظام کر دیا تھا جنہیں اس نے اچھے یونائیٹوں کی طرح پانی سمجھ کر خوب پیا۔

شام کو اس نے فرمائش کر دی کہ کسی لڑکی کا بندوبست کیا جائے۔ میں سمجھا وہ مذاق کر رہا ہے لیکن جب میں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی تو اس نے کہا کہ لڑکی کا مطلب ہے کہ کسی طوائف کا انتظام ہو۔ مجھے سخت غصہ آیا اور میں نے سختی سے کہا کہ وہ ایسی فرمائش نہ کرے تو بہتر ہے۔ ساتھ ہی میں نے اسی وقت الفریڈو کو فون بھی کیا اور اسے کولس کی فرمائش بتائی۔

الفریڈو نے فون بند کر کے مجھے خود لکھی ہوئی کیا اور دوسری طرف سے اس کے ہنسنے کی آواز آرہی تھی اور اس نے ہنسنے ہوئے کہا کہ اس کا جواب تو بہت آسان ہے۔ اسے کہہ دو کہ تم طوائف کا بندوبست کر سکتے ہو۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ مجھے اس کے ہنسنے پر تھوڑی حیرت ہوئی۔

دوسرے دن کولس نے کچھ اور ہی فرمائش کر ڈالی۔ اس نے کہا کہ دو دن اس نے کام دیکھ لیا ہے، دو دن میں وہ واپس جانا چاہتا ہے۔ جتنی رقم اس کے پاس ہے اس سے ہم لوگ مزید شٹ خریدیں اور اس کا انتظام چلائیں۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ کسی بھی شٹ بستی کے سامنے اس کی تصویر لے لی جائے۔ دوسری فرمائش یہ تھی کہ اسے ستانوے ہزار یورو وصول کرنے کی رسید دی جائے جبکہ وہ ہمیں چواہیس ہزار یورو دے گا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

میں نے رات پھر الفریڈو کو فون کیا۔ میں نے طوائف کے سلسلے میں اس کے رویے کی شکایت بھی کی اور کولس کا نیا مطالبہ بھی بتایا۔ مجھے ایسا لگا جیسے الفریڈو کی زبان کسی نے کاٹ دی ہے۔ تھوڑی دیر توقف کے بعد اس نے بڑے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا کہ کولس کو جعلی رسید دینے کی

کر لیا جن کے جوابات ابھی ملنا باقی تھے۔ وہ ابھی تک ججری کی بہت سی باتوں کو نہیں سمجھ پائی تھی مثلاً جب اس سے کوئی سوال کیا جائے تو وہ اس کا جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیتا تھا۔ اس کے اپارٹمنٹ میں کافی کی میز پر مختلف نوعیت کے رسالوں کا ڈھیر بھی اس کی کچھ سے باہر تھا۔ وہ ان تین تصویروں کے بارے میں بھی جانتا چاہتی تھی جن میں وہ ایک چھوٹے سے طیارے کے ساتھ کھڑا ہوا تھا اور جسے وہ اپنی ذاتی ملکیت بتاتا تھا جبکہ اس کے اپارٹمنٹ میں موجود فرنیچر کرائے کا تھا۔ اس کا اندازہ لیتا تو اس وقت ہوا جب وہ اپنے چشمے کا کس اٹھانے کے لیے فرش پر جھکی تو اس کی نظر کاؤچ کے نیچے لگے ہوئے کپڑوں کے انبار پر پڑی اور اب یہ زسری وین کا معاملہ سامنے آ گیا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ اس کا کاروبار ہو لیکن ججری نے بھی اس کے بارے میں بتایا نہیں۔ ججری سے اس کی ملاقات کو دو مہینے سے بھی کم کا عرصہ ہوا تھا لیکن اس دوران ایسی بہت سی باتیں سامنے آئیں جن کی چھان بین ضروری تھی۔

ججری ججری کی وین روانہ ہوئی، لیتا نے بھی فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب شروع کر دیا پھر اس کی نظر گھڑی پر پڑی۔ ایک بنگ کر پچاس منٹ ہو رہے تھے اور وہ اس کا تعاقب جاری رکھتی تو اسے اپنے کام پر پہنچنے میں دیر ہو جاتی۔ ویسے بھی اسے اس تعاقب کا کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے وین کا پیچھا کرنے کے بجائے اس کا لائسنس نمبر سینٹ پر رکھے ہوئے پیڈ پر لکھ لیا۔ وہ اس نمبر کے ذریعے وین کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتی تھی لیکن فی الحال اسے یہ کاغذ اس فائل میں لگانا تھا جو اس نے مسٹر ججری جیس جونیئر کے نام سے کھولی تھی۔

☆☆☆

آٹھ مہینے پہلے اس نے ہوائے فریڈ نمبر سولہ یعنی سام کی فائل بند کر دی تھی۔ وہ چھوٹا ہونے کے علاوہ بڑبولا بھی تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ اس کے بعد درجہ بڑھے ہوئے اعتماد کو دیکھ کر بے چینی محسوس کرنے لگی تھی۔ مثلاً اس کا یہ دعویٰ کہ وہ پیشہ ور کارکن ڈرائیور ہے چکا ہے، کسی طرح بھی ان حالات سے مطابقت نہیں رکھتا تھا جو وہ دیکھ رہی تھی۔ اگر اس کا دعویٰ سچ ہوتا تو وہ ڈرنر کے بعد کار چلاتے ہوئے ایک حادثے سے بال بال نہ بچتا۔ اگر تین وقت پر دوسری کار کا ڈرائیور ہوتا تو وہ نہ دکھاتا تو دونوں کاروں کا ٹکراؤ نہ ہوتا تھا لیکن اس وقت تک اسے اتنا شعور نہیں تھا کہ پہلی ملاقات میں قائم ہونے والے تاثر پر بھروسہ کر سکے کیونکہ ماضی میں

بھی اس طرح کے تجربات ناکام ثابت ہوئے تھے۔ اگر اس میں لوگوں کو سمجھنے کی پرکھ ہوتی تو صرف چوبیس سال کی عمر میں وہ مسرہواں تعلق قائم نہ کر رہی ہوتی۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ اب تک اس نے جتنے لوگوں سے بھی دوستی کی، ان سب نے اس سے اپنے بارے میں کچھ نہ کچھ چھپایا جس کی وجہ سے ہر تعلق ٹوٹا چلا گیا۔ یہی بھی وہ سوچتی کہ کاش اس کے پاس ایسا آلہ ہوتا جس کے ذریعے وہ لوگوں کے عہد جان سکتی۔ اس طرح کم از کم وہ ان بے نتیجہ تعلقات سے محفوظ رہ سکتی تھی۔

ہوائے فریڈ نمبر چودہ یعنی جبکہ کی مثال سامنے تھی۔ اس نے لیتا سے بہت سی باتیں چھپا رکھی تھیں لیکن لیتا نے باتوں باتوں میں بہت کچھ جان لیا۔ مثلاً اس کے ایک دوسری عورت سے بھی تعلقات تھے اور اس نے وقتی طور پر سینڈی سے ملنا چھوڑ رکھا تھا۔ وہ حیران تھی کہ جبکہ ایک جانب تو اس سے تعلق قائم کیے ہوئے تھا اور دوسری جانب دوبارہ سینڈی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی وجہ اسے بعد میں کسی اور ذریعے سے معلوم ہوئی کہ اسے یہاں پسند نہیں بلکہ وہ ان سے نفرت کرتا تھا جبکہ لیتا کو اپنی باتوں میں ”نے“ سے بہت پیار تھا اور جتنی دیر وہ صبر پر رکتی تھی اس سے ایک منٹ کے لیے بھی الگ نہ ہوتی۔ یہ بات اگر وہ خود لیتا سے کہہ دیتا تو شاید اسے زیادہ صبر نہ ہوتا لیکن اس وقت ہوا جب اس نے میٹنگ کی پارٹی میں دوسرے لوگوں سے یہ بات کہی۔ لیتا جانتی تھی کہ وہ بھوت بول رہا ہے اور اس نے محض اپنی حرکت پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ جواز تلاش کیا ہے۔

کچھ ایسی طرح کا معاملہ بارہویں نمبر کے ہوائے فریڈ راجر کا تھا۔ جبکہ کے برعکس اس کا صرف ایک ہی راز تھا اور اسی لیے لیتا کو اس کی فائل دوبارہ پڑھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کہ وہ اسے یاد رکھ سکے۔ اس نے لیتا سے یہ بات چھپائی کہ وہ شادی شدہ ہے۔ اس ایک خانی کے علاوہ ان کا تعلق شیک ٹھاک انداز میں آگے بڑھ رہا تھا اور اس وقت وہ سوچا کرتی تھی کہ شاید راجر سے ملنے کے بعد اس کی تلاش ختم ہوئی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کام کی زیادتی کا پیمانہ کر کے وہ ملنے کا وعدہ پورا نہیں کر پاتا جس پر وہ خفا ہو جاتی۔ یہ عہد اس وقت کھلا جب راجر نے فون کر کے اسے مطلع کیا کہ وہ وعدے کے مطابق اس کے ساتھ ڈرنر نہیں کر سکے گا کیونکہ اسے ایک ضروری کام پر گیا ہے۔ لیتا کو اپنی شام ضائع ہونے کا بہت افسوس ہوا وہ یوریت دور کرنے کی خاطر گھر سے نکلی اور بلا ارادہ ہی شاپنگ مال کی طرف چل دی۔

جہاں اس نے راجر کو اپنی بیوی کے ساتھ شاپنگ کرتے دیکھا۔ اس کے بعد بھی اگر وہ سچ بیان کر دیتا تو وہ کاؤنٹی ریکارڈ آفس کا چکر لگانے سے بچ جاتی۔ جہاں اس نے راجر کی شادی کا سرٹیفکیٹ تلاش کر لیا۔ اسی طرح رجسٹرار کے دفتر سے بھی تصدیق ہوئی کہ راجر جس مکان میں رہتا تھا، وہ راجر مینٹن اور جین تھامس بیٹن کی مشترکہ ملکیت ہے۔

ماضی کے انہی تجربات کی روشنی میں اس نے فیصلہ کیا کہ گھر واپس جانے سے پہلے وہ ایک چکر ساتویں اسٹریٹ پر واقع پیپولگ کے دفتر کا بھی لگالے۔ ججری کا کہنا تھا کہ وہ اسی سوئٹ ویز جینی میں کام کرتا ہے۔ اس نے پارکنگ لاٹ میں اس وین کو تلاش کیا لیکن اس کی جگہ اسے ججری کی سفید سینڈن کھڑی نظر آئی۔ اس نے سوچا کہ شاید وین جینی کی ہو پھر اسے خیال آیا کہ فون کر کے معلوم کرنا چاہیے کہ وہ دفتر میں ہے یا نہیں۔ وہ گاڑی چلاتے ہوئے سڑک کے آخری کونے پر واقع شاہنگ مال میں گئی جہاں سے اس نے اپنے فون کے ذریعے اس کا نمبر ملا لیا۔ اس تین کے ساتھ کہ وہ اس سے بات کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

☆☆☆

لیتا تیزی سے سڑکیاں چھوٹی ہوئی دوسری منزل پر اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچی جو اب کے درختوں سے گھری ایک پرانی عمارت تھی۔ وہاں اس کی طرف جاتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لیے اپنی باتوں میں غلطی کے بارے میں سوچنے لگی۔ ادھر کھلی آنکھوں سے اس کا استقبال کیا۔ پھر اس نے عقبی کمرے کا دروازہ کھولا جہاں لکھنے کی میز اور ایک فائل کیبنٹ رکھی ہوئی تھی۔ پہلے یہ میز ٹیبل روم میں رکھی ہوئی تھی لیکن اکثر اس کے دوست کافی پینے یا اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے ساتھ چلے آتے تو اسے یہ پریشانی لاحق ہو جاتی کہ کہیں وہ ان فائلوں کو نہ بڑھ لیں جس میں اس نے ان کے بارے میں تمام تفصیلات لکھ رکھی ہیں، ویسے تو وہ اپنی فائلوں کے بارے میں بھی کوئی چیز نہیں لکھ رہی تھی۔ کوئی کاغذ رکھا رہ جائے جس پر کسی بارے کے میں کوئی خاص بات درج ہو جیسا کہ کئی مہینے پہلے ہوائے فریڈ نمبر سولہ یعنی سام کی آمد کے موقع پر ہوا تھا۔

وہ ڈرنر کے بعد اس سے معذرت کر کے ہاتھ روم تک گئی۔ واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ سام اس کی میز کے گرد منڈلا رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ کیا تلاش کر رہا ہے پھر اسے یاد آیا کہ اس نے ایک کاغذ پر یونائیٹڈ ٹرانز لائن کا فون نمبر درج کیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اگلے روز صبح فون

کر کے وہ تصدیق کرے گی کہ آیا وہ واقعی بزنس ٹور پر میکسیکو جا رہا ہے۔ راجر والے تجربے کے بعد وہ کسی پرانی آسانی سے بھروسہ نہیں کر سکتی تھی۔ ویسے بھی سام کا رہن سہن اسے کھلتا تھا۔ اس کی تنخواہ تیس ہزار ڈالر سالانہ تھی لیکن وہ قیمتی سوٹ پہنتا اور ریجن روور جیسی مہنگی گاڑی اس کے استعمال میں تھی۔ وہ اس معمولی تنخواہ میں سے سب کچھ افرڈ کر رہا تھا۔ کیا اس کا گزارہ ادھار پر تھا یا اس کا کوئی اور بھی ذریعہ آمدنی تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا ہوائے فریڈ کوئی غیر قانونی کام کرے۔

سام میکسیکو ضرور گیا لیکن کہنی کے کام سے نہیں جیسا کہ اس نے لیتا کو بتایا تھا بلکہ وہ منشیات کی تجارت کرتا تھا۔ پولیس اس سے پوچھ گچھ کر رہی تھی اور سام کے ساتھ تعلق کے نتیجے میں وہ بھی صرف پولیس ہی نہیں بلکہ ایف بی آئی کی نظروں میں بھی مشتبہ قرار پائی۔ وہ خود ڈیلیوری سروس میں کام کرتی تھی اس لیے پولیس کو شبہ تھا کہ وہ ایک ایسے شخص کی... آلو کاربن سکتی ہے جو منشیات لے جانے اور اس کی سپلائی کا کام کرتا ہو۔ وقتی طور پر تو وہ پولیس اور ایف بی آئی کے لوگوں کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گئی لیکن اس کے ساتھ ہی سام اور اس کا مختصر تعلق بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

لیتا نے میز کے اوپر لگے ہوئے پاکس میں سے ایک نیا فولدر نکالا۔ اس میں ایک نیا چھپا ہوا ججری جیس جونیئر نمبر سترہ کے الفاظ لکھ دیے۔ پھر اس نے رائٹنگ پیڈ سے ایک کاغذ چھڑا اور اس پر وین سے متعلق وہ تمام تفصیلات لکھ دیں جو اس نے اپنی کار میں رکھے ہوئے پیڈ پر درج کی تھیں پھر اس نے ججری کے دفتر جانے اور وہاں پارکنگ لاٹ میں وین کے بجائے اس کی سینڈن کار کی موجودگی کے بارے میں بھی لکھا۔ اس کے علاوہ اس نے ججری سے متعلق وہ چھوٹی مونی باتیں بھی لکھ دیں جو وہ اب تک نوٹ کرنی آئی تھیں لیکن وہ اتنی اہم نہیں کہ اس کی وجہ سے ججری کی فائل کھولی جائے۔ آخری کتہ جو اس نے تحریر کیا، وہ اس فون کال کے حوالے سے تھا جو اس نے دوپہر پونے تین بجے فون سے کی تھی اور اس کے جواب میں استقبالیہ ٹکڑے لکھے تھے۔ ”نہیں، ججری جیس جونیئر نام کا کوئی شخص یہاں کام نہیں کرتا۔“

لیتا کو ججری سے ملنے ہوئے ڈیڑھ ماہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ اس مختصر مدت کے دوران کئی سوالات اس کے ذہن میں ابھرے۔ موت کو اسے ججری کے ساتھ ڈرنر کرتا تھا۔ ججری نے بتایا تھا کہ اسے دیر تک دفتر میں کام کرنا ہوا گا۔ اس لیے

بہتر ہوگا کہ وہ کسی ریسٹوران میں ملیں۔ لیٹانے آخری بار آئینہ دیکھ کر اپنے سر پر نظر ڈالی۔ سیاہ چست لباس میں وہ خاصی پُرکشش لگ رہی تھی پھر وہ دل ہی دل میں ان سوالوں کو دہرائے لگی جو وہ ڈرنے کے دوران اس سے کرنے والی تھی مثلاً یہ کہ ان دنوں وہ کس سوئٹ ویزر مٹھوے پر کام کر رہا ہے۔ اس کا جہاز کہاں کھڑا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

جیسے ہی وہ ریسٹوران کی پارکنگ لاٹ میں پہنچی، اسے جبری کی سیڈ ان نظر آئی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے چیلے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے کام سے سیدھا یہاں چلا آیا ہے۔ لیٹا کو دیکھ کر وہ اپنی کار سے باہر نکل آیا اور گرم جوش سے مصافحہ کرتے ہوئے اسے اپنے قریب کر لیا۔ ”تمہیں یہاں دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے؟“ وہ اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔

”اوہ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تمہیں کم از کم اتنی فرصت تول گئی کہ میرے ساتھ ڈرنے کے چلے آئے۔“ ایک لڑکی نے انہیں ان کی میز تک پہنچا دیا۔ لیٹا اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”آج کا دن کیسا لڑا؟“ ”ہمیشہ کی طرح مصروف، سرکھانے کی بھی فرصت نہیں ملتی اور تم کیا کرتی رہیں؟“

”میرا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے..... ویسے تمہاری کمپنی کیسے لگتی ہے؟“ وہ خود کلامی کے انداز میں اسے کمپنی کی مصنوعات وہاں کام کرنے والوں کی تعداد اور... ہارڈ ویئر کے بارے میں بتانے لگا، ان میں سے کچھ نام اسے جانے پہچانے لگے۔ اس نے سوچا کہ شاید وہ ان کے بارے میں پہلے بھی ریڈیو پر سن چکی ہے۔ وہ اپنا ہوم ورک مکمل کر کے آیا تھا اور لیٹا دل ہی دل میں اس کی ذہانت کی معترف ہوئی۔ اس نے کمپیوٹر کے بارے میں مزید کچھ سوالات کیے پھر موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں کتنی بار اپنے جہاز کے ذریعے سفر کرنا ہوتا ہے؟“

”ہفتے میں ایک یا دو بار۔ جب کام سے تھوڑی فرصت مل جائے۔ تمہارے لیے کیا مٹگو اؤں؟“ ”ابھی نہیں۔“ وہ بولی۔ ”کیا ذاتی جہاز رکھنا مہنگا شوق نہیں؟“

”ہاں۔ اس کے اندھن، دیکھ بھال اور پارکنگ فیس پر ہی کافی خرچ ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں اپنے لیے بجھے ہوئے پارے اور چھین مٹگو اؤں۔“

لیٹا نے سنیو کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”میرا خیال ہے

کہ یہی ٹھیک رہے گا۔ یہاں کی ہر چیز یہی اچھی ہوتی ہے، چونکہ جہاز رکھنا کافی مہنگا ہے۔ اسی لیے تمہیں دیر تک کام کرنا پڑتا ہے۔“

جبری کی بھوس تن گئیں اور لیٹا کو یوں لگا شاید اس نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ جبری جہاز کی ملکیت اور دیر تک کام کرنے کے بارے میں جھوٹ بول رہا ہے لیکن اس کا مقصد اس کی دل آزاری نہیں تھا۔ اس لیے بات بناتے ہوئے بولی۔

”کیا یہ ممکن ہے کہ تم کبھی مجھے اپنے ساتھ فلائنگ پر لے چلو؟“

”یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ یقیناً میں تمہارے ساتھ جانا پسند کروں گا۔ کیا تم نے یہاں کی سائنس چھٹی کئی کھائی ہے؟“ ”ہاں اچھی ہوتی ہے۔ یہ تو بتاؤ کہ تمہارا جہاز کہاں کھڑا ہوا ہے؟“

”مقامی ایئر پورٹ پر، میرے لیے وہ جگہ مناسب ہے۔“ اس نے مینیو بتا دیا اور اسے میز پر رکھتے ہوئے اس کی جانب جھکتے ہوئے بولا۔ ”اب تم مجھے اپنے دن کے بارے میں بتاؤ۔“

کوئی جواب دینے سے پہلے لیٹا نے بقیہ سوالات پوچھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور فیصلہ کیا کہ آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ باقی کے سب سوالات اس نے کبھی نہ پوچھنا چاہیے۔ لیٹا نے بھی مہربانی کی ضرورت ہوتی ہے بالکل اس ماہر آثار قدیمہ کی طرح جو مسلسل کھدائی کرتا ہے اور زمین کی گہلیں صاف کر کے ماضی کے نشانات تلاش کرتا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ حال کی حقیقت جاننے کے لیے تحقیق کر رہی تھی۔ جب وہ کھانے کا آرڈر دے چکے تو وہ اسے اپنی دہری بھر کی مصروفیات کے بارے میں بتانے لگی کہ وہ کہاں کہاں گئی اور اس نے کیا چیزیں لوگوں کو پہنچائیں، وہ بڑے شوق سے سن رہا تھا۔

جب بیرابل نے کرایا تو وہ دان کا آخری گھونٹ لے رہی تھی۔ اس نے کن انگوٹوں سے جبری کے چہرے کا جائزہ لیا اور فیصلہ کر لیا کہ کل اس کی چھٹی ہے۔ اس لیے وہ اس کا جہاز دیکھنے ضرور جائے گی۔

☆☆☆

رات کو سونے سے پہلے اس نے پڑھنے کے لیے ایک کتاب کھولی۔ وہ اکثر خاتون جاسوسوں کی کہانیاں پڑھا کرتی تھی اور ان کتابوں سے اسے بعض اوقات بڑے اچھے آئیڈیاز مل جاتے تھے مثلاً روپ بدلنے کے لیے وگ کتنی کارآمد ثابت ہوتی ہے اور کس طرح سرکاری فائلوں

سے کسی کے بارے میں معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس نے جبری کی کافی کی میز پر بھی اس طرح کے جاسوسی ناول دیکھے تھے۔ ممکن ہے کہ اسے بھی جاسوسی کا شوق ہو۔ ویسے وہ... مطالعے کا شوقین معلوم نہیں ہوتا تھا۔

اس لیے وہ اسے لائبریری میں دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ جب اسے یہ پرانی بات یاد آئی تو اس نے بسز پر بڑی فائل اٹھائی اور اس میں اس ملاقات کی تفصیل تلاش کرنے لگی۔

جبری سے اس کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ لائبریری میں میکینیکو کے بارے میں معلومات اکٹھی کر رہی تھی۔ وہ اس شہر کے بارے میں جاننے کے لیے.... بے چین تھی جہاں سام پڑا گیا تھا۔ اس کی انگلیاں نقشہ پر ان راستوں پر گردش کر رہی تھیں جن کا تذکرہ اخبارات میں سام کی گرفتاری کے بعد آیا تھا۔ اس نے وہ تمام تراشے کاٹ کر سام کی فائل میں لگا دیے تھے۔ جبری اس وقت لائبریری کے اس حصے میں تھا جہاں جغرافیہ سے متعلق کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ اس کے پاس سے نئی مرتبہ گزر چکا تھا بلکہ ایک مرتبہ تو ان دونوں کا ٹکراؤ بھی ہو گیا۔ جبری نے بڑی شامی سے اس سے معذرت کی اور بولا کہ کیا وہ میکینیکو کے سفر کا ارادہ رکھتی ہے۔ رفتہ رفتہ تعلقات بڑھنے لگے اور چند دنوں بعد وہ ایک دفعہ دوبارہ ملاقات کی۔

لیٹا شروع شروع میں کافی محتاط تھی۔ اس نے جبری کو اپنا فون نمبر دیا اور نہ ہی اپنے بارے میں کوئی تفصیل بتائی۔ وہ اس سے ملنے کے لیے ایسے مقامات کا انتخاب کرتی جو نسبتاً محفوظ ہوں اور جہاں سے کسی خطرے کی صورت میں نکلنا آسان ہو۔ جبری کے معاملے میں اس کی خاص طور پر یہ کوشش تھی کہ وہ پہلے اس کے بارے میں اچھی طرح چھان بین کرے۔ اس کے بعد ہی اسے بیش قدری کا موقع دے گی۔ جبری جیسے لوگ بہت آہستہ آہستہ چلتے ہیں اور وہ مطمئن ہی کہ اسے اپنی کوششوں میں کامیابی ہو رہی تھی۔

☆☆☆

لیٹا نے بلیک ایوی ایشن کا بورڈ دیکھا اور اپنی گاڑی مقامی ایئر پورٹ کے توسیعی حصے میں واقع پارکنگ لاٹ میں کھڑی کر دی۔ اس نے اخبار میں فلائنگ کے تربیتی کورس کا اشتہار دیکھا تھا اور اگر کوئی اس سے یہاں آنے کی وجہ پوچھتا تو وہ بڑی آسانی سے کہہ سکتی تھی کہ وہ بھی اس کورس میں شرکت کرنا چاہتی ہے۔ کار سے باہر آنے سے پہلے لیٹا نے اپنی وگ درست کی جس نے اس کے سہری بالوں کو چھپا

لیا تھا۔ سینٹ سے بنے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے اسے چھوٹے جہاز کھڑے ہوئے نظر آئے۔ سائے میں اس کی اونچی ایڑی کی کھٹ کھٹ واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ وہ عام طور پر اونچی ایڑی کے جوئے نہیں پہنتی تھی لیکن اس وقت اپنے پانچ فٹ تین انچ کے قدم میں مزید تین انچ کا اضافہ کرنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ اس روپ میں جبری بھی اسے نہیں پہچان سکتا تھا۔

رن وے بالکل خالی تھا اور چند اوجیر عطر کے افراد ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ وہ ان کھڑکیوں کی جانب بڑھی جہاں سے جہازوں کا نظارہ اچھی طرح کیا جاسکتا تھا۔ اس نے انہیں قطار در قطار دیکھنا شروع کیا۔ پہلے وہ ان جہازوں کو تلاش کرنے لگی جو سفید رنگ کے تھے اور ان پر نیلے رنگ کی دھاریاں بنی ہوئی تھیں پھر اس نے ان جہازوں پر لگے نمبر پڑھنا شروع کیے۔ اسے جس نمبر کے جہاز کی تلاش تھی، وہ تیسری قطار میں نظر آ گیا۔

”کیا میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں؟“ اسے اپنے عقب سے ایک آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو وہاں ایک اوجیر عطر شخص کھڑا ہوا تھا اور اس کی جیکٹ پر لگے ہوئے چرچ لکھا ہوا تھا ”بلیک فلائنگ سروس۔ ٹیڈ۔“

”اوہ ہاں۔“ وہ تھوڑا سا پریشان ہوتے ہوئے بولی۔ ”میں ٹیڈی کورس میں حصہ لینا چاہتی ہوں۔ اس مسئلے میں جاننا چاہتی ہوں۔“

”ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں۔ میں تمہیں معلوماتی کتابچے دیتا ہوں۔ اس میں تمہیں ساری تفصیل مل جائے گی۔ آؤ میرے ساتھ، اس نے اپنے چھوٹے سے کمین کی جانب اشارہ کیا۔

”ایک اور سوال؟“

”ہاں۔ ہاں۔ پوچھو۔“

”کیا یہ سب جہاز تربیتی مقاصد کے لیے ہیں یا ان میں کوئی ذاتی طیارہ بھی ہے؟“ اس نے رن وے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اس میں دونوں طرح کے طیارے ہیں، زیادہ تر جہاز لوگوں کے ذاتی استعمال میں ہیں لیکن ان میں سے کئی ایک تربیتی مقاصد کے لیے کرائے پر بھی دے دیے جاتے ہیں تاکہ ان کی دیکھ بھال کے اخراجات پورے ہو سکیں۔“ ”اس جہاز کے بارے میں کیا کہو گے جس پر سفید اور نیلی دھاریاں بنی ہوئی ہیں۔ یہ میں اس.... لیے پوچھ رہی ہوں کہ میرے ڈیڑی بھی اسی طرح کے جہاز میں مجھے

فلاننگ کے لیے لے جاتے تھے۔“

”یہ شیرون تھارن کا ذاتی جہاز ہے جسے وہ خود ہی استعمال کرتی ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ وہ اس جہاز کو کرائے پر نہیں دے گی۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ خود ایک مہنگی کی مالک ہے لیکن تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں کئی ایسے جہاز ہیں جو کرائے پر مل سکتے ہیں۔“

”کیا وہ کسی دوسرے شخص کو بھی اپنا جہاز اڑانے کی اجازت نہیں دیتی؟“ لینا نے پوچھا۔

”کبھی کبھار خاندان کے لوگوں کو یہ موقع مل جاتا ہے۔“ لینا کو یقین تھا کہ اس کے پاس جہاز کا جو نمبر ہے وہ غلط نہیں ہو سکتا۔ اس نے یہ نمبر جیمز کی کمرے میں آویزاں تصویر سے ذہن نشین کیا تھا۔

جب لینا کین سے باہر آئی تو اس نے ایک عورت کو اس جانب آتے ہوئے دیکھا۔ اس کے لمبے بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ اس نے سیاہ رنگ کا بند گلے کا سوٹر، خاکی چٹلون اور کیڑوں شوز پہن رکھے تھے۔ اسے دیکھ کر لینا کو جیمز کی یاد آگئی۔ لینا نے اپنے حواس پر قابو پایا اور یوں ظاہر کرنے لگی جیسے پرس میں جا بیاں تلاش کر رہی ہو۔ جب وہ عورت اس کے قریب سے گزر گئی تو اس کے کانوں پر آواز آئی۔

”گڈ مارننگ، ٹیڈ!“

”تم سچی ہو س تمہارے؟“ ٹیڈ نے خوش اخلاقی سے کہا۔

☆☆☆

اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچ کر لینا نے وگ اتاری اور اپنے بال سنوارنے لگی پھر اس نے فریق سے کولڈ ڈرنک نکالی اور اس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگی۔ تازہ دم ہونے کے بعد وہ اپنی میز پر بیٹھا کہ جو کچھ اس نے دیکھا اور سنا تھا، اس کا اندراج کر سکے۔ پہلی ہی نظر میں اسے اندازہ ہو گیا کہ کچھ گڑبڑ ہے، وہ اپنی فالوں کو ترتیب سے رکھنے کی عادی تھی۔ اس کے علاوہ وہ میز کی دراز کو ایک ایچ کھلا چھوڑ دیتی تھی تاکہ اگر کسی نے اسے چھیڑا ہو تو پتا چل جائے۔ اس نے جلدی سے فائل کی سینٹ کھولا تاکہ دیکھ سکے کہ نمبر سترہ کی فائل اکی جگہ پر ہے جہاں وہ رکھ کر گئی تھی۔

فائل کے صفحات پلٹتے ہوئے اسے ایک معمولی سی شگن نظر آئی۔ وہ ایک نئی فائل تھی اور اس پر ایسے کی نشان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ گزشتہ شب اس نے یہ فائل اپنے بستر پر رکھی ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ اس

کی لمبی کا پنجر اس پر پڑ گیا ہو۔ لمبی کا خیال آتے ہی وہ اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ کہاں چلی گئی۔ ورنہ نے تو اسے دیکھتے ہی دوڑتی ہوئی اس کے پاس آ جاتی۔ اس نے فائل کو ہاتھ بستر کے نیچے سے اس کے کھٹکے کی آواز آئی۔

لینا نے اسے پچکارا تو اس نے بستر کے نیچے سے جھانکنا شروع کیا پھر آہستہ آہستہ اس کا دھڑ بڑانے لگا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ نے بھی اس طرح نہیں سمجھتی تھی جب تک وہ خوفزدہ نہ ہو۔ یوں کی یہاں نہ آیا ہو لیکن ایسا کون ہے جو ان فالوں تک پہنچنا چاہے گا کہ کوئی بھی ان کے بارے میں نہیں جانتا۔

”یہ انتہائی نامعقول حرکت ہے۔“ وہ اسے گود میں اٹھاتے ہوئے بولی پھر کچن میں آکر اسے رات کی بیٹی ہوئی مچھلی کھائی اور سوچنے لگی کہ ابھی اسے مزید جا سوئی کہانیاں پڑھنے کی ضرورت ہے اور یہ کہ وہ آئندہ بھی فائل کی سینٹ کو تالا لگا کر نہیں بھولے گی۔

اپنی میز پر واپس آکر وہ ایک بار پھر جیمز کی فائل دیکھنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جیمز نے اس سے جھوٹ کیوں بولا۔ وہ ظاہر اس کی ملکیت نہیں تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے جہاز کا نمبر پڑھنے میں غلطی ہو گئی ہو۔ اس نے اس نمبر کو دوبارہ چیک کرنے کا فیصلہ کیا لیکن کیسے کیسے اسے اسے فائل سے الگ کرے۔ اسے شک رہی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ اس میں بھی اسے کام کرتا ہو اور اپنی وین کے ڈرائیور کے اسامان لے جاتا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی دوسرے مقام پر کام کرتا ہو اور استقبالی کلرک اسے نہ جانتی ہو، یہ بات وہ آسانی سے یا استقبالی کلرک کو دوبارہ فون کر کے معلوم کر سکتی تھی۔

فائل بند کر کے اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اگلے روز جیمز کا تعاقب کرے گی۔ اگر وہ اپنے ٹرک میں گئی تو پہچان لی جائے گی۔ وہ اسے مقصد کے لیے اپنی سفید رنگ کی چھوٹی کار استعمال کر سکتی تھی جس پر کوئی بھی توجہ نہ دیتا۔ وہ اس کار میں بیٹھ کر اس کے اپارٹمنٹ کے باہر بھی انتظار کر سکتی تھی اور ضرورت پڑنے پر وہاں سے کھسک بھی سکتی تھی۔ بہر حال اسے اگلے روز کچھ سوالات کے جوابات درکار تھے۔

☆☆☆

وہ ہیشاڑ اسٹریٹ سے ہوتی ہوئی ویٹنگن جانے کے لیے بائیں جانب مڑنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اس نے جیمز کو اپنے اپارٹمنٹ کے پارکنگ لائٹ میں اسی وین کے ساتھ کھڑا دیکھا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ وہ اسی لیے وقت سے پہلے آگئی تھی تاکہ اس کے گھٹنے سے

پہلے وہاں پہنچ جائے۔ اب اگر وہ اپنے منصوبے کے مطابق ویٹنگن جانے کے لیے بائیں جانب مڑی تو اسے جیمز کی سامنے سے گزرتا پڑتا اور اگر وہ اپنی وین پارکنگ لائٹ سے نکال رہا ہو تو اس سے ملنے کا بھی امکان تھا۔

اس نے بائیں جانب مڑنے کا ارادہ ترک کر دیا اور انتظار میں رہی کہ دائیں جانب کا ٹریفک گزر جائے تو وہ ہیشاڑ اسٹریٹ پر سیدھی چلتی رہے گی۔ جیسے ہی آخری کار گزری، اس نے اپنا اسٹیریٹنگ دائیں جانب کاٹا۔ عین اسی وقت ایک کار اس کے عقب میں آگئی اور اس کا ڈرائیور زور زور سے ہارن بجانے لگا وہ بہت جلدی میں تھا اور اس سے ایک سینڈ بھی انتظار نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے اسے ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور اپنی گاڑی آخری کار کے پیچھے لگ لی۔ جب وہ چوراہا پار کر رہی تھی تو اس نے اسی گاڑی کے ہارن کی آواز دوبارہ سنی۔ اب وہ بے صبراً ڈرائیور اس کے بائیں ہاتھ سے گزر رہا تھا۔ عین اسی وقت لینا کی نظر جیمز پر پڑی جہاں اسے دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دور جانے کے بعد اس نے پوٹرن لیا اور آہستہ آہستہ کار چلاتی ہوئی ہیشاڑ اسٹریٹ پر آگئی۔ اسے سڑک کے کنارے کچھ جھاڑیاں نظر آئیں۔ جہاں وہ آسانی اپنی کار کھڑی کر سکتی تھی اور وہاں اس کے دیکھنے کے لیے جانے کا امکان بہت کم تھا۔ وہ عین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ جیمز نے اسے دیکھ لیا ہوگا، اس نے اپنے آپ کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ جیمز اس وقت اس کی آمد کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا، لہذا اس نے اسے نہیں دیکھا ہوگا۔

اس نے ایک بار پھر جیمز کی اپارٹمنٹ کی طرف دیکھا۔ اسے وین کی آگنی نشست پر ایک لیپ ٹاپ اور ایک سوٹ کیس رکھا ہوا نظر آیا۔ اس نے جیمز، ہنٹ اور ٹینس شوژ پہن رکھے تھے جس کا مطلب تھا کہ وہ کام پر نہیں بلکہ کہیں اور جا رہا ہے۔ وہ اپنے گروپشن سے خاصاً متاثر نظر آ رہا تھا اور وین کا معائنہ کرنے کے ساتھ ساتھ پارکنگ لائٹ کا بھی جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے اس انداز سے لینا کو شک گزرا کہ شاید وہ دیکھ لیتی تھی۔

جیمز نے وین اسٹارٹ کی اور پارکنگ لائٹ سے باہر آ گیا۔ لینا نے بھی اپنی کار دائیں جانب موڑی اور کچھ فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرنے لگی۔ جیمز کی وین اور اس کی گاڑی کے درمیان دو کاریں تھیں جو آگے چل کر دائیں جانب مڑ گئیں اور جب وہ ایک سکنل پر رے تو لینا کی کار جیمز کی وین کے بالکل پیچھے تھی۔ وہ تھوڑا سا پیچر سیٹ کی

کھجور

☆ جلد بضم ہونے والی غذا ہے۔

☆ توانائی فوری طور پر بحال کرتی ہے۔

☆ کمزوری دور کرتی ہے۔

☆ رنگ نکھارتی ہے۔

☆ خون پیدا کرتی ہے۔ دانتوں اور موٹوں کو مضبوط کرتی ہے۔

☆ سردی کے لیے مفید ہے۔

☆ زخموں کے لیے مفید ہے۔

☆ بلغم کو خارج کرتی ہے۔

☆ دل کے امراض کو رفع کرتی ہے۔

☆ معدے کے زخموں کے لیے مفید ہے۔

☆ قبض کا بہترین علاج ہے۔

☆ پیٹ کے کڑے مارتی ہے۔

☆ کھجور کھانے والے کی نظر کمزور نہیں ہوتی اور

☆ سب سے بڑھ کر کھجور کھانا سنت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

☆ مرحلہ۔ رانا شاہد، سید اشرف (پچھلی)

جانب جھک گئی اور سر پر بھی ٹوپی آگے کر لی۔ اسے امید تھی کہ اگر جیمز نے اپنی وین میں لگے بائیں جانب کے شیشے میں دیکھا تب بھی وہ اسے نہیں پہچان سکے گا۔

وہ جیمز کی وین کا پیچھا کرتے ہوئے ساتویں اسٹریٹ پر واقع کیسول لاک کے دفتر تک جا پہنچی۔ جیمز نے اپنی وین پارکنگ لائٹ میں کھڑی کی اور بھی لینا کی نظر وین کی دائیں جانب لکھی ہوئی عبارت پر گئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں بھی میڈولارک نرسری کے الفاظ تحریر ہوں گے لیکن وہاں عبارت مختلف تھی۔ اوپر چلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ جیمز کی جیس تھارن سینٹر اور اس کے نیچے چھوٹے حروف میں میڈولارک نرسری کے الفاظ درج تھے۔

اسے یاد آیا کہ ٹیڈ نے جہاز کی مالکن کا نام شیرون تھارن بتایا تھا جبکہ وین پر جیمز کی جیس تھارن سینٹر کا نام لکھا ہوا تھا اور وہ جس شخص سے ملاقاتیں کر رہی تھی اس کا نام جیمز کی جیس جونیئر تھا۔ اگر اس کے نام میں تھارن کا اضافہ کر دیا جائے تو ان تینوں کے بیچ ایک تعلق پتا نظر آتا ہے۔ یہ ایک پرانی وین کی جو یقیناً ان کے باپ کی ملکیت رہی

ہوگی۔ شیرون اس کی بہن ہوگی۔ ٹیڈ نے بتایا تھا کہ اس کی اپنی ایک بیٹی بھی ہے۔

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے چھ بج چکے تھے۔ ایک گھنٹے بعد اسے اپنے کام پر پہنچنا تھا۔ وہ گھر واپس آئی تو اسے یاد آیا کہ اب جبری سے اس کی ملاقات اگلے روز رات سے پہلے نہیں ہو سکتی کیونکہ انہوں نے پہلے سے فلم دیکھنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ یونیفارم تبدیل کرنے کے دوران اس کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ وہ شام کو گھر واپس آنے کے بعد جبری کے لیے چاکلیٹ کی ایک تیار کرے گی اور اسی بہانے آج رات ہی اس سے ملنے چلی جائے گی اور اس طرح اس کے بارے میں کچھ مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس نے سوچا کہ وہ ٹیلی فون کر کے اسے بتا دے کہ شام کو اس کے لیے چاکلیٹ ایک لے کر آئے گی۔

نمبر ڈائل کرنے کے بعد دوسری جانب سے ایک کھسی پنی آواز سنائی دی۔ ”یہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں ہے براہ کرم صحیح نمبر ملائیں۔“ لیٹا نے دو تین بار وہ نمبر ڈائل کیا لیکن ہر مرتبہ یہی جواب ملا۔ یقیناً کوئی غلطی ہوئی ہے۔ کچھ دیر پہلے تو اس نے جبری کو اس کے اپارٹمنٹ سے نکلنے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت لیٹا کو کام پر جانے کی جلدی تھی۔ اس نے وہ جبری کے اپارٹمنٹ پر گئی لیکن وہ کئی گھنٹے سے وہاں سوچا کہ وہ جے کے وقت میں اسے چیک کرے گی۔

☆☆☆

اس نے اپنا ٹرک پارکنگ لاث میں کھڑا کیا اور عمارت کی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی دوسری منزل پر واقع جبری کے اپارٹمنٹ تک پہنچ گئی۔ دروازے پر دستک دینے سے پہلے اس نے گھڑی کی طرف دیکھا جس کا پردہ تھوڑا سا ہٹا ہوا تھا۔ اس نے جھانک کر اندر دیکھنے کی کوشش کی۔ اپارٹمنٹ بالکل خالی تھا اور وہاں کوئی سامان نظر نہیں آ رہا تھا، پھر اسے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر شخص کھڑا ہوا تھا۔

”کیا میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں؟“ اس نے پوچھا۔ وہ اسے حیرت سے دیکھتی رہی۔

”میں اس عمارت کا منیجر ہوں۔“ وہ اپنا تعارف کرواتے ہوئے بولا۔

”میں جبری جیسے سے ملنے آئی تھی۔“
”وہ آج صبح یہاں سے چلے گئے، انہیں اپنی نئی ملازمت پر پہنچنے کی جلدی تھی، کیا تم یہ اپارٹمنٹ لیتا جا رہی ہو؟“

”نہیں، کیا مجھے اس کا نیا پتا معلوم ہو سکتا ہے؟“
”نہیں۔ انہوں نے سچ ماہ کا کرایہ پیشگی ادا کر دیا تھا۔ اس لیے میں نے ان سے نیا پتا جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔“

”اوہ۔ میں سمجھ گئی۔“ یہ کہہ کر وہ مڑی اور سیڑھیاں چڑھتی ہوئی نیچے آ گئی۔

لیٹا اپنے ٹرک کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اس جگہ کو دیکھتی رہی جہاں صبح کے وقت جبری کی دین گھڑی ہوئی تھی۔ اس نے سچے گھنٹے پہلے جبری کو دیکھا تھا لیکن اب وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں لے گا۔ گھڑی پر نظر ڈالی۔ صبح کا وقت گزر چکا تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اپنے کام پر روانہ ہو گئی۔

جب اس نے گزشتہ چند روز میں رونا ہونے والے واقعات کا جائزہ لیا تو اس نے محسوس کیا کہ شاید پہلی بار ایسا ہوگا جب تعلق ختم ہو جانے کے باوجود بھی اس کی چھان بین جاری رہے گی۔ اگر واقعی وہ تعلق ختم ہو چکا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ یہ تحقیقات جاری رہنی چاہئیں۔ وہ ایک بار پھر انٹرپورٹ جانے کی اور اس وقت تک وہاں انتظار کرے گی جب تک شیرون نہ آجائے۔ وہ اس سے اس کے جہاز اور جبری کے بارے میں بہت کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی۔
”یہ جاننا کہ جبری کی موت کی وجہ سے اس کی زندگی ختم ہو کر رہ گئی ہے۔“
”میں کسی مذہبی طرح مسٹر جبری جیسے جو میری حقیقت معلوم کر کے ہی رہوں گی۔“

پارکنگ لاث سے باہر نکلے ہوئے اس نے ایک بار پھر اس اپارٹمنٹ کی جانب دیکھا جہاں جبری رہا کرتا تھا۔ اسے اپنی گردن کے پچھلے حصے میں بے چینی محسوس ہونے لگی۔ جیسے کسی کی اصلیت جاننے کی خواہش اس کے دل میں جوش مار رہی ہو۔

☆☆☆

امریکی اٹلانٹک کے جیو 747 میں دوسری قطار والی نشست پر بیٹھا جبری جیمن تھارن جو نیوز اپنے لیپ ٹاپ پر کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ اس نے اپنی رپورٹ کا خاتمہ ان الفاظ میں کیا۔ ”میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ لیٹا ڈون ووڈ کو سام کے منشیات کے کاروبار کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ لہذا کیس نمبر 248 سرکاری طور پر بند کیا جاتا ہے۔“

جبری نے فائل کو کمپیوٹر میں محفوظ کیا اور لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ اسے یہ سوچ کر ہی شرم محسوس ہو رہی تھی کہ لیٹا کسی جرم میں شریک ہو سکتی ہے۔ وہ اسے پہلے سے بھی زیادہ

چاہنے لگا تھا لیکن سام اور میکسیکو حکومت کے افسران کے درمیان رابطوں کا پتا چلانا بھی ضروری تھا۔ ایف بی آئی والے اہلکار ان کرنا چاہتے تھے کہ سام اس چین کی آخری کڑی تھا۔ آج شام تک لیٹا کو سرکاری طور پر خط مل جائے گا جس میں اسے سرکاری طور پر اطلاع دی جائے گی کہ سام کے ساتھ اس کا کاروباری تعلق ثابت نہیں ہو سکا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی ایک خط کے ذریعے اسے مطلع کر دے گا کہ اسے دوسرے شہر میں نئی ملازمت مل گئی ہے۔ امید ہے کہ اس طرح لیٹا مطمئن ہو جائے گی۔

اس کے لیے اسے بہت سوچ سمجھ کر لفظوں کا انتخاب کرنا ہوگا۔ لیٹا اپنی آسانی سے مطمئن ہونے والی نہیں تھی۔ جس طرح وہ انٹرپورٹ گئی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ اسے ماننا پڑا کہ وہ اپنے کام میں بے حد مشاق ہے۔ شاید اس کی وجہ اس کے گزشتہ تجربات ہوں۔ جبری گزشتہ دو برس سے ایف بی آئی ایجنٹ کے طور پر کام کر رہا تھا اور جب اس کے پاس لیٹا کی فائل آئی تو اس نے یہی مناسب چاہا کہ لیٹا کی حقیقت جاننے اور سام سے اس کا کاروباری تعلق معلوم کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ وہ خود سام کی جگہ لے لے اور لیٹا کا بوائے فرینڈ بن کر در پردہ اس کے بارے میں چھان بین کرے۔ اس بہانے اسے لیٹا کے پاس پہنچا۔ لیٹا اس کے ساتھ کام کرنے کے لیے اسے اس کے پاس سے اسے کوئی نہ کوئی ایسا ثبوت مل جائے گا جس سے ظاہر ہو سکے کہ لیٹا، سام کے ساتھ منشیات کے کاروبار میں شامل بھی پھر اس نے ایک دن لیٹا کی غیر موجودگی میں اس کے اپارٹمنٹ کی تلاشی لی اور وہ تمام فائیں دیکھ ڈالیں جو لیٹا نے اپنے سابق بوائے فرینڈز کے بارے میں بنا رکھی تھیں، سام کی فائل میں اس کی عادات و اطوار کے بارے میں تفصیلات، کچھ ہوائی جہاز کے ٹکٹوں کے نمبر اور اس کی گرفتاری کے بعد شائع ہونے والے مضامین کے تراشوں کے علاوہ کوئی خاص چیز نہ ملی۔ وہیں ایک فائل اس کے بارے میں بھی تھی جس سے وہ جان گیا کہ لیٹا اس کے بارے میں بھی چھان بین کر رہی ہے۔ واقعی وہ ہم جو فطرت رکھتی تھی۔

اس نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ لیٹا اس کی گرل فرینڈ نہیں بلکہ ایک مشتبہ لڑکی تھی جس کے بارے میں چھان بین کرنے کے لیے اسے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ یہ تحقیقات مکمل ہو چکی تھیں اور اب اسے اپنے میڈیکل ریکارڈز واپس جا رہا تھا۔ البتہ صبح روانہ ہونے سے پہلے وہ اپنی بہن کے دفتر ضرور گیا تھا تاکہ بتا سکے کہ یہاں اس کا کام ختم ہو چکا

ہے اور وہ اپنی دوسری ذمہ داری سنبھالنے والی جارہا ہے۔ اس نے اپنی بہن کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے اسے اپنا طیارہ استعمال کرنے کی اجازت دی۔ اس کے کام کی نوعیت ایسی تھی کہ وہ شیرون کو بھی حقیقت نہیں بتا سکتا تھا۔ لہذا اس نے اسے ایک من گھڑت کہانی بنا کر مطمئن کر دیا۔ اس میں ایک قباحت ہے یہ بھی سچی کہ سچ جاننے کے بعد شیرون کے دل میں لیٹا کے خلاف برائی بیٹھ جاتی اور وہ اس بات پر ناراض ہو سکتی تھی کہ لیٹا اس کی ٹوہ لینے کے لیے انٹرپورٹ کیوں گئی جبکہ لیٹا نے پس پردہ رہ کر تمام چھان بین کی تھی۔

یہ خیال ذہن میں آتے ہی اسے ہچکچاتا دھونے لگا۔ وہ بھی پس پردہ رہ کر لیٹا کے بارے میں چھان بین کر سکتا تھا۔ اس کا تعاقب کر کے معلوم کر سکتا تھا کہ وہ کن لوگوں سے ملتی ہے اور اس کی سرگرمیاں کیا ہیں۔ اس کی غیر موجودگی میں گھر کی تلاشی لے کر سام اور اس کے روابط کے بارے میں معلوم کر سکتا تھا۔ اس کے بوائے فرینڈ کا ڈھونگ رچانے کی کیا ضرورت تھی۔ اب اس طرح غائب ہو جانے پر وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی، یقیناً وہ اسے بھی دھوکے باز اور فریبی ہی سمجھے گی۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ روانہ ہونے سے پہلے لیٹا سے مل لیتا اور اسے کوئی بھی کہانی بنا کر ذہنی طور پر مطمئن کر لیتا۔ اس طرح کم از کم آئندہ ملنے کی گنجائش کو کافی رکھتا۔ لیکن وہ اس طرح کیوں سوچ رہا تھا کہ واقعی وہ لیٹا سے محبت کرنے لگا تھا؟ اسے لگا جیسے واقعی وہ اس کے دل میں جگہ بنا چکی ہے لیکن تیرکان سے نکل چکا تھا۔ اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ واپس جا کر لیٹا کو اصل حقیقت سے آگاہ کر دے کیونکہ وہ اپنی اصلیت ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس کے پیشہ ورانہ اصولوں کے خلاف ہوتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ لیٹا سب کچھ جاننے کے بعد اس سے نفرت کرنے لگتی اور وہ بھی یہ گوارا نہ کرتا کہ لیٹا جیسی خوب صورت لڑکی اس سے نفرت کرے۔ اس کا بہترین حل یہی تھا کہ وہ اس طارے قلعے کو ایک خوب صورت خواب سمجھ کر بھلا دے۔ اس نے تکیے سے سر اٹھا کر آنکھیں موندیں اور اپنے منہ کام کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ اس کا کام ہی نہیں بلکہ محبوب مشغلہ بھی تھا۔ وہ ہر تحقیقات کو ایک چیلنج سمجھ کر قبول کرتا اور اسے مکمل کیے بغیر چین سے نہ بیٹھتا۔ اب وہ لیٹا کی طرف سے مطمئن ہو گیا تھا۔ جانتا تھا کہ چند روز بعد لیٹا کی میز پر ایک نئی فائل کا اضافہ ہو جائے گا اور وہ اپنے اٹھارویں بوائے فرینڈ کے بارے میں چھان بین کر رہی ہوگی۔

بے ثمر مسافت

سلیم فاروقی

کہتے ہیں کہ صحبتوں سے شخصیت کا اظہار ہوتا ہے لیکن... جب شخصیت ہی بیاز کے چھلکوں کے مانند پرت پرت ڈھکی ہو تو کیسے کوئی تہ میں چھپی اصلیت کا اندازہ کر سکتا ہے۔ وہ بھی اندر سے اتنا ہی گہرا تھا جیسے سمندر... اس کے احساسات میں جتنے مدوجذب جذبات میں تلاطم اور خیالات میں بہتور تھے اتنا ہی وہ سمندر کی سطح کے مانند پرسکون نظر آتا تھا... برسات کی بودوں کی طرح کسی کی خاموش چاہت میں بھیگا ہوا کچی مٹی کے گھر میں رہ کر خوابوں کا تاج محل بنانے والا جب سمت بدل کر چلا تو قدموں کی لہر زش میں منزل کے گم ہو جانے کا خدشہ نمایاں تھا۔ شو مٹی قسمت کہ ان بدلتی رتوں میں بہکی صحبتوں نے اپنا رنگ چمایا اور اسے کسی اور ہی منزل کا راہی بنا دیا۔ پھر تو شعور کی دنیا میں جو ناممکن تھا وہ سب کچھ بہ آسانی لا شعوری طور پر رقم ہوتا چلا گیا۔ اگر اس پر ماں کی دعا کا انچل سایا نہ کرتا تو زمانے کی تپتی دھوپ اسے جلا کر خاک کر ڈالتی۔

جی چاہوں، ادھوری رفاتوں اور رشتہ رقاہوں کی بو بویاں

آہستہ آہستہ میری وحشت ختم ہو گئی اور میں ٹرین میں سفر کرنے لگا۔

میں انجینئر تھا اور امریکا کی ایک معروف انڈسٹری میں ملازمت کرتا تھا۔ بی ای کی ڈگری ہونے کے باوجود مجھے یہاں سے سرے سے انجینئرنگ کرنا پڑی تھی، کیونکہ ہمارے ملک کی پیکرز ڈگری وہاں کے بیشتر اداروں میں قابل قبول نہیں تھی۔ اس وقت میرے سامنے دو صورتیں تھیں یا تو میں اس صورت حال سے گھبرا کر وہاں سے لوٹ آتا یا پھر ان کے معیار کے مطابق وہاں کی کسی یونیورسٹی سے بی ای کرتا۔ واپس آنے کا تو میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ نہ جانے کتنے پا پڑے کے بعد تو مجھے امریکا آنے کا موقع ملا تھا۔

ایاجی نے چلتے وقت اچھی خاصی رقم میرے حوالے کر دی تھی۔ وہ پاکستان ریویوے میں اسٹیشن ماسٹر تھے اور دو سال بعد ریٹائر ہونے والے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے یہ رقم کہاں سے قرض لی تھی۔

ریل کے پھیوں کی گزر گزراہٹ سے مجھے عجیب سی وحشت، بے چینی اور اضطراب ہوتا ہے اور میں اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیتا ہوں۔ مجھے یہ آواز بہت دور، ماضی کی بھول بھلیوں میں لے جاتی ہے۔ شروع شروع میں تو یہ کیفیت ناقابل برداشت ہوتی تھی لیکن پھر آہستہ آہستہ میں نے اپنی اس ذہنی کمزوری پر قابو پایا۔ بے چینی اور اضطراب کا احساس اب بھی ہوتا ہے لیکن صورت حال اتنی ہولناک نہیں ہوتی۔

میں گزشتہ سات برس سے امریکا میں تھا۔ وہاں تو ٹرین میں سفر کرنا ہر شخص کی مجبوری ہے۔ میں نے بھی بہت مشکل سے اپنی اس کیفیت پر قابو پایا تھا لیکن ٹرین کا سفر میرے لیے خوش گوار نہیں ہوتا تھا۔ سفر کے دوران خود کو مصروف رکھنے کے لیے میں نے پہلے اخبار اور رسائل کا سہارا لیا پھر میں نے اپنے سیل فون میں ویڈیو فری لکھ لیا اور خاصی تیز آواز میں گانے سننے لگا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ

”اجنبی ملک ہے، اجنبی جگہ ہے۔“ اباجی نے کہا۔
”اے میں خدا خواست نہیں کوئی ضرورت پیش آئی تو کس سے مانگو گے؟“
”لیکن اباجی، یہ رقم تو نورین کے لیے تھی۔ وہ۔۔۔۔۔“
”اللہ مالک ہے بیٹا۔“ اباجی نے کہا۔ ”مجھ جب تک نورین کی شادی ہوگی تم بھی انشاء اللہ وہاں سیٹ ہو چکے ہو گے۔ کیا تم اپنی بہن کی شادی کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے؟“
”میں اسی لیے تو ساسند پر جا رہا ہوں اباجی۔“
”میں نے کہا۔“ تاکہ آپ لوگوں کی خدمت کر سکوں۔“ اپنی شادی کے ذکر پر نورین شرمائی تھی۔ وہ میری لاڈلی بہن تھی۔ عمر میں پورے دس سال چھوٹی تھی۔
اس دن میں دفتر سے واپس آ رہا تھا اور ہیڈ فون حسب معمول میرے کانوں میں ٹھسا ہوا تھا کہ اچانک سیل فون کی تیل بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی، وہاں اباجی کا نام تھا۔ مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔
”السلام علیکم اباجی!“ میں نے ہیڈ فون کا بٹن آف کرنے کے بعد کہا۔ ”کیسے ہیں آپ؟“
”وعلیکم السلام بیٹا۔“ اباجی نے کہا لیکن ان کی آواز میں وہ والہانہ پن نہیں تھا جو میں سننے کا عادی تھا۔ میرا سامنے بھی آچکا تھا جس نے ریشما کی آواز میں سے باہر نکل آیا۔
”سب خیریت تو ہے اباجی؟“
”ہاں خیریت ہی ہے۔“ اباجی کا لہجہ کھوکھلا تھا۔
”بس تمہاری ماں کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ وہ تمہیں بہت یاد کر رہی ہے۔“
”کیا ہوا ہے ماں کو؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔
”بیٹا اسے بہت تیر بخار ہو گیا تھا۔ وہ بخاری حالت میں بار بار تمہارا نام لے رہی تھی کہ صفدر کو بلاؤ۔“ میں۔۔۔۔۔
بے چین ہو گیا۔ میرا دل ان جانے دوسو سے دھڑکنے لگا۔
اباجی جیسے سمجھ دار آدمی سے مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ محض اماں کے بخار کی وجہ سے مجھے ٹیلی فون کر دیں گے۔ اماں جی تو اس سے پہلے بھی کئی دفعہ بیمار ہوئی تھیں لیکن مجھے اس کی اطلاع اس وقت ہوتی تھی جب وہ صحت یاب ہو جاتی تھیں۔
”اباجی!“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔
”آپ مجھ سے کچھ چھپائے مت، مجھے بتائیے کہ اماں کی طبیعت اب کیسی ہے؟ میری بات کرائیے ان سے۔“ میں

نے کہا۔
”بیٹا، وہ اس وقت تو راجا کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گئی ہوئی ہے، ابھی آئے گی تو بات بھی کرادوں گا۔“
”اباجی! آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں؟“ میں نے کہا۔ اچانک لائن کٹ گئی۔ میں نے اباجی کا نمبر کی مرتبہ ملا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ ٹیٹ ورک کام ہی نہیں کر رہا تھا۔ میں اسی پریشانی کے عالم میں گھر پہنچا۔ چھوٹے سے دو کمروں کا وہ اپارٹمنٹ میں نے اپنے ایک پاکستانی دوست لطیف کے ساتھ مل کر لیا تھا۔ لطیف وہاں کی ایک آئل کمپنی میں سپروائزر تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گیا۔
”کیا بات ہے صفدر؟“ اس نے پوچھا۔ ”تو اتنا پریشان کیوں ہے؟“
”یار، ابھی کچھ دیر پہلے اباجی کا فون آیا تھا۔ وہ بتا رہے تھے کہ اماں کی طبیعت خراب ہے۔ میں ان سے مزید تفصیل پوچھنا چاہتا تھا کہ لائن کٹ گئی۔ اب ٹیٹ ورک کام نہیں کر رہا ہے۔“
”پریشان مت ہو یار۔“ لطیف نے کہا۔ ”ماں جی انشاء اللہ خیریت سے ہوں گی۔“ پھر وہ ہنس کر بولا۔
”ٹیٹ ورک کام نہیں کر رہا ہے تو کیا ہوا۔“ تو لینڈ لائن سے ٹیلی فون کر لے۔“
”ہاں! اب پریشانی میں مجھے اس کا کیا خیال ہی نہیں آیا۔“ میں نے کہا۔
”تو فکر مت کر۔“ میں پرسوں پاکستان جا رہا ہوں، تیرے گھر جا کر سب کی خیریت معلوم کرلوں گا۔“
میں تو گو یا اس کی بات ہی نہیں سن رہا تھا۔ میں نے بریف کیس صوفے پر اچھالا اور ٹیلی فون سیٹ اپنی طرف کھدکالیا۔ پہلے میں نے سوچا کہ اباجی کے سیل فون پر کال کروں پھر مجھے نورین کا خیال آیا۔ نورین مجھے صحیح صورت حال بتا سکتی تھی۔
میں نے نورین کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجنے کی آواز آئی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ اب میری نورین سے بات ہو سکتی تھی۔ تین چار گھنٹیاں بجنے کے بعد نورین نے کال ریسیو کر لی۔ ”ہیلو۔“
”ریزو! میں صفدر بول رہا ہوں۔“
”السلام علیکم بھیا۔“ اس نے کہا۔ ”بڑی عمر ہے آپ کی۔ میں ابھی آپ ہی کو یاد کر رہی تھی۔“
”ریزو! اماں کی طبیعت کیسی ہے؟ ذرا ان سے بات کراؤ۔“ میں نے کہا۔

”بھیا۔۔۔ وہ اماں کی طبیعت۔۔۔ ٹھیک ہے۔ وہ۔۔۔۔۔“
”مجھ سے جھوٹ مت پوچھو ریزو۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اماں کی طبیعت کیسی ہے؟“
نورین اچانک رونے لگی اور بولی۔ ”بھیا۔۔۔۔۔ اماں کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ وہ اس وقت اسپتال میں ہیں لیکن ان کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔“
”اماں اسپتال میں ہیں؟“ میں نے گھبرا کر کہا۔
”ان کے ساتھ کون ہے؟“
”میں، اباجی اور راجا بھائی ہیں۔“ اس نے بتایا۔
راجا ہمارا پڑوسی تھا اور وہ ہمارے گھر کا بہت خیال رکھتا تھا۔
”بھیا۔۔۔۔۔ اباجی کو مت بتائیے گا کہ میں نے آپ کو کچھ بتایا ہے۔ وہ آپ کو پریشان کرنا نہیں چاہ رہے تھے لیکن اماں بار بار آپ کا نام لے رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اپنے بچے کو فوراً یہاں بلا لیں۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ آپ امریکا میں ہیں تو اس نے کہا کہ ٹیلی فون پر بیٹے سے ان کی بات کرادیں۔ اباجی نے آپ کا نمبر ملا یا اور آپ سے بات کر رہی رہے تھے کہ اماں جی بے ہوش ہو گئیں۔“
”اماں اتنی بیمار ہیں اور اباجی اسے معمولی بخار کہہ کر مجھے بھلا رہے تھے؟ میں پاکستان آ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم مجھ سے رابطے میں رہنا۔“ یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ لطیف اس وقت پاکستان جانے کے لیے اپنا سامان پیک کر رہا تھا۔ وہ بہت غور سے میری باتیں بھی سن رہا تھا۔
”کیا ہوا صفدر؟“ وہ گھبرا کر بولا۔ ”سب خیریت تو ہے؟“
”اماں کو ہارٹ ایک ہوا ہے۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
”اللہ رحم کرے گا۔“ لطیف نے کہا۔ ”لیکن تو دل چھوٹا مت کر۔ تو نے تو عورتوں کی طرح آنسو بہانا شروع کر دیے۔“
اس کے کہنے پر مجھے احساس ہوا کہ واقعی میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ ”لطیف! میں بھی تیرے ساتھ ہی پاکستان چلوں گا۔“
”تو پہلے چھٹی تو لے لے۔“
”میں چھٹی لے لوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”تو اس فلاحیت میں ایک سیٹ مزید پیک کر دے تو جا رہا ہے۔“
”یار! میں کوشش کرتا ہوں۔“ لطیف نے کہا۔ ”اس فلاحیت میں اب شاید ہی سیٹ ملے۔ میں نے تو ایک بچے

پہلے سے سیٹ کنفرم کروائی تھی۔“
”تو بات تو کر۔ اس فلاحیت میں تیرا کوئی دوست بھی تو ہے۔ ورنہ میں کسی دوسری فلاحیت سے جاؤں گا۔“
لطیف نے اسی وقت اپنے دوست سے بات کی اور تھوڑی بحث کے بعد بالآخر وہ سیٹ کنفرم کروانے میں کامیاب ہو گیا۔
”یار! تو پہلے چھٹی تو لے لیتا۔“ لطیف نے کہا۔ ”اگر تجھے چھٹی نہ ملی تو؟“
”تو پھر میں یہ ملازمت ہی چھوڑ دوں گا۔ ملازمت تو مجھے دوسری بھی مل جائے گی لیکن ماں نہیں ملے گی۔“ میرے سیل فون کی گھنٹی بجی تو میں چونک اٹھا۔ وہ نورین کا فون تھا۔
”ہاں نورین!“ میں نے کہا۔ ”کیسی ہیں اماں؟“
”اماں کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔“
”اماں جی سے بات کراؤ میری۔“ میں نے کہا اور دوسرے ہی لمحے اباجی کی آواز آئی۔
”ہاں صفدر بیٹا! اب تمہاری ماں کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ تم فکر مت کرو۔ یہ ریزو تو ایسے ہی گھبرا جاتی ہے۔ میں نے اسی لیے تمہیں نہیں بتایا تھا کہ تم پریشان ہو جاؤ گے۔“
”اباجی! اماں کو دل کا دورہ پڑا ہے اور آپ مجھ سے چھپا رہے ہیں؟“ میں نے کہا۔
”دل کا دورہ کہاں، انجانا کا معمولی سا ایک تھا بیٹا۔“ اباجی نے کہا۔
”میں پاکستان آ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔
”تم پاکستان ضرور آؤ۔“ اباجی نے کہا۔ ”تمہیں دیکھے ہوئے برسوں ہو گئے ہیں لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری ماں اب بالکل ٹھیک ہے۔“ پھر وہ مجھ سے میری خیریت پوچھتے رہے۔ میری جاب کے بارے میں بات کرتے رہے۔
میری وہ رات بہت بے چینی اور اضطراب میں گزری۔ صبح آفس پہنچنے ہی میں نے دو ماہ کی چھٹی کے لیے درخواست دے دی۔ کمپنی کا جی ایم خاصا معقول آدمی تھا۔ وہ میرے کام سے خوش بھی تھا پھر میں نے گزشتہ پانچ برس میں کوئی چھٹی بھی نہیں لی تھی۔ اس نے میری چھٹی منظور کر لی۔ اماں کی حالت بہتر ہونے کی خبر سن کر مجھے بھی خاصا اطمینان ہو گیا تھا۔ میرے پاس ایک دن تھا۔ میں نے اباجی، اماں اور ریزو کے لیے بہت سارے تحفے خریدے۔ راجا اور اس کے گھر والوں کے لیے بھی اور خالہ، ثمرہ، اس

کی گاڑی کا نمبر نوٹ کرتے ہوئے بولا۔ ”سر! اگر یہ آپ

— جنوری 2015ء

پچیس ایکڑ زمین اور ایک مکان تھا۔ وہ مکان اکثر بند رہا۔
سسپنس ڈائجسٹ —

القدس کے پھر سے روزانہ ان کے ہر پر پڑھنے جایا کرتا تھا۔

وہ ہمیشہ مجھ سے انگلیں میں بات کرتے تھے اور کہتے تھے کہ تم دوسروں سے بھی انگریزی میں بات کیا کرو۔ یہ مت سوچو کہ تم غلط بول رہے ہو یا سچ، بس بولتے رہو۔ تمہاری انگریزی رواں ہوگی تو انگریزی بھی بولنے لگو گے۔

میں کان میں اپنے دوستوں سے بھی انگلیں میں بات کرتا تھا۔ وہ لوگ پہلے تو میرا مذاق اڑاتے تھے پھر وہ بھی انگریزی میں بات کرنے لگے۔

فوج میں نہ جانے کا مجھے اتنا صدمہ ہوا کہ میرا دل ہر کام سے اجاٹ ہو گیا۔ میں سارا سارا دن آوارہ گھومتا رہتا۔ لاہور کا اسٹیشن کافی بڑا ہے۔ میں اسٹیشن پر چلا جاتا اور مختلف پلیٹ فارمز پر گھومتا رہتا۔ وہاں بیٹھے اسپتال والے تھے بھی مجھے پہچانتے تھے۔ میں رات گئے گھر میں داخل ہوتا اور دیر تک فلی میگزین پڑھتا رہتا یا پھر ٹی وی کھول کر بیٹھ جاتا اور چار چار بجے تک ٹی وی دیکھتا رہتا پھر میں دوسرے دن بارہ ایک بجے سے پہلے نہیں اٹھتا تھا۔ اٹھنے کے بعد میرا پھر وہی معمول ہوتا۔ میں منہ دھو کر ناشا کرتا، بہترین کپڑے پہنتا اور آوارہ گردی کے لیے نکل جاتا۔ کبھی مال روڈ، کبھی انارکلی اور کبھی یوں ہی کسی پارک میں جا بیٹھتا اور لوگوں کو دیکھتا رہتا۔ پارک میں بھانت بھانت کے لوگ نظر آتے۔ میرے لیے سب سے دلچسپ وہ ماشے تھے جو ایک اسٹینڈر مختلف تیلوں کی گاڑیاں چالنے لگتی تھیں۔ مجھے ان سے بہت محبت تھی۔ لوگ ان سے ماش بھی کرواتے تھے۔ پھر وہ کن میبلے تھے جو سر پر کپڑا اس انداز میں باندھتے تھے کہ ٹوٹی کا گمان ہوتا تھا۔ ان کے پاس میلا سا ایک تھیلّا بھی ہوتا تھا جس میں روٹی، تیل اور چھوٹی موٹی شیشیوں میں خود ساختہ دوا بھی ہوتی تھیں وہ نہ صرف کانوں سے میل نکالتے تھے بلکہ اس شخص کو میل کی چھوٹی سی گولی دکھا کر کہتے تھے کہ آپ کے کان سے یہ میل نکلا ہے۔ میں حیران ہوتا تھا کہ کسی آدمی کے کان میں اتنا میل کیسے ہو سکتا ہے؟

ایک دن میرے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ میں کان صاف کروانے بیٹھ گیا۔ کن میبلے نے بہت مہارت سے سلائی میرے کان میں ڈالی اور اسے اندر دھونے لگے۔ مجھے بہت اچھا لگا لیکن میری نظر اس کے ہاتھوں پر پڑی۔ ہر ظاہر میں آنکھیں بند کر لی تھیں لیکن آنکھیں بہت خفیف سی کھول کر اس کے ہاتھوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

اس نے مختلف قسم کی سلائیاں میرے کانوں میں ڈال کر گھما گھما کر اس نے بہت چابک دقت سے سر پر بندھے ہوئے کپڑے سے ایک سلائی نکالی لیکن اس کے

ساتھ ہی میل کی ایک چھوٹی سی گولی بھی نکال لی اور بولا۔ ”دیکھیے بابو صاحب! آپ کے کان میں کتنا میل تھا۔ آپ کو کم سے کم پچھن دس دن میں ایک دفعہ کان ضرور صاف کروانا چاہئیں۔“

”بکواس کرتے ہو تم۔“ میں پھر کر بولا۔ ”تم نے یہ میل میرے کانوں سے“ مانے؟“

”تو کیا یہ میں نے اپنے کانوں سے نکالا ہے؟“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔

”جھوٹ مت بولو۔“ میں چیخ کر بولا۔ ”میں نے کل ہی ایک ای این این کی سرجن سے اپنے کانوں کی صفائی کروائی ہے۔“ میں نے بھی ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ ”کیا تم اس ڈاکٹر سے بھی زیادہ ماہر ہو؟“

”کان صاف کروانے کے بعد آپ بہانے بنا رہے ہیں۔“ وہ تلخ لہجہ میں بولا۔ ”میرے تو ہمیں دینا ہی پڑیں گے۔“

”میں تمہیں ایک پیسا بھی نہیں دوں گا۔ تم بے وقوف بناتے ہو لوگوں کو۔“

”یہ کبھی طرح سے پیسے نکال۔“ وہ اپنی اصلیت پر آگیا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تو اس کے منہ پر چٹا رخ سے ایک ٹھنڈا رسیر کر دیا۔ وہ بھی مجھ سے لپٹ بڑا۔ میں لڑاؤ نہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ میں کو اپنے انوایتھ ہال بھیج گئے اور وہاں کے سب ایک دم مجھ سے لپٹ گئے۔

وہیں پارک کے ایک گوشے میں میری عمر کے کچھ لڑکے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے پتا دیکھ کر وہ دوڑے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک لڑکا ڈپٹ کر بولا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟ چھوڑو اسے، ایک آدمی کو ل کر اتنے آدمی مار رہے ہو؟“ اس لڑکے کی آواز سن کر ان لوگوں نے فوراً مجھے چھوڑ دیا۔ میرے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے، کلائیوں اور چہرے پر خراشیں تھیں اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔

اس نے ایک نظر میرا جائزہ لیا پھر درشت لہجہ میں بولا۔ ”کیوں مار رہے تھے اسے؟“

”انہو بھائی! اس نے کان صاف کروائے اور پیسے بھی نہیں دے رہا ہے۔“ وہ کن میلیا بولا جس نے میرے کان صاف کیے تھے۔

”یہ جھوٹا اور دھوکے باز ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس نے میرے کانوں سے نہیں بلکہ اپنے سر پر بندھے ہوئے کپڑے سے میل نکالا تھا۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو اس کا

کپڑا اتار کر دیکھ لیں۔ اس میں اب بھی میل کی گولیاں ہوں گی۔“

”اپنے سر سے کپڑا اتارو۔“ انو نے جھکمانہ لہجہ میں کہا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ سادہ لباس پولیس آفیسر ہے۔ غلطی ہو گئی انو بھائی۔“ اس نے کہا۔ ”مجھے معاف کر دیں۔“

”معافی ان صاحب سے مانگو۔“ انو نے حکم دیا۔ ”اور ہمارے لیے گرما گرم چائے اور مسوے لے کر آؤ۔“

کن میلیا میری طرف گھوما اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”مجھے معاف کر دیں۔“ پھر وہ تیزی سے چلا گیا۔

انو نے مجھ سے کہا۔ ”آپ میرے ساتھ آئیں۔“ وہ مجھے ایک طرف لے گیا جہاں پانی کا ٹنکا لگا ہوا تھا۔ اس نے میرا منہ دھلویا، میرے کپڑے صاف کیے اور مجھے اپنے پاس بٹھالیا۔ وہاں اس کے چار پانچ دوست پہلے ہی سے بیٹھے تھے۔ وہ بھی اپنے پلیٹوں سے آوارہ اور نکلے لگ رہے تھے۔ انو البتہ خامے معقول لباس میں تھا۔

اس نے ان سب سے میرا تعارف کروایا۔ ”یہ مراد ہے، یہ عقل ہے، یہ اشراف ہے لیکن ہم اسے شرف کہتے ہیں اور یہ خالد ہے۔“ پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ”میرا نام انور ہے لیکن لوگ مجھے انوکھتے ہیں، آپ کا کیا نام ہے؟“

”میں نے جواب دیا۔ یہ انوکھے میری پہلی ملاقات تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لاہور کا بہت خطرناک غنڈا ہے۔ اس نے بے شمار لوگوں کو لوٹا تھا، ان پر تشدد کیا تھا اس پر لڑکیوں کے اغوا اور زیادتی کا بھی الزام تھا لیکن اب تک کوئی بھی الزام ثابت نہیں ہو سکا تھا اس لیے وہ آزادانہ شہر میں ندنا تا پھرتا تھا۔

بہت سی لڑکیوں سے اس کی دوستی تھی۔ اس نے مجھے بھی اپنی گرل فرینڈز سے ملوایا۔ ان میں سے ایک لڑکی فوزیہ مجھے بہت اچھی لگی۔ وہ جلد ہی مجھ سے بے تکلف ہو گئی۔ اس کا تعلق اوسط درجے کے ایک شریف خاندان سے تھا۔ وہ گھر سے ملازمت کرنے لگی تھی تاکہ اپنے بوڑھے والد کا ہاتھ بٹانے لیکن نہ جانے کیسے انوکھے سے چوہ گئی۔ انو اس سے چھوٹے مولے کام لیتا تھا اور اسے خاصا معقول معاوضہ دیتا تھا پھر فوزیہ کے بعد شہناز، سلمیٰ اور عذرا میری زندگی میں آئیں۔ ان لڑکیوں کا انوکھے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ میری دوست تھیں اور میری مراد نہ وجاہت پر مرمی تھیں۔

میں ان لوگوں کو اسٹیشن پہنچنے کو کہتا پھر خود بھی اسٹیشن پہنچ جاتا۔ لاہور اسٹیشن پر بہت سی ایسی جگہیں ہیں جہاں

کوئی بھی نہیں جاتا۔ مختلف ویران جگہوں پر بولگیوں کے ناکارہ ڈبے کھڑے ہوتے تھے۔ میں چونکہ ایس ایم کا بیٹا تھا اس لیے اگر کوئی مجھے اس طرف جاتے دیکھ بھی لیتا تو... بائیں نہ کرتا۔ دو چار دفعہ بولگیوں کے ناکارہ ڈبے استعمال کرنے کے بعد تو میں بے خوفی سے یہ کام کرنے لگا۔

اب اکثر انوکھی وہیں آ جاتا تھا۔ کبھی اس کے دوست بھی ہوتے تھے۔ ہم لوگ وہاں بیٹھ کر بات چیت کرتے، مگر یہ بتاتے۔ جی ہاں، انوکھی صحبت میں رہ کر میں سگریٹ بھی پینے لگا تھا اور کبھی کبھی شراب بھی پی لیتا تھا۔ اب میں اس کے ساتھ مختلف وارداتوں میں بھی حصہ لینے لگا تھا۔ میں فطرتاً نڈر تھا اور انوکھے کے ساتھ رہ کر میں لڑائی بھڑائی کے فن میں بھی طاق ہو گیا تھا۔

لاہور ہی میں میری ایک خالہ بھی رہتی تھیں۔ برسوں پہلے کسی بات پر اماں کے تعلقات ان سے خراب ہو چکے تھے اس لیے امی ان سے ملتی نہیں تھیں۔ میں بچپن میں ایک دفعہ ان کے گھر گیا تھا۔ ماڈل ٹاؤن میں ان کا بہت بڑا گھر تھا۔ خالو خامے دولت مند آدمی تھے۔ وہ برس کرتے تھے اور اس وقت ان کی آمدنی میرے اندازے کے مطابق لاکھوں میں تھی۔ ان کی صرف دو بیٹیاں تھیں۔ اب تو مجھے ان کے نام یاد تھے نہ چہرے۔

ایک دن میں سو کر اٹھا ہی تھا کہ اباجی بہت افسردہ اور پریشان گھر میں داخل ہوئے۔ اماں بھی انہیں اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گئیں اور بولیں۔ ”کیا ہوا، خیریت تو ہے؟“

”خیریت نہیں ہے سید۔“ اباجی نے افسردگی سے کہا۔ ”تم پنڈی چلنے کی تیاری کرو۔“

”یا اللہ خیر۔“ اماں گھبرا کر بولیں۔ ”بھائی جان کے یہاں تو سب خیریت ہے؟“ پنڈی میں میرے ماموں ٹار رہتے تھے۔ وہ امی اور خالہ سے بڑے تھے۔ اکثر ہمارے گھر آتے رہتے تھے، مجھ سے تو خاص طور پر بہت محبت کرتے تھے۔

”بھائی ٹار.....“ اباجی کہتے کہتے رک گئے۔

”کیا ہوا بھائی جان کو؟“ اماں روہانی ہو گئیں۔

”بھائی ٹار..... اب اس دنیا میں نہیں رہے۔“ اباجی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”ہائے میرا پر۔“ اماں نے کہا اور چکر اکر گرنے ہی والی تھیں کہ میں نے لپک کر انہیں تھام لیا اور اٹھا کر چار پائی پڑ لٹا دیا۔ خود میرا دل بھی غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ نو رین بھی تم

ہم لوگ اسی دن چنڈی پہنچ گئے۔ ماموں سفر آخرت کے لیے تیار تھے۔ شام تک میں اپنے محبت کرنے والے ماموں کو نمونوں مٹی تلے دبا کر واپس آ گیا۔ ماموں کی چیزیں دیکھ دیکھ کر مجھے مزید اذیت ہو رہی تھی۔ وہاں خالد زینت بھی آئی ہوئی تھیں اور ان کی دونوں بیٹیاں بھی۔ خاندان کے کچھ بزرگوں نے اماں اور خالد زینت کی صلہ کر وادی بھر تو وہ دونوں ایک دوسرے سے گلگ لگ کر یوں نلک نلک کر رہیں کہ وہاں موجود ہر آدمی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ بھائی کی جدائی کا غم تھا یا بہن سے برسوں نہ ملنے کا صدمہ..... دونوں رورور کر نڈھال ہو گئیں تو پھر ماما نے ان دونوں کو سنبھالا۔

زینت خالہ کی دونوں بیٹیاں بھی وہاں موجود تھیں لیکن میں نے ابھی تک کسی پر دھیان نہیں دیا تھا۔ اس وقت نہ جانے کس کے گھر سے کھانا آ گیا۔ کھانے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن دوسروں کے اصرار پر مجھے دسترخوان پر بیٹھنا پڑا۔ ابھی میں نے پہلا ہی لقمہ لیا تھا کہ میرے منہ میں آگ سی گئی۔ تورے میں اتنی گرمی تھیں کہ میرے حلق سے لے کر کانوں تک میں آگ لگ گئی۔ میں نے ٹھہرا کر پانی کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑایا۔ اسی وقت ایک خوب صورت لقمہ میری طرف بڑھا۔ اس میں پانی کا گلاس تھا۔ میں نے گلاس لے کر پانی دینے والی کو دیکھا تو کھینچ ہی رہ گیا۔ وہ بلا کی حسین اور پرکشش لڑکی تھی۔ اس کی بولتی ہوئی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں عجب سحر تھا۔ اسے دیکھ کر میں پانی پینا بھول گیا۔ وہ ایک عجیب شان بے نیازی سے آگے بڑھ گئی۔ میں چندھوں تک گلاس ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا پھر ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا پھر مجھ میں دوسرا لقمہ لینے کی جرأت نہ رہی اور میں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

شام تک ماموں جان کے تمام دوست احباب اور ان کی فیملیہر چلی گئیں۔ اماں نے مجھے بلایا۔ وہ اس وقت بھی زینت خالہ کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ ”صفدر!“ اماں نے کہا۔ ”تم نے انہیں پچھا؟“ انہوں نے خالہ کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے خالہ زینت کو برسوں پہلے دیکھا تھا لیکن نہ پچھانے کا کیا سوال تھا۔ میں نے کہا۔ ”اماں! یہ بھی کوئی چچہ کی بات ہے، خالہ زینت ہیں۔“

”ارے، یہ صفدر ہے؟“ خالہ نے کہا۔ ”ماشاء اللہ یہ تو اپنے اباجی سے بھی لمبا ہو گیا۔“

”اور پیڑمڈ بھی۔“ میرے پیچھے سے کسی لڑکی کی

آواز آئی لیکن وہاں خاندان کی کئی لڑکیاں تھیں اس لیے مجھے علم نہ ہو سکا کہ یہ جملہ کس کا تھا۔
 ”شہرہ!“ خالہ نے کسی کو آواز دی۔ ”ادھر آؤ۔“ وہی شعلہ جوالا جکتی ہوئی وہاں آگئی۔ ”یہ میری نسیہ خالہ کا بیٹا صغیر ہے۔“ خالہ نے کہا۔ ”اور یہ میری بڑی بیٹی شہرہ ہے۔“ صغیر نے بے نیازی سے مجھے دیکھا پھر میری انداز میں سلام کر کے اسی ہی کے پاس بیٹھ گئی۔

”اور میں نے کوسم سے ہی جی ہو۔“ خا نے کہا۔
 ”ہی، میں بھی آپ کی بیٹی ہوں۔“ اچانک خوب
 صورت ہی ایک لڑکی نے آگے بڑھ کر کہا۔ اس کے چہرے
 اور سراپا دونوں میں شہرہ کی شاہت ہی لیکن حسن، دلکشی اور
 پائین میں شہرہ اس سے کہیں آگے تھی۔
 ”میں خود اپنا تعارف کروا دیتی ہوں۔“ اس نے
 مترنم لہجے میں کہا۔ ”مفتدہ بھائی! میں آپ کی کزن یعنی خالہ
 زادہ شاہ ہوں۔“ اس کے انداز میں بھجکا تپن تھا۔ یہ شہرہ
 سے میری پہلی ملاقات تھی اور اس پہلی ملاقات نے ہی مجھے
 لویا کمال کروا دیا تھا۔

ہم لوگ ماموں جان کے سوئم کے بعد واپس آ گئے۔
 البتہ اماں وہیں رک گئی تھیں۔ لاہور آنے کے بعد میری
 نظروں میں وہی منظر گھومتا رہتا کہ شہر مجھے اپنے خوب
 صورت ماموں سے اپنی کا کاٹاں پیش کر رہا ہے۔ چندی
 حد اماں بھی لوٹ آئیں اور نورین بھی۔ چندی دنوں میں وہ
 بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ میں نے کچھ دن تو ماموں جان کی
 موت کا سوگ منایا پھر میرے وہی معمولات شروع
 ہو گئے۔

ایک دن رات گئے میں گھر میں داخل ہوا تو اباجی کے کمرے سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ وہاں سے گزرتے ہوئے میں اپنا نام سن کر چونک گیا۔ اباجی کہہ رہے تھے۔ ”تم کس منہ سے صفدر کا رشتہ لے کر زینت کے یہاں جاؤ گی۔ صاحب زادے سوائے آوارہ گردی کے اور کرتے بھی کیا ہیں؟ یوں بھی بھائی مشتاق کا روبرو آدی ہیں۔ وہ بجلیاں کھائے کا سودا یوں کرنے لگے؟“

”آپ بھی ایسی باتیں کرتے ہیں۔ میرا مفرد تو
 انھوں میں ایک ہے۔ شیخ اودھ لنگا ہے بالکل۔“
 ”کوئی بھی ڈی ہوش شخص کسی کچھل شہزادے کو اپنی
 بی بی نہیں دیتا۔ شروہ پھر خوب صورت ہے۔ دولت مند باپ
 کی بی بی ہے اور اہلیہ ایسی سی گر رہی ہے۔ ہاں اگر
 اجزاہ کے میرے مشورے پر عمل کرتے اور انجینئر لگ

بڑھ رہے ہوتے تو اس صورت میں شاید یہ رشتے لے جانے پر میں بھی اعتراض نہ کرتا اور عین ممکن ہے کہ صفدر کے تابناک مستقبل کو دیکھ کر بھائی کی مشتاقی بھی انکار نہ کرتے۔“ میں بوجمل قدموں سے اپنے کمرے کی طرف آ گیا۔ وہ رات میں نے گویا انگاروں پر گزاری۔ اباجی واقعی سچ کہہ رہے تھے۔ میں آخر تھا بھی کیا؟ ایک آوارہ اور لنگھا جو سرگرتہ پیتا تھا اور لڑکیوں کی عزت بھی پامال کرتا تھا۔ اباجی کو یہ سب معلوم نہیں تھا۔ ان کے علم میں تو یہ بھی نہیں تھا کہ میں جرائم کی راہ پر بھی چل پڑا ہوں اور اپنے ساتھ ہر وقت پستول بھی رکھتا ہوں۔

میں رات بھر کمرے بیٹھ جھونکا رہا اور صبح کے بارے میں سوچا رہا۔ اذان فجر بلند ہوئی تو میں نے برسوں بعد نماز فجر ادا کی اور اللہ تعالیٰ سے رورو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ اسی وقت میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب میں ہر برا کام چھوڑ دوں گا۔ میں اپنی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دوں گا اور خود کو کوشش کے قابل بنادوں گا۔ صبح کی نماز کے بعد اباجی واپس آئے تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس دن میں نے اباجی کے ساتھ میرا ناشیا کیا اور ان سے کہا۔ ”اباجی! کیا اب بھی میرا داخلہ انجمن ترمک میں ہو سکتا ہے؟“

اباجی نے چوک کر بھیج دیا۔ پھر بولے: ”بیٹا! ایک سال تو تم نے آوارہ گردی میں صاف گزر دیا اور نہ تمہارے خیر تو ایف ایس سی میں اتنے اچھے تھے کہ تمہیں انجینئرنگ میں داخلہ بہت آسانی سے مل جاتا۔“

”اباجی! اگر کوئی طالب علم بیمار ہو جائے تو کیا اس پر تعلیم کے دروازے بند ہو جاتے ہیں؟“ میں نے کہا۔

”لیکن بیٹا! تم تو بیمار نہیں تھے۔ میں اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتا۔ پھر پوری رشتی میں اگر گنجائش بھی ہو تو وہ میڈیکل سرٹیفکیٹ مانگیں گے۔ تمہیں میڈیکل سرٹیفکیٹ کہاں سے ملے گا؟“

”اباجی امیر نے ایک دوست کے بھائی ڈاکٹر یونس میں ان سے میڈیکل سرٹیفکیٹ لینے کا ارادہ کیا۔ میں نے کہا: ”حالانکہ میرا کیا کوئی دوست نہیں تھا جس کے بھائی ڈاکٹر ہوں لیکن میں سرٹیفکیٹ حاصل کر سکتا تھا۔“

”وہ تو تمہیں بروقت خیال آیا ہے۔“ انجیئر نے کہا۔

”میرا خیال تو شروع ہونے ہی والے ہوا تھا۔“

میں اسی دن یونیورسٹی چلا گیا اور جا کر پرنسپل صاحب سے ملا۔ وہاں میرے اعتماد سے زیادہ میری انگریزی بولنے کی صلاحیت کام آئی۔ میں نے بہت اچھے نمبروں سے

ایف ایس سی پاس کیا تھا۔ میں نے پرنسپل صاحب سے بھی یہی کہا کہ میں گزشتہ سال عین اس وقت بیمار پڑ گیا تھا جب داخلے ہو رہے تھے۔

پرنس صاحب نے کہا۔ ”آپ جیسے بہترین طالب علم کو یونیورسٹی میں داخلہ دے کر مجھے خوش ہوگی۔ آپ اپنی بیماری کا مزید یکل سرٹیفکیٹ تو لا ہی سکتے ہیں؟“

”شیدو سر۔“ میں نے کہا۔ ”میں کل ہی آپ کو سرٹیفکیٹ لا دوں گی۔“

”کل ہمیں آپ سات تاریخ کو اپنے کاغذات بنھے لاکر دے دیں۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کا ایڈیشن ہو جائے۔“

میں نے اس روز انوسے کہا۔ اس نے مجھے تھمر کے ایک معروف ڈاکٹر کامیڈیکل سرٹیفکیٹ لادیا اور بولا۔ ”تو پانچ مہینے تک بیمار رہا ہے۔ تیرے سر میں شدید درد ہوتا تھا اور چکر بھی آتے تھے لیکن اب علاج کے بعد تو بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔“

یوں میرا داخلہ انجینئرنگ میں ہو گیا۔ یہ کو یا ایک مجبور
تھاور نہ انجینئرنگ اور میڈیکل میں تو اچھے سے اچھے طالب
علم کو ایڈمیشن نہیں ملتا۔ یہ شاید میری اس دعا کا اثر تھا یا حاجی
کی وسالت داری کا.....

میں دوبارہ پکرا کر مشرومہ سے چڑھ گیا۔ میں نے سب آوارہ لڑکوں سے ملنا چھوڑ دیا۔ میں نے کبھی بھی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی چھوڑ دیا۔ بس ایک انوسے میری دوستی تھی۔ وہ بھی میری مجبور تھی۔ میں اس سے دوستی ختم کرتا تو میرے خلاف بہت کچھ کر سکتا تھا۔ ہاں، اس نے مجھ پر اتنا کر ضرر کر دیا کہ وہ میری تعلیم کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنا۔ اسے سب سے زیادہ پریشانی یہ تھی کہ اسٹیشن کی ناکارہ بو گیوں والا ٹھکانا اب ختم ہو گیا تھا۔

میں اب اکثر خالد زینت کے گھر بھی چلا جاتا تھا۔ ان کا مکمل نما گھرب پہلے سے زیادہ آراستہ تھا۔ خالد مشتاق کے پاس جدید ماڈل کی ہینڈ اسٹیجھی۔ ان کے مقابلے میں میرے پاس سائیکل تھی۔ مجھے وہاں سائیکل پر جاتے ہوئے شرم آتی تھی اس لیے میں بسوں میں دھکے کھاتا ہوا دھار جاتا تھا اور کچھ فاصلے پر اتار کر کیسی لیے لیتا تھا تاکہ وہاں رہنے والوں کو میری کم مائیگی کا احساس نہ ہو۔

میں چب بھی خالہ کے کھر جاتا، تمرہ بہت لم میرے
سانے آتی تھی۔ کبھی سامنا ہو بھی جاتا تو وہ بے نیازی سے
سلام کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ جاتی۔ اس کے

برکس رمشا بہت باتوں اور شوخ لڑکی تھی۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ بے تکلف ہوئی تھی۔ میں بھی اسے بچی سمجھ کر ہی بات کرتا تھا۔ وہ اس وقت آٹھویں کلاس میں پڑھ رہی تھی۔

میں اس دن یونیورسٹی سے واپس آیا یہی تھا کہ خالہ زینت آئیں۔ حسب معمول رمشا ان کے ساتھ تھی، شمرہ نہیں آئی تھی۔ اماں نے بہت دالہانہ انداز میں ان کا استقبال کیا پھر شکایتا بولیں۔ ”باجی! کیا شمرہ آدم بیزار ہوگئی ہے یا تم نے اسے پردہ کرنا شروع کر دیا ہے؟“

”ارے نیسہ! اس لڑکی پر تو پڑھائی کا بھوت سوار ہے۔ وہ کہیں کلاس اول پوزیشن لینے کی تیاری کر رہی ہے۔“

میں خالہ زینت سے مل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ رمشا میرے پیچھے پیچھے ہی آگئی۔ اس نے چمک کر کہا۔ ”ہیلو زین! کیسے ہیں آپ؟“

”رمشا! میں تم سے پورے گیارہ سال بڑا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”تم تو مجھ سے یوں بات کرتی ہو جیسے میرے برابر کی ہو۔“ میں نے کہا۔

رمشانے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

”آپ مجھ سے گیارہ سال بڑے ہیں تو کیا ہوا؟ اور اگر آپ کو مجھ سے بات کرنا پسند نہیں ہے تو میں بھی آئندہ بات نہیں کروں گی۔“

”اوہو، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ میں نے کہا۔

”میں آپ سے گیارہ سال چھوٹی ہوں تو کیا ہوا۔ کیا میں بزرگوں کی طرح آپ کا احترام کروں؟“

اسی وقت نورین اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں آگئی اور بولی۔ ”تم یہاں کبھی بیٹھی ہو اور میں تمہیں پورے گھر میں تلاش کر رہی ہوں۔“ پھر وہ مجھ سے بولی۔ ”بھیا! ذرا خالہ جان کے ڈرائیور کو بھی چائے وغیرہ دے آئیں۔“ میں خالہ کے ڈرائیور کو چائے دینے گیا تو گاڑی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ وہ گاڑی تو نہیں جو خالہ وفاق کے استعمال میں رہتی تھی۔ خالہ جان تھوڑی دیر بیٹھ کر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں اور اماں سے بولیں۔ ”نیسہ! ابھی تم بھی ہماری طرف آ جاؤ۔ میرا بھانجا تو اکثر وہاں آتا رہتا ہے۔“

”میں بھی آؤں گی باجی۔“ اماں نے کہا۔ ”میں گھر کے کچھ بیڑوں سے فرصت ہی نہیں ملتی۔“ میرا دل چاہا کہہ دوں کہ آپ کی طرح ہمارے گھر میں تو کئی ہیں لیکن میں یہ صرف سوچ کر ہی رہ گیا۔ ان کے جانے کے بعد اماں گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔ نورین ہنسی ہوئی میرے کمرے میں آئی اور بولی۔ ”بھیا! آپ کے لیے ایک اچھی

خبر ہے۔ آپ آئیں کریم کھانے کا وعدہ کریں تو بتاؤں گی۔“

”مجھے آئیں کریم کھانا ہے تو دیے ہی تھا کھائے۔ بہانے باز یاں کیوں کر رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”میرے پاس واقعی ایک خبر ہے۔ آپ سنیں گے تو اچھل پڑیں گے۔“ اس نے کہا۔

”چل پھر تیری آئیں کریم بچی۔“ میں نے کہا۔

”لیکن اگر وہ خبر تیری دوسری باتوں کی طرح فضول ہوئی تو آئیں کریم نہیں ملے گی۔“

”اماں اور خالہ آپ کی شادی کی بات کر رہی تھیں۔“ نورین مسکرا کر بولی۔

”میری شادی کی بات؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں، وہ دونوں تو بہت آہستہ آہستہ بول رہی تھیں لیکن میں اس وقت برآمدے میں تھی اس لیے ان کی باتیں سن گئیں۔“

”ارے تو یہ کون سی بی بات ہے۔ اماں کو تو کب سے میری شادی کی فکر ہے۔“ میں نے خود پر قابو پا کر کہا۔

”بی بات یہ ہے کہ وہ دونوں آپ کی اور شمرہ باجی کی شادی کی بات کر رہی تھیں۔“

میرا دل بے اختیار زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے خود پر قابو پا کر پوچھا۔ ”میری شمرہ کی شادی؟“

”دیکھا، کیسے دل میں لڈو چھوٹ رہے ہیں۔“

”پوری بات بتا۔“ میں نے اس سے کہا۔

”پوری بات تو بتادی۔“ اس نے معصومیت سے کہا۔

”مجھے تفصیل سے بتاؤ، وہ کیا باتیں کر رہی ہیں؟“

”وہ.....“ نورین سوچتے ہوئے بولی۔ ”اماں نے خالہ جان سے کہا کہ باجی، آپ کو یاد ہے میں نے شمرہ کو بچپن ہی میں صفدر کے لیے مانگ لیا تھا۔ خالہ جان نے کہا ہاں مجھے یاد ہے۔ میں تو خود چاہتی ہوں کہ شمرہ کی شادی صفدر سے کر دوں لیکن صفدر اپنے بیروں پر تو کھڑا ہو جائے۔ ملک صاحب کو بھی تو راضی کرنا ہوگا۔“ وہ خالہ وفاق کو ملک صاحب کہتی تھیں۔

”صفدر بیٹا انجینئر بن جائے گا تو وہ بھی انکار نہیں کریں گے۔ صفدر کو تا پند تو وہ نہیں کرتے۔“

نورین کی باتیں سن کر میرا دل گویا بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ منزل خود ہی میرے نزدیک آ رہی تھی۔

میں نے ریو کو جڑانے کے لیے کہا۔ ”یہ کوئی خاص خبر نہیں ہے اور شمرہ بھی تو نہ جانے کتنی لڑکیاں یونیورسٹی میں میرے آگے پیچھے پھرتی ہیں۔“

”اب آپ اسے وعدے سے پھریں مت۔“

نورین نے کہا۔ ”ہاں اگر آپ کو شمرہ باجی پسند نہیں ہیں تو آپ اماں سے انکار کر دیں۔“

”اماں کی پسند ہے وہ۔ میں بھلا کیسے انکار کر سکتا ہوں۔“

میں نے ہنس کر کہا۔ ”خبر تو ایسی کوئی خاص نہیں ہے لیکن آئیں کریم تو مجھے کھانا ہی پڑے گی۔“ اس دن کے بعد تو میں شمرہ کے عشق میں مزید ڈوب گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں زیادہ محنت سے پڑھنے لگا۔

میں اب لاشعوری طور پر خالہ جان کے گھر بھی چلا جاتا تھا لیکن شمرہ کا رویہ عجیب تھا۔ وہ بھی سامنے آ جاتی تو بہت شائستہ انداز میں سلام کر لیتی ورنہ میرے سامنے نہ آتی۔ چاہے میں گھنٹوں وہاں بیٹھا رہوں۔ مجھے اس کا یہ رویہ عجیب سا لگتا تھا۔ مجھے تو اپنی مردانہ وجہات پر بہت ناز تھا۔ کوئی بھی لڑکی مجھ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی پھر شمرہ ایسا کیوں کر رہی تھی؟ کیا اسے بھی علم ہو گیا تھا کہ خالہ جان اس کی شادی میرے ساتھ کرنا چاہتی ہیں؟ کیا وہ مجھ سے شرماتی ہے یا پھر وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے؟ اس کے برعکس رمشا ہمیشہ میرے ارد گرد موندلاتی رہتی۔ میں اس سے شمرہ کے بارے میں کچھ پوچھنے کی کوشش کرتا تو وہ ٹال جاتی۔ مجھے معلوم ہوتا کہ شمرہ کو کوئی رنگ پسند ہے تو وہی رنگ میری پسند بھی بن جاتا۔ کئیوں سے مجھے شدید چڑھتی تھی لیکن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ قیہ اور کئی شمرہ کی پسندیدہ ڈش ہے تو میں قیہ اور کئی بہت رعبت سے کھانے لگا۔ رمشا نے ایک دن باتوں ہی باتوں میں بتایا کہ شمرہ باجی کو سفید کاٹن کا کلف دار شلوار سوٹ پسند ہے تو میں ان کے یہاں سفید براق کاٹن کی کلف دار شلوار قمیض پہن کر جانے لگا۔

میں چٹا اس کے نزدیک ہوتا چاہ رہا تھا، وہ اتنا ہی مجھ سے کڑی نہ تھی۔ شمرہ نے بی ایس سی کیا تو واقعی اس کی دوسری پوزیشن تھی۔ میں نے خبر سنتے ہی بازار کی طرف بھاگا اور اپنے جیب خرچ سے بچائے ہوئے پیسوں سے شمرہ کے لیے انتہائی خوب صورت اور قیمتی گھڑی خریدی اور ان کے گھر پہنچ گیا۔

اس دن میری قسمت اچھی تھی کہ شمرہ سامنے ہی برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے مخصوص شائستہ انداز میں مجھے سلام کیا اور اندر کی طرف جانے لگی تو میں نے پہلی دفعہ اسے آواز دے کر روک لیا۔ اس نے رک کر بیزار سی میری طرف دیکھا پھر نظریں جھکا کر بولی۔ ”جی، کیسے؟“

”شمرہ! میں تمہیں امتحان میں کامیابی کی مبارک باد دینے آیا ہوں اور تم اندر جا رہی ہو۔“

”جی بہت شکریہ۔“ یہ کہہ کر وہ پھر اندر جانے کے ارادے سے چلی۔

”ایک منٹ۔“ میں نے کہا۔ ”اپنا حقہ تو لیتی جاؤ۔“ میں نے خوب صورت پیکنگ میں لپٹا ہوا گھڑی کا ڈبا اس کی طرف بڑھا دیا۔

”سوری صفدر بھائی۔“ اس نے کہا۔ ”میں..... یہ گفت..... اسی وقت خالہ جان آئیں، وہ شاید کہیں گئی ہوئی تھیں۔“

میں نے خالہ جان کو سنانے کے لیے کہا۔ ”بھئی یہ تمہاری کامیابی کا انعام ہے۔ تم اسے لینے سے انکار کر رہی ہو۔“ اس نے ہچکچاتے ہوئے گھڑی کا ڈبا میرے ہاتھوں سے لے لیا۔

”ایک منٹ۔“ میں نے پھر کہا اور اپنا لایا ہوا مضامی کا ڈبا کھول کر اس کی طرف بڑھایا۔ ”خوشی کے موقع پر تو منہ میٹھا کرتے ہی ہیں نا!“ اس نے پھر خالہ کی طرف دیکھا اور مضامی کا ایک کٹڑا اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”اوہو، مضامی! کھانا جا رہی ہیں؟“ رمشانے کہا۔

”میں بھی تو امتحان میں پاس ہوئی ہوں، میرا گفت کہاں ہے؟“ اس نے مضامی کھاتے ہوئے کہا۔

”تم نے کوئی پوزیشن نہیں لی ہے۔“ خالہ جان نے اسے گھورا۔

”اچھا تو حقہ لینے کے لیے پوزیشن لینے پڑتی ہے۔“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔ ”شک ہے، اب میں بھی آپ کو پوزیشن لے کر دکھاؤں گی۔“ وہ یہ کہہ کر پھر چلی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

”عجیب اول جلول لڑکی ہے۔“ خالہ جان نے کہا۔

”شمرہ والی تو کوئی بات بھی اس میں نہیں ہے۔ وہ جتنی ہر بار ہے۔ یہ اتنی ہی شوخ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا الٹ ہیں۔“

”خالہ جان! رمشا ابھی بچی ہے۔“ میں نے کہا۔

”بڑی ہوگئی تو یہ بھی شمرہ کی طرح بردبار ہو جائے گی۔“ میں پھر وہاں زیادہ دیر تک نہیں بیٹھا۔ میں جانتا تھا کہ اب میں سارا دن بھی یہاں بیٹھا رہوں تو شمرہ میرے سامنے نہیں آئے گی۔

میں نے اس دن ایک کام اور کیا تھا۔ گھڑی کے ساتھ ایک کاغذ پر ایک شعر بھی لکھ دیا تھا۔ ”مت سہل ہمیں جاؤ، پھر تاتے فلک برسوں..... تب خاک کے پردے سے

انسان نکلتے ہیں۔ میں نے ہمت کر کے یہ شعر شمرہ کو دے تو دیا تھا لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ اس کا رد عمل کیا ہوگا؟ اس پر کچھ اثر ہوگا بھی یا نہیں۔ ریشا نے بتایا تھا کہ شمرہ باجی شاعری کی کتابیں بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ اگر اسے شعر و شاعری کا شوق تھا تو یقیناً یہ شعر بھی اس کی سمجھ میں آجائے گا اور میرا شکوہ بھی۔

میں ان دنوں انجینئرنگ کے فاضل ایئر میں تھا اور شمرہ ماسٹر۔۔۔ کر رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ مجھے اپنے بیرون پر کھڑا ہونے کے لیے مزید وقت مل جائے گا۔ میں پہلے بھی زیادہ محنت سے پڑھنے لگا۔

میرے امتحانات ختم ہوئے تو مختلف کمپنیوں سے ملازمت کی پیشکش ہونے لگی۔ میں سوچ بچ کر فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ ابائی نے بھی یہی کہا تھا۔ ”بیٹا! جلدی مت کرنا۔ خوب سوچ بچ کر فیصلہ کرنا۔ اپنے اساتذہ سے مشورہ بھی ضرور کرنا۔“

☆☆☆

ان ہی دنوں میرے دل پر گویا بجلی گر پڑی۔ مجھے حیرت ہوئی ہے کہ وہ خبر سن کر میں زندہ کیسے رہا۔ میرے دل کی حرکت بند کیوں نہ ہوئی۔ ابھی میں نے ملازمت کی بھی نہیں تھی کہ اماں سے شمرہ ہو سکا۔ وہ شمرہ کا رشتہ لے کر خالہ جان کے یہاں پہنچ گئیں۔ انہوں نے ریشے کی بات کو تو مشتاق خالو نے انتہائی رعونت سے انکار کر دیا اور بولے۔ ”معاف کرنا لیسہ! تم میں اور ہم میں بہت فرق ہے۔ میری بیٹیاں عیش و آرام اور ناز و نعم کی عادی ہیں۔ تمہارا بیٹا ان کے اخراجات کہاں سے پورے کرے گا؟“

”میرا بیٹا اب ماشاء اللہ انجینئر ہو جائے گا۔“ اماں نے فخر سے کہا۔

”تب بھی کتنا کمالے گا؟“ خالو مشتاق نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اس کی تنخواہ سے میری بیٹی کے دو جوڑے بھی نہیں آئیں گے۔ انسان کو رشتہ ہمیشہ اپنے ہم پلہ لوگوں میں ہی کرنا چاہیے۔ آپ بھی کسی کلرک یا انجینئر ماسٹر کی بیٹی کا رشتہ دیکھیں۔“

اماں اس سے زیادہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ اسی وقت وہاں سے روانہ ہو گئیں۔ خالہ جان انہیں روکتی ہی رہ گئیں لیکن اب رکے کا کیا جواز تھا؟ یہ سب تفصیل مجھے نورین نے بتائی تھی۔ وہ اماں کے ساتھ گئی تھی۔ ایک لمحے کو تو مجھے یوں لگا جیسے میرے دل کی

دھڑکن رک گئی ہو اور ذہن مفلوج ہو گیا ہو لیکن پھر آہستہ آہستہ مجھے زندگی کا احساس ہوا تو مشتاق خالو کی باتیں یاد کر کے میرا خون کھولنے لگا۔ انکار کرنے کے اور بھی بہت سے مہذب طریقے ہوتے ہیں۔ انہیں اماں کی بے عزتی کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

میں اسی وقت گھر سے نکل گیا اور اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ ایک دفعہ پھر میں اسی دور پر پہنچا ہوا تھا جہاں سے شمرہ کی ایک طرف محبت کھینچ کر لے گئی تھی۔ یہ میری ایک طرفہ محبت ہی تو تھی ورنہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اب تک میں اسے اپنے عشق میں گرفتار کر چکا ہوتا پھر اس کا دولت مند باپ میری ماں کی بے عزتی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ لڑکی تن کر اپنے باپ کے سامنے کھڑی ہو جاتی لیکن شمرہ نے تو مجھی مجھ سے کھل کر بات بھی نہیں کی تھی۔ کھل کر بات کرنا تو دور کی بات ہے، اس نے تو اس پورے عرصے میں مجھ سے صرف چند جملے ہی بولے ہوں گے۔

میں جتنا شمرہ کے بارے میں سوچ رہا تھا، میرا خون کھول رہا تھا۔ میرے تصور میں اماں کا بے بس چہرہ تھا۔ جب مشتاق خالو نے انہیں دھککا دیا ہوگا تو ان کے دل پر کیا گزری ہوگی؟

میں شام تک اسٹیشن پر بیٹھ ہی بیٹھ ہی بیٹھ رہا تھا۔ وہاں آنے جانے والے لوگوں کو دیکھتا رہا۔ ان میں کئی لڑکیاں بے انتہا خوب صورت تھیں لیکن ان میں شمرہ جیسی کوئی نہیں تھی۔

رات کو میں تھا کہ ہارا گھر آ رہا تھا کہ انو مجھ سے ٹکرایا۔ وہ مجھے لے کر ایک ہوٹل میں چلا گیا اور بولا۔ ”کیا بات ہے صفر۔۔۔ تو کچھ پریشان ہے؟“

میں اپنے دل کا حال کہہ کر اپنی ہڈی اس کا لٹا چاہتا تھا۔ انو نے پوچھا تو میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔

”یار! اس سب کی بے محال۔“ خالو مشتاق سمجھتے تھے۔ انو بھی نہیں جانتا تھا۔ ان کا گاڑیوں کا ایک شوروم بھی تھا۔ انو ان سے بھٹا لیا کرتا تھا لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ انو میرا دوست ہے ورنہ وہ بہت پہلے میرا داخلہ اپنے گھر میں بند کر چکے ہوتے۔

”یار! ہم کر بھی کیا کتے ہیں؟“ میں نے بے بسی سے کہا۔ ”یار! اس حرام زادے نے دولت کے نشے میں ڈوب کر اماں کی بے عزتی کی ہے۔ کیا تو ان کی یہ بے عزتی برداشت کر لے گا؟“

”وہ تو مجھے برداشت کرنا پڑے گی۔“ میں نے

کہا۔ ”اور میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ کیا میں اس مشتاق کو کوئی مار دوں؟“

”اسے مارنے سے کیا حاصل ہوگا۔“ انو نے کہا۔ ”ورنہ اسے تو میں کل ہی گولی مار دوں گا۔ میرے ذہن میں کچھ اور ہے، میں اس کے ساتھ ایسا کروں گا کہ وہ اپنی موت آپ مر جائے گا۔“

”کیا کرے گا تو؟“ میں نے پوچھا۔ ”میں اس کی بیٹی کو اٹھالوں گا۔ کیا نام بتایا تو نے شمرہ؟“

”تو ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔“ میں نے بھڑک کر کہا۔

”یار! پوری بات سن بغیر بیچ میں مت بول۔“ انو نے کہا۔ ”کوئی بھی لڑکی ایک دو رات گھر سے باہر رہے تو پھر اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ تو فکر مت کر اس کی عزت پر آج بھی نہیں آئے گی۔ میں اسے صرف دو دن تک رکھنے کے بعد دوبارہ گھر چھوڑ دوں گا پھر وہ مجھاس کی شادی تجھ سے کرنے پر راضی ہوگا۔۔۔۔۔ میں اس کے جاننے والوں میں یہ مشہور کر دوں گا کہ شمرہ مشتاق کی بیٹی کو اغوا کر لیا گیا ہے۔“

”لیکن یار! میرا دل نہیں مانتا۔“ میں نے کہا۔ ”شمرہ تو یہ بے عزتی ہی نہیں کر سکتی۔“

”اس میں شمرہ کی بے عزتی کہاں ہوگی۔“ انو نے کہا۔ ”وہ تو بہت آرام سے بڑی حفاظت میں رہے گی۔“

”انو! یہ کام بہت خطرناک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا خطرناک ہے یار؟“ انو نے منہ بنا کر کہا۔ ”تو

کیا مجھے جانتا نہیں ہے۔ کیا میں نے اس سے پہلے یہ کام نہیں کیے اور اب تو میں نے پورا ایک گینگ بنالیا ہے۔ اب اس شہر پر میرے بھائی کا راج ہے۔“ اس نے فخریہ انداز میں کہا۔ ”کوئی الو کا بھٹا دولت کے نشے میں چور ہو کر میری ماں کی بے عزتی کر دے، میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے تجھے دوست کہا ہے تو تیری ماں میری ماں بھی تو ہوگی۔“ اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ میں خود بخود ان کی آگ میں سلا گیا ہوا تھا اس لیے مجھے اس کی ہر بات سچ لگ رہی تھی۔

”اب تو مجھے اس کے اسکول کا پتا بتا۔“ اس نے کہا۔

”میں اسے راتے ہی سے اغوا کر لوں گا۔“ ”یار! وہ اسکول میں نہیں کالج میں پڑھتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ بس میں یا پیدل نہیں جاتی ہے بلکہ ان کا ڈرائیور ہوتا ہے، وہ گاڑی میں جاتی ہے۔“ ”تو ڈرائیور کہاں کا رستم ہوگا۔ میں گاڑی روک کر

سرعام اسے اٹھالوں گا۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائیور کا چھٹکا بھی کر دوں گا تاکہ اس سیٹھ کے دل پر دہشت طاری ہو جائے۔“

”نہیں یار۔“ میں نے کہا۔ ”کسی کو قتل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ڈرائیور ہی تو گھر جا کر اس کے اغوا کی خبر دے گا۔“

”چل، تو کہتا ہے تو ڈرائیور کو بخش دیتا ہوں۔“ میں نے اسے شمرہ کے کالج کا پتا بتا دیا۔ خالو مشتاق کے گھر کا ایڈریس سمجھایا اور اسے بتایا کہ ان کے پاس کس میک اور ماڈل کی اور کس رنگ کی گاڑیاں ہیں۔

”بس تو اب بے فکر ہو جا۔“ انو نے کہا۔ ”کل کا سورج اس سیٹھ کے لیے بدنامی اور رسوائی لے کر آئے گا۔“ ”لیکن یار! ایک بات کا خیال رکھنا۔“ میں نے کہا۔ ”شمرہ کو تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ اس کی عزت پر ذرا بھی آج نہیں آتی چاہیے۔“

”تو فکر مت کر یار۔“ انو نے ہنس کر کہا۔ ”وہ آخر بھائی ہے میری۔ بھائی تو بہن کی طرح ہوتی ہے۔ میں اسے بہت باعزت طریقے سے لے جاؤں گا اور انتہائی باعزت طریقے سے چھوڑ بھی دوں گا۔“

”انو! مل کر میرا دل کچھ کھٹکا ہو گیا تھا اور میرا دل میں ایک مرتبہ شمرہ کی محبت اُٹھرائی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”اس کی محبت تو میرے دل پر نقش ہو چکی لیکن اسے وقتی طور پر مایوسی کے اندھیروں نے نگل لیا تھا۔ اب انو نے امید کی کرن دکھائی تو مجھے شمرہ کا حصول اس مرتبہ ممکن نظر آنے لگا۔ بھلا ایسی لڑکی سے کون شادی کرتا جو گھر سے دورا میں باہر گزرا کر آتی۔ وہ بھی اغوا ہو کر۔ ایسے میں جب میں اس کے لیے رشتہ بھیجتا تو اس کا مغرور باپ اسے ہی قبول کرنے میں عاقبت سمجھتا۔ شمرہ کی نظروں میں میری عزت بڑھ جاتی کہ میں سب کچھ جانتے ہو جھٹے اسے اپنا رہا ہوں۔ میں مطمئن ہو کر گھر آ گیا لیکن اس رات۔۔۔ مجھے نیند نہیں آئی۔ اس رات مجھے بے چینی اور اضطراب تو تھا لیکن مایوسی اور بے چارگی نہیں تھی۔

میں رات کو دیر تک جاگتا رہا اس لیے دن چڑھے تک سوتا رہا۔ اچانک اباجی کی گھبراہٹ ہوئی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ وہ اماں سے کہہ رہے تھے۔

”تم ابھی نورین کو لے کر فوراً اباجی کے گھر چلی جاؤ۔ نہ جانے بے چارگی کی کیا حالت ہوگی۔“ میں آنکھیں ملتا ہوا کرے سے باہر آیا اور اباجی سے

TSR Image - www.tsrimage.com - Unregistered

موٹاپا کریں کم...
slim، فٹ اور Young!!
رہیں

(موجودہ رنگ اور
مچھل سے پاک)



طیبی
عرق
اوبینسل

موٹاپے میں کمی کی قدرتی دوا

100 فیصد قدرتی جڑی بوٹیوں سے تیار شدہ

- جسم سے زائد چربی خالص کرتا ہے • ہاضمہ درست اور جگر کو قوی کرتا ہے
- اجابت صاف لاتا ہے • آنکھوں کی سوزش دور کرتا ہے
- ہاتھ اور پاؤں کی سوجن میں فائدہ مند

طیبی

دواخانہ (پرائیویٹ) لمیٹڈ

کراچی - پاکستان www.tayyebi.com.pk



پوچھا۔ ”کیا ہوا بانی! آپ اسنے پریشان کیوں ہیں؟“
ان کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ انہوں نے کہا۔
”صفر بیٹا! آج صبح کچھ لوگوں نے رمشا کو اغوا کر لیا ہے۔“
”رمشا کو اغوا کر لیا ہے؟“ میرے ذہن میں گویا کسی
نے ہتھوڑا رسید کر دیا۔ ”رمشا کو کون اغوا کر سکتا ہے اباجی؟“
”یہاں تو اب اغوا اور ڈکیتی کی وارداتیں معمول کی
بات بن کر رہ گئی ہیں بیٹا۔“

”آپ کو کس نے بتایا؟“ میں نے پوچھا۔
”مجھے اباجی نے خود ٹیلی فون کیا تھا۔“ اباجی نے کہا۔
”وہ بے چاری تو حج طرح بات بھی نہیں کر پارہی میں۔ ان
کا ڈرائیور رمشا کو اسکول لے کر جا رہا تھا۔ آج شہرہ کی
طبیعت خراب تھی اس لیے وہ کالج نہیں گئی تھی ورنہ دونوں
یہیں ساتھ جاتی ہیں۔“

”اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت تھی۔“ اماں نے
کہا۔ ”ورنہ اغوا کرنے والے تو دونوں لڑکیوں کو لے
جاتے۔“ فوہین بری طرح رو رہی تھی۔ اس دوران میں رمشا
سے اس کی بہت دوستی ہوئی تھی۔ وہ بھی ابھی تو اس کی ہم عمر۔
میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ یہ انونے کیا غضب
کر دیا۔ اس نے رمشا کو اغوا کیوں کیا پھر مجھے خود ہی خیال
آتا کہ اس میں انوکھا بھی کیا قصور؟ وہ تہہ نہ ہو کچھ جانتا تھا نہ
رمشا تو رمشا اسکول کے لیے نکلی ہوئی تو وہ بھی سمجھا ہوگا کہ
یہ شہرہ ہے۔ اس نے اسی کو اغوا کر لیا۔

”صفر بیٹا! اباجی نے کہا۔“ تم بھی خالہ کے پاس
چلے جاؤ۔ انہیں اس وقت نسلی کی ضرورت ہے بیٹا۔ میرا
اے اس اہم آجائے تو میں بھی آتا ہوں۔“

عجیب صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ انوکھی غلط فہمی کی
وجہ سے میرا مقصد بھی پورا نہیں ہوا اور وہ محسوس ہو گئی تھی
اذیت سے گزر رہی ہوگی میں نے سوچا کہ میں فوراً انوسے
ملوں لیکن فی الحال اس سے ملاقات ممکن نہیں تھی۔ وہ نہ
جانے اس وقت کہاں ہوگا؟ اس وقت سبیل فون اسنے عام
نہیں ہوئے تھے۔ ہاں پاکستان میں دولت مند لوگوں نے
سبیل فون خرید لیے تھے جنہیں وہ ہاتھوں میں لے کر چلتے
تھے۔ گویا اس کی نمائش کر رہے ہوں۔ میرا اس وقت خالہ
جان کے گھر جانا ضروری تھا۔

میں اماں اور نورین (رینو) کو لے کر خالہ جان کے
گھر روانہ ہو گیا۔ وہاں عجیب کھرام چا ہوا تھا۔ ہم سے پہلے
وہاں خالو مشتاق کے بھائی اور ان کے بیٹے موجود تھے۔
خالو مشتاق بھی موجود تھے۔ میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں

نے بہت سرد انداز میں سلام کا جواب دیا۔
میں نے ان سے پوچھا۔ ”یہ واقعہ کہاں پیش آیا
خالو۔۔۔ ڈرائیور کا کہنا ہے؟“
”پولیس تفتیش کر رہی ہے۔“ خالو نے سرد لہجہ میں
جواب دیا۔ ”وہ آج شام تک اغوا کرنے والوں کو ڈھونڈ
نکالے گی۔“

”میرا ایک دوست ایس بی کرانز ہے۔“ مشتاق
خالو کا ایک بھتیجا بولا۔ میں اسے پہلے بھی کئی تقریبات میں
دیکھ چکا تھا لیکن اس سے میرا تعارف نہیں تھا۔ میں نے بھی
اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ وہ یوں
بھی عمر میں مجھ سے کافی بڑا اور کئی بچوں کا باپ تھا۔ اس کے
چہرے پر بھی وہی رعوت تھی جو عمو یا دولت مند لوگوں کے
چہروں پر نمایاں ہوتی ہے۔

اچانک ٹیلی فون کی کرخت گھنٹی بھی تو وہاں موجود ہر
شخص چونک کر ٹیلی فون سیٹ کو گھورنے لگا۔ خالو مشتاق نے
آگے بڑھ کر ریسپور اٹھایا اور بولے۔ ”ہیلو۔۔۔ کون۔۔۔ تم
ذیل آدی۔ کیا سنو؟ ہاں بولو۔۔۔ اچھا پھر۔ کیا
کہا۔۔۔ پچیس لاکھ روپے۔۔۔ ورنہ کیا کرو گے؟ کہاں
پہنچاؤں۔۔۔ ہیلو۔۔۔ ہیلو! انہوں نے ریسپورخ دیا۔ شاید
دوسری طرف سے لائن کاٹ دی گئی تھی۔

”کیا ہوا بانی جان؟“ ان کے منہ سے پوچھا۔
”اسی ذیل آدی کا ٹیلی فون تھا جس نے رمشا کو اغوا
کیا ہے۔“ انہوں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

میں چونک اٹھا۔ یہ تو ہمارے پلان میں شامل نہیں
تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہا تھا وہ؟“
”کہہ رہا تھا کہ کل تک پچیس لاکھ روپے کا انتظام کر لو
ورنہ تمہاری بیٹی ہمیں زندہ نہیں ملے گی۔“ خالو مشتاق کا بھتیجا
اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھا۔

”کسے ٹیلی فون کر رہے ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔
”میں ایس بی رضا کو ٹیلی فون کرتا ہوں۔“ ساجد
نے کہا۔ ”اسے ساری صورت حال بتاتا ہوں۔“

”اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر پولیس کو اطلاع دی تو
رمشا ہمیں زندہ نہیں ملے گی۔“

”ارے یہ اچھے اس قسم کی دھمکیاں تو دیتے ہی ہیں۔“
ساجد نے کہا۔ ”میں رضا کو ابھی سب کچھ بتاتا ہوں۔“

”اچھی ڈراٹھہر جائیں۔“ میں نے اچانک کہا۔
”کیوں؟“ ساجد نے میری طرف غصہ کر پوچھا۔
مجھے ایسا لگا جیسے اسے مجھ پر شہ ہو گیا ہو۔

”وہ لوگ پھر کب ٹیلی فون کریں گے؟“
”تمہیں کیسے معلوم کہ وہ پھر ٹیلی فون کریں گے؟“
ساجد نے تلخ لہجے میں پوچھا۔
”یہ تو سامنے کی بات ہے ساجد صاحب۔“ میں نے
کہا۔ ”ابھی انہوں نے صرف رقم کا مطالبہ کیا ہے۔ یہ نہیں بتایا
کہ رقم کہاں اور کیسے پہنچانی ہے۔ یہ بات تو کوئی کم متعل آدی
بھی بتا سکتا ہے۔“ ساجد نے مشتاق خالو کی طرف دیکھا۔
”ہاں، مفرد ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ان لوگوں نے ابھی
صرف یہی بتایا ہے کہ رمشا ان کے قبضے میں ہے اور پچیس
لاکھ کا مطالبہ کیا ہے۔ رقم کی وصولی کے لیے وہ بعد میں ٹیلی
فون کریں گے۔“

”تو کیا اس وقت تک ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے
رہیں؟“ ساجد نے کہا۔ وہ کچھ زیادہ ہی سرگرمی دکھا رہا تھا۔
”تو پھر کیا کریں گے؟“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔
مجھے تو اس سے پہلے بھی چڑھی۔ ”نکل جائیں رمشا کی تلاش
میں اور لے آئیں اسے۔“

”میں نے رضا کو ٹیلی فون کیا ہے۔“ ساجد نے کہا۔
”تمہیں جلدی کیا تھی؟“ خالو مشتاق نے اسے
جھڑک دیا۔۔۔ ”رضا بھی کیا کر لے گا؟ کیا تم پولیس کی
کارروائی سے واقف نہیں ہو؟ ان لوگوں کا دوسرا ٹیلی فون
آگے دو پھر پھر سوچیں گے۔“ اسی وقت ڈرائنگ روم میں
ایک بارودی ایس پی داخل ہوا۔ اس نے کمرے میں موجود
ہر شخص کا جائزہ اس انداز سے لیا جیسے انہوں نے انہوں
میں سے کوئی ہو۔ وہاں موجود ہر شخص اس کے احترام میں نہ
جانے کیوں کھڑا ہو گیا۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ وہ پولیس کا
ایک افسر تھا، کوئی صدر مملکت یا وزیر اعظم نہیں تھا کہ لوگ
اس کے احترام میں کھڑے ہو جاتے۔ خالو مشتاق البتہ پہلے
ہی کھڑے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہی وہ ایس پی ہے
جس پر ساجد اچھل رہا ہے۔

”کچھ معلوم ہوا؟“ اس نے ساجد سے پوچھا۔
”معلوم کرنا تو آپ کا کام ہے ایس پی صاحب۔“
میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ اس نے کھم کرنا گواہی سے مجھے
دیکھا۔ وہ چہرے سے ہرگز ایس پی نہیں لگ رہا تھا۔ اگر اس
کے جسم پر وردی نہ ہوتی تو میں یہ سمجھتا کہ وہ پولیس کا کوئی
معمولی حوالدار یا ایس آئی ہے۔ اس کے چہرے پر وہ
وقائیں تھا جو افسروں کے چہروں پر ہوتا ہے، چہرے پر
یوں بھی خباثت پریں رہی تھی۔
اس نے تلخ لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ ”آپ کی

تعریف؟“
”میں مشتاق ملک صاحب کا بھانجا ہوں۔“ میں نے کہا۔
”ساجد! تم نے رضا کو یہاں کیوں بلایا ہے؟“ خالو
مشتاق نے کہا۔ ”وہ بھی وردی میں۔“ انہوں نے والے۔۔۔
۔۔۔ گھر کی نقل و حرکت پر نظر رکھتے ہیں۔ اگر انہیں معلوم
ہو گیا کہ ہم نے پولیس سے رابطہ کر لیا ہے تو وہ رمشا کو کوئی
نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“
”تو کیا آپ انہیں پچیس لاکھ روپے دے دیں
گے؟“ ساجد نے بھی تلخ انداز میں کہا۔
”پچیس لاکھ؟“ رضا نے پوچھا۔

”ہاں، انہوں نے والوں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے
فون کر کے پچیس لاکھ کا مطالبہ کیا ہے۔“ ساجد نے کہا۔
”انہوں نے یہ بھی بھیجی دی ہے کہ اس بارے میں پولیس کو
اطلاع نہ دی جائے ورنہ رمشا ہمیں زندہ نہیں لے گی۔“
”یہ تو کسی پیشہ ور گینگ کا کام ہے۔“ رضا نے
راز دارانہ انداز میں کہا۔ ”ایسے لوگوں کی ہتھیاری پولیس کے
پاس بھی ہوتی ہے۔ میں ابھی آفس جا کر معلوم کر تا ہوں کہ
اس قسم کی وارداتوں میں کون سے گروہ ملوث ہیں۔ آپ فکر
مت کریں مشتاق صاحب، میں ان لوگوں تک جلد ہی پہنچ
جاؤں گا۔“ وہ اپنی چوڑی ہاتھ پٹیا ہاتھ میں لے کر
مجھے اب یہ خطرہ محسوس ہوا کہ میں وہ لوگ انونیک پہنچ
ہی نہ جاؤں۔ اس کا بھی تو پولیس ریکارڈ ہوگا پھر میں نے یہ
سوچ کر خود کو تسلی دے لی کہ انونیک تک بھی گرفتاری نہیں
ہو، ابھی جیل نہیں گیا۔ اس کا ریکارڈ پولیس کے پاس کب
ہوگا؟ پولیس والوں نے ایک ظلم یہ کیا تھا کہ ڈرائیور کو اپنی
تحویل میں لے لیا تھا۔ ورنہ میں اس سے کچھ معلومات
حاصل کرنا کہ انہوں نے والے کتنے آدی تھے؟ ان کے
چلے کیسے تھے؟ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کا روروا میں
انونیک موجود تھا یا نہیں؟ خالو مشتاق تو کچھ بتانے کے موڈ میں
نہیں تھے۔

میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا پھر انونیک کی تلاش میں نکل کھڑا
ہوا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس وقت وہ کہاں ہوگا۔ اس کے
توئی ٹھکانے تھے۔ میں اس کے ایک ٹھکانے کی طرف
جانے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ مجھے خیال آیا کہ اگر اس نے
بھی اس واردات میں حصہ لیا ہے تو وہ اس وقت اپنے کسی
بھی ٹھکانے پر نہیں ہوگا۔ وہ کسی ایسی جگہ ہوگا جہاں اس نے
رمشا کو رکھا ہوگا۔ یہ سوچ کر ہی میں نے اپنا ارادہ ملتوی
کر دیا اور ایک رستوران میں جا بیٹھا۔

بے غم مسافت

میں نے وہاں بیٹھ کر چائے کا آرڈر دیا ہی تھا کہ
میری نظر ایک آدی پر پڑی۔ وہ بہت غور سے مجھے دیکھ رہا
تھا۔ اس نے شلواریں اور پشاور کی چپل پہن رکھی تھی اور
چہرے ہی سے اچھا آدی نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ
اس کی طرف دیکھا اور ہر مرتبہ اسے گھورتے ہوئے پایا۔
مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں بھی جوابی طور پر اسے گھورنے لگا۔
وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھا اور میری طرف بڑھا۔
میں نے بے اختیار اپنے نیچے پر ہاتھ مارا لیکن عرصہ ہوا میں
پستول رکھنا چھوڑ چکا تھا، اس لیے وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔
اس کرحت چہرے والے نے کرسی اٹھائی اور میرے سامنے
بیٹھ گیا پھر وہ انتہائی بے تکلفی سے بولا۔ ”کیا حال ہے؟“

”میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔
”ارے یار، ایسی بھی کیا ہے مروٹی۔“ اس نے مکروہ
انداز میں کہا۔ ”تم انو بھائی کے دوست ہو نا؟“
”کون انو بھائی؟“ میں نے پوچھا۔
”تم انو بھائی کو نہیں جانتے؟“ اس نے حیرت سے
کہا۔ ”تمہاری یادداشت تو بہت کمزور ہے۔“

”مطلب کی بات کرو۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔
”یار! ایک دفعہ انو بھائی تم سے ملے یونیورسٹی گئے
تھے۔ ان کے گھر والے نے ان کے گھر کو لے لیا۔“ اس نے
کی کوشش کی۔ ”میں بھی اس دن ان کے ساتھ تھا۔“
مجھے یاد آ گیا کہ یونیورسٹی یونین کے الیکشن کے موقع
پر انو میرے پاس آیا تھا۔ میں نے خود نو الیکشن میں حصہ نہیں
لیا تھا لیکن میں اپنے ایک دوست کے پیش کش کی پیروی کر رہا
تھا۔ انو ای سلسلے میں میرے پاس آیا تھا کہ مجھے اس کی مدد
کی ضرورت تو نہیں ہے؟

اچانک پولیس کا ایک اے ایس آئی وہاں آ گیا اور
بولا۔ ”بائے چل، ڈرامیرے ساتھ تھانے چل۔“
”کیوں جناب، اب میں نے کیا کر دیا ہے؟“
”یہ تو تھانے چل کر ہی معلوم ہوگا۔“ اے ایس آئی
نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔
”تمہیں بھی چلنا پڑے گا۔“

”مجھے کیوں؟“
”یہ کیوں اور کیسے تھانے جا کر کرنا۔“ اس نے کہا۔
”تم ہوش میں تو ہو۔“ میں نے بلند آواز میں کہا۔
”مجھے اس لہجے میں بات کیوں کر رہے ہو؟“
”آپ بالے کے ساتھ بیٹھے تھے اس لیے۔“

میں نے وہاں بیٹھ کر چائے کا آرڈر دیا ہی تھا کہ
میری نظر ایک آدی پر پڑی۔ وہ بہت غور سے مجھے دیکھ رہا
تھا۔ اس نے شلواریں اور پشاور کی چپل پہن رکھی تھی اور
چہرے ہی سے اچھا آدی نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ
اس کی طرف دیکھا اور ہر مرتبہ اسے گھورتے ہوئے پایا۔
مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں بھی جوابی طور پر اسے گھورنے لگا۔
وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھا اور میری طرف بڑھا۔
میں نے بے اختیار اپنے نیچے پر ہاتھ مارا لیکن عرصہ ہوا میں
پستول رکھنا چھوڑ چکا تھا، اس لیے وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔
اس کرحت چہرے والے نے کرسی اٹھائی اور میرے سامنے
بیٹھ گیا پھر وہ انتہائی بے تکلفی سے بولا۔ ”کیا حال ہے؟“

”میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔
”ارے یار، ایسی بھی کیا ہے مروٹی۔“ اس نے مکروہ
انداز میں کہا۔ ”تم انو بھائی کے دوست ہو نا؟“
”کون انو بھائی؟“ میں نے پوچھا۔
”تم انو بھائی کو نہیں جانتے؟“ اس نے حیرت سے
کہا۔ ”تمہاری یادداشت تو بہت کمزور ہے۔“

”مطلب کی بات کرو۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔
”یار! ایک دفعہ انو بھائی تم سے ملے یونیورسٹی گئے
تھے۔ ان کے گھر والے نے ان کے گھر کو لے لیا۔“ اس نے
کی کوشش کی۔ ”میں بھی اس دن ان کے ساتھ تھا۔“
مجھے یاد آ گیا کہ یونیورسٹی یونین کے الیکشن کے موقع
پر انو میرے پاس آیا تھا۔ میں نے خود نو الیکشن میں حصہ نہیں
لیا تھا لیکن میں اپنے ایک دوست کے پیش کش کی پیروی کر رہا
تھا۔ انو ای سلسلے میں میرے پاس آیا تھا کہ مجھے اس کی مدد
کی ضرورت تو نہیں ہے؟

اچانک پولیس کا ایک اے ایس آئی وہاں آ گیا اور
بولا۔ ”بائے چل، ڈرامیرے ساتھ تھانے چل۔“
”کیوں جناب، اب میں نے کیا کر دیا ہے؟“
”یہ تو تھانے چل کر ہی معلوم ہوگا۔“ اے ایس آئی
نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔
”تمہیں بھی چلنا پڑے گا۔“

”مجھے کیوں؟“
”یہ کیوں اور کیسے تھانے جا کر کرنا۔“ اس نے کہا۔
”تم ہوش میں تو ہو۔“ میں نے بلند آواز میں کہا۔
”مجھے اس لہجے میں بات کیوں کر رہے ہو؟“
”آپ بالے کے ساتھ بیٹھے تھے اس لیے۔“

ریسیور اٹھایا اور بولے۔ ”ہیلو! ہاں میں سن رہا ہوں۔۔۔ اچھا۔۔۔ پھر۔۔۔ لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ رقم لینے کے بعد تم لوگ مجھ سے دھوکا نہیں کرو گے۔ اچھا۔۔۔ لیکن مجھے ایک دن کی مہلت اور دے دو۔۔۔ میں نے پچیس لاکھ کا بندوبست تو کر لیا ہے لیکن اتنی ہی رقم مزید جمع کرنے میں مجھے کچھ تو وقت لگے گا۔۔۔ کیا۔۔۔ ہاں، وہ تو ابھی دے سکتا ہوں۔۔۔ کہاں۔۔۔ ٹھیک ہے۔“ انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا پھر اباجی سے بولے۔ ”میں نے کہا تھا تاکہ جرم پیشہ لوگ بہت ہوشیار ہوتے ہیں۔ انہوں نے اب صرف پچیس لاکھ پر رضامندی ظاہر کر دی ہے۔ مجھے رقم کا بریف کیس لے کر مال روڈ پر جانا ہوگا۔ وہیں ان کا کوئی آدمی مجھ سے بریف کیس لے لے گا۔“

شاید انہوں نے انہیں اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ مزید رقم کا مطالبہ نہ کریں۔

”لیکن بھائی مشتاق۔“ اباجی نے کہا۔ ”اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ رقم لینے کے بعد وہ رشاکو بہ حفاظت ہمارے حوالے کر دیں گے؟“

”میں نے بھی ان سے یہی سوال کیا تھا۔“ خالو مشتاق نے کہا۔ ”انہوں نے کہا کہ بھائی ضمانت ہماری زبان ہے۔ آپ کو ایسی برادری کا ہونا ہوگا۔“

”میں انہوں نے کب مافی ہے؟“ اباجی نے پوچھا۔

”وہ کل گیارہ بجے مجھے بتائیں گے کہ مجھے کس وقت گھر سے نکلتا ہوگا اور مال روڈ پر کس طرف پیدل چلنا ہوگا۔ انہوں نے انتہائی سختی سے کہا ہے کہ اگر پولیس کا یا کوئی مشتبہ شخص میرے آس پاس بھی ہوا تو وہ مجھ سے رقم لیے بغیر لوٹ جائیں گے۔“

”اس کے لیے مال روڈ کا علاقہ تو مناسب نہیں ہے۔“ اباجی نے کہا۔ ”وہ صرف دھوکا دے رہے ہیں۔ کل وہ کسی ایسے مقام کا تعین کریں گے جہاں عام لوگوں کا گزر نہ ہو۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ رقم ملنے ہی آدھے گھنٹے کے بعد رشاکو پہنچ جائے گی۔“

خالو مشتاق کے بڑی منظور صاحب نے کہا۔ ”اب ان کی طرف سے کوئی ٹیلی فون نہیں آئے گا۔ آپ صبح سے یہاں بیٹھے ہیں۔ کچھ دیر آرام کریں۔“

”آرام کیسے کروں منظور صاحب۔“ خالو مشتاق کے لیے میں عجیب سا کرب تھا۔ ”میری بیٹی نہ جانے کس حال میں ہوگی۔ میں کیسے آرام کر سکتا ہوں۔ آپ بھی کوئی کٹھنوں سے یہاں بیٹھے ہیں۔ آپ جا کر آرام کریں۔“

ان کا کیا حال ہوگا۔ میں نے دل سے دعا کی۔ ”یا اللہ! میرے اس گناہ کو معاف فرما دے اور میری عزت رکھ لے۔ میں اپنے کے پر مشرندہ ہوں۔ رشاکو بھی اپنی حفاظت اور پناہ میں رکھنا میرے بالک۔“ دعا مانگتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”یا اللہ! تو ہم سب پر رحم فرما۔“ میں نے بلند آواز میں کہا۔

اسی وقت مجھے خالو مشتاق کی آواز سنائی دی۔

”مفرد! تم رورہ ہو؟“

”مجھے رشاک کی طرف سے بہت پریشانی ہے خالو۔“

میں نے کہا۔ ”وہ محصور بنی ہے نہ جانے اس کا کیا حال ہوگا۔“

”چلو، اندر چلو۔“ انہوں نے نرمی سے کہا۔ میں نادم سا ان کے ساتھ اندر کی طرف بڑھا۔ وہ تو شکر ہے کہ دعا کے ابتدائی جملے میں نے بلند آواز میں نہیں کہے تھے ورنہ خالو مشتاق مجھے ابھی پولیس کے حوالے کر دیتے۔ اندر اب صرف خالو مشتاق کے ایک بڑی اور اباجی بیٹھے تھے۔ باقی لوگ رخصت ہو چکے تھے۔ خالو شاید اباجی لوگوں کو رخصت کرنے باہر آئے تھے۔ وہ مجھے لان میں روتا دیکھ کر میری طرف آئے۔

”میں نے کہا ہے کہ ایک بار مجھے پھر جان بوجھ کر رشاکو کی طرف دیکھو۔“

”میں نے کہا ہے کہ ایک بار مجھے پھر جان بوجھ کر رشاکو کی طرف دیکھو۔“

”میں نے پچیس لاکھ کا بندوبست تو کر لیا ہے لیکن اب ان بد بختوں نے پچاس لاکھ کا مطالبہ کر دیا ہے۔ صرف اس لیے کہ میں نے پولیس کو اطلاع کر دی۔ کل تک اتنی بڑی رقم میں کہاں سے لاؤں گا؟“ پچاس لاکھ اس دور میں آج کے کم سے کم پانچ کروڑ کے برابر تھے۔

”آپ پریشان نہ ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ہم بھی انہیں رقم نہیں دیں گے۔ میں ابھی مارکیٹ جا کر نوٹوں کے سائز کے کاغذ کٹوا لیتا ہوں۔ ہم ان کاغذوں کی گڈیاں نوٹوں کی طرح بنا دیں گے پس ان کے اوپر اور نیچے ہزار روپے کا صرف ایک نوٹ ہوگا۔“

”وہ لوگ پرویشل ہیں بیٹا۔“ خالو مشتاق نے نرم لہجے میں کہا تو اباجی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ”پہلے وہ اپنی ٹیلی کریں گے۔“

”ایسی وارداتوں میں انہوں نے والوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ نوٹ گنتے بیٹھے جائیں۔“

اسی وقت فون کی کھنٹی بجنے لگی۔ خالو مشتاق نے

خالو مشتاق نے کہا۔

”میں بات کو بڑھا رہا ہوں۔“ وہ گرج کر بولے۔

”تم نے دس آدمیوں کے سامنے میرے بیٹے کی تذلیل کر دی۔ وہ کوئی بچہ نہیں ہے، تین بچوں کا باپ ہے۔ اس نے تو تمہاری بھلائی کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا۔“

ساجد نے ٹیلی فون پر کسی کے نمبر ڈائل کیے اور بولا۔

”ہیلو رضا! میں ساجد بول رہا ہوں۔ یار، چچا جان نہیں چاہتے کہ پولیس اس کیس میں مداخلت کرے۔ سارا سٹیج اب تم کرو، ریکارڈنگ روک دو اور ان کے ٹیلی فون سے آڈیو لینش بنادو۔۔۔ یار جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا کرو۔۔۔ ہاں، جب انہیں احساس نہیں ہے تو میں کیوں سرکھپاؤں۔ تم بھی صبح سے مصروف ہو گھر جا کر آرام کرو۔“ یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور بولا۔ ”میں نے رضا سے کہہ دیا ہے کہ وہ مزید کوئی کارروائی نہ کرے۔ اب آپ جا میں آرام کریں۔“

”اب چلو یہاں سے۔“ اشتیاق صاحب نے درشت لہجے میں کہا۔

”پلیز ایسے موقع پر آپ میں تو تعلقات خراب مت کریں۔“ میں نے کہا۔ ”ساجد صاحب نے تو اپنے طور پر بالکل درست فیصلہ کیا تھا لیکن۔۔۔“

”میں نے تمہاری رائے نہیں لی تھی۔“ خالو مشتاق نے انتہائی حقارت سے کہا۔ اباجی بھی وہاں موجود تھے، انہوں نے اشارے سے مجھے خاموش رہنے کو کہا۔

ان کے بھائی اپنے بیٹے کو لے کر وہاں سے نکل گئے۔ اباجی نے مجھے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ میں خاموشی سے اٹھا اور باہر آ گیا۔ چند منٹ بعد اباجی بھی باہر آ گئے اور مجھے لان کے ایک سنان گوشے میں لے گئے۔ میں حیران تھا کہ اباجی مجھ سے کیا بات کرنے والے ہیں۔

انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ”مفرد! تجھے اس معاملے میں بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو نے دیکھا بھائی مشتاق نے تجھے کس طرح ذلیل کر دیا۔“

”وہ تو اس وقت اپنے حواس میں نہیں ہیں اباجی۔ انہوں نے تو اپنے بھائی اور مجھے کو بھی ناراض کر دیا۔ میں نے تو ان کی بات کا بالکل برا نہیں مانا۔ آپ فکرمات کریں۔ میں اب کچھ نہیں بولوں گا۔“

وہ واپس اندر چلے گئے۔ میں ایک بار پھر خود کو لامنت کرنے لگا۔ میرے باپ کو میری عزت کا اتنا خیال تھا کہ وہ مشتاق کی درشت کلامی بھی برداشت نہیں کر سکے۔ کل جب انہیں یہ علم ہوگا کہ ان کا بیٹا اس انوکھا ڈسے دار ہے تو

”تم سے کس نے کہا تھا کہ پولیس کو اس معاملے میں انوکھا کرو۔ اب وہ لوگ پچاس لاکھ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ میں پچاس لاکھ بھی دے دوں گا لیکن اب وہ ہمیں دوسرا موقع نہیں دیں گے۔ اب پولیس نے مداخلت کی تو وہ رشاکو قتل کر کے اس کی لاش ہمارے گھر کے سامنے پھینک دیں گے۔“

”لیکن چچا جان میں نے تو۔۔۔“

”رہے دو۔“ انہوں نے اسے جھڑک دیا۔ ”تم نے اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے اس فی رضا کو اس کیس میں انوکھا کر لیا۔ اب اگر رشاکو کچھ ہو گیا تو میں تمہیں بھی معاف نہیں کروں گا۔“

”یہ کیسی باتیں کر رہے ہو مشتاق۔“ ان کے بھائی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”ساجد تمہارا دشمن نہیں ہے، نہ اسے رشاکو سے کوئی دشمنی ہے۔ اس نے تو تمہاری بھلائی۔“

یہ سب کچھ کیا تھا۔

”یہ بھلائی ہو رہی ہے میرے ساتھ؟“ خالو مشتاق نے درشت لہجے میں کہا۔ ”رشاک کی جان خطرے میں پڑ گئی ہے۔ وہ نکلا اس بی بی تو بہت وعدے کر کے گیا تھا کہ وہ شام تک ان لوگوں تک پہنچ جائے گا پھر اب کیا ہوا؟“

”وہ تو اپنی کوشش کر رہا ہے۔ اس وقت بھی آپ کا ٹیلی فون آڈیو لینش پر لگا ہوا ہے۔“

”گفتگو ایس بی آس میں ریکارڈ ہو رہی ہے۔“ ساجد نے کہا۔

”رضا بہت ذہین پولیس افسر ہے اور۔۔۔“

”تم نے کس کی اجازت سے میرا ٹیلی فون آڈیو لینش پر لگا دیا ہے؟“ خالو مشتاق گرج کر بولے۔ ”تم کیا چاہتے ہو کہ وہ لوگ رشاکو قتل کر دیں؟“

”تم اس وقت پاگل ہو چکے ہو۔“ ان کے بھائی نے کہا۔ ”تمہارے ساتھ تو بھلائی کرنا ہی نہیں چاہیے۔“ پھر وہ بیٹے سے مخاطب ہوئے۔ ”رضا کو ابھی اور اس وقت منع کرو کہ وہ کوئی بھی کارروائی نہ کرے۔ اس سے کہو کہ وہ مشتاق کے فون کو آڈیو لینش سے ہٹا دے۔“

”ڈیڈی! اس سے تو رشاک کی جان مزید خطرے میں پڑ جائے گی۔“ ساجد نے کہا۔

”تو رشاکا باپ نہیں ہے۔“ اس کے باپ نے گرج کر کہا۔ ”کیا تو چاہتا ہے کہ مشتاق تجھے دھکے دے کر یہاں سے نکال دے۔ اس دور میں تو کسی کے ساتھ بھی ہمدردی نہیں کرنی چاہیے۔ ابھی رضا کو ٹیلی فون کر اور جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر عمل کر۔“

”بھائی جان! آپ فضول میں بات بڑھا رہے ہیں۔“

حالت مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ میرا لحاظ جرم اور احساسِ عداوت مجھے مارے ڈال رہا تھا۔ میں خالو مشتاق سے پلٹ کر اس بری طرح رویا کر نکلا ہوا گیا۔ یہ رمشا کی موت سے زیادہ چھتاوے کے آنسو تھے۔

پولیس نے رمشا کی لاش وہاں سے اٹھائی تھی اور اسے پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا تھا پھر مجھ پر ایک اور انکشاف ہوا۔ اسٹیشن کے دورِ افادہ گوشے میں آخری پلیٹ فارم پر پولیس کو تین لاشیں مزیڈ کی تھیں۔ انہیں گولی مار کے قتل کیا گیا تھا۔ ان لاشوں میں سے ایک لاش انوکھی بھی تھی۔ پھر ساری صورت حال میری سمجھ میں آئی۔

انہوں نے ان لوگوں پر زور دیا ہوگا کہ وہ رمشا کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیں۔ ان لوگوں کا آپس میں جھگڑا ہوا ہوگا۔ وہ دونوں آدمی انوکھی گولیوں سے ہلاک ہوئے ہوں گے پھر ان کے کسی آدمی نے انوکھیاں مار دی ہوں گی۔ ان کے آپس کے جھگڑے سے فائدہ اٹھا کر رمشا وہاں سے بھاگ نکلی ہوگی۔ ان لوگوں نے اس کا پیچھا کیا ہوگا۔ وہ اس سونے کی چڑیا کو کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ چھپیں لاکھ روپے کا چیک ان کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا لیکن اس وقت یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر رمشا نے پل کے جھنگے پر چڑھ کر چلا گیا کیوں لگاؤ؟ وہ بدعاشی لوگ اس کے پیچھے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو تب بھی وہ اس کا چھ لگاؤ نہیں سکتے تھے۔ پل پر لوگوں کی آمد و رفت تھی۔ وہ اتنی آسانی سے رمشا کو نہیں لے جاسکتے تھے پھر میں بھی اس پل پر موجود تھا۔ اس نے آخر کیا کیوں کیا؟

جب انہو اور دوسرے لوگوں کی لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہوا تو میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ دونوں اس ریوالور سے ہلاک ہوئے تھے جو انوکھے ہاتھ میں تھا۔ ان پر جس ریوالور سے گولیاں چلائی گئی تھیں، پولیس کو وہ ریوالور نہیں ملا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انوکھے فائر ان دونوں ہی نے کیے تھے جو رمشا کا تعاقب کر رہے تھے۔

☆☆☆

رمشا کی موت کے بعد میں بالکل نوٹ پھوٹ کر رہ گیا تھا۔ یہ احساس مجھے مارے ڈال رہا تھا کہ ایک معصوم لڑکی میری خواہشات کی بیعت چڑھ گئی۔ مجھے ہر لمحہ رمشا کی کٹی ہوئی لاش کا خیال رہتا تھا۔ میں نے اسٹیشن کی طرف جانا چھوڑ دیا تھا کہ ٹرین کی ٹرگڑاہٹ سے مجھے وحشت ہوتی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں پوری دنیا کو آگ لگا دوں۔ ہمارا گھر اسٹیشن کے نزدیک تھا اس لیے رات دن وہاں

ٹرینوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ہاسٹل میں رہنے لگا تھا۔ رمشا کے تعاقب میں جو آدمی تھے، وہ میرے لیے اجنبی تھے لیکن ان کے چہرے میرے ذہن پر نقش ہو چکے تھے۔ وہ نہ صرف رمشا کے قاتل تھے بلکہ انوکھے قاتل بھی تھے۔ میں ان سے رمشا کی موت کا انتقام لینا چاہتا تھا۔

میں انوکھے کے ساتھ رہ کے اس کے کئی ٹھکانوں سے واقف ہو گیا تھا۔ ایک دن میں انوکھے کے ایک ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ وہ بہ ظاہر چھوٹا سا جائے کا ایک ہوٹل تھا۔ اس کا مالک دلاور تھا۔ اس نے ہوٹل کے عقی جسے میں ایک ہال بنا رکھا تھا جہاں لوگ کیرم اور تاش وغیرہ کھیلتے تھے۔ اس ہال کی دائیں جانب دو کمرے تھے جہاں انوکھے اور اس کے ساتھی بیٹھتے تھے۔ وہ لوگ عموماً اس جگہ کسی واردات کی منصوبہ بندی کرتے تھے اور وہیں ہونے والے مال کا بھارا بھی ہوتا تھا۔ زیورات اور قیمتی شایاں اور خرید لیتا تھا اور اس کے بدلے میں نقد رقم ادا کر دیتا تھا۔ انوکھے دو تین ٹھکانے اور بھی تھے لیکن میں نے سب سے پہلے اس ٹھکانے کا انتخاب کیا تھا۔

کاؤنٹر پر اس وقت دلاور کے بجائے ایک نو عمر لڑکا بیٹھا تھا۔ میں اس لڑکے کو بھی پہچانتا تھا۔ دلاور کی عدم موجودگی میں وہی کاؤنٹر پر بیٹھا تھا۔ لڑکے نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا، میں بے نیازی سے ہوٹل کے عقی جسے کی طرف بڑھ گیا۔

ہال میں اس وقت کچھ لوگ کیرم کھیل رہے تھے اور ایک طرف تاش کی بازی بھی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہاں کیرم پر بھی جوا ہوتا ہے اور تاش پر بھی لیکن نقد رقم بھی سامنے نہیں ہوتی تھی۔

وہاں اس وقت مجھے کوئی شناسا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔ میں مایوس ہو کر باہر آ گیا اور ایک طرف بیٹھ کر انوکھے کی آدمی کا انتظار کرنے لگا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے میں نے یکے بعد دیگرے تین سگریٹ پھونک ڈالے۔

میں مایوس ہو کر اٹھنے ہی والا تھا کہ ہوٹل کے دروازے پر ایک موٹر سائیکل آ کر رکی۔ اس کی عقی سیٹ پر ساجد بیٹھا تھا۔ لوگ اسے جھوکتے تھے۔ وہ اس گینگ کا آدمی تھا جو انوکھے اور دیکھت کی وارداتیں کرتا تھا۔ انوکھے میں اسی گینگ میں شامل ہو گیا تھا۔ میں نے جو کو ایک دوسرے انوکھے کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ انتہائی واباش لڑکا تھا اور بات بات پر پتول نکال لیتا تھا۔ جھو موٹر سائیکل سے اتر کر ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ موٹر سائیکل والا اسے چھوڑ کر روانہ ہو گیا۔ ممکن

ہے وہ بھی اسی گینگ کا آدمی ہو لیکن میرے لیے اجنبی تھا۔ مجھے اب بے تابی سے جوا کا انتظار تھا۔ وہ ضرور ان بدعاشوں کو جانتا ہوگا جو انوکھے اور رمشا کی موت کے ذمے دار تھے۔ بے اختیار میرا ہاتھ جیب کی طرف گیا لیکن پلٹ موجد نہیں تھا۔ میں تو بڑا ارادہ اس طرف آ گیا تھا۔

مجھے آدھ گھنٹا مزید انتظار کرنا پڑا۔ پھر مجھے جوا باہر آتا دکھائی دیا۔ باہر آ کر اس نے سگریٹ سلگایا اور پیدل ہی ایک طرف روانہ ہو گیا۔ میں کچھ فاصلے سے ہو کے پیچھے چلنے لگا۔ اس کا رخ پرانے لاہور کی طرف تھا۔ میں بہت محتاط انداز میں اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ بھائی گیٹ سے وہ اندر ٹیڑھی میزیں گلیوں میں داخل ہو گیا۔ دو تین گلیاں طے کرنے کے بعد جو ایک پرانے اور بوسیدہ سے مکان کے سامنے رکا۔ مکان کا دروازہ مقفل تھا۔ جوائے جیب سے چابی نکالی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

میں اب مزید انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ میں آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا اور اس پر دستک دی۔

”کون ہے؟“ اندر سے جوا کی کرخت آواز سنائی دی۔ ”جوا، دروازہ کھول یا“ میں نے آواز بدل کر کہا حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ جوا جھوٹا اس کے باوجود میں نے خطرہ مول لیا تھا۔ دروازے کے دروازے پر اس کی آواز سنائی دی۔ ”جوا، دروازہ کھول یا“ میں نے آواز بدل کر کہا۔ ”کون ہے تو؟“ اچانک اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک نمودار ہوئی اور وہ حیرت سے بولا۔ ”اے تو یہاں کیا کر رہا ہے؟“

”مجھے تجھ سے کچھ پوچھنا ہے جوا“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کا پلٹل چار پائی پر نیچے کے ساتھ بڑا تھا۔

وہ اچانک پلٹا اور ایک کمرے میں اٹھانا چاہا لیکن میں نے اسے موقوف نہ دیا اور اس کی پشت پر لٹا رسید کر دی۔ وہ لڑھک کر فرخ پر گر گیا۔ میں نے چھٹ کر اس کا پلٹل اٹھا لیا اور اس کا رخ جوا کی طرف کر دیا پھر میں درشت لہجے میں بولا۔ ”اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا جو روئے نہ کھوپڑی اڑا دوں گا۔“

جوا وہیں ساکت ہو گیا اور بولا۔ ”تو آخر چاہتا کیا ہے؟“ ”میں جو کچھ پوچھوں سچ بتانا۔“ میں نے کہا۔ ”انوکھے“

”کون سے قتل کیا ہے؟“ ”اے تو کیا دلاور کے گینگ میں شامل ہو گیا ہے؟“ میں نے آگے بڑھ کر اس کے گھٹنے پر زور دیا۔ ”جوا“ وہ بولا۔ ”مجھے سے جو کچھ پوچھ رہا ہوں، وہ بتا۔“ پھر میں نے اس کے سوال کا جواب دیا۔ ”ہاں، میں دلاور کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ بس اب کوئی سوال مت کرنا۔ بتاؤ انوکھے کس نے قتل کیا ہے؟“

اچانک مجھے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں پھرتی سے زمین پر گر گیا۔ کسی نے پشت سے مجھ پر ڈنڈے سے وار کیا تھا۔ وہ ڈنڈا میرے بجائے جوا کے سینے پر پڑا اور حملہ آور اپنی ہی جھونک میں جوا پر گر پڑا۔ پلٹل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گیا تھا۔ مجھ پر حملہ کرنے والا اب سنبھل گیا تھا اور دوبارہ ڈنڈا سنبھل رہا تھا۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے اس کے سینے پر لٹا رسید کر دی۔ وہ ارٹ کر پیچھے گرا۔ میں نے جھک کر اسے دیوچ لیا۔ وہ شخص میرے لیے اجنبی تھا۔ میں نے اس کے بڑے بڑے بال منجھی میں جکڑ کر اس کا سر فرش پر دے مارا۔

اچانک پشت سے مجھے جوا کی غراہٹ سنائی دی۔ ”بس کرواے ہر دور نہ میں تیری کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔“

میں نے جھک کر دیکھا۔ جوا نے پلٹل اٹھا کر مجھ پر وار کیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ پلٹل شخص دھمکانے کو نہیں نکالتا بلکہ فائر بھی کر دیتا ہے۔ میں خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔

اس نے درشت لہجے میں کہا۔ ”اب بتا، تجھے دلاور نے میرے پیچھے کیوں بھیجا ہے؟“

”مجھ سے کیا پوچھ رہا ہے؟“ میں نے بے ساختہ اس کی پشت پر دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ بہت پرانی چال تھی لیکن وہ دھوکا کھا گیا اور اچانک پلٹ کر دیکھا۔

وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر تھا درخت میں اسے پکڑنے کی کوشش کرتا۔ اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر میں ایک ہی جست میں کھلے ہوئے دروازے سے باہر آ گیا اور اندھا دھند وہاں سے بھاگ نکلا۔

کچھ دور جانے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرے تعاقب میں کوئی نہیں تھا۔ میں بھاگنے کے بجائے تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ان ٹیڑھی میزیں گلیوں سے باہر نکل آیا۔ میں نے وہاں سے رکشا پکڑا اور ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں اب دلاور کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے ایک دوسرے انوکھے دلاور کا نام سنا تھا لیکن اب اسے

دیکھا نہیں تھا۔ جو کے لیے مجھے محسوس ہوا تھا کہ وہ دلاور سے خوف زدہ ہے۔ شاید وہ اتنا ہی بڑا مدعا تھا۔
ہاسل ہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ میرا زلٹ آچکا ہے اور میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوا تھا۔ عام حالات میں مجھے یہ خبر سن کر بہت خوشی ہوتی لیکن اس وقت مجھے اس خبر سے ذرہ برابر خوشی نہیں ہوئی۔ میرا دوست وحید بھی پاس ہو گیا تھا۔ وہ اب ہاسل چھوڑنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اب میرا بھی ہاسل میں رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔
نہ چاہتے ہوئے بھی میں گھر آ گیا۔ اباجی اس وقت آفس میں تھے۔ اماں اور رینو گھر میں موجود تھیں۔ جب اماں کو یہ معلوم ہوا کہ میں نے امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کر لیا ہے تو خوشی کے مارے وہ زار و قطار رونے لگیں، پھر اسی وقت وضو کر کے شکرانے کے نفل ادا کرنے کھڑی ہو گئیں۔ اباجی گھر لوٹے تو وہ بھی خبر سن کر خوش ہو گئے۔
ہمارا گھر ریلوے لائن کے بالکل نزدیک ہی تھا۔ اچانک ٹرین کی گڑگڑاہٹ شروع ہو گئی۔ میں ایک دم حواس باختہ ہو گیا۔ اباجی مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے لیکن مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھ پر ایک عجیب سی وحشت طاری ہو گئی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان بند کیے اور گھبرا کے ادھر ادھر دیکھنے لگا، پھر میں شاید چیخنے لگا۔ اس کے بعد مجھے کچھ بھی نہیں یاد تھا۔
مجھے اسپتال میں ہوش آیا۔ اباجی، اماں اور رینو وہاں موجود تھے۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر اماں نے کہا۔
”یالہ تیرا شکر ہے۔“ وہ میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگیں۔

”اب یہی طبیعت ہے پتر؟“ اباجی نے پوچھا۔
”مجھے کیا ہوا تھا اباجی؟“ میں نے پوچھا۔
”تو کسی چیز سے ڈر گیا تھا بیٹا!“ اماں نے کہا۔ ”میں آج ہی شاہ جی سے تیرے لیے تعویذ لے کر آؤں گی۔ تجھے کسی کی نظر لگ گئی ہے۔“
مجھے سب یاد آ گیا کہ میں ٹرین کی آواز سن کر وحشت زدہ ہو گیا تھا۔ مجھے تو خود اپنی ہی نظر لگ گئی تھی۔ میری خواہش نے ایک معصوم لڑکی کو نگل لیا تھا۔ میں گھر واپس آیا تو پھر وہی مسئلہ تھا۔ ظاہر ہے گھر تو ریلوے لائن کے نزدیک ہی تھا۔ میں نے اس کیل جیل نکالا کہ کانوں میں روٹی ٹھوس کر دو گیا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو اباجی آفس جا چکے تھے۔ میں ناشا کر کے گھر سے نکل گیا۔ میں نے سگریٹ پیتا چھوڑ دی

تھی لیکن اب کئی دنوں سے پینے لگا تھا۔ میں سگریٹ ہمیشہ اسٹیشن کے ایک مخصوص اسٹال سے لیتا تھا کیونکہ وہاں ادھار سگریٹ، بان وغیرہ مل جاتا تھا۔
میں سگریٹ سلگا کر مڑا ہی تھا کہ میری نظر ایک شاسرا چہرے پر پڑی۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں آ رہا تھا لیکن میں نے اسے اکثر انوکے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ اس سمت سے آ رہا تھا جہاں ریلوے کی پرانی بوگیاں کھڑی تھیں۔ میں انوکے ساتھ اکثر ان ہی بوگیوں میں سے ایک بوگی میں جا بیٹھتا تھا۔ وہ آدمی تیزی سے باہر کی طرف جا رہا تھا۔
میں اس کے پیچھے لپکا اور اسے آواز دی۔ ”سنو!“
اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور رک گیا۔ ”جی فرمائیے؟“ اس نے پوچھا۔ شاید وہ مجھے پہچان نہیں تھا یا پھر جان بوجھ کے انجان بن رہا تھا۔
میں نے بے تکلفی سے کہا۔ ”یار! مجھے پہچانا؟“
اس نے نفی میں سر ہلادیا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن کے تاثرات تھے۔ واقعی وہ مجھے نہیں پہچانتا تھا۔
”تم انوکے دوست ہوتا؟“ میں نے اچانک کہا۔
اس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر اچانک اس کی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک دکھائی دی۔ ”ہاں..... میں انوکا دوست ہوں۔“ اس نے چونک کر کہا۔ ”اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ میں نے انوکے ساتھ کبھی کبھی کھانا کھا ہے۔“
”نہیں جارہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
”نہیں، میں یہاں اپنے ایک دوست کو ریسو کر کے آیا تھا۔ وہ کراچی سے آنے والا ہے لیکن ابھی تک آیا نہیں ہے۔“ وہ بات کرتے ہوئے مجھ سے نظریں نہیں ملایا تھا۔
میں جانتا تھا کہ اس وقت کوئی ٹرین کراچی سے نہیں آتی ہے۔ میری تو عمر اس پلیٹ فارم پر گزری تھی لیکن میں نے اسے ٹوکا نہیں۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ”آؤ یار، چائے پیتے ہیں۔“ میں نے بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تمام لیا اور اسے پلیٹ فارم سے باہر ایک ہوٹل پر لے گیا۔ میں نے چائے کے ساتھ سموسے بھی منگوا لیے۔
میں اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا، پھر میں نے اچانک پوچھا۔ ”تم جو کوجانتے ہو؟“
”ابھی طرح جانتا ہوں۔“ اس کے چہرے پر نفرت کے آثار دکھائی دیے۔ ”انوکے موت میں اس کا ہی ہاتھ ہے۔“
”یار! میں نے تو سنا ہے کہ انوکے کو کسی اور نے مارا تھا۔“
میں نے کہا۔ ”مجھے اس کا قاتل ایک مرتبہ مل جائے تو میں اسے اپنے ہاتھوں سے جہنم رسید کر دوں گا۔“

”انوکا عابد نے مارا ہے۔“ اس نے نفرت سے کہا۔
”میں خود اس کی تلاش میں ہوں۔ وہ اس دن کے بعد سے نظر نہیں آیا ہے۔ عابد، جو کا آدمی ہے۔ جو، انوکے ساتھ شامل ضرور تھا لیکن اس کی بھی انوکے ہی نہیں۔“
”معاف کرنا یار!“ میں نے کہا۔ ”میں نے اب تک تمہارا نام بھی نہیں پوچھا۔“
”تو میں نے کب پوچھا ہے۔“ وہ بھی مسکرایا۔ ”میرا نام اکل ہے۔“
”میں صفر ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔
”اکل! تم عابد کا علیہ بتاتے ہو، ممکن ہے میں نے بھی اسے دیکھا ہو؟“
”وہ گھٹے ہوئے جسم اور درمیانے قد کا گورا چٹا آدمی ہے۔“
مجھے ایک دم یاد آ گیا کہ رمشا کے پیچھے بھاگنے والوں میں سے ایک وہ بھی تھا۔ میں نے اکل سے پوچھا۔ ”یار، کچھ اندازہ ہے کہ یہ عابد اس وقت کہاں ہوگا؟“
”اندازہ ہوتا تو میں وہاں جا کر اس کا کام تمام کر دیتا۔“

میں اس کے ساتھ مزید کچھ دیر بیٹھا، پھر اس سے آئندہ ملاقات کا وعدہ کر کے اٹھ گیا۔
دوسرے دن میرا ہاسل والا دوست وحید واپس اپنے گاؤں جا رہا تھا۔ میں نے وہاں ہاسل میں گھر کے کچھ فیصلہ کیا اور ایک پی سی او سے اباجی کو فون کر دیا کہ میں آج رات اپنے دوست کے ساتھ رہوں گا۔ ہم دونوں رات گئے تک ماضی کی باتیں کرتے رہے۔
صبح ناشتے کے بعد وہ مجھ سے رخصت ہو کر لاری اڈے کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں گھر پہنچا تو رینو نے ڈاک سے آیا ہوا ایک لفافہ مجھے دیا اور بولی۔ ”بیٹا! یہ ابھی تھوڑی دیر پہلے آیا ہے۔“ لفافے پر کراچی کی ایک ملٹی مشنل مینی کا پتا چھپا ہوا تھا۔ اس میں میرا اپنا نمبر لکھا تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ امتحانات کے بعد میں نے اور وحید نے اس مینی میں ملازمت کی درخواست بھیج دی تھی۔ بڑے بڑے ادارے مختلف تعلیمی اداروں سے رابطہ میں رہتے ہیں۔ وہ اچھے نمبروں سے پاس ہونے والوں کو اپنے طور پر بھی پیشکش کرتے ہیں۔
”کس کا خط ہے بیٹا؟“ رینو نے پوچھا۔
”مجھے کراچی کی ایک فرم میں جاب مل گئی ہے۔“ میں نے کہا۔ لیکن مجھے اس کی کوئی خوشی نہیں تھی۔ اب تو سب کچھ میرے لیے بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ میرا کراچی جانے کا

کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔
میں اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جا ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ رینو نے دروازے کی طرف بڑھنا چاہا لیکن میں نے اسے روک دیا اور خود آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

دوسرے ہی لمحے مجھے جو کا مخوس چہرہ دکھائی دیا۔ وہ مجھے دھکیلتا ہوا اندر آیا۔
”یہ کیا تمیزی ہے؟“ میں دباؤ کر بولا۔

اس نے ایک دم اپنا سہل نکال لیا۔
یہ صورت حال دیکھ کر رینو نے فلک شگاف چیخ ماری۔
اچانک کھلے ہوئے دروازے سے دو آدمی اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک عابد تھا اور دوسرا بھی وہی تھا جو رمشا کے تعاقب میں بھاگ رہے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں بھی گنز تھیں۔ انہیں دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا۔ میں نے بے اختیار جیب پر ہاتھ مارا لیکن میرا سہل موجود نہیں تھا۔

”آواز نکالی تو ابھی چھپتی کر دوں گا۔“ عابد نے سفاک لہجے میں کہا۔ ”تجھے میری تلاش تھی نا۔ اب میں تیری بہن کو لے جاؤں گا، پھر میرے ساتھ ساتھ اسے بھی تلاش کرتے رہنا۔“
رینو ایک دم بے پروا ہو کر رمشا کے دروازے کی طرف سے باہر نکل آئیں۔ گھر میں راج مدعا شہر دیکھ کر وہ بے ہوش ہو کر گر پڑیں۔ ”اگر تو نے میری بہن کی طرف میلی نظر سے دیکھا بھی تو میں تیرے کٹوے کر دوں گا۔“
”اچھا!“ عابد نے کہا۔ ”چل پھر کر دے کٹوے!“ وہ رینو کی طرف بڑھا تو میں بھی گن کی پروا کے بغیر اس پر چھپنا۔

اچانک میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ سر پر لگنے والی ضرب اتنی ہی شدید تھی کہ میری آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے دائرے سے دھڑکنے لگے اور میں دھڑام سے زمین پہ جا گرا۔

میں پوری طرح بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ مجھے رینو کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر اس کی چیخیں معدوم ہو گئیں۔
میں ہمت کر کے کھڑا ہو گیا اور اپنے کمرے کی طرف دوڑا تا کہ اپنا سہل لے لوں۔ میرے سر میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ میں سہل اٹھانے کے لیے جھکا تو مجھے پکڑا آیا لیکن میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ میں نے سر پر ہاتھ لگا یا تو مجھے علم ہوا کہ میرے سر سے خون بہہ رہا ہے۔
میں نے اماں کو اٹھا کر بیڈ پر ڈالا اور خود یونہی وار

رنگت نکھرے گی تو اب نکھری ہی رہے گی!

فیر فیس

ٹی ٹی کی فیر فیس گولیوں کی صورت میں کھائی جاتی ہے اور خون کو صاف کر کے جسم کے اندر سے رنگ نکھار دیتی ہے۔ اس کے باقاعدہ استعمال سے رنگت کھلتے ہوئے گورے پن میں بدل جاتی ہے اور ساتھ ہی چہرے کے داغ دھبے، آنکھوں کے گرد ہلکے پھلکے پھیرے اور گردن کی جھریاں بھی دور ہو جاتی ہیں۔ خواتین کے ساتھ ساتھ مردوں کے لئے کیاں مفید ہے۔ مردوں کے لئے بہت مشکل ہے کہ باہن اور کرکٹس ہلکے پھلکے جین فیر فیس کھانا ان کے لئے بہت آسان ہے۔

f www.facebook.com/top.treatments

چھوٹے قد والے دل چھوٹا نہ کریں!!

گروٹال

ٹی ٹی کی گروٹال ایک ہومیو پیٹھک دوا ہے جو معجز اثرات سے پاک ہے۔ اس میں شامل اجزاء انسانی جسم میں، سونا ٹروپین (نشوونما کار ہارمون) کی پیداوار میں اضافہ کرتے ہیں جس سے ہڈیوں اور ڈھانچے کو تقویت ملتی ہے اور ان کے بڑھنے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اس کے استعمال سے ہر وہ شخص جس کی عمر 30 سال سے کم ہے اپنے قد میں کم از کم اضافہ کر سکتا ہے۔

اگر آپ کی عمر 30 سال سے کم ہے تو گروٹال آپ کا قد بڑھا سکتی ہے!



ملک بھر کے ہر اچھے میڈیکل سٹور، ہومیو پیٹھک سٹور اور دوا خانہ پر دستیاب

042-35789145 & 6,0334-4266255

Email: toptreatments@gmail.com, Website: www.toptreatments.net

نہایت کی صورت میں یا حریص
معلومات حاصل کرنے کے لیے

II

وہ پولیس کا ایک اے ایس آئی تھا۔ اباجی کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”ایس ایم صاحب! آپ کی بیٹی کا بیان بھی لیتا پڑے گا۔“

”ضرور بیان لو لیکن اسے ذرا سنبھلے تو دو۔ ابھی تو اس کے لیے بات کرنا بھی مشکل ہے۔“

”بیان میں نہیں لوں گا بلکہ متعلقہ تھانے کا کوئی افسر لے گا۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

”رینو بیٹا! سب کچھ سچ سچ پولیس کو بتادینا کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔“ اباجی نے کہا۔ ”گھبراہ امت۔“

اگلے کو پولیس نے ہتھکڑی ڈال دی تھی اور اب اسے وہاں سے لے جا رہے تھے۔

”صنذر! تم گھر سے مت نکلتا، میں ابھی آتا ہوں۔“

اباجی نے کہا اور باہر نکل گئے۔

”یہ کون لوگ تھے بیٹا؟“ اماں نے پوچھا۔ ”کیا پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا؟“

اماں کو معلوم ہی نہیں ہوسکا تھا کہ ہمارے گھر میں داخل ہونے والے تینوں بد معاش مرچے تھے۔

آدھے گھنٹے بعد خالو مشتاق اور خالہ زینت بھی وہاں پہنچ گئے۔ اماں جی نے انہیں ٹیلی فون کر کے بلایا تھا۔

انہوں نے ہم سے کہا۔ ”تم سب میرے ساتھ چلو۔ میں نے سرور بھائی صاحب کے کہنے پر پولیس کو بلا دیا۔“

بھی رینو بیٹا کا بیان لینے آئے، اسے میرے پاس بھیج دیں۔“

وہ اصرار کر کے ہم لوگوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔

پولیس کے اعلیٰ افسروں سے ان کے تعلقات تھے اس لیے ہمیں بالکل پریشانی نہیں ہوئی۔ اگلے نے بیان دیا تھا کہ مرنے والوں سے اس کی دشمنی تھی۔ وہ اپنے ایک دوست کو رخصت کرنے اسٹیشن آیا تھا۔ وہ واپس جا رہا تھا کہ اس کی نظر ان تینوں بد معاشوں پر پڑی۔ وہ ایک لڑکی کو اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ وہ پوری طرح سچ تھے۔ میں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھ پر فائر کر دیا۔ اپنے دفاع کے لیے مجھے بھی فائرنگ کرنا پڑی اور وہ تینوں مارے گئے۔ فائرنگ کی آواز سن کر وہاں بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ رینو کا بھائی اس سے پہلے ان سے التجا کر رہا تھا کہ میری بہن کو چھوڑ دو۔

اس کے بیان کی تائید محلے والوں نے بھی کی۔

یوں کسی جھگڑے میں پڑے بغیر ہماری جان چھوٹ گئی۔ جو، عابد اور ان کے ساتھی کی موت کے بعد مجھے کسی حد تک سکون مل گیا تھا اور میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ میں کراچی چلا

گھر سے باہر نکلا۔

رینو کی مزاحمت کے باعث وہ لوگ زیادہ دور نہیں جا سکے تھے۔ عابد نے رینو کو کندھے پر اٹھالیا تھا۔ بجو اور دوسرا بد معاش آگے آگے گرنے لپے چل رہے تھے۔

میں نے بیچ کر کہا۔ ”میری بہن کو چھوڑ دے کیسے!“

اچانک جو نے پھل کی ٹال میری طرف کی اور فائر کر دیا۔

میں نے گولی سے بچنے کی کوشش کی لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ میرے بجائے گولی بھوکھلی تھی اور وہ اوندھے منہ گر پڑا تھا۔ فوراً ہی دوسرا فائر ہوا اور عابد کا ساتھی کرب ناک انداز میں چیخا ہوا زمین پر گر گیا۔

عابد نے گھبرا کر رینو کو نیچے پھینک دیا اور بھٹکا کر مجھ پر فائر کرنا چاہا لیکن اس کے فائر کرنے سے پہلے ہی ایک اور فائر ہوا۔ گولی اس کے سینے میں بیوست ہوئی اور وہ چیخا ہوا زمین پر گر گیا۔

پھر ایک دیواری کی اوٹ سے اگل نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ اس کی ٹال سے اب بھی دھواں نکل رہا تھا۔ اس دوران میں رینو دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ خوف اور دہشت سے وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔

وہاں ارد گرد لوگوں کا مجمع لگتا جا رہا تھا۔ اگل دوڑ کر میرے نزدیک آیا اور بولتا۔ ”میرے دل میں کوئی شے نہیں جاؤ۔ ابھی تھوڑی دیر میں پولیس یہاں پہنچ جائے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ ہمیں بھی شے میں گرفتار کر لے۔“

وہ تینوں میرے سامنے مردہ پڑے تھے۔ میرے سینے میں تھنڈی پڑی۔ آخر اگل نے انو اور رشا کے قاتلوں کو تھکانے لگا دیا تھا۔

پھر وہاں پولیس اور ریلوے کا دوسرا عملہ ایک ساتھ پہنچا۔ میں رینو کو گھر میں چلا آیا تھا اور میں نے اپنا مہل بیڈ کے گدے کے نیچے چھپا دیا تھا۔

ریلوے کے عملے کے ساتھ ابا بھی تھے۔ انہیں جیب معلوم ہوا کہ بد معاشوں نے رینو کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی تو وہ حواس باختہ سے گھر میں داخل ہوئے۔ اس وقت تک اماں بھی ہوش میں آچکی تھیں۔ وہ بھی بری طرح کھبی ہوئی تھیں۔ پھر وہ بری طرح روتی ہوئی رینو سے لپٹ گئیں اور اس کی پیشانی چومتے ہوئے پولیس۔ ”تو تھیک تو ہے بیٹی؟“

”یہ بالکل ٹھیک ہے اماں!“ میں نے جواب دیا۔

دروازے پر ایک مرتبہ پھر دسک ہوئی تو میں چونک اٹھا۔ مجھ سے پہلے ہی اباجی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

جاؤں۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اباجی بھی اب ریٹائر ہوئے والے تھے۔ گھری ذمے داریاں اب مجھے ہی اٹھانا تھیں۔

اباجی نے فی الحال دفتر سے کچھ دن کی چھٹی لے لی تھی۔ ایک دن اباجی نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے اماں کو بتایا۔ ”بھائی مشتاق نے فوراً ہم لوگوں کو بلایا ہے۔“

”خیریت تو ہے؟“ اماں گھبرا گئیں۔

”ہاں خیریت ہے۔“ اباجی نے جواب دیا۔ ”وہ غمہ کی شادی اپنے ایک دوست کے بیٹے سے کر رہے ہیں۔ وہ معروف ارب پتی صنعت کار شہر یار کا بیٹا ہے۔“

”اللہ مبارک کرے۔“ اماں نے کہا۔ ”ہم سب شادی میں جا سکیں گے۔“

”اماں، میں تو ملازمت کے لیے کراچی جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تو اتنی دور کیوں جا رہا ہے؟“ اماں نے پوچھا۔

”یہاں تیرے لیے کوئی ملازمت نہیں ہے کیا؟“

”نہیں اماں!“ میں نے کہا۔ ”تمام بڑی بڑی فرمز کراچی اور لاہور میں ہیں۔ مجھے دوبارہ ایسا موقع اتنی جلدی نہیں ملے گا۔“

”تم کراچی ضرور جاؤ بیٹا!“ اباجی نے کہا۔ ”لیکن غمہ کی شادی کے بعد۔“

”رہنہ زینت بہن اور بھائی مشتاق بھی انجینئرس کے گھر اس شادی سے خوش نہیں ہوں۔“

ان کی بات معقول تھی اس لیے میں نے کراچی جانے کا پروگرام کچھ دن کے لیے ملتوی کر دیا۔

غمہ کی شادی کے بارے میں سن کر میرے دل کو شدید دھچکا لگا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا اور آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ اچانک میرے ذہن کی اسکرین پر رمشا نمودار ہوئی۔ ”صغیر بھائی! اپنی خواہش کے لیے آپ نے میری جان لے لی لیکن میری قربانی بھی آپ کے کام نہ آ سکی۔“ وہ روتے روتے ہانگوں کی طرح ہنسنے لگی۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان بند کر لیے لیکن اس کے قہقہے میرے ذہن میں گونجتے رہے۔ پھر انو، اکبر، عابد، جو اور ان کے دوسرا بھی میرے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ ”ہم سب تمہاری خواہش کی سمیٹ چڑھ گئے۔ تم نے اپنی محبت پانے کے لیے ہماری جان لے لی لیکن حاصل کیا ہوا؟“ انو نے کہا۔

”میں نے کسی کی جان نہیں لی۔ کسی کی جان نہیں لی۔“ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میرا چہرہ پسینے میں تر تھا، اور دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

☆☆☆

برات کا استقبال کرنے والوں میں خالو مشتاق کے ساتھ میں اور اباجی بھی موجود تھے۔

جہانگیر خاصا وجہہ اور دراز قد فوجان تھا۔ غمہ کی طرح اس کا رنگ بھی سرخ و سفید اور بال سیاہ تھے پھر غمہ میری آنکھوں کے سامنے گھبرا گئی کی اینم ڈیو کار میں بیٹھ کر رخصت ہوئی۔ میں ہارے ہوئے جواہر کی طرح ہال میں واپس آ گیا۔ میں نے غمہ کو اپنانے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا لیکن میرے ہاتھ کیا آیا؟ عمر میاں اور ناکا میاں! میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے جنہیں میں نے جلدی سے صاف کر لیا۔

اچانک جانے میرے جی میں کیا آئی کہ میں نے بے اختیار اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ اسٹیشن کا وہی ماحول تھا، وہی گہما گہما بھی لیکن اتنے عرصے میں بہت سے چہرے بدل گئے تھے۔ ہاں اسٹیشن والے سب میرے شناسا تھے۔ ہر شخص مجھ سے بہت تپاک سے ملا۔

میں پلیٹ فارم پر ٹھہرا ہوا بے اختیار اس طرف جانکلا جہاں ریلوے کی ناکارہ بوکھڑاں کھڑی ہوتی تھیں۔ میرے قدم خود بہ خود اس بوکی کی طرف اٹھ گئے جو دوسری ناکارہ بوکیوں کے درمیان کھڑی تھی۔ وہی بوکی جو کبھی میرا ٹھکانہ تھی میں غیر ارادی طور پر دروازہ کھول کر اس بوکی میں داخل ہو گیا۔ وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے اپنا لٹریچر روشن کیا اور اس سیٹ کی طرف چل دیا جہاں میں اکثر بیٹھا کرتا تھا۔ میرے ساتھ کی خوب صورت لڑکیاں اس سیٹ پر بیٹھ چکی تھیں۔ انو بھی اکثر میرے ساتھ اسی سیٹ پر بیٹھتا تھا۔ میں آگے بڑھا ہی تھا کہ مجھے سیٹ کے نیچے کی طرف کوئی بیٹ سی نظر آئی۔ میں نے جبکہ کر بیٹ پکڑی اور اسے باہر مٹھ بیٹ لیا۔ وہ کوئی اسکول بیگ تھا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ رمشا کا اسکول بیگ تھا۔ وہ بیگ تین مہینے تک اسی طرح وہاں پڑا رہا تھا۔ لگتا تھا اس دوران میں کوئی اس بوکی میں آیا ہی نہیں ورنہ وہ قہقہے بیگ وہاں نہ ہوتا۔ میں نے غیر شعوری طور پر وہ بیگ اٹھایا اور اسے کندھے سے لٹکا کر باہر نکل آیا۔

وہاں سے میں سیدھا وینٹنگ روم میں پہنچا۔ فرسٹ کلاس کے وینٹنگ روم کا کیرا بھی مجھے اچھی طرح پہچانتا تھا۔ میں اکثر اسے پانچ دس روپے دے دیا کرتا تھا۔ اس نے مجھے ادب سے سلام کیا اور بولا۔ ”صغیر بابو! وینٹنگ روم کھول دوں کیا؟“

”ہاں غلام حسین۔“ میں نے کہا۔ ”ذرا وینٹنگ روم کھول دو۔ میں کچھ دیر یہاں آرام کروں گا۔“

اس نے وینٹنگ روم کھولا تو میں نے سو روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ خوش ہو کر بولا۔ ”آپ کے لیے چائے لے کر آتا ہوں۔“

میں نے وینٹنگ روم میں بیٹھ کر رمشا کا بیگ کھول لیا۔ اس میں اس کی کتابیں، کاپیاں اور دوسری چیزیں تھیں۔ میں نے اس کی ایک کتاب نکالی تو اس پر خوش خط انگریزی میں اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ ”رمشا مشتاق۔“ اس میں سے اچانک کچھ کاغذ نکل کر باہر گر پڑے۔ میں نے جھک کر وہ کاغذ اٹھالیے۔

میں نے پوچھی ان کاغذات کی تہیں کھولیں تو مجھے رمشا کی تحریر نظر آئی۔ اس نے انگریزی میں کچھ لکھا تھا۔ ہیڈنگ پر میری نظر پڑی۔ ”پولیس کے لیے۔“

اس کے نیچے لکھا تھا۔ ”مجھے امید تو نہیں ہے کہ میری یہ تحریر پولیس تک پہنچے گی لیکن میں پھر بھی لکھ رہی ہوں۔ شاید پہنچ ہی جائے۔ میں صبح اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلی تو بہت خوش تھی۔ اس دن میرا ٹیسٹ تھا اور میں نے بہت اچھی طرح ٹیسٹ کی تیاری کی تھی۔ میں ایک مرتبہ پھر اسے دہرایا تھی کہ اچانک گاڑی رک گئی۔ میں نے جبکہ کر دیکھا تو ایک پولیس گاڑی کھڑی تھی۔ وہ چوڑھڑ ماڈل لکڑی لائی تھی۔ وہ اس انداز میں کھڑی تھی کہ میں اس کا نمبر نہ دیکھ سکی۔ اس گاڑی کے ساتھ تین آدمی کھڑے تھے۔ ڈرائیور نے گاڑی روک دی اور گاڑی کا شیشہ ہٹا کر بولا۔ ”یار، یہ گاڑی تو سائڈ میں لگاؤ۔ راستہ بند ہو گیا ہے۔“

اچانک سائڈ میں سے دو آدمی نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں گھنٹیں۔ ان میں سے ایک میری طرف آیا۔ دوسرا ڈرائیور کی طرف چلا گیا پھر اس نے ڈرائیور کے سر پر گن کا بن مار کے بے ہوش کر دیا اور جبکہ کر مجھے سے بولا۔ ”اگر تو نے آواز نکالی تو مجھے بھی گولی مار کر ڈھیر کر دوں گا۔ دروازہ کھول اور خاموشی سے بیٹھ جا۔“

میں اتنی خوف زدہ ہوئی تھی کہ فوراً دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔ باہر کھڑے ہوئے آدمی نے مجھے بازو سے پکڑا اور تھپتھپ کر اس پرانی کرولا میں بٹھا دیا جو وہاں کھڑی تھی پھر دوسرا آدمی میرے ساتھ پنجر سیٹ پر بیٹھ گیا اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ ان میں سے ایک نے میرے دوپٹے سے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور گاڑی تیزی سے ایک طرف روانہ ہو گئی۔ ڈرائیور کے ساتھ جو آدمی پنجر سیٹ پر

بیٹھا تھا اس نے کہا۔ ”اس لڑکی کا خیال رکھنا، اسے تکلیف مت ہونے دینا۔ یہ میرے دوست کی امانت ہے۔“

”کون سا دوست؟“ یہ سوال شاید ڈرائیور نے کیا تھا۔ ”وہ صغیر۔۔۔۔۔؟“

”ہاں صغیر۔“ پہلے آدمی نے جواب دیا۔

”یار انو! وہ تجھے کب کا چھوڑ گیا ہے۔ تیری ابھی تک دوستی ہے اس سے؟“

”وہ مجھے چھوڑ کر نہیں گیا ہے بلکہ میں نے ہی اسے چھوڑ دیا۔“

”بات تو ایسی ہی ہے۔“ ڈرائیور نے کہا۔ ”وہ یہ لڑکی بہت خوب صورت ہے، بالکل گڑیا کی طرح ہے۔“

”اکو۔۔۔۔۔!“ انو نے سخت لہجے میں کہا۔ ”میں نے کہا ناکا اس لڑکی کے ساتھ کوئی زیادتی مت کرنا۔“

”ارے استاد! تم تو فضول میں گرم ہو رہے ہو۔ میں تو لڑکی کے حسن کی تعریف کر رہا تھا۔“

”انو بھائی! یہ تو صحن ملائی ہے۔“ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔

مجھے ان لوگوں کی باتوں سے گھن آ رہی تھی اور میں شدید خوف زدہ تھی۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ”تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“

”تم پریشان مت ہو۔“ یہ آواز انو کی تھی۔ ”تمہارے باپ سے ہمیں کچھ معاملات طے کرنا ہیں۔ وہ سیدھی طرح قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ کام ہوتے ہی تمہیں واپس گھر چھوڑ دیں گے۔ تمہیں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوگی۔“

پھر وہ نرم لہجے میں بولا۔ ”بس اب رونا بند کر دو۔“

گاڑی تقریباً ایک گھنٹے تک چلتی رہی پھر وہ رک گئی۔ میری آنکھوں سے پٹی ہٹا دی گئی۔ وہ لاہور کا کوئی مضافاتی علاقہ تھا۔ وہاں دو رنگ کھیت تھے۔ ان ہی کھیتوں کے سرے پر ایک کچا سا مکان تھا۔ وہ لوگ مجھے اٹھی مکان میں لے گئے۔ میں خوف سے لرز رہی تھی کہ نہ جانے وہ لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کریں۔ خاص طور پر انو تو مجھے ایسی نظروں سے دیکھتا تھا جیسے وہ مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جائے گا۔

اس کچے مکان میں دو کمرے تھے۔ ایک کمرے میں پٹنگ پر آرام دہ بستر بچھا ہوا تھا۔ انو نے مجھے اس کمرے میں بٹھایا دیا اور بولا۔ ”تم گھبراؤ مت، میں تمہارے کھانے پینے کے لیے کچھ منگو آتا ہوں۔“

وہ مہاراجن روتے ہوئے گزر گیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا

فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔

وہ لوگ بہت غلٹ میں وہاں سے بھاگے لیکن میں اپنا بیگ اٹھاتا نہیں بھولی۔ اس مرتبہ پھر انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور سفر شروع ہو گیا۔ ان کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ وہاں پولیس نے چھاپا مارا تھا۔ ان ہی لوگوں کی طرح کچھ اور ڈاکو بھی وہاں چھپے ہوئے تھے۔ پولیس والے انہی لوگوں کے لیے آئے تھے۔ جب پولیس اور ان ڈاکوؤں کا مقابلہ ہو رہا تھا تو وہ لوگ وہاں سے بھاگ نکلے۔ ان کی باتوں سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ڈاکوؤں میں ان کا ایک آدمی شامل تھا۔ اسی خوف سے وہ فرار ہو گئے تھے۔

اس مرتبہ وہ مجھے کسی ریلوے اسٹیشن پر لے آئے۔ میری آنکھوں پر پٹی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں نے مجھے برقع پہنا کر اوپر سے نقاب بھی ڈال دیا تاکہ کسی کو میری آنکھوں پر ہندسی ہوئی پٹی نظر نہ آ سکے۔ ان میں سے ایک نے میرا ہاتھ پکڑا اور میں اندھوں کی طرح ان کے ساتھ چل دی۔ دس منٹ تک چلنے کے بعد انہوں نے مجھے ٹرین میں سوار ہونے کو کہا۔ لگتا تھا اب وہ ٹرین کے ذریعے مجھے کہیں لے جا رہے ہیں۔

بوکی میں پہنچ کر انہوں نے میری آنکھوں سے پٹی ہٹا دی۔ میں اس اظہار میں غمی کہ میں نے یہ سب کچھ سمجھ لیا ہو کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ ڈیڑے کی گھڑیاں بندھیں لیکن میں ان سے کہہ کر انہیں کھلا سکتی تھی۔ ان سب لوگوں میں وہی مجھے سب سے زیادہ شریف اور ہمدرد لگتا تھا۔ وہ بوکی تھی کہ چلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بہت دیر بعد میں مجھے احساس ہو گیا کہ یہ بوکی بھی نہیں چلے گی۔ مجھے ٹرین کے انجن کا ہارن اور چلنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں لیکن وہ دوسری ٹرینیں ہوتی تھیں۔

جب ایک دن اسی طرح گزر گیا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ بوکی بھی نہیں چلے گی کیونکہ یہ بالکل الگ تھلک کھڑی ہے۔ ”نو بھائی!“ میرے منہ سے بے اختیار اس کے لیے بھائی کا لفظ نکل گیا۔ ”آپ مجھے گھر پہنچائیں گے؟“ ”تم پریشان مت ہو گڑیا، ہم آج ہی تمہیں گھر پہنچا دیں گے۔“ وہ ٹھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ بوکی میں ٹھوڑی دیر بعد کچھ اندھیرا چھا گیا۔ اچانک مجھے بوکی کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اگر ان لوگوں نے میرے ہاتھ پاؤں نہ باندھے ہوتے تو میں کب کی وہاں سے نکل کر بھاگ چکی ہوتی۔ کوئی بہت آہستگی سے اندر آ گیا۔

کہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں۔ وہ لوگ بار بار کسی صفدر کا نام لے رہے تھے۔ یہ نام تو میرے دل کی دھڑکن تھا۔ مجھے اس پر صفدر بھائی یاد آتے تھے۔ وہ کتنے ڈشنگ اور ہینڈ ہیں۔ میں عمر میں ان سے اتنی چھوٹی تھی کہ اپنے دل کی بات کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ کچھ کہنے کی کوشش بھی کرتی تھی تو وہ سمجھتے ہی نہیں تھے، عجیب بدھوتے۔ شاید انہیں بھی کسی لڑکی سے محبت ہی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے کئی بار سوچا کہ میں ان سے کل کر اپنی محبت کا اظہار کر دوں لیکن ہر بار میری زبان گنگ ہو جاتی اور میں ان سے کچھ بھی نہ کہہ پاتی۔ میں نے اکثر یہ بھی سوچا کہ میں رینو سے اپنے جذبات کا اظہار کر دوں لیکن اس کے سامنے بھی صفدر بھائی کا نام لیتے ہوئے میری زبان گنگ ہو جاتی۔

پھر میں نے یہ محسوس کیا کہ صفدر بھائی مجھ میں کم اور باجی میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ باجی شاید انہیں ناپسند کرتی تھیں یا ممکن ہے وہ بھی انہیں پسند کرتی ہوں لیکن میں جانتی ہوں کہ باجی اپنے دل کی بات نہ کہتی تھیں۔ بتائیں گی کہ نہ صفدر بھائی کو بتا پائیں گی۔ کاش اس وقت صفدر بھائی یہاں آجائیں تو وہ ان بد محاشوں کو سیدھا کر دیں۔ روتے دھوتے پورا دن گزر گیا۔ میں نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں حالانکہ اس انہوں نے بہت کوشش کی کہ میں کچھ کھالوں، کم سے کم دو دو کھالیں لیکن میں اسے انکار کر دیتی۔ رات کو بہت مشکل سے میں نے ڈبل روٹی کے دو سلائس اور دو دوہ کا ایک گلاس پیا۔ وہ بے مجھے بھوک بہت لگ رہی تھی اور بھوک مجھ سے برداشت نہیں ہوتی ہے پھر مجھے خیال آیا کہ میرے بیگ میں بچ باکس بھی تو ہوگا۔ میرا بیگ ابھی تک میرے پاس تھا۔ میں نے جلدی سے بیگ کھولا اور بچ باکس نکال لیا۔ اس میں سینڈوچز، فرنیچر، فرائز اور مایونیز تھا۔ میں نے خوب ڈٹ کر سینڈوچز کھائے اور جب جا کر میری جان میں جان آئی۔ لیکن یہ میں کالکھ گئی۔ صفدر بھائی کو معلوم ہوگا تو کتنی شرمندگی ہوگی اور شرہ باجی تو مجھے تھپڑ مار دیں گی۔ مار دیں..... کم سے کم میں نے اپنی محبت کا اظہار تو کر دیا اور اگر یہ تحریر پولیس کے ہاتھ لگ گئی تو..... تو بھی کیا ہے جب صفدر بھائی کو معلوم ہوگا، باجی کو معلوم ہوگا، ماما اور بابا کو معلوم ہوگا تو پولیس والوں سے کیا شرمناک لیکن اس کا فائدہ کیا ہے؟ پاپا تو خالہ لسیہ کو اتنا بے عزت کر چکے ہیں۔ اب تو شاید صفدر بھائی بھی ہمارے گھر بھی نہ آئیں لیکن انہیں معلوم تو ہو جائے گا کہ اس گھر میں کوئی تو ایسا ہے جو ان کے لیے جان تک دے سکتا ہے۔ رات کو اچانک

”کون ہے؟“ میں نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔ ”ڈروست۔“ مجھے اکو کی آواز سنائی دی۔ اس کی زبان بری طرح لڑکھاری تھی۔ وہ اندھیرے میں ٹٹول کر میرے بالکل نزدیک بیٹھ گیا اور بولا۔ ”رمشا! یہی نام ہے نا تمہارا؟ تم نے مجھی سوچا ہے کہ تم تنہی حسین ہو۔ اتنی حسین کہ تمہیں ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ تم میلی نہ ہو جاؤ۔“ وہ لڑکھائی ہوئی آواز میں بولا۔

”یہ تم کیسی بے ہودہ باتیں کر رہے ہو؟“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”نو بھائی کہاں ہیں؟“ ”بھائو میں گئے انو بھائی۔“ وہ بھڑک کر بولا اور میرے ساتھ بالکل چپک کر بیٹھ گیا۔ ”تم بس یہاں آج رات کی مہمان ہو۔ کل تمہیں تمہارے گھر پہنچا دیں گے۔“ ”سچ کہہ رہے ہو تم؟“

”ہاں، انوکھی جھوٹ نہیں بولتا۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھے اپنی ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ میرے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے ورنہ میں اسے اتنی آسانی سے اپنے نزدیک نہیں آنے دیتی۔ پھر اس نے..... میری عزت..... مجھے تو کہتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے۔

اس کے بعد دوسرا آدمی آگیا اور بولا۔ ”واہ اکو! اسکیلے ہی اسکیلے۔ ارے بار ہمارے بدن میں کیا کانٹے ہیں۔ لیکن تم نے بہت فطرت کیا، انوکھی کو معلوم ہوگا تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”اس انو سے میں خود نمٹ لوں گا۔ میں خود بھی اس سے الگ ہونے کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہوں۔“

”ارے یار تو پھر ہم کیوں پیاسے رہیں۔“ اس نے کہا پھر اس نے اکو کے ساتھ مل کر میرے ساتھ..... میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں مرجاؤں، رورور کر میری آنکھوں سے آنسو بھی خشک ہو گئے تھے۔ میں تو اب کسی قابل نہیں رہی تھی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر ان لوگوں نے مجھے چھوڑ بھی دیا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔ ان لوگوں نے مجھے میری ہی نظروں میں کر دیا تھا۔

ان دونوں نے مجھے دھمکی دی کہ اگر تم نے انو بھائی کو کچھ بتایا تو یا ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں تو خود بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ لوگ مجھے جان سے مار دیں۔ ان لوگوں نے زبردستی مجھے پانی پلایا اور بوکی سے باہر نکل گئے پھر وہاں انو بھائی بھی آ گئے۔ وہ لوگ بوکی کے باہر تھے اور کسی بات پر بحث کر رہے تھے۔

انو بھائی نے کہا۔ ”بچیں لاکھ کافی ہیں۔ اب زیادہ

لا لاج مت کرو۔ پچاس لاکھ اکٹھے کرنے میں اس کا باپ ایک اور دن لگا دے گا۔ یہاں ہر طرف خطرہ ہے۔ اس دوران میں یہاں پولیس بھی پہنچ سکتی ہے۔“ کافی بحث کے بعد وہ لوگ بچیں لاکھ پر راضی ہوئے۔ انہوں نے میری رہائی کے لیے بچیں لاکھ روپے مانگے تھے۔ صبح وہ لوگ مجھے ڈیڑے بجے کے حوالے کرنے والے تھے۔

انو بھائی نے بوکی میں آکر میرے ہاتھ کھولے اور مجھے کھانے کو دیا اور خود باہر چلے گئے۔ صبح ہوتے ہی میں کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی۔ ان میں سے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ میں نے جلدی جلدی یہ سارے واقعات لکھ دیے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں انو بھائی کو بھی سب کچھ بتا دوں گی پھر وہ لوگ شاید مجھے کوئی مار دیں گے۔ میں اب بے آبرو ہو کر مزید جینا نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆

اس سے آگے کچھ نہیں لکھا تھا۔ شاید رمشا کو مزید کچھ لکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس نے وہ کاغذ بیگ کی ایک کتاب میں رکھ کر بیگ کو سیٹ کے نیچے ڈھکیل دیا ہوگا۔ مجھے خیال نہیں بلکہ یقین ہے کہ اس نے انوکھی سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ اسی بات پر انو سے ان لوگوں کا جھگڑا ہوا ہوگا اور بات فائرنگ تک پہنچ گئی ہوگی۔ رمشا کے ہاتھ تو کھلے ہوئے تھے۔ اس نے میری جھپٹ لیا۔ ہوں گے اور بوکی کے نکل کر باجی ہوگی تاکہ وہ اسے گولی مار دیں۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ لوگ گولی مارنے کے بجائے اسے زندہ پکڑنا چاہتے تھے تو اس نے ریلوے کے پل پر چڑھ کر نیچے چھلانگ لگا دی۔

”صاحب چائے۔“

یہ سن کر میں بری طری اچھل پڑا۔ وہ وینٹگ روم کا حیران تھا۔ اس نے حیرت سے کہا۔ ”صفدر صاحب! آپ رو رہے ہیں؟“ خط پڑھتے ہوئے بے اختیار میرے آنسو بہنے لگے تھے۔

اچانک مجھے کسی ٹرین کا ہارن سنائی دیا اور اس کے پیہوں کی گونگواہٹ کانوں تک پہنچی تو میں وحشت زدہ ہو کر وہاں سے بھاگا۔ حیران حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید میرا دماغی توازن بگڑ چکا ہے۔

میں یوں وہاں سے بھاگا تھا جیسے فرشتہ اجل میرے پیچھے لگا ہو۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور اس سے اتار رکھی جانے کو کہا۔ میں فوری طور پر ان آوازوں سے دور بھاگنا چاہتا تھا ورنہ اتار رکھی میں اس وقت کیا ہوتا۔ رمشا کا بیگ میرے کندھے سے لٹک رہا تھا۔

میں نے انارکلی سے پہلے ہی چھوڑ دی اور پیدل ہی ایک طرف روانہ ہو گیا۔ اب میں اس جگہ کو کھکانے لگانا چاہتا تھا ورنہ وہاں سے سیدھا ماڈل ٹاؤن ہی جاتا۔ وہاں ایک جگہ مجھے کچھ انارکلی سے نظر آئے۔ سردی بہت شدید تھی۔ شاید وہاں چوکیدار نے الاؤ روشن کیا تھا جو اب تقریباً بجھ چکا تھا۔ میں نے پہلے بیگ سے ایک کاپی نکال کر راکھ کے اس ڈھیر میں پھینکی۔ راکھ کے نیچے اب بھی چنگاریاں تھیں۔ تھوڑی دیر میں کاپی سلگنے لگی۔ میں نے دوسری کاپی نکال کر اس سے شعلے کا کام لیا اور اس سے آگ کو جھل کر مزید آگ بھڑکادی پھر میں ایک کے بعد دوسری کاپی اور کتاب اس الاؤ میں ڈالتا رہا اور خود اس پتھر پر بیٹھ گیا جو شاید چوکیدار نے اپنے لیے رکھا تھا۔

اب آگ خوب بھڑک اٹھی تھی۔ میں نے ایک ساتھ اس میں پٹی ہوئی کتابیں اور کاپیاں ڈال دیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب جل کر خاکستر ہو گئیں۔ اب مسئلہ اس بیگ کا تھا۔ وہ خالص چمڑے کا بیگ تھا اور جلنے میں کافی وقت لیتا۔ میں نے وہ بیگ بھی بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جھونک دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے بھی آگ پکڑ لی۔ جلد ہی وہ بیگ ناقابل شناخت ہو گیا۔ اب یہ تو معلوم ہو سکتا تھا کہ اس الاؤ میں بیگ جل رہا ہے لیکن اب وہ ناقابل شناخت ہو چکا تھا۔ وہ سخت اللہ کی بات تھی کہ میری جیب میں شعلے جو مشتائے آخری وقت میں لگے تھے۔ میں نے وہ سخت احتیاط سے اپنی جیب میں رکھ لیے اور وہاں سے اٹھ گیا۔

رات خاصی ہو چکی تھی لیکن مجھے وہاں سے ماڈل ٹاؤن کے لیے ٹیکسی مل گئی۔ وہ شادی کا گھر تھا۔ ابھی تک وہاں سب جاگ رہے تھے۔ شمرہ کی چچا زاد، رینو، اماں اور خالہ جان بھی وہاں موجود تھیں۔ ابابھی، خالو مشتاق اور ان کے کوئی اور رشتے دار ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔

”صفر بچا! خالو مشتاق نے کہا۔“ کہاں چلے گئے تھے؟ تم نے کھانا بھی نہیں کھایا۔“

”میں اپنے ایک پرانے دوست سے ملنے چلا گیا تھا۔“ مجھے چانک رہا تھا کہ کتنا پھنساؤ اور اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا آخری خط یاد آ گیا۔ میرا دل بھر آیا اور میں خود پر ضبط نہ کر سکا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”ارے، ارے..... کیا وہ صفر بچا؟“ خالو نے پوچھا۔

”خالو، میرا وہ دوست ایک حادثے میں مر گیا۔“ میں نے زار و قطار روئے ہوئے کہا۔ خالو نے بے اختیار مجھے سینے سے لگالیا اور دلاسا دینے لگے۔

”صفر کو بیٹا۔ رونے کے بجائے اپنے اس دوست کے لیے دعا کرو۔“

اب میں انہیں کیا بتاتا کہ میری وہ دوست مرنا تھی۔ وہ پاگل لڑکی مجھے اتنا جانتی تھی۔ مجھے اگر اندازہ ہوتا تو شاید میں اسے پیار سے سمجھاتا لیکن اب تو وہ مجھے سمجھانے کی حدود سے بہت دور جا چکی تھی۔

☆☆☆

اس کے بعد کئی شادیوں میں، خاندان کی دوسری تقریبات میں شمرہ سے میرا سامنا ہوا۔ وہ شادی کے بعد کچھ اور گھر گئی تھی۔ وہ اپنی قیمتی لایم ڈیبلو سے اترتی تو وہاں موجود تمام خواتین کا حسن باند پڑ جاتا۔ وہ کسی مہارانی کی طرح نئے نئے قدم رکھتی ہوئی اندر داخل ہوتی اور خالہ جان یا اماں کے پاس جا بیٹھتی۔ وہ مجھے پہلے کی طرح سلام بھی کرتی تھی لیکن اب فرق یہ پڑا تھا کہ وہ وہاں سے بھاگتی نہیں تھی بلکہ مجھ سے اچھی خاصی باتیں بھی کر لیتی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے شدید احساس کمتری ہوتا تھا۔ میں نے بھی سوچ لیا کہ اب میں بھی خالو مشتاق اور شمرہ کو ان کے ہم پلہ ہو کر دکھاؤں گا مگر جا بظن طریقے سے۔

اس دوران میں شمرہ ایک بچے کی ماں بن چکی تھی۔ میں اس دن آفس سے گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ٹیلی فون اٹھا کر دیکھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ کال صاحب کا ٹیلی فون ہوگا اور وہ مجھے توری طور پر بلا رہے ہوں گے۔ کال صاحب میرے پاس تھے اور اکثر ضروری پروڈکٹس پر بات چیت کرنے کے لیے انہیں یہی وقت ملتا تھا۔ میں نے بریف کيس رکھ کر ریسپونڈ اٹھا لیا اور آہستہ سے بولا۔ ”ہیلو۔“

”السلام علیکم!“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ وہ آواز سن کر میرے چوہہ طبق روشن ہو گئے۔ میں اس آواز کو کیسے بھول سکتا تھا۔ وہ شمرہ کی مترنم آواز تھی۔

”شمرہ تم.....؟“ میں نے کہا۔ ”خیریت تو ہے، اس وقت کیسے فون کیا؟“

”کیون صفر بھائی! کیا میں آپ کو فون نہیں کر سکتی؟“ اس کے منہ سے بھائی کا لفظ سن کر مجھے شاک سالگا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”ہاں کر تو سکتی ہو لیکن کرتی نہیں ہو اس لیے کہہ رہا ہوں۔“

”وہ اگلے مہینے کی پندرہ تاریخ کو میرے بیٹے دانیال کا عقیقہ ہے اور آپ کو ضرور آنا ہے۔“

”ماشاء اللہ! دانیال بیٹا ایک سال کا ہو گیا؟ بہت

مبارک ہو۔“

”خیر مبارک لیکن آپ آ رہے ہیں نا؟“

”لیکن تمہیں میرا ٹیلی فون نمبر کہاں سے ملا؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کا نمبر کیا خیر ہے؟“ وہ مسکرائی۔ ”ارے مجھے خالہ نسیم سے ملا ہے اور کہاں سے لے گا۔ آپ آئیے گا ضرور، خدا حافظ۔“ یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں بہت دیر تک ریسپونڈ ہاتھ میں پکڑے اسے گھورتا رہا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ ماؤتھ پیس سے اس کی سانسوں کی خوشبو آ رہی ہے۔ یقیناً اماں نے اس سے کہا ہوگا کہ تم خود فون کرلو۔ ہمارے کہنے سے تو وہ شاید نہ آئے۔

شمرہ کے بیٹے دانیال کے عقیقے میں اتنا اہتمام تھا کہ کسی شادی یا عیسے کی تقریب میں بھی کیا ہوگا۔ خالہ کا پورا گھرانہ بہت خندہ پیشانی سے پیش آیا۔ اس تقریب میں شمرہ کے شوہر جہانگیر سے بھی تفصیلی ملاقات ہوئی۔ وہ خاصا عظیم القریب شخص تھا اور دن رات پیسا کمانے اور کاروبار کو وسعت دینے میں مصروف رہتا تھا۔ شمرہ کی شادی کے بعد میں آج اسے دیکھ رہا تھا ورنہ خاندان میں کئی تقاریب ہوتی تھیں جن میں صرف شمرہ ہی شریک ہوتی تھی، وہ یا تو ملک سے باہر ہوتا تھا یا پھر شمرہ سے باہر پہلا موقع تھا جب اس نے اپنے گھر کی طرف لوٹنے کا موقع ملا۔ کاروبار کی مصروفیت ترک کر دی تھیں۔

اس سے بات کر کے مجھے مزید احساس کمتری ہوا۔ اگر اس کی روزانہ کی آمدنی کا اوسط نکالا جائے تو وہ بھی میری ایک مہینے کی تنخواہ کے برابر تھا۔ میں جس فرم میں کام کرتا تھا، اس کے چیز میں سے بھی وہ واقف تھا۔ وہ ان کے بارے میں پوچھتا رہا اور میں جھوٹی سچی باتیں بتاتا رہا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اپنی اس مالی منتقلی مہینے کی کسی ای او سے میری دو چار ملاقاتیں ہی ہوتی تھیں۔ میں اس کے بارے میں اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ بھی جہانگیر کی طرح ایک کروڑ پتی شخص ہے اور بس۔

پھر جہانگیر مجھے اپنے غیر ملکی دوروں اور بزنس کی مصروفیات کے بارے میں بتاتا رہا۔ میرے پاس اتنی دولت تو نہیں لیکن معلومات اس سے کہیں زیادہ تھیں، پھر مجھ میں دوسروں کی باتیں سننے کا حوصلہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ وہ بوتلر رہا اور میں دل ہی دل میں مرعوب ہوتا رہا اور سوچتا رہا کہ چوبیس گھنٹوں میں سے شمرہ کے لیے وہ کتنا وقت نکال پاتا ہوگا۔

میں نے باتوں باتوں میں اس سے پوچھ بھی لیا۔ ”جہانگیر صاحب! آپ اتنی بڑی لائف میں سے ہر دواؤں کے لیے وقت کیسے نکال پاتے ہیں؟“ میری بات پر وہ مسکرا کر رہ گیا۔

اس تقریب کے بعد میرا احساس محرومی مزید بڑھ گیا۔ انتہائی تنگ ترین علاقے میں جہانگیر کا وسیع وعریض بنگلا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ دواؤں سے زیادہ ہی ہوگا۔ وسیع وعریض لان اتنا بڑا تھا کہ وہاں دو ہزار سے زیادہ کرسیاں آسکتی تھیں۔ اس کا کارپورس بھی اتنا بڑا تھا۔ اسے دیکھ کر کسی پارکنگ لائٹ کا گمان ہوتا تھا۔ مہمانوں کی روانگی کے بعد شمرہ نے خند کر کے ہم لوگوں کو روک لیا۔ یوں بھی رات کافی ہو چکی تھی اور وہاں جانے میں خاصی وقت ہوتی۔ اس رات مجھے اس کا مکمل نما گھر اندر سے بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ اس میں اوپر پینچ آراستہ بیڈروم تھے۔ مہمانوں کے لیے علاحدہ سے ایک کئی کئی لیکن وہاں جہانگیر کے کاروباری اور غیر ملکی مہمان ٹھہرتے تھے۔

دس پندرہ رومز کے علاوہ وسیع وعریض اور جدید ترین اور بیش قیمت فرنیچر سے آراستہ ڈرائنگ روم تھا۔ جہانگیر کا بیڈروم بھی شاندار تھا۔ اس کے علاوہ اس محل میں ایک اسٹڈی روم بھی تھا۔ ہر موضوع کا پورٹن علاحدہ تھا۔ ان کتابوں میں ماریٹائم، انٹرنیشنل سیلیس، تاریخ، ادب اور انگریزی ادب پر ایسی کتابیں تھیں کہ انہیں دیکھ کر مجھے رشک کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوئی۔

میں نے شمرہ سے پوچھا۔ ”کیا جہانگیر صاحب کو مطالعے کا بہت شوق ہے؟“ شمرہ عجیب سے انداز میں مسکرا دی۔

”جہاں تک مجھے علم ہے، مطالعے کا شوق تمہیں تھا۔ خاص طور پر اردو ادب سے لگاؤ تھا تمہیں؟“ میں نے کہا۔

”وہ تو اب بھی ہے مجھے۔“ اس نے جواب دیا۔

”مجھے تو لگنے کا شوق بھی تھا لیکن زندگی نے مہلت ہی نہیں دی کہ میں اپنے لیے بھی کچھ وقت پس انداز کر سکوں۔“

میں نے سوچا کہ جہانگیر اتنی دولت کما کر کیا کرے گا؟ جہاں تک مجھے علم ہے شادی کے بعد اس نے صرف پہلے پندرہ دن شمرہ کے ساتھ ہی مون منایا تھا اور شمرہ کو سوسٹریلینڈ، اٹلی، لندن اور نہ جانے کہاں کہاں کی سیر کروائی تھی۔ اس کے بعد شاید کئی دن اس کی شمرہ سے ملاقات نہ ہوئی ہوگی۔ اس کی مصروفیات تو کچھ ایسی ہی تھیں۔

میں نے کراچی آ کر نہ صرف امریکا کی کئی کمپنیوں

میں ملازمت کے لیے درخواست بھی بھیجی بلکہ مختلف یونیورسٹیوں سے بھی رابطہ کر لیا۔ ان دنوں کمپیوٹر پاکستان میں آچکا تھا لیکن ابھی وہ صرف دفاتر اور دولت مند گھرانوں تک ہی پہنچا تھا۔

میں نے کمپیوٹر کے ذریعے ہی امریکا اور یورپ کی دوسری کمپنیوں کو ملازمت کے سلسلے میں ای میل کی تھی۔

اس بھاگ دوڑ میں ایک سال گزر گیا۔ میں ہر مہینے پابندی سے اماں اور اباجی سے ملنے بھی جاتا تھا۔ ریٹونے ایف اے کر لیا تھا اور اب وہ اے میں پڑھ رہی تھی۔۔۔

اباجی مجھے دیکھ کر اتنے خوش ہوتے تھے کہ میں اس خوشی کو صرف محسوس کر سکتا تھا، بیان نہیں۔ اماں ہر دفعہ یہی کہتی تھیں کہ میں تیرے لیے چاندی دکن لاؤں گی لیکن ابھی تک انہیں اپنی وہ چاندی بھوکھن ٹی نہیں تھی۔ میرا تو شادی کا۔۔۔

فی الحال کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔

آخر ایک دن میری کوششیں رنگ لائیں اور مجھے امریکا کی ایک فرم میں ملازمت مل گئی۔ وہاں میری تنخواہ اور دیگر مراعات اتنی تھیں کہ میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ کمپنی کی طرف سے بنگلا تھا، کار خانی اور طبی سہولیات تھیں۔ جتنا میں یہاں رہ کر سال بھر میں کماتا، وہاں صرف ایک مہینے میں کمالیتا۔ اب مسئلہ صرف اماں اور اباجی کو کھانا کھانے کا تھا۔

میں نے اپنی موجودہ ملازمت چھوڑ دی تھی۔ میں اپنا سب سامان سمیٹ کر لاہور روانہ ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

”دیکھو بیٹا! تم کراچی گئے تو میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہم سے دور ہو لیکن اپنے ملک میں تو ہو۔“ اباجی نے کہا۔

رات کے کھانے کے بعد میں اباجی کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جھجکتے ہوئے انہیں بتایا تھا کہ میں امریکا جانا چاہتا ہوں۔

”یہاں تمہیں کس چیز کی کمی ہے پتر؟“ انہوں نے کہا۔ ”کیا تم نے انجینئرنگ کی ڈگری اس لیے لی تھی کہ وہ غیروں کے کام آئے؟“

میں اباجی کو کیسے سمجھاتا کہ میں شرمہ کی ضد پر زیادہ سے زیادہ دولت کماتا چاہتا ہوں۔ اباجی کی بات درست تھی۔ مجھے کسی بھی چیز کی کمی نہیں تھی۔ اللہ نے مجھے میری اوقات سے بڑھ کر دیا تھا۔

”اباجی!“ میں نے کہا۔ ”میں صرف دو سال وہاں

لگاؤں گا اور کچھ پیسے کم کر اپنے ملک لوٹ آؤں گا۔“

”ٹھیک ہے بیٹا!“ اباجی نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ ”تو نے جانے کا فیصلہ کر لی لیا ہے تو ہم تجھے کیسے روک سکتے ہیں؟“ ان کے لہجے میں افسردگی تھی۔ ”جا اپنی یہ خواہش بھی پوری کر لے۔“

”صفر! تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ ہمارا کیا بنے گا؟“

اماں نے کہا۔

”آپ لوگ تو عیش کریں گے عیش!“ میں نے موضوع بدلنا چاہا۔

”نہیں چائیں ہمیں عیش!“ اماں نے کہا۔

”اے مت رو کو نسیر!“ اباجی نے کہا۔ ”اس نے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو ہم جھلا اسے روکنے والے کون ہوتے ہیں۔ جاؤ بیٹا، خبر سے جاؤ اور خبر سے واپس آؤ۔“

☆ ☆ ☆

امریکا پہنچ کر شروع شروع میں تو مجھے خاصی تکلیف ہوئی۔ پھر میں نے بھی خود کو اس انجینی ماحول میں ڈھال لیا۔ وہیں میری ملاقات لطیف سے ہوئی۔ اس کا تعلق بھی پاکستان میں جہلم سے تھا۔ جلد ہی ہم دونوں میں گہری دوستی ہوئی۔

لطیف کسی آئل فیلڈ پر کام کر رہا تھا۔ میرے پاس خاصا بڑا اپارٹمنٹ تھا اس لیے میں نے اسے بھی اپنے ساتھ رکھ لیا۔

☆ ☆ ☆

اجانک مجھے کسی نے چھوڑا تو میں چونک اٹھا۔ لطیف مجھ سے کچھ کہہ رہا تھا۔

”کیا کہہ رہے ہو؟“ میں نے ہیڈ فون کانوں سے نکالتے ہوئے کہا۔

”اب اترو، ہم لاہور پہنچ چکے ہیں۔“ میں جلدی سے نیچے اتر آیا پھر ہم کوچ کے ذریعے اپنے اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ اباجی گاؤں منتقل ہو چکے تھے۔ گاؤں کی حالت بھی بدل چکی تھی۔ وہاں پختہ سڑک بن گئی تھی اور اس سڑک پر تانگوں کے ساتھ ساتھ رکشا بھی چلنے لگے تھے۔

میں نے بھی رکشا ہی لیا تھا۔

کچھ دور چلنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اماں تو جہلم کے اسپتال میں ہوں گی یا لیکن ہے گھر چلی گئی ہوں۔

میں نے ہیل فون نکال کر ریڈو کا نمبر ملایا تو اس نے فوراً ہی کال ریسیور کر لی۔ ”السلام علیکم بھیا!“

”علیکم السلام۔“ میں نے کہا۔ ”ریڈو! اب اماں کی طبیعت کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہے بھیا۔ ابھی ڈاکٹر انہیں دو مہینے روز مزید

اسپتال میں رکھیں گے۔“

”تم اس وقت اسپتال میں ہو؟“

”جی بھیا۔“ اس نے جواب دیا۔

”اچھا اماں سے میری بات کرواؤ۔“

”اماں..... تو اس وقت سو رہی ہیں بھیا۔“ اس نے کہا۔

”اچھا میں تھوڑی دیر بعد پھر فون کروں گا۔“ میں نے کہا۔

میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ میں جہلم پہنچ گیا ہوں۔

میں اسے سر پر اتر دینا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ سارا سامان گھر میں چھوڑ کر اسی رکنے میں واپس جہلم چلا جاؤں گا۔ گھر کی چابی راجا کے گھر والوں کے پاس تو ہوگی۔ چابی نہ بھی ہوتی تو میں سامان راجا کے گھر رکھ دوں گا۔

میں اپنے گھر کے نزدیک پہنچا تو مجھے گھر کی حالت دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ اباجی نے اسے شاید نئے سرے سے بنوایا تھا یا پھر اس میں کچھ ردوبدل کروایا تھا۔

راجا کے گھر میں صرف خالہ اجنہ تھیں۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ میرا سامان رکھ لیں، میں اب بھی جہلم واپس جا رہا ہوں۔ میں سامان وہاں رکھ کر اسی ٹیکسی سے جہلم کے ڈسٹرکٹ اسپتال پہنچا۔

ریڈو جانک مجھے اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ اب بھی بڑا بڑا ہو چکی تھی اور اب وہاں ٹی ریڈو کی جگہ ایک خوب صورت ڈشویئر کھڑی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر مجھ سے لپٹ گئی اور بری طرح رونے لگی۔

”تم رو کیوں رہی ہو ریڈو؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

”اماں تو ٹھیک ہیں؟“

”ہاں بھیا! اماں بالکل ٹھیک ہیں۔ یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔“

”اب آنسو بہانا چھوڑ مونی۔“ میں نے نس کر کہا۔

اسی وقت اباجی بھی آگئے۔ وہ پہلے کے مقابلے میں بہت کمزور ہو گئے تھے اور خاصے بوڑھے بوڑھے لگ رہے تھے۔ میں والہانہ انداز میں ان سے لپٹ گیا اور میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اباجی میری پشت سہلاتے رہے۔

”اب آپ کیوں رو رہے ہیں مونے آلو؟“ ریڈو نے منہ بنا کر کہا تو بے اختیار مجھے ہنسی آ گئی پھر راجا مجھ سے گلے ملا۔

میں نے کہا۔ ”راجا! تیرا شکر ہے میں کس منہ سے ادا کروں۔ تو نے میرے ماں باپ کی بہت خدمت کی ہے۔“

”صفر! اگر تو ایسی باتیں کرے گا تو میں تیرے گھر آنا چھوڑ دوں گا۔“

وہاں کے کسی بھی گوشے میں اور ملک گھر نہیں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسٹمز ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ٹائمز گزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ

(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

ایک ایڈیٹر یا سب ایڈیٹر کے لیے 8,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ تم اسی حساب سے ارسال کریں ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے پیسہ دلانے کے لیے بہترین تھوڑی ہو سکتا ہے

ہیروان ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر ہماری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ شمارے (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیر III سسٹمز ڈائجسٹ ہاؤسنگ اتھارٹی میں کورنگی روڈ کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

”ارے نہیں، تو میرا بچپن کا یا رہا ہے۔“
میں نے ابا سے کہا۔ ”ایا! آپ اب گھر چلے جائیں۔ میں اماں کے پاس رہوں گا۔“
”تو بہت لمبا سفر کر کے آیا ہے بیٹا۔“ ابا جی نے کہا۔
”گھر جا کر آرام کر۔“

میں نے ابا کی بات ماننے سے انکار کر دیا پھر میں ڈاکٹر سے ملا اور اس سے اماں کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ اماں کو دل کا دورہ تو نہیں پڑا تھا لیکن انجائنا کا ایک ہوا تھا۔ ان کا بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا تھا اس لیے انہیں آئی سی یو میں رکھنا پڑا۔ اب وہ خیریت سے ہیں اور آج شام تک انہیں ڈسچارج بھی کر دیں گے۔

مجھے دیکھ کر تو اماں اتنی خوش ہوئیں کہ گویا دوبارہ جی اٹھیں۔ انہوں نے عادت کے مطابق میری پیشانی پر بوسہ دیا پھر پہلے کی طرح مجھے دھیرے دھیرے دعا میں دے ڈالیں۔

ڈاکٹروں نے شام تک انہیں ڈسچارج کر دیا۔ وہ دن ہمارے لیے گویا عید کا دن تھا۔ اماں کی طبیعت بھی حیرت انگیز طور پر سنبھل گئی تھی۔ میں نے سب لوگوں کو اپنے لائے ہوئے تحفے بانٹے اور کئی تان کر سو گیا۔

دوسرے دن اماں کی حالت مزید سنبھل گئی اور انہوں نے چلتا پھرتا شروع کر دیا۔ وہ میرے لیے اپنے ہاتھوں سے پرانے بنائے جا رہی تھیں، میں نے اور رینو نے ان کی خوشامد کر کے انہیں روکا۔

مجھے اچانک ان جنھوں کا خیال آیا جو میں شمرہ، جہانگیر اور دانیال کے لیے لایا تھا۔ میں اسی دن اسلام آباد روانہ ہو گیا۔ میں نے اماں کو اسپتال سے گھر لاتے وقت جہلم کے ایک ریٹن اسے کار والے سے ایک مبینے کے لیے ایک گاڑی کرائے پر لے لی تھی۔

شمرہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جہانگیر بھی اس وقت گھر میں موجود تھا لیکن صرف آدھے گھنٹے کے لیے۔ اسے ایک ضروری میٹنگ میں جانا تھا اس لیے معذرت کر کے چلا گیا۔ میں نے شمرہ کو اپنے لائے ہوئے تحفے دیے تو اس نے ہنس کر کہا۔ ”اس کی کیا ضرورت تھی صدف بھائی؟“

”میں جانتا ہوں کہ تمہارے پاس ضرورت کی ہر چیز موجود ہے بلکہ اس سے کہیں قیمتی چیزیں ہیں لیکن گفت کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔“ پھر میں نے دانیال کو چاکلیٹ کا بکس اور بہت سارے کھلونے دیے، کچھ نئے میگزین سی ڈیز تھیں۔ وہ انہیں لے کر بہت خوش ہوا۔ وہ بہت پیارا بچہ

تھا۔ اس میں شمرہ اور جہانگیر دونوں کی شاپت تھی اور وہ دونوں ہی خوب صورت تھے۔

اچانک ڈرائنگ روم میں ایک عورت داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ تین، ساڑھے تین سال کی ایک بچی بھی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے اچانک ریشا یاد آگئی۔ وہی ناک نقشہ، وہی بال، وہی آنکھیں۔

میں نے شمرہ سے پوچھا۔ ”شمرہ... یہ... یہ...“
”یہ ریشا ہے۔“ شمرہ نے مجھے حیران کر دیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے دیکھ کر مجھے ریشا یاد آئی تھی۔ یہ شمرہ کی چھوٹی بیٹی تھی۔

”اوہو، مجھے اس کے بارے میں تو معلوم ہی نہ تھا۔“
میں نے کہا۔ ”سوری گزیا! میں تمہارے لیے کوئی کٹ نہ لاسکا لیکن میں تمہیں یہیں سے بہت اچھے اچھے کھلونے لادوں گا۔“

”انکل! آپ بھی کھلونوں سے کھیلے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔
”ہیٹا انکل! اتنے بڑے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”بڑے کیا کھلونوں سے کھیلے ہیں؟“
”ممما! انکل کو کچھ جانے وغیرہ تو پلائیں۔“ دانیال نے کہا تو مجھے ہنسی آگئی۔

”ہاں بیٹا! میں نے ریشہ سے کچھ کھلا ہے۔ وہ جانے لاری ہوئی۔“ شمرہ مجھ سے بولی۔ ”ایک بات بتائیں صدف بھائی۔ آج کل ہر آدمی پیسے کے پیچھے کیوں بھاگ رہا ہے؟“
”اس لیے کہ پیسہ ساری اس دور کی سب سے بڑی قوت ہے۔“ میں نے کہا۔

”گویا آپ بھی لوگوں کے اس قبیل میں شامل ہو گئے ہیں جن کے لیے پیسہ رشتوں ناتوں سے زیادہ اہم ہے؟“
”نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں صرف اتنا کمانے گیا تھا کہ جس سے زندگی میں آسانی پیدا ہو سکے۔ مجھے پیسے کی ضرورت تھی، ہوں نہیں۔“ میں نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ حالانکہ اسی پیسے کی ہوس نے تو مجھے کئی سال تک پاکستان نہیں آنے دیا۔

”تم سناؤ شمرہ، کیسی زندگی گزر رہی ہے؟“
”کیسی گزر سکتی ہے؟“ شمرہ نے اٹھا مجھ سے سوال کر دیا۔ ”جہانگیر نے مجھے دنیا کا ہر عیش، ہر آرام مہیا کیا ہے پھر ان کا سب سے بڑا احسان تو میرے لیے دو نئے کھلونے ہیں۔“

میں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا۔ شمرہ کے چہرے پر عجیب سی افسردگی تھی۔ شاید وہ اپنے شوہر سے خوش نہیں تھی یا شاید کوئی اور بات ہو۔

اماں کی طبیعت اب بالکل ٹھیک تھی۔ میں انہیں اور رینو کو لے کر لاہور چلا آیا تاکہ میرے ساتھ ساتھ اماں اور رینو کی ملاقات بھی ان سے ہو جائے۔ خالہ جان اور خالو مشتاق دونوں پہلے کے مقابلے میں خاصے بوڑھے اور کمزور لگ رہے تھے لیکن اب بھی وہ بزنس میں مصروف تھے۔ ہم لوگ کچھ دن وہیں ٹھہرے، میں نے اماں، خالہ اور رینو کو خوب سیر کروائی۔ ابا جی وہیں جہلم میں تھے۔ وہ کہیں آتے جاتے نہیں تھے۔ چار دن بعد جب ہم واپس گاؤں پہنچے تو اماں کو دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ کچھ دن پہلے بہت بیمار تھیں۔ میں کچھ دن گاؤں میں رہا پھر میرا رخ ایک دن لاہوری طور پر شمرہ کے محل کی طرف ہو گیا۔ وہاں اس وقت بالکل سناٹا تھا پھر ایک کمرے سے دانیال بھاگتا ہوا آیا اور میری ناک سے لپٹ گیا۔ ”انکل! آپ تو اس دن کے بعد آئے ہی نہیں۔“

”بیٹا وقت ہی نہیں ملا۔“
”مہی بات پایا کہتے ہیں تو ماما کی اور ان کی خوب لڑائی ہوتی ہے۔“ دانیال نے کہا۔

”تمہارے ماما اور پایا کہاں ہیں؟“
”ماما، ماما اپنے دوست کی شادی میں کراچی گئے ہیں۔“
”اور تم کونوں کو کیا چھوڑ گئے؟“
”ہم تو کئی گھر میں ہیں۔“ ریشا نے کہا۔
جانے کب وہاں آگئی تھی۔ ”آیا اماں ہیں، ریشہ ہے، گل چاچا اور خان بابا ہیں۔“

”یار! ہم ذرا تمہاری ماما کی لائبریری دیکھ لیں؟“
میں نے کہا۔
”دیکھ لیں انکل۔“ اس نے کہا۔

میں اسٹڈی روم کی طرف بڑھا تو اس نے کہا۔ ”ماما کی لائبریری تو ادھر ہے۔“ اس نے اندر کی طرف اشارہ کیا۔
”چلو، پھر ادھر ہی چلتے ہیں۔“ وہ مجھے چھوٹے سے ایک کمرے میں لے آیا۔ اس میں ایک طرف آرام دہ کاؤچ بڑا تھا۔ ایک صوفی سیٹ بھی تھا اور ایک راکنگ چیئر بھی۔ کرسی کے سامنے کونے میں ایک رائٹنگ ٹیبل تھی اور اس کے اوپر دیوار میں کچھ رنگے تھے۔ اس میں میر تقی میر سے لے کر فیض، فراق، ناصر کاظمی، منیر نیازی اور احمد فراز کے دیوان اور کلیات موجود تھے۔

دانیال نے کہا۔ ”انکل! اوپر والی کینٹ میں میری بال بڑی ہے۔ تمنا نے مجھے سے چھین کر وہاں ڈال دی تھی۔ پلیز مجھے وہ بال اتار دیں۔“

”لیکن ایک شرط پر، تم لوگ ماما کو نہیں بتاؤ گے کہ وہ بال میں نے اتار کر دی ہے۔“
”نہیں کہوں گا، پراس۔“ اس نے کہا۔
میں رائٹنگ ٹیبل پر احتیاط سے چڑھا اور چھت سے لگے ہوئے اس دیوار گیر کینٹ تک پہنچ گیا۔ اس میں میکینک دروازے لگے تھے۔ میں نے دروازہ کھینچ کر کھولا تو حیران رہ گیا۔

اس میں شمرہ کی بہت سی ڈائریاں پڑی تھیں۔ مجھے وہ ڈیا بھی نظر آیا جو میں نے میٹرک پاس ہونے پر شمرہ کو دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہاں ایک گیند بھی پڑی تھی۔ میں نے گیند اتار کر دانیال کو دی اور اس سے کہا۔ ”جاؤ بیٹا کھیلو لیکن لان میں ہی کھیلنا۔ کسی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنا نہیں چاہیے ورنہ تمہاری ماما مجھے بھی ڈانٹیں گی۔“ وہ اپنی گیند لے کر خوشی خوشی باہر چلا گیا۔

میں نے بے اختیار وہ ڈائریاں اور گھڑی کا ڈبا نکال لیا۔ وہ بہت سی ڈائریاں تھیں۔ میں نے نو سال پہلے کی ڈائری نکالی اور اس کے بعد دو تین ڈائریاں نکالنے کے بعد موجودہ سال کی ایک ڈائری بھی نکال لی۔

کسی کی ڈائری پڑھنا انتہائی غیر اخلاقی حرکت ہے لیکن دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں وہ حرکت کر بیٹھا تھا۔ تو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ریشا کی جان بھی کھینچا تھا۔ پہلے میں نے گھڑی کا وہ ڈبا کھولا۔ اس میں وہ گھڑی اسی حالت میں رکھی تھی لیکن اس میں سے وہ شعر غائب تھا جو میں نے شمرہ کو لکھ کر دیا تھا۔

پھر میں نے نو سال پرانی ڈائری کھولی تو اس میں سے وہی پرچہ نکل کر باہر گر پڑا جس پر میں نے شعر لکھا تھا۔
”مت ہل ہمیں جانو، پھر تارے فلک برسوں۔ جب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں!“

اسی کے نیچے اس نے لکھا تھا۔ ”میں نے تمہیں پہل کب جانا تھا صدف! میں تو آنکھوں ہی آنکھوں میں تمہاری پوجا کرتی تھی۔“

میرا دل بے اختیار زور سے دھڑکنے لگا پھر میں نے ڈائری کھولی، صفحات پلٹتے ہوئے میں نے ان پر سرسری نظر ڈالی۔ روزمرہ کی باتیں تھیں۔

ایک صفحے پر لکھا تھا۔ ”جہانگیر کے لیے میرے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ صدف کو بڑا ہوا دیکھتی ہوں تو دل خون کے آنسو روتا ہے لیکن پایا کو بیٹی سے زیادہ پیسا عزیز تھا۔“
میرے ہاتھ جیر بے قابو ہو رہے تھے۔ سر میں

دانیال پانی نے کہا آیا تو میں نے پانی پیا اور اس سے بولا۔ ”دانیال پینا اب میں اس وقت آؤں گا جب تمہاری ماما اور بابا آجائیں گے۔“

یہ کہہ کر میں بوچھل قدموں سے لڑکھڑاتا ہوا ہار لٹکا اور گاڑی میں بیٹھ گیا پھر نہ جانے کس طرح میں گاڑی ڈرائیو کر کے گاؤں پہنچا۔ گھر پہنچے پہنچے میرا پورا وجود بری طرح جھلنے لگا تھا۔ مجھے شدید بخار ہو گیا تھا۔

اماں ساری رات میرے سر ہانے بیٹھی رہیں اور ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتی رہیں۔ صبح تک میری طبیعت کچھ سنبھل گئی۔ اس دن ہم سب لوگ شام کی چائے پی رہے تھے کہ چائے خالہ زینت گھر میں داخل ہوئیں۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”کیا ہوا بیٹی؟“ اماں نے پوچھا کہ پوچھا۔ ”نسیہ! اجنا گھیر نے شرہ کو طلاق دے دی اور بچے بھی اس کے حوالے کر دیے۔“

میں کہتے میں رو گیا۔ امی اور رینو بھی یہ خبر سن کر بری طرح رونے لگیں۔

”نسیہ! اب میری شرہ کا کیا ہوگا؟ کیا تم.....“

اماں نے میری طرف دیکھا، پھر ان کے چہرے پر ناگواری کی کھینٹیں نمودار ہوئیں۔ میں کچھ گیا کہ اماں جواب نہیں لیا۔ ”میں نے دانیال کو اس کے جلدی سے کہا۔ خالہ بی! اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں.....“

خالہ نسیہ نے روتے ہوئے مجھے گھٹے لگا لیا اور بولیں۔ ”بیٹا! تو نے ثابت کر دیا کہ انسان دولت سے بڑا یا چھوٹا نہیں ہوتا۔“

”اب بس کریں باقی؟“ اماں نے کہا۔ ”اس موقع پر اپنے ہی تو کام آتے ہیں۔“

پھر شرہ سے میری شادی ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے دو پیارے پیارے بچے بھی ملے ہیں۔ میرے آگن میں ہر طرف بہاریں رقص کرتی ہیں لیکن یہ بچہ تاد اب بھی میری جان نہیں چھوڑتا کہ اس میں بے چارہ ریشا کا کیا قصور تھا؟ وہ کس گنہگار کی پاداش میں ماری گئی؟ میری جلد باز اور کلنڈری طبیعت نے مجھ سے سوچنے سمجھنے کی سکت تک چھین لی تھی..... کاش میں اچھی صحبت اختیار کرتا تو میرے دوست بھی مجھے کوئی ٹیک مشورہ دیتے۔ یا مجھے ایسا کوئی گھناؤنا قدم اٹھانے سے روک دیتے۔ میری غلط صحبت ہی ریشا کی قاتل بن گئی۔

دھماکے سے ہونے لگے۔ شرہ، وہ مفروضہ شرہ مجھے اتنا چاہتی تھی۔

گزشتہ سال کی ڈائری میں پہلے ہی صفحے پر لکھا تھا۔ ”آج جہانگیر کی شرافت کا پول کھل گیا۔ وہ چپسا کمانے کا تو جنونی ہے ہی، عورتوں کا بھی دیوانہ ہے۔ راتوں کو وہ کاروباری سینکوں میں نہیں بلکہ اپنی مجبوراؤں سے ملنے جاتا تھا پھر اس نے مجھ سے شادی کیوں کی؟ دل چاہتا ہے کہ ابھی اور اسی وقت اسے چھوڑ کر چلی جاؤں لیکن میرے بچوں نے میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں۔“

موجودہ سال کی ڈائری میں لکھا تھا۔ ”اب جہانگیر کے ساتھ زندگی ایک عذاب بن کر رہ گئی ہے۔ اسے نہ جانے کہاں سے علم ہو گیا ہے کہ خالہ نسیہ صفر کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ میں اس سے لڑتی ہوں تو وہ مجھے صفر کا طعنہ دیتا ہے۔ مہذب نقاب میں چھپا ہوا حیوان! اسے تو اپنے بچوں کا بھی خیال نہیں ہے۔ کاش..... کاش میں اس وقت خود میں اتنی جرأت پیدا کر سکتی جب صفر کا رشتہ میرے لیے آیا تھا۔ پانیان مجھے بے شرم اور بے حیائی کو کہتے لیکن اب..... اب تو جہانگیر مجھے شراب پینے پر مجبور کرتا ہے۔“

ایک اور صفحے پر لکھا تھا۔ ”آج جہانگیر نے مجھے اپنے ایک دوست کے ساتھ ڈانس نہ کرنے پر پوری محفل میں دھنک کر دیا پھر گھر آکر اس نے ڈیڑھ گھنٹہ شراب کی بوتل میرے حلق میں انڈیل دی۔ درندہ کہیں کا۔ میں اب اس کے ساتھ ایک ہل بھی نہیں رہوں گی۔“

اس کے بعد ڈائری کے صفحات سادہ تھے۔ میرا سر بری طرح پکڑا رہا تھا۔ میں نے سب ڈائریاں تمبین۔ گھڑی کا ڈبا اور تمام ڈائریاں اسی طرح اوپر چڑھ کر کینٹ میں رہیں۔ میز کا وہ حصہ صاف کیا جہاں میرے چڑھنے سے جوتوں کے نشانات بن گئے تھے اور بوچھل قدموں سے باہر آ گیا۔

اسی وقت مجھے دانیال نظر آیا۔ وہ مجھ سے بولا۔ ”اٹکل! آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”بیٹا! میں گھر جا رہا ہوں۔ آپ ذرا مجھے ایک گلاس پانی پلا دیں۔“

اس نے مستعدی سے کہا۔ ”ابھی لاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اندر بھاگ گیا۔

میں نے وہ گیند اٹھائی اور اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ شرہ کی نظر اس گیند پر پڑے اور وہ سمجھ جائے کہ اس کے کینٹ کو کسی نے ہاتھ لگا دیا ہے۔